قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور
قیمت فی پرچہ
پاکستان — ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ
بدل اشتراک
سالانہ — پاکستان — دس روپے
سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے
سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ
نمبر ۷
جولائی سنہ ۱۹۷۰ء
جلد ۲۳

فہرست

سنہ ۱۹۳۸ء نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

سنہ ۱۹۴۷ء نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

سنہ ۱۹۷۰ء نفرت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان کی فضا اس قدر نفرت آگیں کیوں ہے؟

(ایک حقیقت کشا سنجیدہ تجزیہ)

پاکستان کی سیاست حاضرہ پر اگر کوئی شخص دو لفظوں میں تبصرہ کرنا چاہے تو اس کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس وقت پاکستان کی فضا، باہمی نفرت اور عداوت کے جذبات سے معمور ہے اور جب جذبات نفرت اور عداوت کی وسعت اور شدت کا یہ عالم ہو تو اس قوم سے اس کی توقع کرنا، بیکار ہے کہ وہ کسی معاملے پر ٹھنڈے دل سے سوچ اور بچار کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکے گی۔

نفرت کے جذبات یکطرفہ ٹریفک نہیں ہوتے، جب کسی ایک طرف سے نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا ہے تو فریقِ مخالف کا ردِ عمل بھی ایسا ہی ہوتا ہے (بجز اس کے کہ وہ فریق اخلاقِ عالیہ کی اتنی بلندیوں تک پہنچ چکا ہو کہ وہ جذبات کی شدت میں بھی، بلند اقدارِ سماوی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے) اس طرح باہمی نفرت اور عداوت کا ایک ایسا دائرۃ السوء (VICIOUS CIRCLE) وجود میں آجاتا ہے جس میں ایک جذبہ اسی قسم کے دوسرے جذبہ کو جنم دیئے چلا جاتا ہے، اور ساری قوم اس زہر آلود فضا میں سانس لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ بہی خواہانِ پاکستان کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ان جذباتِ نفرت و عداوت کے سرچشمہ کا سراغ لگائیں اور پھر کوشش کریں کہ کسی طرح وہ بند ہو جائے تاکہ اس بدقسمت سرزمین کی فضا اعتدال پر آجائے۔ ان سطور کی تحریر کا جذبہ محرکہ یہی ہے۔

یوں تو ہمارے ملک میں (یعنی تقسیم سے پہلے) مذہبی فرقوں میں باہمی اختلاف بھی تھا اور سیاسی پارٹیوں میں کشمکش بھی لیکن نفرت اور حقارت کے اس دور کی ابتداء سنہ ۱۹۳۹ء سے ہوئی جب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے ان مضامین کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ وہ دن اور

آج کا دن ــــ یہی نہیں کہ یہ لہر کہیں تھمی یا رکی نہیں بلکہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اس کی رفتار میں تیزی اور تندی میں شدت آتی چلی گئی تا آنکہ اب اُس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

تاریخ کی یہ ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ جب کوئی شخص کسی طرح اثر یا اقتدار حاصل کر لیتا ہے تو اُس کی ذاتی نفسیات کا رنگ اُس کے پورے حلقۂ اقتدار یا اثر پر چھا جاتا ہے۔ اور اگر اس شخصیت کو مذہبی تقدس بھی حاصل ہو جائے تو پھر اُس کی یہی نفسیاتی خصوصیات مذہبی زندگی کا منتہیٰ و مقصود قرار پا جاتی ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ اگر وہ ذی اثر اور صاحبِ اقتدار شخصیت بلند اقدار کی پیکر ہوتی ہے تو اُس کے زیرِ اثر جماعت بھی انہی اقدار کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ لیکن اگر اُس کی ذات متوازن نہیں ہوتی، وہ کسی قسم کے سیاسی گرداب (COMPLEXES) میں گھری ہوتی ہے تو اُس کا زیرِ اثر حلقہ بھی اُنہیں احساسات کا شکار ہو جاتا ہے اور بدقسمتی یہ کہ وہ انہیں سیرت و کردار کا بلند معیار قرار دے دیتا ہے۔

گزشتہ تیس برس سے مودودی صاحب کا جو کردار لوگوں کے سامنے آیا ہے اُس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اُن میں انتہا درجے کی رعونت، تکبر، نخوت، خود پسندی، ہمچو ما دیگرے نیست کا احساس کبریٰ 'انا الموجود لا غیری' کی آمرانہ ذہنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ (سوائے اُن لوگوں کے جو اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں) ہر ایک کو ذلت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں حتّیٰ کہ وہ اپنے مصاحبین کو بھی اُس وقت تک برداشت کرتے ہیں جب تک ان کی روش یہ ہو کہ ــــ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

قارئین کو معلوم ہے کہ ہم کبھی ذاتیات میں نہیں الجھا کرتے، اس لئے مودودی صاحب کے اس نفسیاتی تجزیہ کے لئے بھی ہم اپنی ذاتی معلومات کو درمیان میں نہیں لائیں گے بلکہ انہی شہادات کو پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو اس سے پہلے پبلک کے سامنے آ چکی ہیں۔ انہوں نے اپنے بچپن کی زندگی کے متعلق خود کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں، جن سے اُن کی نفسیاتی ذہنیت کی بنیاد ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

بچپن کی زندگی

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا، میرے ایک بھائی مجھ سے تین چار برس بڑے تھے۔ مجھے کھانے کی جو چیز ملتی تھی اُسے میں فوراً کھا لیتا تھا مگر بھائی سنبھال کر کسی اچھے وقت پر کھانے کے لئے انتظار رکھتے تھے۔ اس طرح جو پیسے ملتے تھے اُن کو بھی میں فوراً خرچ کر ڈالتا تھا اور بھائی صاحب اُنہیں جمع کر کے کوئی اچھی چیز خرید لاتے۔ بس یہ میرے اور اُن کے درمیان جھگڑے کی مستقل بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ اُن کے حصے میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور اس طرح والدین کے حصے میں

سے تین پچہتر فیصد کا مالک ہوتا تھا، پچاس فیصد اپنے حساب میں اور پچیس فیصد اپنے بڑے بھائی کے حساب میں۔ (ماہ نامہ چراغِ راہ۔ جولائی ۱۹۵۳ء)

اس سے آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

مجھے سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا تھا جب مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لئے پریشان ہوتے تھے۔ اس لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی جان بوجھ کر بھی خطرے میں ڈالتا۔ (ایضاً)

فطرۃً خود مختار

مودودی صاحب کی اس بنیادی نفسیات سے اُن کی کیا سرشت بنادی گئی اس کے متعلق وہ اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں۔

قدیم تعلقات کی بنا پر مجھے الجمعیت کو ہمدرد پر ترجیح دینی پڑی۔ اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری وجہ یہ بھی کہ میں فطرۃً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں اور کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام نہیں کر سکتا، خواہ وہ میرے نزدیک کتنا ہی محترم ہو۔

(مولانا مودودی اپنوں اور دوسروں کی نظر میں)

اس ذہنیت نے مودودی صاحب کو بزعمِ خویش کس مقام پر پہنچا دیا، اس کے متعلق اُن کے بڑے بھائی مولانا ابوالخیر مودودی صاحب کی رائے قابلِ غور ہے۔ بات یوں ہوئی کہ ماہنامہ نگار پاکستان نے نیاز نمبر کے سلسلے میں ملک کے اُن مختلف اربابِ قلم کو دعوتِ نگارش دی، جنہیں کسی نہ کسی جہت سے جنابِ نیاز سے تعلق یا دلچسپی تھی۔ ان میں ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالخیر مودودی کا نام سرِ فہرست آتا تھا کیونکہ انہوں نے بقول ابوالخیر قلم پکڑنا حضرت نیاز کی حاشیہ نشینی میں سیکھا تھا۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس فرمائش کے جواب میں کیا لکھا اور جنابِ نیاز نے اس پر کیا تبصرہ فرمایا، یہ ایک الگ داستان ہے۔

شاہدٌ من اہلہا

مولانا ابوالخیر صاحب سے کہا گیا تھا کہ وہ نیاز صاحب کی بھوپال کی زندگی سے متعلق کچھ لکھیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں لکھا۔

جی ہاں! نیاز اور بھوپال پر لکھنے والا ہی ایک نافرجام رہ گیا ہے کاش..... ! تم کو مرحوم ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ابوالاعلیٰ "بعد از خدا بزرگ" ہو گئے۔ اور یہ نافرجام.....

(نگار پاکستان ۱۹۶۳ء صفحہ ۶۳)

ہم سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب کی ذہنیت، افتادِ طبیعت اور نفسیات کے متعلق اس سے صحیح تر تبصرہ اور ہو نہیں سکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب کسی بڑی سے بڑی ہستی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ہم نے جب

"بڑی سے بڑی ہستی کہا ہے تو سمجھ سوچ کر کہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں کون کون سی ہستیاں آجاتی ہیں۔

(۵)

حضور رسالتمآب کی شان میں

عالمِ انسانیت میں حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کا جو مقام ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ـــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــ حضورؐ اور صرف حضورؐ ہی کی نسبت کہا گیا ہے اور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے متعلق کن خیالات کا اظہار فرماتے ہیں ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بعض سرکردہ ساکنین ـــ جن میں مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن جیسے زعما بھی شامل تھے جو ایک وقت میں امیر جماعت بھی رہ چکے تھے ـــ جماعت سے الگ ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ مودودی صاحب نے جو اصول جماعت کی تشکیل کے زمانے میں اختیار کئے تھے، اب حصولِ اقتدار کے وقت وہ اُن میں سے ایک ایک اصول کو توڑتے چلے جاتے ہیں اور اس کے جواز میں کہتے یہ ہیں کہ اقامتِ دین کا تقاضا حکمتِ عملی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس اصول کو جی چاہے عندالضرورت توڑ دو۔ جب اُن سے کہا گیا کہ یہ کس قسم کا اسلام ہے جس کی آپ دعوت دے رہے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس روش پر نادم ہوتے آپ کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سنیئے کہ انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے کہا (توبہ اَستغفراللہ، نقلِ کفر، کفر نہ باشد) کہ میں نے اگر حکمتِ عملی کے تابع اصول شکنی کی ہے تو یہ کون سی نئی بات ہے خود رسول اللہؐ نے بھی ایسا کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا ہے اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرماں روائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من القریش، امام قریش میں سے ہوں۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا
>
> (رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم صفحہ ۲۰۔۳۲۹)

معترضین نے یہ بھی کہا تھا کہ میدانِ سیاست میں آپ جھوٹ اور فریب تک کو جائز قرار دے دیتے ہیں، اس کے جواب میں انہوں نے پہلے تو یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ

راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضروریات ایسی ہیں، جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔"

اور اس کے بعد پھر اسی ڈھٹائی سے جسے دہراتے ہوئے ہمارا کلیجہ کانپتا ہے، یہ کہا

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں، کعب بن اشرف کے قتل کے لئے جب محمد بن مسلمہ کو حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔ حضورؐ نے بالفاظ صریح اس کی اجازت دی۔

(ترجمان القرآن - بابت مئی ۱۹۵۸ء صفحہ ۵۵ - ۵۶)

کہہ دیا جائے گا کہ یہ واقعات کتب روایات میں موجود ہیں، اس لئے مودودی صاحب نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان باتوں کا ذکر کتب روایات میں آیا ہے لیکن روایات (احادیث) کے معاملہ میں مودودی صاحب کا مسلک مختلف ہے۔ ایک اہلحدیث اس کا مکلف ہے کہ بخاری اور مسلم میں جو احادیث آئی ہیں انہیں بلا تنقید صحیح تسلیم کرے اور دیگر کتب احادیث میں سے جو حدیثیں صحیح قرار پا چکی ہیں انہیں اسی طرح قبول کرے۔ لیکن مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ وہ اس باب میں کسی کے فیصلے کے پابند نہیں، وہ ہر حدیث پر تنقید کر سکتے ہیں اور صرف اُن احادیث کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں جنہیں اُن کی بصیرت صحیح قرار دے دے۔ ظاہر ہے کہ اس مسلک کے ماتحت وہ اس کے پابند نہیں تھے کہ ان احادیث کو بلا تنقید قبول کر لیں۔ انہوں نے ان احادیث کو اس لئے اپنی تائید میں پیش کیا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ احادیث صحیح ہیں۔

ارباب علم کو معلوم ہے کہ ہمارے کتب روایات میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط بھی۔ مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ پہلے ایک مسلک اختیار کرتے ہیں اور پھر کتب روایات میں سے چُن چُن کر وہ روایات نکال لیتے ہیں جو اُن کے مسلک کی تائید کرتی ہوں، خواہ اصولِ حدیث کے مطابق وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ یہی کچھ انہوں نے زیر نظر معاملہ میں بھی کیا۔ اصولوں کو توڑا، سیاست میں جھوٹ بولنے اور فریب دینے کو روا رکھا۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا تو بجائے اس کے کہ اس پر شرماتے، وہ وضعی حدیثیں چُن کر لے آئے جو اُن کے مسلک کی تائید کرتی ہیں اور انہیں قطعاً اس کا احساس نہ ہوا کہ وہ اس سے اُس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی کس قسم کی تصویر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، جنؐ کے خلقِ عظیم کی شہادت خود خدا نے دی۔

آپ نے دیکھا کہ جذبۂ رعونت اور نخوت انسان کو کہاں پہنچا دیتا ہے۔

صحابہ کبارؓ کے خلاف

خاتمِ رسالت مآبؐ کے بعد صحابہ کبارؓ کا مقام ہے — وہ صحابہ کبارؓ جن کے مومن حقّہ ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی ہے۔ لیکن یہ لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کی رعونت نے اُن ہستیوں کو بھی نہیں بخشا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلے الیکشن کے زمانے میں مودودی صاحب نے محسوس کیا کہ اُن کی جماعت کو انتخابات میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا انہوں نے اعلان فرمایا کہ انتخابات میں شرکت سرے سے خلافِ اسلام ہے۔ انہوں نے کہا۔

> اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعتِ اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی، نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو، اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے، لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اس بیان کے خلاف یہ اعتراض ہوا کہ اگر کسی منصب کے لئے، امیدوار بن کر کھڑے ہونا اسلام کے خلاف ہے تو حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو منصبِ خلافت کے لئے کیوں پیش کیا تھا۔ اس پر انہیں سوچنا چاہیئے تھا کہ میں نے واقعی ایک غلط بات کہی ہے اور اس کے بعد اس سے رجوع کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن ان کا جذبۂ رعونت انہیں اس کی اجازت کب دے سکتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کے جواب میں کیا کہا۔ سنیئے اور پھر کلیجہ تھام کر سنیئے کہ یہ کچھ خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا۔

> آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابۂ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی

بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں" (ترجمان القرآن بابت اکتوبر ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۲۸)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب نے کیا کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے (معاذ اللہ) خدا اور رسولؐ کے صاف صاف ارشادات کی خلاف ورزی کر کے ایک لغزش کی تھی۔ میں اس قسم کی لغزش نہیں کر سکتا۔

حضرت علیؓ کے متعلق تو یہ کہا اور جب ۱۹۵۶ء کے دستور کے تابع منعقد ہونے والے انتخابات کے متعلق اندازہ ہوا کہ اُس میں ان کے اُمیدوار کامیاب ہو سکتے ہیں تو انہوں نے اپنی سابقہ پالیسی بدلی اور فیصلہ کیا کہ وہ انتخابات میں حصہ لیں گے۔ اس مقام پر آپ کو یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ مودودی صاحب نے اس فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہوگا کہ انہیں بے حد ندامت ہے کہ انہوں نے پہلے ایک غلط بات اسلام کے سر تھوپ دی اور حضرت علیؓ کی شان میں بھی گستاخی کی۔ اس کے لئے وہ خدا اور قوم سے معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کی رعونت اس کی کب اجازت دے سکتی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس نئے فیصلے کا اعلان کن الفاظ کے ساتھ کیا ۔۔۔ ان الفاظ کے ساتھ کہ •

ہر معقول آدمی بہ یک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

یعنی ان کا اب یہ فیصلہ کہ کسی منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہونا عین دینی نظام کے مطابق تھا لیکن حضرت علیؓ کا اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنا خدا اور رسول کے واضح ارشادات کی خلاف ورزی اور بہت بڑی لغزش تھی۔ واضح رہے کہ اب جماعتِ اسلامی آئندہ الیکشن میں ایک ایک نشست کے لئے امیدوار کھڑے کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔

(۰)

حضرت عثمانؓ کیخلاف

مودودی صاحب کے نشترِ تنقید کا ہدف صرف حضرت علیؓ کی ذات نہیں تھی، ان کے ناوک نے کسی صید کو بھی نہیں چھوڑا۔ انہوں نے ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۶۰ء و جنوری ۱۹۶۱ء میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "تجدید و احیائے دین" ۔۔۔ بعد میں

اسے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ اس کا ذیلی عنوان تھا "مجددین امت کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر"۔ ان مجددین میں جنہیں مودودی صاحب نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا خلفائے راشدین بھی شامل تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے حضرتِ عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے دورِ خلافت کے متعلق لکھا تھا۔

> مگر ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمان رضؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمان رضؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔ انکے بعد حضرت علی رضؓ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن اُن کی جان کی قربانی بھی اس انقلابِ معکوس کو نہ روک سکی۔ آخرکار خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دور ختم ہوگیا۔　　(صفحہ ۳۵)

حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کی اس ناکامی کا ذکر کرنے کے بعد وہ مجددین کی طرف آتے ہیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، ائمہ اربعہ، امام غزالی۔ امام ابن تیمیہ۔ شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ) میں سے ایک ایک کا نام لے کر یہ بتاتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے مشن میں کس طرح ناکام رہ گئے۔ اس کے بعد وہ قوم سے کہتے ہیں کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ایک آنے والا آئے گا اور جو کچھ ان اسلاف میں سے کسی سے نہیں ہوسکا وہ کچھ کر کے دکھائے گا۔ وہ لکھتے ہیں۔

آنے والا

> میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علومِ جدیدہ پر اُس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی سیاست، سیاسی تدبر، جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید تر ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا۔ اُس کی علامتوں سے اُس کو تاڑ لیا جائیگا۔
>
> ...... وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہبِ فکر پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا اور ایک زبردست تحریک اٹھائیگا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور

سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اُس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹیفک ترقی اوجِ کمال تک پہنچ جائے گی۔

(ایسا ہوگا' آنے والا مہدی) ۔ (صفحات ۴۵۔۴۴)

اگر اس کے بعد بھی آپ پہچان نہ سکیں کہ وہ "مہدی آخرالزمان" کون ہے تو آپ کی کورنگہی کا کیا علاج!

(۵)

مزاج شناسِ رسولؐ

مودودی صاحب نے اپنے لئے جو مقام اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے۔ اور وہ مقام ہے "مزاج شناسِ رسولؐ" کا۔ مزاج شناسِ رسولؐ کے اختیارات کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں کی تعداد کے ذخیرہ احادیث میں سے جس کے متعلق وہ کہہ دے کہ وہ صحیح ہے' اُسے صحیح تسلیم کرنا ہوگا' اور جسے وہ غلط کہہ دے' اُسے غلط ماننا پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ

> جن مسائل میں اُس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی' اُن میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرمؐ کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اُس کی روح' روحِ محمدیؐ میں گم اور اُس کی بصیرت' بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہوجاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوسکتا۔　　　(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۳۔۳۲۴)

یہ ہے مقام مزاج شناسِ رسولؐ کا۔ یعنی تمام جامعینِ احادیث و رواۃ اور ائمہ اسماء الرجال سے بلند تر مقام جس کی نگہِ بصیرت یہ بتائے گی کہ آج رسول اللہؐ ہوتے تو وہ اس معاملے میں یوں فرماتے۔ اور آپ کو شاید یاد ہوگا کہ منیر کمیٹی کے سامنے یہ کہا گیا تھا کہ یہ مزاج شناسِ رسولؐ خود مودودی صاحب ہیں۔ اور ماہنامہ فاران نے اپنی جون ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

> کوئی شک نہیں کہ مودودی صاحب کی شخصیت' امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مودودی صاحب نے نومبر ۱۹۵۱ء میں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ان کی اطاعت درحقیقت خدا اور رسولؐ کی اطاعت ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر
کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔
جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر
مانا ہے وہ اُس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اُس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس
کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔ (ہدایات۔ صفحہ ۳۷)

آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مودودی صاحب اپنے آپ کو کس طرح مجددین اور ائمہ حدیث اور ائمہ فقہ سے بلند سمجھتے ہیں۔
جہاں تک تفسیر قرآن کریم کا تعلق ہے وہ متقدمین یا متاخرین ائمہ تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ

میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا اور جب میرا اُن کے بیانات سے
اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔
(رسائل و مسائل جلد دوم۔ صفحہ ۱۶۰)

(۰)

پنجاب میں آکر

یہ تھی وہ ذہنیت جسے لئے ہوئے مودودی صاحب ۱۹۳۷-۳۸ء میں حیدر آباد دکن سے پنجاب کی طرف تشریف لائے اور اپنے ان مقالات کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے کتابی شکل میں سامنے آیا۔ اس وقت ملکی سیاست کی کیفیت یہ تھی کہ قومیت پرست مسلمانوں کو چھوڑ کر پوری کی پوری قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے قائد اعظم محمد علی جناح رح کی زیر قیادت اپنے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ میں والہانہ سرگرم عمل تھی۔ مودودی صاحب کی حیثیت صرف ایک ماہنامہ کے مدیر کی تھی — وہ ماہنامہ جس کی اشاعت حیدر آباد میں تین سو سے زیادہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہاں مودودی صاحب کو کون پوچھتا! لہذا جس چیز کو انہوں نے 'سیاسی کشمکش' سے تعبیر کیا تھا وہ درحقیقت ان کی اپنی اندرونی نفسیاتی کشمکش کا آئینہ تھی۔ اُن کی فطرت یہ کہ — بعد از خدا بزرگ توئی — اور پوزیشن یہ کہ پوری قوم ایک اور شخص کو اپنا قائد تسلیم کئے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقتِ حال سے اُن کے دل میں حسد حقارت، نفرت کی آگ کے شعلے بھڑکتے تھے۔ یہی وہ شعلے تھے جنہوں نے اُن مقالات کی صورت اختیار کی اور جنکا اجمالی ذکر ہم آئندہ سطور میں کر رہے ہیں۔

ہم نے اوپر کہا ہے، اس زمانے میں مسلم لیگ ایک مؤثر اور طاقت ور جماعت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اور مودودی صاحب یہاں بالکل "یوسف بے کارواں" تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مسلم لیگ کے مقابلے میں کوئی دوسری پارٹی بنانا اُن کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کو مسلم لیگ سے برگشتہ کرنے کی تدبیر سوچی

اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے یہ کہا کہ اسلام میں سرے سے پارٹی بنانا ہی جائز نہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء کے رسالہ 'پیغام حق' میں ایک مقالہ لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ

پارٹی بنانا خلاف اسلام ہے

یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرکے، اُن کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرکے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں، وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آسکتیں۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں خاکساروں کی تنظیم بھی ایک بڑی مؤثر جمعیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مودودی صاحب کے مقالہ میں "وردی" یا "کسی ظاہری علامت" سے خاکساروں کی طرف اشارہ تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کو آپ جانتے ہیں۔ وہ تو بخشنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اس پر مودودی صاحب کو ایک ڈانٹ پلائی جس کا عنوان تھا۔

'پٹھانکوٹ میں مذہبی بدمعاشی کا نیا اڈہ'

پوری قوم کیخلاف

اس کے بعد مودودی صاحب نے اُدھر کا رُخ تو کیا نہیں، لیکن مسلم لیگ کی تنقید کو انہوں نے اپنا مستقل شعار قرار دے دیا۔ مسلم لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلمان من حیث القوم اُس کے ساتھ ہیں۔ مودودی صاحب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جنہیں تم مسلمان کہتے ہو وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اُتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں ..... یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو، اُس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کرکے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے اُن کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیئے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لئے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ ۔ صفحہ ۵۸)

دوسرے مقام پر انہوں نے لکھا :-

ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ اُن کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول پر ہی ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اُس کا حال یہ ہے کہ اُس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے یہ مسلمان' نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی، تو اُس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۲۷)

اُس زمانے میں ایک تو مودودی صاحب کی حیثیت ایک جرنلسٹ سے زیادہ کچھ نہیں تھی اور دوسرے مسلم لیگ کی قیادت اُس وسیع النظر، کشادہ قلب، بلند کردار انسان کے ہاتھوں میں تھی، جو احساسِ کمتری کا شکار نہیں تھا۔ اس لئے نہ قوم نے ان خرافات کو درخورِ اعتنا سمجھا اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ نے ہی ان ہفوات کا کوئی نوٹس لیا۔ لیکن مودودی صاحب اُن کی اس کشادہ نگہی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے چلے گئے اور مسلم لیگ کا ساتھ دینے والے مسلمانوں کی تنقیص اور تکفیر میں مسلسل آگے بڑھتے گئے۔ حتّٰی کہ وہ یازاریت پر بھی اُتر آئے۔ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں یہاں تک لکھ دیا کہ

غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔

رفتہ رفتہ وہ آگے بڑھے اور مسلم لیگ کے علاوہ دیگر جماعتوں کو بھی ساتھ ہی رگیدنا شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں لکھا کہ

---

[1] انہوں نے ہزار میں سے (۹۹۹) کہہ کر ایک کی استثناء کیوں کی ہے اس کی وجہ ذرا آگے جا کر سامنے آئے گی!

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر اُن کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ فاسد نکلیں گی۔

مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ وہ جداگانہ مملکت کا مطالبہ اس لئے کر رہی ہے کہ وہ وہاں اسلامی حکومت قائم کر سکے۔ اس سلسلے میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ

پاکستان میں مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہوگی، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔

(ترجمان القرآن۔ بابت محرم ۱۳۶۰ھ حاشیہ صفحہ ۷۶)

۵۔ قائدِ اعظمؒ کیخلاف

جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، اس وقت مسلم لیگ کی قیادت ایک ایسے ٹھنڈے دل و دماغ کے انسان کے ہاتھ میں تھی جسے اس قسم کی باتیں برانگیختہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لئے قائدِ اعظمؒ نے مودودی صاحب کیخلاف ایک لفظ تک نہ کہا لیکن مودودی صاحب اور آگے بڑھتے گئے اور ـــــ بازی بازی باریش ہم بابا بازی کے مصداق عام مسلمانوں سے آگے بڑھ کر ... خود مسلم لیگ کے قائدین کو بھی اپنی تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنانے لگ گئے۔ چنانچہ انہوں نے سیاسی کشمکش (حصہ سوم) کے شروع میں مسلم لیگ کی قیادت کے متعلق لکھا۔

اس نئی تحریک کے دور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبے کے ماتحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں، جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔

اور قائدِ اعظمؒ کے متعلق لکھا۔

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔　　　(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ صفحہ ۳۴)

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ سیاسی قیادت اُن لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے

جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے

لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں مسلم لیگ کے قائدین کے گروہ میں علامہ اقبالؒ جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں۔ لیکن مودودی صاحب تو آسمان کی بلندیوں پر متمکن تھے، انہیں "خاک کے یہ ذرّے" کس طرح نظر آتے۔

کہا جائے گا کہ مودودی صاحب نے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کہا تھا، اُس میں کون سی بات غلط تھی۔ کیا ہماری اخلاقی حالت ایسی ہی نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہماری اخلاقی حالت ایسی ہی تھی اور ایسی ہی ہے لیکن مودودی صاحب اس قوم پر اس طرح تنقید کرتے تھے گویا وہ ان میں سے نہیں۔ یہ قوم تو ان بداخلاقیوں میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن مودودی صاحب کہیں آسمان سے اُترے ہیں اور بالکل معصوم اور منزہ عن الخطا ہیں۔ یاد رہے کہ اس بات کا حق خدا کے ایک رسول کو تو پہنچتا ہے کہ وہ آکر اپنی پوری کی پوری قوم سے کہے کہ تم فسق و فجور، اور کفر و معصیان کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہو اور میں حق و صداقت کا علمبردار بن کر آیا ہوں۔ آؤ اور اس روشنی میں میرے پیچھے پیچھے چلو، لیکن یہ حق کسی اور کو نہیں پہنچتا کہ وہ قوم پر اس قسم کی تنقید کرے اور اپنے آپ کو اس سے بالا سمجھے۔ مودودی صاحب جب عامۃ المسلمین اور ان کی قیادت پر تنقید کرتے تھے تو وہ درحقیقت کہتے یہ تھے کہ تم سب کافرانہ زندگی بسر کرتے ہو مومن بننا چاہتے ہو تو میری طرف آؤ۔ چنانچہ ان کی اس تنقید کا یہ نتیجہ نکلا کہ کچھ لوگ سچ مچ یہ سمجھنے لگے کہ ہم مسلم کافرنہاد ہیں۔ صحیح مسلمان بننے کے لئے ہمیں اسی شخص کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیئے۔ جب ان لوگوں نے اس کی آمادگی ظاہر کی تو مودودی صاحب نے (جنہوں نے شروع میں یہ کہا تھا کہ مسلمانوں میں کوئی الگ جماعت قائم کرنا خلافِ اسلام ہے) اپنی جداگانہ جماعت کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام "جماعتِ اسلامی" رکھا۔ اس جماعت میں شمولیت کے متعلق فرمایا کہ

اپنی الگ جماعت

> جماعتِ اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمہ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں آنے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو۔ اور وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اُس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور یہ شہادت۔ اس کے طرزِ خیال اور طرزِ زندگی میں کس قسم

کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اشہدان لاالٰہ الاّ اللہ
و اشھدان محمد الرسول اللہ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعتِ اسلامی میں
داخل ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتدائیۃً شہادت ادا کرے۔ یا
پیدائشی مسلمان ہو اور از سر نو ایمان لائے۔　(ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۱ھ صفحہ ۴۸)

ان شرائط کی وضاحت کے بعد جماعتِ اسلامی کے یومِ تاسیس کی جو روئیداد شائع ہوئی تھی اُس میں بتایا گیا تھا کہ اس میں شامل ہونے والوں نے کس طرح تجدید ایمان کی اور مودودی صاحب کو اپنا امیر تسلیم کیا — یہ تھی "ہزار میں سے ایک فرد" کا مجموعہ جماعت!

بر خود غلط گروہ

یوں نفرت اور رعونت کے شجرۃ الزقوم کا یہ بیج ۱۹۴۱ء میں بویا گیا۔ آپ سوچئے کہ جس گروہ کے دل میں یہ بٹھا دیا گیا ہو کہ یہ تمام مسلمان فاسق اور فاجر بلکہ کافر اور بے دین ہیں اور ان میں سے تم ہی پکے اور سچے مومن ہو، ان کے دل میں ان مسلمانوں کے خلاف جذباتِ نفرت کس شدت سے موجزن ہونگے اور دوسری طرف ان میں کتنی شدید رعونت اور خود پسندی پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ اُس کے بعد عامۃ المسلمین اور خود ساختہ "مقدسین" کے اس گروہ میں ایک گہری حد فاصل حائل ہو گئی۔ یہ گروہ باقی مسلمانوں کو نہایت ذلت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، اُن کے قائدین کا مذاق اڑاتا تھا اور اپنے امیر کو یکتا اور منفرد سمجھتا تھا۔ چنانچہ اُسی زمانے میں انہوں نے مودودی صاحب کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ شخص اپنے آپ کو دس کروڑ مسلمانوں میں تنہا پاتا ہے۔

ان کی جماعت کے دل میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ ہماری تعداد بڑی قلیل ہے، ہم اکثریت کے مقابلے میں کیا کر سکیں گے۔ تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا کہ

> جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھیں گی وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف بتیس (۳۲) لاکھ ہے۔ اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اُس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت تین لاکھ تھی مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے . . . . اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُسی طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک

رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے ۔　　　(ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۸۰)

انہیں یہ تعلیم دی گئی کہ

اٹھو۔ اور حکومت پر قبضہ کرلو

اسلام کی نگاہ میں یہ بات ہرگز کافی نہیں ہے کہ تم نے خدا کو خدا اور اس کے قانون کو قانونِ برحق مان لیا۔ نہیں، اس کو ماننے کے ساتھ ہی آپ سے آپ، تم پر یہ فرض عاید ہوجاتا ہے کہ جہاں بھی تم ہو جس سرزمین میں تمہاری سکونت ہو، وہاں خلقِ خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو۔ حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرماں روائی کا اقتدار چھین لو اور بندگانِ خدا کی سربراہ کاری اپنے ہاتھ میں لے کر خدا کے قانون کے مطابق آخرت کی ذمہ داری اور جواب دہی کا اور خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین رکھتے ہوئے حکومت کے معاملات انجام دو، اسی کوشش اور اسی جدوجہد کا نام جہاد ہے۔　　　(خطبات ۔ صفحہ ۲۲۴)

پھر ان سے کہا گیا کہ خدا نے جماعتِ مومنین کے متعلق بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑکر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کردو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔

(خطبات ۔ صفحہ ۲۲۵)

یہ تھا وہ آب و گل جس سے اس جماعت کا خمیر اٹھایا گیا اور ان کی سرشت کی تشکیل کی گئی تھی۔ یعنی یہ بات ان کے دل میں راسخ کردی گئی کہ

(۱) یہ پیدائشی مسلمان سب جہنم کے کندے ہیں۔ سچے اور سچے مسلمان تم ہی ہو۔ تم خدا کے صالح بندے ہو۔ تم حزب اللہ ہو۔

(۲) تم اپنی قلتِ تعداد پر نہ جاؤ۔ روس کے کمیونسٹوں، اٹلی کے فاشسٹوں اور جرمنی کے نازیوں سے سبق سیکھو۔ جنہوں نے قلیل التعداد ہوتے ہوئے اکثریت پر غلبہ حاصل کیا۔ اور انہیں اپنے استبداد کے آہنی شکنجوں میں جکڑا۔

(۳) حکومت قائم کرنا صرف تمہارا حق ہے۔ یہ دوسرے مسلمان جو حکومت قائم کریں گے وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ خدا کی حکومت کرنے کے حق دار بلکہ اجارہ دار تم ہی ہو۔ اطاعتِ امیر سے اپنے اندر قوت پیدا کرو۔ اور اقتدار کی کنجیاں ان فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں سے چھین لو۔ یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔

سوچئے کہ جس جماعت کو یہ سبق پڑھایا جائے وہ جماعت نفرت، حقارت اور عداوت کے بیج نہیں بوئے گی تو اور کیا کرے گی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران یہ مسلسل اس نفرت کو عام کرتے چلے گئے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں کی جمعیت قائداعظمؒ کے زیرِ قیادت اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ اس جماعت کی یہ کارفرمائیاں اُن میں کسی رخنہ اندازی کا موجب نہ بن سکیں۔ نہ ہی انہوں نے انہیں اس قابل سمجھا کہ ان سے کوئی ٹکر لی جائے۔ یونہی اکا دکا واقعات ایسے رونما ہوئے جس میں مسلم لیگ کے بعض کارکنوں کے ساتھ ان کا ٹکراؤ ہوا اور وہ بھی مدراس اور پٹنہ جیسے دور دراز علاقوں میں۔

ہندوؤں سے سازباز

جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کی تنہا کوششیں مسلم لیگ کی صفوں میں کوئی انتشار پیدا نہیں کر سکیں تو انہوں نے ہندوؤں سے بھی سازباز شروع کی۔ چنانچہ انہوں نے پٹنہ میں اپنے پہلے پبلک جلسہ میں مسٹر گاندھی کو دعوت دی اور انہوں نے اس میں شرکت بھی کی لیکن (ہمارا خیال ہے کہ) بنیئے نے اس ۔ ۔ کو کچھ منفعت بخش نہ سمجھا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ تشکیلِ پاکستان سے تین چار ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نوائے وقت مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۴۷ء۔

یوں عامۃ المسلمین کو کوستی، اور اُن کی قیادت کو گالیاں دیتی ہوئی یہ جماعت وردِ فرمائے پاکستان ہوئی۔

---(٥)---

پاکستان پہنچکر

مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے تحریکِ پاکستان کے خلاف جو کچھ کیا تھا اور وہ جس طرح مسلسل دس برس تک مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے چلے آئے تھے، ذرا سوچئے کہ اگر معاملہ یوں ہوتا کہ یہی کچھ کسی پارٹی نے جماعتِ اسلامی کے ساتھ کیا ہوتا اور مودودی صاحب پاکستان کے گورنر جنرل ہوتے تو کیا وہ ان لوگوں کو پاکستان میں گھسنے کی اجازت دیتے۔ اور اگر وہ زبردستی اندر آجاتے تو یہ اُن کے خلاف کیا کچھ نہ کرتے۔ لیکن یہاں صاحبِ اقتدار قائداعظمؒ جیسا وسیع الظرف سربراہ تھا۔ انہوں نے نہایت کشادہ نگہی اور خندہ جبینی سے کہا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ جو کچھ پہلے ہو چکا وہ ہو چکا۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اب آئندہ کے لئے امن اور سکون سے زندگی بسر کیجئے۔ کوئی اور ہوتا تو وہ قائداعظمؒ کے اس حسنِ سلوک پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کا رہینِ منت رہتا لیکن ان حضرات کے دل میں تو حسد کی آگ بھڑک رہی تھی کہ قائداعظمؒ کی قیادت کامیاب کیوں ہو گئی۔ اور ہماری اس مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود [illegible] گیا۔ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن کے پہلے ہی شمارہ میں (جو جون ۱۹۴۸ء کو شائع ہوا تھا) تحریکِ پاکستان پر بھرپور تنقید کی۔ اور اُس کے بعد دل کے پھپھولے یہ کہہ کر پھوڑے کہ

> یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

پھر اُس کے بعد انہوں نے اگست ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں لکھا۔

> اس پورے گروہ میں سے ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے بھری پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

آپ سوچئے کہ اس زمانے میں حالات کیا تھے۔ تقسیم ہند کے عواقب کے سلسلے میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی تھی، اُس سے ہر ایک کے سینے چھلنی ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہیاں ہندو کے جذبۂ عناد اور انگریز کے جذبۂ شکست خوردگی کی وجہ سے لائی گئی تھیں لیکن اُس وقت قوم سے یہ کہنا کہ ان تباہیوں کے ذمہ دار تمہاری قیادت ہے جس کے متعلق ہم دس برس سے متنبہ کرتے چلے آرہے تھے، قوم کے دل میں کس قسم کی کیفیات ابھارنے کا موجب بن سکتا تھا۔ قوم اپنی مصیبت میں مبتلا تھی، اس لئے وہ یہ سب کچھ سن کر پی گئی لیکن اُس کے تحت الشعور میں اس جماعت کے خلاف جذباتِ نفرت نیم خوابیدہ حالت میں کروٹیں لیتے رہے۔ اُس کے بعد آج تک پاکستان میں کوئی ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی جس کے خلاف انہوں نے جذباتِ نفرت اور حقارت مشتعل نہ کئے ہوں۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پہلی حکومت کے متعلق انہوں نے لکھا تھا۔

> کسی ملک و قوم کی انتہائی بدقسمتی یہ ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اُس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔ ایک سفینۂ حیات کو غرق کرنے کے لئے طوفان کی موجیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو اس کے خیانت کار ملاح کر سکتے ہیں۔ کسی قلعہ کی دیواروں کو دشمن کے گولے اس آسانی سے نہیں چھید سکتے، جس آسانی سے اس کے فرض ناشناس سنتری اُس کی تباہی کا سامان کر سکتے ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ جون جولائی ۱۹۴۹ء)

اور اس ساری تنقید کا ٹیپ کا بند یہ تھا کہ

> ایسے حالات میں غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرنا خلافِ مصلحت ہے۔ ایک غلط قیادت کی بقا کے لئے اس طرح کی کوشش کرنا ملک اور قوم کے ساتھ سب سے بڑی غداری اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی فکر کرنا، اس کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔
>
> (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ہوسِ اقتدار کی جو چنگاری پہلے دن سے ان کے سینے میں تڑپ رہی تھی وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کس طرح شعلوں میں تبدیل ہو گئی ہے اور اس کے لئے ٹیکنیک وہی استعمال کی جا رہی ہے کہ ہمارے سوا قیادت کسی کے ہاتھ میں بھی

ہو وہ غیر صالح قیادت ہوگی۔ اور صالح قیادت صرف صالحین کی قیادت ہی قرار پائے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی جماعت کے منشور میں اپنی جماعت کا نصب العین ان الفاظ میں بیان کیا کہ

پاکستان کی سیاسی قیادت کو ایک صالح قیادت میں بدل دیا جائے۔

صالحین کا گروہ

تقسیم سے پہلے ان صالحین کا دائرہ محدود تھا۔ اب انہوں نے اسے وسیع کیا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے جولائی ۱۹۵۵ء میں سرگودہا میں ایک تقریر کے دوران فرمایا۔

اس وقت جماعتِ اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں، پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اُس نے اس ملک میں قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی اس وقت ہمارے ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت کی صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں، سرکاری ملازمین، تاجر اور صنعت پیشہ طبقہ غرض ہر گروہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے کیریکٹر اور کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت کا کوئی کام ان کے سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول و قرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ کہ قول و قرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر نہ جائیں۔ اس کیفیت میں قوم کی عظیم اکثریت مبتلا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس سیرت و کردار والی قوم میں کہاں کہاں قابلِ اعتماد سیرت والے لوگ موجود ہیں۔ آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیریکٹر والے لوگوں کو منظم کیا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابلِ اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔

(بحوالہ اعتصام - ۱۵ر جولائی ۱۹۵۵ء)

اس طرح اس پوری قوم سے "بلند سیرت و کردار" کے افراد کو اکٹھا کر کے صالحین کے گروہ کو وسیع کیا گیا۔ آپ سوچئے کہ جس فرد کو بھی اس گروہ میں شامل کر لیا جائے وہ اپنے آپ کو کس طرح ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرے گا اور باقی قوم کو کس طرح ذلت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھے گا۔

جس نے ذرا اختلاف کیا....

اور آپ کو معلوم ہے کہ صالحین کے اس گروہ میں شامل ہونے کی شرط کیا ہے۔ صرف یہ کہ وہ مودودی صاحب کی ہاں میں ہاں ملائے۔ جو شخص ان کا ہمنوا ہو جائے وہ کوئی (معاف فرمائیے) "بازاری شُہدہ" بھی کیوں نہ ہو، صالح ترین بزرگ قرار پا جاتا ہے اور ان صالحین کے گروہ میں سے جو شخص کسی معاملے میں مودودی صاحب سے اختلاف کرے وہ بدترین خلائق قرار دیا جاتا ہے اور اُس پر وہ گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے کہ توبہ بھلی۔ مثال کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی

کو لیجئے۔ جماعت میں ان کا مقام مودودی صاحب سے دوسرے درجے پر تھا۔ وہ کئی مرتبہ جماعت کے امیر بھی رہے۔
ماہر القادری صاحب نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

> عالم، بلند نظر اور متبحر عالم جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے اور مہ و انجم کی گزرگاہوں کا بھی پتہ کرتی ہے۔ دس بیس نہیں، ہزار دن راتیں صرف قرآنِ کریم کے مطالعے میں بسر کی ہیں۔ جن کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابلِ وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسّر، اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔ (فاران۔ بابت جون ۱۹۵۳ء)

لیکن انہی اصلاحی صاحب کو جب مودودی صاحب سے کچھ اختلاف ہوا۔ اور وہ جماعت سے الگ ہو گئے تو خود مودودی صاحب اور ان کے مصاحبوں نے اصلاحی صاحب کے خلاف وہ کچھ کہا جس کی شہادت اُن کے جرائد و رسائل آج تک دیتے ہیں: "وہ نجویٰ کے مرتکب، ضعیفِ ارادہ و نفرت کے مریض، یک رُخے، تحریک اسلامی کے نادان دوست جماعت کے غدار۔ اقامت دین کی جدوجہد کے روڑے، خدا کے خوف سے عاری۔ خائن۔ انتشار پسند"۔ (المنیر، بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء)

صالح اور غیر صالح کا معیار

مودودی صاحب کے نزدیک صالح اور غیر صالح کا معیار امتیاز کیا ہے؟ اسکا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت انتخابات کے سلسلے میں یہ کہا تھا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اس کی حمایت نہیں کریگی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے، اُسے میری تائید حاصل ہو گی۔ اس لئے کہ اُس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔
> (بحوالہ امروز۔ ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

یعنی ان کا ہمنوا کافر، مخالف پارٹی کے فرشتے سے بھی بہتر ہے۔

سوچئے کہ نفرت انگیزی کے لئے اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی کہا اور کیا جا سکتا ہے۔ اور مصیبت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح مومن اور صالح وہ ہے جو ان کا ہمنوا ہو، اسی طرح اسلام بھی وہی اسلام ہے جس کی تائید مزاج شناسِ رسولؐ یعنی مودودی صاحب فرما دیں۔ ان کے کسی فیصلے اور کسی نظریہ کے خلاف کوئی اور نظریہ، ان کے نزدیک یکسر غیر اسلامی اور زندقہ، الحاد، اور کفر ہے۔ اصلاحی صاحب نے جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہوتے وقت مودودی صاحب سے یہی کہا تھا کہ

> آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعتِ اسلامی کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ خود اسلام کا بھی

قائم مقام سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے۔ اور جب یہ جماعت پر اعتراض ہے تو اسلام پر اعتراض ہے۔ اسی طرح آپ اپنا یہ ذہن بنا بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کبھی زیر بحث آتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک میں اقامتِ دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائیں گی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں، خدا نے اسلام کو نہ آپ کے ساتھ باندھا ہے نہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔ اگر آپ اسلام کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خدارا اس کی یہ قیمت نہ مانگیے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چپ رہیں، کیونکہ اس سے اقامتِ دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔

(اصلاحی صاحب کا خط مودودی صاحب کے نام)

مرغ بادنما کا سا اسلام

یہ ہے وہ آہنی ڈکٹیٹرشپ جسے اقامتِ دین اور اسلامی نظام کے نام پر اس سختی سے مسلط کیا گیا ہے کہ مودودی صاحب جو کچھ کہہ دیں، ان کی جماعت آمنّا و صدّقنا کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُن کا اسلام "حکمتِ عملی" کے مسلک کے تابع آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً:-

(۱) الگ پارٹی بنانا اسلام کی رُو سے یکسر ناجائز ہے لیکن اس کے بعد اپنی الگ پارٹی بنانا عین تقاضائے اسلام قرار پاجاتا ہے۔

(۲) جمہوریت کی رُو سے قائم کردہ حکومت، کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہے اور پھر جمہوریت عین مطابقِ اسلام ہے۔

(۳) صدرِ مملکت کے لئے ویٹو کا استعمال، اسلامی نظام کا تقاضا ہے اور اس کے بعد صدارتی نظام اس لئے خلافِ اسلام ہے کہ اس میں صدر کو ویٹو کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

(۴) انتخابات میں امیدوار کھڑے کرنا یکسر خلافِ اسلام ہے اور پھر ایک ایک سیٹ کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کرنا عین تقاضائے اسلام۔

(۵) عورت کا سیاست میں حصہ لینا یکسر خلافِ اسلام ہے اور پھر عورت کا صدارت تک کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہونا، عین مطابقِ اسلام۔

(۶) زمین کی جائیداد وغیرہ کی ملکیت پر کسی قسم کی تحدید خلافِ اسلام ہے اور پھر اراضی کے رقبے کی حد بندی

عین مطابقِ اسلام۔

(۷) "نیشنلائزیشن (قومیانہ) کے انسانیت کُش نظام سے بدتر نظام ابلیس آج تک ایجاد نہیں کر سکا" یہ بھی اسلام۔ اور اس کے بعد کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لینے کا فیصلہ، یہ بھی اسلام۔

جو شخص ان کے اس مرغِ بادنما اسلام پر صاد کرتا چلا جائے، اس کا شمار صالحین میں اور جو اس سے اختلاف کرے وہ جہنم کا کُندہ جس مسلک پر یہ گامزن ہوں وہ اسلامی نظام کا صحیح نقشہ اور دوسری پارٹیاں جو نظریہ پیش کریں، وہ غیر اسلامی۔

آپ سوچئے کہ جس جماعت کے امیر کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو کہ وہ اسلاف سے لیکر اخلاف تک کسی کو اپنا ہم پایہ نہ سمجھے اور اپنے ہر قول کو دین میں سند اور حجت قرار دے؛

جس کے ارکان اور متفقین کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا جائے کہ وہ دنیا میں اسلام کے صحیح نمونہ اور خدا کے منتخب، صالح افراد ہیں اور جو لوگ اُن کے ہمنوا نہیں، وہ سب فاسقانہ اور کافرانہ زندگی بسر کرتے ہیں ۔۔!

جن کا اسلام ہر مصلحت کے ساتھ، آئے دن بدلتا رہے،

اور جس جماعت کے پاس روپیہ سیلاب کی طرح بہے چلا آئے،

اُس جماعت کے صاحبِ اثر اور صاحبِ اقتدار ہو جانے کا اندیشہ باقی قوم کے دل میں کیا کیا خطرات پیدا نہیں کر دیتا؟ اس وقت ملک میں نفرت، حقارت، عداوت، وحشت اور دہشت کی جو فضا عام ہو رہی ہے، اُس کی بنیادی علت یہ ہے۔ اس جماعت نے گذشتہ تیس سال سے نفرت اور حقارت کی جو فضا پیدا کرنا شروع کی تھی، وہ اب اپنی انتہا تک پہنچ گئی ہے اور جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اُس کے ردِ عمل میں ہر طرف سے نفرت اور حقارت کے جذبات مشتعل ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس جماعت کے عزائم کیا ہیں، وہ بھی سن لیجئے۔ مودودی صاحب اپنی کتاب "مرتد کی سزا" میں اس سوال کے جواب میں کہ مستقبل میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا، لکھتے ہیں کہ

سب کو قتل کر دیا جائے گا

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ واللہ الموفق بالصواب:- کہ جس علاقے میں اسلامی نظام رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں، اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی اُن

پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھیگا (یعنی جس بات کو مودودی صاحب اسلام کہدینگے، اسکے دائرے سے باہر قدم رکھیگا۔ طلوع اسلام) اُسے قتل کر دیا جائیگا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائیگی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے، بچا لیا جائے، پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (یعنی ان سے متفق ہوں۔ طلوع اسلام)۔

(صفحہ ۸۱ - ۸۰)

یہ ہے وہ آنے والے دور کا انتہائی خوفناک بھوت (فرنکین سٹائن) جس کے تصور سے پاکستان کا ہر امن پسند شہری لرزاں و ترساں ہے۔ ان میں سے بعض نے یہ روش اختیار کر لی ہے کہ منافقانہ طور پر ہی سہی، اس جماعت کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو۔ بعض (INDIFFERENT) رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں ـــ یا یوں کہیے کہ وقت ٹالتے ہیں ـــ بعض سرپھرے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے تباہ کن مسلک پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے انتشار اور خلفشار کا وہ عالم جس میں اس وقت یہ ملک بدقسمتی سے گرفتارِ بلا ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے۔ طلوع اسلام کی نہ کوئی پارٹی ہے نہ یہ عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ دیکھتا ہے کہ اس خطۂ پاک کی طرف ـــ جسے ہم نے اپنی بڑی مقدس آرزوؤں کی تعبیر کے لئے حاصل کیا تھا ـــ کوئی خطرہ بڑھے چلا آ رہا ہے تو یہ قوم کو اس سے متنبہ کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے۔ طلوع اسلام نے جماعتِ اسلامی کے اس خطرے کو آج نہیں، اسکے یومِ تاسیس کے زمانے ہی سے بھانپ لیا تھا اور اسی وقت سے قوم کو اس سے متنبہ کرنا شروع کر دیا تھا (یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے) تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی وہ مسلسل اور متواتر قوم کو اس خطرہ سے آگاہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک اس خطرے کے سدباب کا طریق ـــ اینٹ کا جواب پتھر ـــ نہیں، اس سے ملک تباہ ہو جائے گا اور اسکے بدخواہ گھی کے چراغ جلائیں گے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ملک کی دیگر پارٹیاں وحشت سامانی اور نفرت انگیزی کے مسلک سے یکسر اجتناب کر کے اپنی ساری کوششوں کو اس مقصد پر مرتکز کر دیں کہ نہایت پُرامن اور ٹھنڈے طریقے سے دلائل و براہین کی رُو سے قوم کو بتایا اور سمجھایا جائے کہ جماعتِ اسلامی کی تائید و حمایت سے اس ملک میں کس قسم کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اگر قوم کو صحیح طریق سے اس خطرہ سے متنبہ کر دیا جائے اور وہ اس جماعت کی سرگرمیوں کی تائید نہ کرے تو آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس جماعت کا اثر خود بخود کم اور رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اکاس بیل کی اپنی جڑ کوئی نہیں ہوتی۔ وہ درخت کا خون چوستی اور اس سے بڑھتی پھولتی ہے۔ اُسے اگر درخت سے الگ کر دیا جائے ـــ یا یوں کہیے کہ درخت کو اُس سے الگ کر دیا

جائے۔ تو وہ چند دنوں میں مرجھا کر خود ہی ختم ہو جاتی ہے۔ تقسیم سے پہلے نہ قوم نے ان کا ساتھ دیا، نہ قائداعظمؒ نے ان کا کوئی نوٹس لیا تو یہ کوئی اثر اور اقتدار پیدا نہ کر سکی۔ آپ اسے جس قدر اہمیت دیتے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس سے متصادم ہوتے جائیں گے، اس کا حیطۂ اثر اتنا ہی وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ اس سے ملک میں بد امنی پھیلے گی اور ان طاقتوں کا منشا پورا ہوگا جن کی آنکھوں میں پاکستان کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ دلائل و براہین سے ان کے خود ساختہ اسلام کی پردہ دری کیجئے۔ اسناد و شہادات سے ان کے عزائم کو بے نقاب کیجئے۔ ان سے پیدا ہونے والے خطرات سے قوم کو آگاہ کیجئے ـــ لیکن ان سے الجھئے نہیں، ٹکرایئے نہیں، پُر امن رہیئے اور ثبات و استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد ساری دنیا کی دولت بھی ان کے پاؤں نہیں جمنے دے گی۔ پیسے کے زور پر نفرت پھیلائی جا سکتی ہے، ہنگامے برپا کئے جا سکتے ہیں، دلوں میں گھر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس جماعت کے اسقدر وسیع و شدید پروپیگنڈہ کے باوجود اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہیں۔

روپیہ، اور پروپیگنڈہ کے زور پر ہنگامہ آرائیاں برپا کر کے دوسروں کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ یوں یہ تاثر پیدا کر دیا جاتا ہے کہ انہیں بہت بڑا اقتدار حاصل ہے لیکن ایسی روش اور اس قسم کی ذہنیت کے حصے میں بقا نہیں ہوتی۔ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ یہاں بقا اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو اس پروگرام کو لے کر اٹھے۔ جو اقدارِ سماوی کے مطابق عام انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔ اس لئے یہاں بھی آخر الامر بقا اسی کے لئے ہو گی جو قرآن کے اس نظام کو لے کر اٹھے گا۔ جھکڑ اور آندھیاں درختوں کو جڑ سے اکھیڑ سکتی ہیں لہلہاتی کھیتیاں پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو جماعت اس راز کو پا لے گی وہی نوعِ انسانی کی نفع بخشیوں کا ذریعہ بنے گی اور ثبات و بقا اسی کے حصے میں آئے گی۔

(✻)

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں: محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم، ہر اتوار کی صبح بوقت ۸ بجے ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور میں ہوتا ہے۔

(ناظم - ادارہ طلوعِ اسلام)

(خواتین کیلئے پردہ کا انتظام بھی ہوتا ہے)

پرویز

اسلامی مشاورتی کونسل کے صدر محترم علاؤ الدین صدیقی صاحب کی طرف سے مجھے حسب ذیل چٹھی موصول ہوئی۔

محترم المقام جناب غلام احمد پرویز صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہونگے۔

اسلامی مشاورتی کونسل کے آئندہ اجلاس میں قانونِ جوازی وقفِ مسلمانان مصدرہ ۱۹۱۳ء (THE MUSSALMAN WAQF VALIDATING ACT, 1913) کی دفعات پر غور کرنا طے پایا ہے اور اس ضمن میں مندرجہ ذیل تنقیحات زیرِ غور آئیں گی۔

(۱) آیا قرآن وسنت میں وقف علی الاولاد کے بارے میں کوئی حکم ہے۔

(۲) آیا بصورتِ دیگر یہ فقہ کا ایسا جزو لاینفک ہے کہ اگر کوئی شخص وقف علی الاولاد قائم کرے تو حکومت پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ صرف تسلیم کرے بلکہ نافذ بھی کرے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کیا حکومت اس مسئلہ میں کوئی مداخلت کرنے کی مجاز نہیں۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قانونِ جوازی وقفِ مسلمانان مصدرہ ۱۹۱۳ء کے متعلق ایک خیال یہ ہے کہ یہ قانون اب ازکار رفتہ ہونے کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکا ہے اس لئے اس کو منسوخ کر دینا ہی مناسب ہے۔ اس خیال کی رُو سے قانونِ ہذا کی بدولت وقف علی الاولاد ایک عرصہ دراز کے بعد واقف کے ورثار کو محسوس فوائد پہنچانے کے بجائے اس کے بالکل برعکس ثمرات مرتب کرتا ہے۔ اس لئے کہ دو یا تین پشتیں گذرنے کے بعد منتفعین کی تعداد اس قدر کثیر ہو جاتی ہے کہ اس جائیداد سے، جو کسی وقت واقف کے معدودے چند ورثار کی ایک ٹھوس آمدنی کا ذریعہ تھی، ورثار کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب معمولی گذارے کی آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں رہتی۔ لہٰذا نفع اٹھانے والے ورثار جائیداد موقوفہ کے تحفظ اور بہتری میں دلچسپی لینا ترک کر دیتے ہیں اور اس طرح اس وقف کا مطلب

فوت ہو جاتا ہے۔

کونسل کو اس مسئلہ میں آپ کی گراں قدر رائے درکار ہے۔ امید ہے کہ آپ اس موضوع پر قرآن وسنت کی روشنی میں ایک جامع، مکمل اور مدلل مقالہ لکھ کر کونسل کے دفتر کو جلد از جلد ارسال فرمائیں گے جس میں آپ کی قطعی رائے قانون ہذا کے منسوخ کرنے یا نہ کرنے کے متعلق بھی دی گئی ہو۔

کونسل اس سلسلے میں آپ کی گرانقدر مساعی پر آپ کی بے حد ممنون ہوگی، اور اپنے قواعد کی رو سے آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا معاوضہ بھی پیش کرنے کی جرأت کریگی۔ ممکن ہے کہ آپ کو اس سلسلہ میں کونسل کی میٹنگ میں تشریف لانے کی زحمت بھی دیجائے جس کے لئے کونسل آپ کو بروقت اطلاع دے گی اور آپ کے آنے جانے اور قیام کے مصارف کا بھی انتظام کریگی۔

قانونِ جوازیٔ وقفِ مسلمانان مصدرہ ۱۹۱۳ء کی ایک ٹائپ شدہ نقل آپ کے مطالعے کے لئے اس خط کے ساتھ منسلک کی جارہی ہے۔"

میں نے اس چھٹی کا حسب ذیل جواب بھیجا ہے۔

" محترمی جناب صدیقی صاحب۔

السلام علیکم! ــ آپ کا گرامی نامہ (نمبر۔ ۳(۱)/۷۰ ۔ ۔ اے۔سی۔آئی۔آئی۔ مؤرخہ ۲۹رمئی ۱۹۷۰ء) شرفِ صدور لایا۔ اس میں آپ نے قانونِ جوازیٔ وقف مصدرہ ۱۹۱۳ء کے سلسلہ میں حسب ذیل تنقیحات کے متعلق میری رائے دریافت فرمائی ہے۔

(۱) آیا قرآن وسنت میں وقف علی الاولاد کے بارے میں کوئی حکم ہے؛

(۲) آیا بصورتِ دیگر یہ فقہ کا ایسا جزو لاینفک ہے کہ اگر کوئی شخص وقف علی الاولاد قائم کردے تو حکومت پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ صرف تسلیم کرے بلکہ نافذ بھی کرے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کیا حکومت اس مسئلہ میں کوئی مداخلت کرنے کی مجاز نہیں۔

چونکہ زیرنظر سوال قانونِ جوازیٔ وقف مصدرہ ۱۹۱۳ء کی تنسیخ سے متعلق ہے، اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کو وقف علی الاولاد تک محدود رکھنے کے بجائے خود نفسِ وقف کا جائزہ لے لیا جائے۔ لہٰذا، میرا جواب وقف کی اِس مخصوص (علی الاولاد) حیثیت کے بجائے، اس کی عمومی حیثیت سے متعلق ہوگا یعنی وقف، خواہ وہ کسی مقصد کے لئے ہو۔

(۲) عام طور پر وقف کی تعریف (DEFINITION) یہ کی جاتی ہے کہ الوقف لا یملك ولا یباع ولا یوھب ولا یورث۔ یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے، نہ اسے فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ ہبہ

کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر قانونِ وراثت کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۳) قرآنِ کریم کی رُو سے، مال یا جائیداد پر افراد کی ذاتی ملکیت کا تصور کیا ہے، یہ سوال وسیع اور دقیق ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ مسئلہ زیرِ نظر پر غور و خوض کے لئے، میں اس نقطہ سے آگے بڑھتا ہوں کہ اسلامی حکومت جس شے پر کسی کی ذاتی ملکیت تسلیم کرے اور اسے دوسروں کی طرف منتقل کرنے کا اختیار دے، اس کے کسی دوسرے کی طرف انتقال کی صورت میں حقِ ملکیت کی پوزیشن کیا ہو گی؟

قرآن کریم میں انتقال مال کی جتنی شکلیں بیان ہوئی ہیں، ان میں کوئی شکل بھی ایسی نہیں کہ مال تو دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے، لیکن اس پر ملکیت اُس کی قائم نہ ہو۔ مثلاً خرید و فروخت، تحفہ، خیرات، قرضہ، وصیت یا وراثت وغیرہ کی رُو سے جو شے بھی دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ وہ قانوناً اس کا مالک متصور ہو گا۔ (شئے مستعار کی حیثیت بالکل الگ ہے) لہٰذا قرآن کی رُو سے وقف کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو سکتی۔

(۴) اب رہا سنت کا سوال، سو، سنتِ رسول اللہ کے تعین (بلکہ تعریف تک) میں علماء میں جو اختلاف چلا آ رہا ہے وہ آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہو گا۔ بعض کا خیال ہے کہ سنت، حدیث ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور بعض کے نزدیک سنت، احادیث سے مرتب ہوتی ہے۔ ائمہ حدیث نے متنِ حدیث کے پرکھنے کے لئے جو اصول متعین فرمائے ہیں، ان میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ مسئلہ زیرِ نظر میں جب یہ واضح ہو گیا کہ قرآن کریم کی رُو سے وقف کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تو پھر کتبِ روایات میں اگر کوئی روایت ایسی ملے جو وقف کی تائید میں ہو تو اس کے متعلق یہی سمجھا جانا چاہیئے کہ اُس کی نسبت رسول اللہ کی طرف صحیح نہیں۔ یا یہ کہ وہ قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے ظاہر ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ سورۂ نساء میں احکامِ وراثت نازل ہو جانے کے بعد حضورؐ نے حبس کی ممانعت فرما دی تھی۔

(۵) جہاں تک فقہ کا تعلق ہے تو اس کے لئے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ فقہ کی پوزیشن کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں (مستثنیات کو چھوڑ کر) عام طور پر اصولی احکام دیئے گئے ہیں۔ اور یہ چیز اسلامی مملکت پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق تفصیلی احکام خود مرتب اور نافذ کرے۔ اِن تفصیلی احکام کو فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے (خواہ وہ انفرادی طور پر مرتب کئے گئے ہوں یا حکومت کی طرف سے)۔ ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن اُن کی روشنی میں وضع کردہ فقہی احکام کے متعلق ہر دور کی اسلامی حکومت مجاز ہو گی کہ وہ ان احکام میں مناسب ردّ و بدل کرے، یا

اُن کی جگہ دوسرے احکام نافذ کرے۔ ان احکام کے وضع کرنے میں یہ اسلامی حکومت سابقہ زمانوں میں مرتب شدہ احکام سے استفادہ کرے گی۔ لیکن اس کی پابند نہیں ہوگی کہ مِن وعَن انہی احکام کو اختیار اور نافذ کرے۔ اس سے واضح ہے کہ اگر آج کوئی اسلامی حکومت وقف سے متعلق فقہی احکام کو منسوخ کرنا چاہے تو وہ اس کی مجاز ہوگی۔

(۶) جہاں تک "حکمت" کا تعلق ہے "مردہ بدستِ زندہ" تو ایک بدیہی بات ہے۔ لیکن وقف میں "زندہ بدستِ مردہ" ہوتا ہے۔ مرنے والا ایک حکم صادر فرما دیتا ہے کہ میری جائیداد نہ ورثاء میں تقسیم ہوسکتی ہے، نہ فروخت۔ یہ ابدالاباد تک میری ملکیت متصور ہوگی اور اس سے حاصل شدہ منافع میری مرضی کے مطابق فلاں مصرف میں لائے جائیں گے۔ اب زمانے کے حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، زندہ انسان اُس مردہ کے فیصلے سے سرِ مو سرتابی نہیں کرسکتے ــــ نہ افراد، نہ معاشرہ اور نہ ہی حکومت۔ کسی جائیداد کے اس طرح منجمد ہوجانے کے جو نقصانات ہیں، وہ ہمارے سامنے ہیں۔ وقف علی الاولاد سے جو نقصانات ہوتے ہیں، ان کی نشان دہی آپ نے اپنی چٹھی میں خود ہی فرمادی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ (قومی اور اجتماعی) نقصانات کا موجب وہ جائیدادیں ہیں جو "نیک مقاصد" کے لئے موقوف ہوں۔ نہ صرف یہ کہ قوم اُن سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اٹھا سکتی، وہ ان کی وجہ سے پیدا شدہ مضرتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے، لیکن قانونِ وقف کی پابندیوں کی وجہ سے کچھ کر نہیں سکتی۔

(۷) اندریں حالات میری رائے یہ ہے کہ

(i) حکومتِ پاکستان وقف کے غیر قرآنی قانون کو منسوخ کردے۔

(ii) وقف علی الاولاد جائیدادیں ان کے موجودہ ورثاء کی طرف منتقل کردے۔ اور

(iii) دیگر تمام موقوفہ جائیدادوں کو حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں اپنی صوابدید کے مطابق رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کرے۔

(۸) آپ نے لکھا ہے کہ اسلامی مشاورتی کونسل میری اس رائے کے لئے کوئی معاوضہ بھی پیش کرے گی۔ میں کونسل کی اس پیشکش کے لئے شکرگزار ہوں۔ لیکن اسے قبول کرنے سے معذرت چاہوں گا۔

(۹) اسی ضمن میں ایک اضافہ کی اجازت چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں صاحبِ جائیداد کو جو مشکلات پیش آتی ہیں اور جن کے حل کے لئے وہ کبھی ہبہ کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کبھی وقف کا، جہاں تک میں نے دیکھا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کے قانونِ وصیت کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اتنی سخت تاکید کی ہے۔ اگر قرآن کے قانونِ وصیت کو کاملۃً نافذ کردیا جائے تو کسی کو اس قسم کی گریز کی

راہوں کی ضرورت ہی لاحق نہ ہو۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس قسم کے اصلاحی اقدامات کی ضرورت اس لئے پیش آ رہی ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں۔ اس نظام کی موجودگی میں وہ تمام مشکلات از خود حل ہو جاتی ہیں جو اس وقت ہمارے لئے اس قدر دردسری کا موجب بن رہی ہیں۔

(۱۰) چونکہ آپ کی چٹھی "صیغۂ راز" کی نہیں اس لئے میں استفادہ عام کی غرض سے اسے اور اپنے اس جواب کو طلوعِ اسلام میں اشاعت کے لئے دے رہا ہوں۔ امید ہے آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

تکملہ

چٹھی کا جواب تو میں نے ان تنقیحات تک محدود رکھا جن کے متعلق میری رائے دریافت کی گئی تھی۔ لیکن قارئین طلوعِ اسلام کے لئے چند ایک نقاط کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) دینی مقاصد کے لئے جو کچھ وقف کیا جائے گا، ظاہر ہے کہ وہ یا زمین کی شکل میں ہوگا یا جائیداد کی شکل میں، یا سرکاری تمسکات کی شکل میں اور یا پھر کسی کاروبار میں روپیہ (INVEST) کیا ہوگا یا کسی صنعتی ادارے کے حصے خریدے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی شکل بھی ہو، ظاہر ہے کہ اس میں اصل تو محفوظ رہے گا اور جو کچھ حاصل ہوگا وہ اس اصل پر منافع ہوگا۔ قرآن کریم صرف سرمایہ پر منافع کو خواہ وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو، ربٰو قرار دیتا ہے۔ اس لئے موقوفہ جائیداد وغیرہ سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ قرآن کریم کی رُو سے ربٰو ہوگا۔ ہماری مروجہ فقہ اس قسم کے منافع کو جائز قرار دیتی ہے۔ لیکن اس کے جواز کی دلیل صرف یہ ہے کہ اسے وہ ربٰو کے نام سے نہیں پکارتی بلکہ مزارعت یا مضاربت جیسی اصطلاحات سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ محض الفاظ کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ ربٰو، ربٰو ہی رہتا ہے خواہ اسے کسی اصطلاح سے بھی کیوں نہ پکارا جائے۔ مسلمانوں کا اس طرح جائیدادوں کو وقف کرنا، اور پھر حکومت کی طرف سے ایک محکمہ قائم کرنا تاکہ وہ ربٰو کے اس کاروبار کا نظم و نسق سنبھالے اور اس سے حاصل شدہ روپے کو "دینی" مقاصد میں صرف کرنا، جس قدر خیر و برکت کا موجب ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔

(۲) وصیت کے متعلق قرآن کریم میں بنصِ صریح کہا گیا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ (۲/۱۸۰)۔ یعنی جب کسی کے سامنے موت آموجود ہو تو اس پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے والدین اور اقربین کے لئے اپنے ترکہ کی وصیت کرے۔ اور ایسا کرنا متقیوں کے لئے لازم ہے۔ پھر (۵/۱۰۶) میں تفصیل سے کہا گیا ہے کہ یہ وصیت کس طرح لکھائی جائے گی اور اس میں شاہد کون کون سے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اور سورۃ نساء میں جہاں وراثت کے حصوں کا ذکر ہے،

ہر حصے کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ "تقسیم وصیت پوری کرنے کے بعد جو کچھ بچے گا" اس کی کی جائے گی۔ لیکن قرآن کریم کے ایسے واضح اور تاکیدی احکامات کے خلاف ہماری مروجہ فقہ یہ کہتی ہے کہ وصیت صرف ⅓ مال ہی کی جا سکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں۔ آپ خود سوچئے کہ اسے کیا کہا جائے؟

(۳) میں نے اپنے جواب میں ضمناً یہ کہا ہے کہ یہ تمام مشکلات اس وقت تک پیدا ہوتی رہیں گی جب تک قرآن کریم کا معاشی نظام رائج نہیں ہوگا۔ اس نظام میں نہ زمین اور دیگر وسائل پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ روپیہ رہتا ہے کہ وہ جائیدادیں کھڑی کرے، یا اسے کاروبار میں منافع پر لگائے۔ اس نظام میں ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے اور اسلامی مملکت اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی کفیل ہوتی ہے۔

———(※)———

رفیعُ اللہ

عُلمائے کرام ___ امام غزالیؒ کی نگاہ میں

(قسطِ دوم)

قسطِ اوّل طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۰ء میں شائع ہو چکی ہے!

آٹھ مسائل

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ شاگرد کو ویسا ہونا چاہیئے جیسا کہ جناب شفیق بلخیؒ کے شاگرد حاتم اصمؒ تھے۔ روایت کی گئی ہے کہ ایک دن شفیقؒ نے حاتمؒ سے دریافت فرمایا کہ تم کتنے عرصے سے میری صحبت میں ہو۔ انہوں نے جواب دیا تینتیس برس سے۔ شفیقؒ نے پوچھا کہ اس عرصے میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا ہے۔ حاتمؒ نے کہا صرف آٹھ مسئلے۔ انہوں نے اِنَّا لِلّٰہ پڑھا اور فرمایا کہ تیرے ساتھ میری زندگی گذر گئی اور تو نے صرف آٹھ مسائل سیکھے۔ حاتمؒ نے کہا کہ اے استاد! اس سے زیادہ میں نے نہیں سیکھے اور غلط بیانی کو میں ناپسند کرتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ آٹھ مسئلے کون کون سے ہیں تاکہ مجھے بھی معلوم ہوں۔ حاتمؒ نے کہا کہ :-

(۱) پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے انسانی مخلوق کو دیکھا تو معلوم کیا کہ ہر شخص کا ایک محبوب ہوتا ہے اور وہ قبر تک اپنے محبوب کے ساتھ رہتا ہے۔ جب قبر میں پہنچ جاتا ہے تو اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے نیکیوں کو اپنا محبوب بنا لیا ہے کہ جب میں قبر میں جاؤں تو میرا محبوب میرے ساتھ رہے۔ شفیقؒ نے فرمایا کہ تو نے بہت اچھا سیکھا۔ باقی مسائل کونسے ہیں۔

(۲) آپ نے کہا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے اس آیت شریفہ پر غور کیا۔ " وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى " اور جو کوئی اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو بہشت اس کا ٹھکانا ہے؛ تو میں نے جان لیا کہ ارشادِ ربانی حق ہے سو میں نے اپنے نفس کو خواہشات سے دور رکھنے کی عادت ڈالی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت پر جم گیا۔

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے جب انسانی مخلوق کی طرف دھیان دیا تو یہ دیکھا کہ ہر شخص کے پاس

کوئی قدر و قیمت کی چیز ہوتی ہے تو وہ اسے سنبھال کر رکھ چھوڑتا ہے تاکہ محفوظ رہے۔ پھر اس ارشادِ ربانی پر غور کیا۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (اور جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے) تو جو کچھ قدر و قیمت کی کوئی چیز میرے ہاتھ آئی میں نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا تاکہ اسکے پاس باقی اور محفوظ رہے۔

(۴) اور چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے بنی نوعِ انسان کو غور سے دیکھا تو یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ ان میں سے ہر شخص مال و دولت اور حسب نسب کی طرف میلان رکھتا ہے اور جب میں نے ان امور پر غور و فکر کیا تو ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے اس ارشادِ ربانی پر غور کیا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔) اس لئے میں نے تقویٰ اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کریم ہو جاؤں۔

(۵) اور پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو ایک دوسرے پر بدگمانی کرتے ہوئے دیکھا۔ اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور اس تمام برائی کی جڑ حسد ہے۔ اور پھر میں نے اس فرمانِ الٰہی پر غور کیا۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان ان کا رزق تقسیم کیا) اس لئے میں نے حسد چھوڑ دیا اور مخلوق سے اجتناب کیا اور جان لیا کہ تقسیمِ رزق تو اللہ پاک کی طرف سے ہے۔ اس لئے میں نے مخلوق سے عداوت چھوڑ دی۔

(۶) اور چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ بنی نوعِ انسان ایک دوسرے پر سرکشی اور کشت و خون کرتے ہیں اور فرمانِ باری تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو فرمایا ہے کہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا۔ (تحقیق شیطان تمہارا دشمن ہے پس تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو)۔ اسی بنا پر میں نے صرف اس اکیلے کو اپنا دشمن تصور کر لیا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود اس کی دشمنی پر گواہی دی ہے کہ وہ میرا دشمن ہے اس لئے میں نے تمام مخلوق کی عداوت چھوڑ دی۔

(۷) ساتواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ان میں ہر ایک روٹی کے ایک نوالے کے لئے اپنے نفس کو ذلیل کرنے والا ہے اور اس کے لئے حرام امور کے ارتکاب سے بھی دریغ نہیں کرتا، تو میں نے اس ارشادِ ربانی پر غور کیا۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (روئے زمین پر ہر چلنے والے کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے) اور میں نے سمجھ لیا کہ میں بھی انہی روئے زمین پر چلنے والوں میں سے ہوں جن کے رزق کا وہ ذمہ دار ہے۔ اس لئے میں حقوق اللہ کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے حقوق اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیئے۔

(۸) آٹھواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے انسان کو دیکھا تو ان میں ہر کوئی اپنے جیسی مخلوق پر بھروسہ

کئے ہوئے ہے۔ کوئی اپنی زمین پر، کوئی اپنی تجارت پر، کوئی اپنی صنعت گری پر اور کوئی اپنے بدن کی تندرستی پر غرضیکہ تمام مخلوق اپنے جیسی دوسری مخلوق کا سہارا لئے ہوئے ہے۔ تو میں نے اس فرمانِ ربانی کی طرف رجوع کیا۔ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۔ (کہ جو اللہ تعالےٰ پر توکل کرے تو وہ اس کے لئے کافی ہے) اس لئے میں نے اللہ تعالےٰ پر توکل کیا کہ صرف وہی مجھے کافی ہے۔

اس پر آپ کے استاذ جناب شقیق بلخی نے فرمایا کہ اے حاتم! اللہ تعالےٰ تجھے توفیق دے کہ میں نے تمام آسمانی کتابوں کے علوم پر نظر کی تو میں نے نیکی اور دیانت کی تمام اقسام کو انہی آٹھ مسئلوں کے گرد گھومتا پایا جس نے ان پر عمل کیا اس نے گویا چاروں الہامی کتابوں پر عمل کیا۔ اور حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے ادراک اور حصول کے لئے علمائے حق ہی کوشش کرتے ہیں اور دنیادار علماء تو صرف ان امور میں مشغول ہوتے ہیں جن سے دنیاوی مال و مرتبہ آسانی سے حاصل ہو سکے۔ اور اس قسم کے علوم کو چھوڑ دیتے ہیں جن کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے تمام انبیا کو مبعوث فرمایا ہے۔

ایک عیش پرست فقیہہ کا قصہ

ضحاک بن مزاحم فرماتے ہیں کہ سلف صالحین ایک دوسرے کو پرہیزگاری کے سوا کچھ نہیں سکھاتے تھے۔ اور آج بجز فلسفہ کے کچھ نہیں سیکھتے۔ اور علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ کھانے پینے میں آسائش، لباس میں شان و شوکت اور ساز و سامان اور رہائش کے معاملے میں زینت کی طرف مائل نہ ہوں۔ بلکہ ان سب امور میں میانہ روی اختیار کریں اور اس بارے میں سلف صالحین سے مشابہت پیدا کریں اور سب امور مذکورہ میں کم سے کم مقدار پر کفایت کریں کیونکہ جس قدر ان چیزوں کی خواہش کم ہوگی اسی نسبت سے اللہ تعالےٰ کا قرب زیادہ ہوگا اور اسی طرح علمائے حق میں اس کا مرتبہ بلند ہوگا اور یہ قصہ اس امر پر شاہد ہے جو حاتم اصم کے شاگرد ابوعبداللہ خواص روایت کرتے ہیں کہ میں حاتم کے ساتھ شہر رے میں گیا۔ ہمارا قافلہ جو تین سو بیس آدمیوں پر مشتمل تھا حج کا ارادہ رکھتا تھا۔ سب کے سب کمبل پوش تھے کسی کے پاس توشہ دان یا کھانا نہیں تھا۔ ہم ایک سوداگر کے گھر اترے جو زیادہ دولتمند نہیں تھا، غریب دوست تھا۔ اس نے اس رات ہماری ضیافت کی۔ جب صبح ہوئی تو اس نے حاتم سے کہا کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو ارشاد فرما دیجئے کہ میں اپنے ایک بیمار فقیہہ کی بیمار پرسی کو جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ بیمار پرسی کار ثواب ہے، اور فقیہہ کو دیکھنا عبادت میں شامل ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور وہ بیمار فقیہہ محمد بن مقاتل قاضی رے تھا۔ جب ہم دروازے پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خوبصورت بلند و بالا محل تھا۔ حاتم ششدر رہ گئے کہ ایک عالم دین کا ایسا دروازہ! پھر جب اجازت کے بعد اندر گئے تو دیکھا کہ مکان خوبصورت اور بڑا وسیع تھا۔ قالین بچھے ہوتے اور پردے لگے ہوئے تھے۔ حاتم پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوئے۔ پھر قاضی صاحب کے ڈرائنگ روم میں گئے جس میں نرم قالین بچھا ہوا تھا اور وہ اس پر لیٹے ہوئے تھے اور سر کے پاس ایک

نوکر لڑکا پنکھا لئے کھڑا تھا۔ سوداگر قاضی صاحب کے سرہانے بیٹھ کر حال احوال پوچھنے لگا لیکن حاتم کھڑے رہے۔ قاضی نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن آپ نے بیٹھنے سے انکار کردیا۔ اس پر قاضی نے پوچھا کہ کیا تمہیں کوئی حاجت ہے؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا کہ ایک سئلہ پوچھنا ہے بشرطیکہ آپ اٹھ کر بیٹھ جائیں جب قاضی صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تو حاتم نے کہا کہ تم نے علم کس سے سیکھا ہے؟ جواب دیا کہ معتبر علمائے دین سے جنہوں نے میرے سامنے احادیث بیان کیں۔ حاتم نے پوچھا کہ انہوں نے کس سے احادیث روایت کی تھیں۔ قاضی نے جواب دیا صحابہؓ رسولؐ سے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ صحابہؓ نے کس سے روایت کی تھیں۔ قاضی نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جنہوں نے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کیا تھا۔

اس پر حاتم نے فرمایا کہ جو علم اللہ تعالیٰ سے جبرئیل علیہ السلام نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا اور آپ نے صحابہؓ کو اور انہوں نے معتبر علماء کو جنہوں نے اسے تجھ تک پہنچایا تو کیا تم نے اس علم میں کہیں یہ بھی دیکھا سنا ہے کہ جس شخص کے گھر کی کرسی بلند ہو اور وہ بڑا وسیع ہو تو اس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا ہوتا ہے؟ قاضی نے کہا کہ نہیں، میں نے ایسا کہیں نہیں سنا۔ حاتم نے دوبارہ پوچھا کہ پھر آپ نے کیا سنا ہے؟ قاضی نے کہا کہ یوں سنا ہے کہ جو شخص دنیا میں زہد اختیار کرے اور آخرت کی خواہش رکھے اور مساکین اسے محبوب ہوں اور آخرت کے لئے تیاری کرے تو اس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند ہوگا۔ حاتم نے فرمایا کہ پھر تم نے کس کی پیروی کی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ کی یا نمرود اور فرعون کی جنہوں نے سب سے پہلے اینٹوں اور چونے کے محل بنائے تھے۔ اے عالم باطل! دنیا پر حریص اور جاہل لوگ جو دنیا کے لئے لڑتے ہیں وہ تمہیں جیسے لوگوں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ہم اگر ان علماء سے بدتر ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ یہ کہہ کر حاتم اس کے پاس سے چلے آئے۔ اور قاضی ابن المقاتل کی بیماری اور بڑھ گئی مدرسے کے لوگوں کو قاضی اور حاتم کی گفتگو کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ قزوین کا قاضی طنافسی تو اس سے بھی زیادہ عیش پرست ہے۔ بس حاتم قصداً اس کے پاس گئے اور سلام ورحمت کے بعد درخواست کی کہ میں ایک عجمی شخص ہوں۔ مجھے وضو کی عملی

اسراف کے متعلق فقہا کا نظریہ

تعلیم دیجئے۔ طنافسی نے کہا بہت بہتر۔ اور نوکر لڑکے سے کہا کہ ایک برتن میں پانی لے آؤ۔ جب پانی آگیا تو طنافسی نے بیٹھ کر وضو کیا اور ہر عضو کو تین تین بار دھویا اور پھر کہا کہ اس طرح وضو کرتے ہیں۔ حاتم نے کہا کہ اس مسئلہ کو پختہ کرنے کے لئے آپ کے سامنے وضو کرتا ہوں چنانچہ فقیہہ طنافسی کھڑے رہے اور حاتم وضو کرنے بیٹھے اور آپ نے وضو میں اپنے ہاتھوں کو چار چار مرتبہ دھویا۔ طنافسی نے اعتراض کیا کہ تم نے اسراف سے کام لیا ہے۔ حاتم نے پوچھا کیسے، تو اس نے کہا کہ تم نے اپنے ہاتھ تین کی بجائے چار مرتبہ دھوئے۔ حاتم نے کہا سبحان اللہ! میں نے ایک چلو پانی میں اسراف کیا اور تم نے عیش پرستی کے ان سب سامانوں کے جمع کرنے میں اسراف نہیں کیا۔ اب طنافسی اس

حقیقت کو پہنچ گیا کہ ان کا مقصد وضو سکھانا نہ تھا بلکہ یہی امر جتانا مقصود تھا۔ یہ سنکر وہ گھر میں داخل ہو گئے اور شرم سے اڑتالیس روز تک لوگوں کے سامنے نہ آئے۔

پھر جب حاتم بغداد تشریف لے گئے تو اہل بغداد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے ابو عبدالرحمن! تم ایک عجمی شخص ہو اور تتلا کر بات کرتے ہو مگر جو بھی تم سے بحث کرتا ہے تم اسے کاٹ کر رکھ دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ میں تین ایسی خصلتیں ہیں جن کی وجہ سے میں فریق مخالف پر غالب رہتا ہوں۔ پہلی یہ کہ جب میرا دشمن صحیح بات کہتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ اور دوسری یہ کہ جب وہ غلطی کرتا ہے تو مجھے رنج ہوتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ میں اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہوں کہ مخالف فریق پر کوئی زیادتی نہ کر بیٹھوں۔ یہ خبر جب امام احمد بن حنبلؒ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! بڑے عاقل شخص معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی ان کی خدمت میں لے چلو۔ جب یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام احمدؒ نے آپ سے دریافت کیا کہ سلامتی کس بات میں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اے ابو عبداللہ! جب تک آپ میں چار خصلتیں نہ ہوں گی، دنیا میں سلامتی سے نہ رہو گے (۱) لوگ زیادتی کریں تو تم درگذر کرو (۲) دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔ (۳) اپنی چیزیں دوسروں کے لئے خرچ کرو۔ (۴) لیکن ان سے ان کی چیزوں کی کبھی توقع نہ رکھو۔ جب تم ان پر عمل کرو گے تو انشاء اللہ اس دنیا میں سلامت رہو گے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے محلات؟

پھر حاتم مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اہل مدینہ آپکے استقبال کو آئے تو آپ نے دریافت کیا کہ یہ کون سا مدینہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ مدینۃ الرسول (صلے اللہ علیہ وسلم) ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حضور صلعم کا محل کہاں ہے؟ تاکہ میں اس میں نماز پڑھوں۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کا تو کوئی محل نہ تھا بلکہ آپ کا گھر تو بہت پست تھا۔ حاتم نے کہا کہ صحابۂ رسولؐ کے محلات ہی بتادو انہوں نے کہا ان کے بھی کوئی محل نہیں تھے بلکہ ان کے مکانات تو زمین سے لگے ہوئے تھے۔ حاتم نے کہا کہ لوگو! تو پھر یہ شہر فرعون کا معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اسے پکڑ کر حاکم شہر کے پاس لے گئے اور شکایت کی کہ یہ عجمی کہتا ہے کہ یہ مدینہ فرعون کا ہے۔ حاکم نے کہا کس لئے ایسا کہتا ہے۔ حاتم نے کہا جلدی نہ کرو۔ میں ایک عجمی مسافر ہوں۔ جب شہر میں آیا تو لوگوں سے پوچھا یہ کس کا مدینہ ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ مدینۃ النبی صلعم ہے۔ میں نے کہا حضور کا محل کہاں ہے اور سب ماجرا تفصیلاً بیان کیا پھر فرمایا کہ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (تمہارے لئے اللہ کا رسول عمدہ نمونہ تھے) تم نے کس کا اتباع کیا ہے؟ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یا فرعون کا جس نے سب سے پہلے اینٹوں اور چونے کے محل بنائے۔ تو حاکم شہر نے لاجواب ہو کر آپ کو رہا کر دیا۔

زینت حرام نہیں ہے

ویسے زینت کے مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حرام نہیں بلکہ مباح ہے۔ لیکن جب [illegible]

...ی امر ہے۔ اس کے بعد اس کا ترک کرنا شاق گزرتا ہے۔ اور زینت اختیار کرنے کی وجہ سے انسان اکثر اس کے
...ل کی وجہ سے مداہنت، مخلوق کی ناجائز طرف داری وغیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے
اس سے اجتناب کیا جائے اس لئے کہ جو دنیاداری میں غرق ہو جاتا ہے وہ اس سے صحیح سالم نہیں نکلتا۔ اگر
...یاداری میں پوری طرح منہمک ہو جانے کے باوجود سلامتی کا یقین ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترکِ دنیا میں
...بالغہ نہ کرتے۔ یہاں تک کہ آپ نے دھاری دار کرتہ اتار دیا تھا اور خطبہ کے دوران سونے کی انگوٹھی بھی اتار
...تھی۔ وغیرہ۔

امام مالکؒ کی زینت کا جواز

کہتے ہیں کہ یحییٰ بن یزید نوفلی نے امام مالکؒ بن انس کو ایک خط لکھا جس کی عبارت یوں تھی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر درود وصلوٰۃ۔ یحییٰ بن یزید نوفلیؒ کی جانب سے مالک بن
...س کے نام۔ حمد وصلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ میں نے سنا ہے کہ تم باریک (نفیس) کپڑے پہنتے ہو اور پتلی چپاتیاں
...کھاتے ہو اور نرم بچھونے پر بیٹھتے ہو۔ اور اپنے دروازے پر دربان مقرر کرتے ہو۔ حالانکہ تمہاری مجلس علم کے لئے ہوتی
ہے جس میں لوگ دور ونزدیک سے آتے ہیں جنہوں نے تمہیں اپنا امام بنا رکھا ہے اور وہ تمہارے اقوال پر راضی ہیں۔
...تمہیں اللہ تعالےٰ کا تقویٰ اختیار کرنا چاہیئے اور تواضع کو لازم پکڑنا چاہیئے۔ میں نے یہ خط تمہیں بطور نصیحت لکھا
ہے جسے اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔" والسلام

امام مالکؒ کا جواب

امام مالکؒ بن انس نے اس خط کے جواب میں لکھا:-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وصلی اللہ علی محمد وآلہٖ واصحابہٖ وسلم۔ مالک بن انس
...کی جانب سے یحییٰ بن یزید کی طرف۔ آپ پر اللہ تعالےٰ کا سلام ہو۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ میں آپ کی شفقت
ونصیحت کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو تقویٰ کی نعمت سے نوازے اور اس نصیحت کے عوض بھلائی دے
...میں گناہوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالےٰ کی توفیق چاہتا ہوں۔ آپ نے جو لکھا ہے کہ میں باریک کپڑے پہنتا ہوں،
پتلی چپاتیاں کھاتا ہوں اور نرم فرش پر بیٹھتا ہوں اور دروازے پر دربان رکھتا ہوں، تو واقعی میں ایسا کرتا ہوں
اور اللہ تعالےٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کا خواستگار رہوں۔ مگر باری تعالےٰ یہ بھی تو فرماتے ہیں۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ
زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (کس نے اللہ کی زینت کی
چیزوں کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیں اور پاکیزہ کھانے) یہ میں جانتا ہوں کہ ان چیزوں
کا ترک کر دینا ان کے اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ اور آپ اپنی خط وکتابت سے ہمیں نہ بھولئے۔ ہم بھی خط وکتابت
جاری رکھیں گے۔" (والسلام)

امام مالکؒ کا اقرار ملاحظہ ہو کہ تسلیم کرلیا کہ ان امور کا نہ کرنا اختیار کرنے کی نسبت اچھا ہے اور یہ رائے بھی ظاہر کردی کہ یہ امر مباح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اور جب امام مالکؒ جیسی شخصیت ایسی ضعیف میں انصاف سے کام لیں اور حق بات کا اعتراف کریں تو ان کا نفس مباح کی حدود کے قیام پر بھی قادر ہوگا۔ اور وہ مداہنت، دکھلاوا، اور مکروہات میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہیگا۔ مگر عام آدمی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مباح کی حدود پر قائم رہے۔ اس لئے مباح سے لذت حاصل کرنے میں بھی بہت خوف ہے اور علمائے حق کا ایک وصف خوف الٰہی ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خطرہ کی جگہ سے دوری اختیار کی جائے۔

دنیاوی حاکم اور علمائے حق

علمائے حق کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ سلاطین سے دور رہیں اور جب تک ان سے علیحدہ رہنے کی صورت ممکن ہو ان سے دور ہی رہیں۔ بلکہ اگر وہ امراء خود بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوں تب بھی ان سے ملنے سے احتراز کریں اس لئے کہ دنیا میٹھی اور سرسبز ہے جس کی باگیں حکامِ وقت کے پاس ہوا کرتی ہیں اور ان سے میل جول میں ان کی خوشنودی اور دلداری کا خیال رکھنا پڑجاتا ہے حالانکہ وہ ظالم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر عالمِ دین کو ان سے میل ملاپ سے انکار کرنا چاہیئے بلکہ ان کے مظالم کا اظہار اور ان کی بُری حرکات کی نشان دہی کرکے ان کے ہوش دحواس ٹھیک کرنے چاہئیں۔ لیکن جو ان سے میل جول بڑھائے گا وہ یا تو ان کی زینت کی طرف توجہ کرے گا اور اپنے اوپر نعمت الٰہی کو حقیر سمجھنے لگے گا، یا ان پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے سے خاموش رہے گا، تو مداہنت میں مبتلا ہوگا۔ یا ان کی خواہشات کے مطابق گفتگو کرنے کی کوشش کرے گا اور یہ واضح جھوٹ ہوگا۔ یا اس کو یہ لالچ ہو کہ اسے بھی دنیاوی سازوسامان سے کچھ حاصل ہو اور یہ حرام ہے۔ اس کی تفصیلات کتاب حرام وحلال میں آئیں گی۔

مختصر یہ کہ دنیاوی حکمرانوں سے میل جول قائم کرنا برائیوں کی کنجی ہے اور علمائے حق اس بارے میں احتیاط کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس نے جنگل میں ڈیرا لگایا، اس نے ظلم کیا اور جو شکار کے پیچھے چلا اس نے غفلت کی اور جو بادشاہوں کی خدمت میں حاضر ہوا وہ فتنوں میں مبتلا ہوا۔ اور آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے ایسے حکمران ہوں گے جن کے کاموں کو تم پہچانتے بھی ہوگے اور نہیں بھی پہچانتے ہوگے۔ بس جس نے ان سے شناسائی نہ کی وہ بَری ہے اور جس نے ان کو بُرا سمجھا وہ سلامت رہا۔ لیکن جس شخص نے ان سے رضامند ہوکر ان کی تابعداری کی وہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے دور ہوا۔ کسی نے عرض کیا کہ ہم ان سے جہاد کریں۔ آپ نے فرمایا نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ دوزخ میں ایک وادی ہے جو صرف ان علماء کے لئے مخصوص ہے جو بادشاہوں سے میل ملاپ بڑھاتے ہیں اور حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ اپنے آپ

کوئی ان کے دروازے پر جاتا ہے تو جھوٹ پر اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی شان میں وہ باتیں کہتا ہے جن کا وہ اہل نہیں ہوتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علمائے دین اللہ تعالےٰ کے بندوں پر رسولوں کے امین ہیں جب تک کہ سلاطین سے میل جول نہ کریں۔ اور جب وہ ایسا کریں تو انہوں نے رسولوں کی خیانت کی۔ ایسے علماء سے ڈرو اور علیحدہ ہو جاؤ۔

امراء کے دروازے پر حاضری دینے والا عالمِ دین چور ہے

حضرت اعمش سے کسی نے کہا کہ آپ نے علم کو زندہ کر دیا ہے کیونکہ بہت سے لوگ آپ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ جلدی نہ کرو۔ جتنے لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان میں سے ایک تہائی تو پختہ ہونے سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور ایک تہائی سلاطین کے دروازوں پر جا چمٹتے ہیں۔ وہ لوگ تمام مخلوق سے بُرے ہیں۔ اور باقی تہائی میں سے کمتر ایسے ہیں جو فلاح پاتے ہیں اور اسی وجہ سے حضرت سعید بن المسیبؒ نے فرمایا کہ جب تم کسی عالمِ دین کو امراء پر گرتا پڑتا دیکھو تو اس سے احتراز کرو۔ کیونکہ وہ درحقیقت چور ہے۔ اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک اس عالمِ دین سے زیادہ بُری مخلوق کوئی نہیں' جو امراء کی زیارت کے لئے جائے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدترین علماء وہ ہیں جو امراء کے ہاں حاضری دیتے ہیں اور حکمرانوں میں سے بہترین وہ ہیں جو علماء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور مکحول دمشقی کا فرمانا ہے کہ جو شخص قرآن مجید کا علم حاصل کرے اور دین میں تفقہ پیدا کرے اور پھر خوشامد کے لئے سلطان کی صحبت اختیار کرے اس چیز کے لالچ میں جو ان لوگوں کے اختیار میں ہوتی ہے تو وہ قدموں کے شمار کے لحاظ سے آگ کے سمندر میں گھستا ہے اور سمنون حسنؒ نے فرمایا کہ عالمِ دین کے حق میں یہ کتنا بُرا ہے کہ کوئی اس کی مجلس میں جاوے تو وہ موجود نہ ہو۔ پوچھنے پر معلوم ہو کہ وہ امراء کے سلام کے لئے گیا ہوا ہے۔

علمائے اسرائیل سے بھی بدتر

اور آپ نے فرمایا کہ میں سنا کرتا تھا کہ جب کسی عالمِ دین کو دنیا سے محبت کرتے دیکھو تو دین کے معاملے میں اس پر اعتبار نہ کرو۔ اس حقیقت کا اب میں نے خود تجربہ کر لیا ہے۔ یعنی جب بھی میں کسی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں سے نکلنے کے بعد اپنے نفس کا محاسبہ کیا تو میں نے اس اثر کو محسوس کیا حالانکہ میں جس طرح سلاطین سے ملتا ہوں تم اسے جانتے ہو کہ ان سے سختی سے پیش آتا ہوں اور اکثر حاکم کی خواہش کی مخالفت کرتا ہوں اور یہی چاہتا ہوں کہ اس تک جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ان سے کچھ لینا بھی نہیں یہاں تک کہ ان کے ہاتھ کا پانی بھی نہیں پیتا۔ پھر فرمایا کہ ہمارے زمانے کے علماء اسرائیل کے علماء سے بھی بدتر ہیں کہ جیسی سلاطین کی خواہشات ہوں ان کے لئے شرعی جواز ڈھونڈتے ہیں اور اگر ان کو وہ باتیں سکھائیں جو ان پر واجب ہیں اور جن میں ان کی نجات ہے تو یہ حاکم ان علماء سے نفرت کریں اور انہیں

اپنے قریب نہ ہونے دیں حالانکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعثِ نجات ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنے زمانے کے سلاطین کے پاس نہیں جاتے تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ آپ کے بیٹوں نے کہا کہ وہ لوگ جو اسلام اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارے برابر نہیں وہ ان سلاطین کی خدمت میں جاتے ہیں۔ اگر آپ بھی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ آپ نے فرمایا۔ کیا میں بھی اس مردار کے پاس جاؤں جسے لوگوں نے گھیر رکھا ہے۔ اللہ کی قسم، جب تک مجھ میں ہمت ہوتی میں ان کا شریک نہیں ہوں گا۔ بیٹوں نے کہا کہ تم لاغری میں مر جاؤ گے۔ فرمایا کہ ایمان کے ساتھ لاغری میں مر جانا اس سے اچھا سمجھتا ہوں کہ منافق ہو کر فربہ مروں۔ حسنؒ فرماتے ہیں کہ بخدا آپ نے اپنے بیٹوں کو لاجواب کر دیا۔ جب معلوم کر لیا کہ قبر کی مٹی گوشت اور چربی کو کھا جائے گی لیکن ایمان کو نہ کھائے گی۔ اور اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سلاطین کی خدمت میں حاضر ہونے سے آدمی نفاق سے نہیں بچ سکتا جو ایمان کی ضد ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے حضرت سلمہؓ کو نصیحت کی کہ بادشاہوں کے دروازوں پر نہ جایا کرنا۔ اس لئے کہ تمہیں ان کی دنیا سے جو بھی کچھ ملے گا جب وہ تمہارے دین سے اس سے بہتر لے لیں۔ اور علمائے دین کے لئے یہ امر ایک بڑا فتنہ ہے اور یہ شیطان کا علماء پر ایک سخت حملہ ہے خاص کر وہ عالم دین جس کی آواز پیاری اور گفتگو میٹھی ہو۔ اس لئے کہ شیطان اسے ہمیشہ یہی سمجھاتا ہے کہ سلاطین کے پاس جانے اور ان کو نصیحت کرنے سے یہ لوگ ظلم سے باز رہیں گے اور وہ شعائرِ اسلامی قائم کریں گے۔ اور آخر کار ان کے دل میں یہ خیال پختہ کر دیتا ہے کہ تمہارا ان کے پاس جانا دین میں داخل ہے اور پھر جب ان کے پاس جاتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ ان سے نرم کلامی اور مداہنت نہ کی جائے اور ان کی تعریف اور خوشامد کی بات نہ کرے اور ان باتوں میں دین کی خرابی ہے۔ سلف صالحین فرمایا کرتے تھے کہ جب علماء علم حاصل کر لیتے تو عمل کرتے تھے اور عمل میں اس طرح مشغول ہو جاتے تھے کہ وہ گمنام ہو جاتے تھے۔ اور جب گمنام ہوتے تو لوگوں کو ان کی تلاش ہوتی۔ لیکن جب ان کی طلب ہوتی تو وہ بھاگ جایا کرتے تھے۔

علمائے حق اور حکومت

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت حسن بصریؒ کو ایک خط میں حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ درخواست کی کہ آپ کچھ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ فرما دیں جن سے میں خدا تعالیٰ کے امور میں مدد لیا کروں۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ اہلِ دین تو تمہارے پاس آئیں گے نہیں اور دنیا دار علماء کی تجھے ضرورت نہیں۔ تاہم آپ اشراف کو اپنے ساتھ رکھیں کہ وہ لوگ اپنے شرف کو خیانت سے آلودہ نہیں کرتے۔ یہ حال حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا گیا جو اپنے زمانے میں سب سے زیادہ پاک باز تھے۔ تو جب علمائے حق کو ایسے حاکم سے بھی گریز کرنا ضروری ہے تو دوسرے سلاطین کی طلب اور ان سے میل ملاپ کیسے مناسب ہوگا؟ اور سلف صالحین میں سے جناب حسن بصریؒ، امام سفیان ثوریؒ، جناب ابن مبارکؒ، جناب فضیلؒ، جناب ابراہیم بن ادہمؒ،

(اور یوسف بن اسباطؒ مکہ شریف اور شام کے دنیا دار علماء کے یہ عیب گنایا کرتے تھے کہ وہ دنیا داری کی طرف مائل ہیں، یا سلاطین کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں وغیرہ۔

علمائے حق فتوے میں جلدی نہ کریں

اور علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ فتویٰ دینے میں جلدی نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو فتویٰ دینے سے بچنے کی کوشش کریں۔ پس اگر کوئی ایسا مسئلہ پوچھے جسے وہ قرآنِ مجید یا قطعی حدیث یا اجماع یا قیاس ظاہر کی بناء پر یقین کی حد تک جانتا ہو تب تو وہ بے شک فتویٰ دے دے۔ اور اگر ایسا مسئلہ ہو جس میں اسے شک ہو تو اسے کہہ دینا چاہیئے کہ میں نہیں جانتا۔ اور اگر کوئی ایسا مسئلہ دریافت کرے جس میں اسے اپنے اجتہاد اور اندازے میں کچھ شک ہو تو اس میں احتیاط کرے اور دوسرے کسی بڑے عالم کے سپرد کر دے۔ یہ احتیاط کا درجہ ہے اس لئے کہ اجتہاد کا خطرہ اپنی گردن پر رکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ علم تین ہیں۔ ایک کتابِ ناطق، دوسرا سنتِ جاریہ اور تیسرا لاأدری (میں نہیں جانتا) کہنا۔ امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ لا ادری کہنا نصف علم ہے اور جو شخص کسی چیز کا علم نہ رکھتا ہو اور اللہ تعالےٰ کے لئے فتوے دینے سے چپ رہے تو اللہ کے نزدیک اس کا اجر صحیح فتوے دینے والے سے کم نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا نفس کو سخت ناگوار گزرتا ہے۔ یہ تھی صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی عادت۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب کوئی فتوے پوچھا جاتا تو آپ فرماتے کہ اس امیر کے پاس جاؤ جسے لوگوں کے معاملات سونپے گئے ہیں[1]۔ مسئلہ اس کی گردن پر رکھو۔ اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کو ہر مسئلے میں فتویٰ دے اس کے مجنوں ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور فرمایا کہ عالم کی ڈھال لاأدری (میں نہیں جانتا) ہے۔ کیونکہ اگر وہ چوک جائے تو پھر اس کی خیر نہیں۔ ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں کہ شیطان پر اس عالم سے سخت کوئی نہیں جو علم ہی سے بولے اور علم ہی سے سکوت اختیار کرے۔ شیطان کہتا ہے کہ اس شخص کو دیکھو کہ بولنے کی نسبت اس کا خاموش رہنا میرے لئے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور بعض اکابر نے ابدال (صوفیا کا ایک درجہ) کی صفت یوں بیان کی ہے کہ ان کی غذا فاقہ ہے۔ اور وہ صرف اس وقت سوتے ہیں جب نیند ان پر غلبہ پالے اور ضرورت کے بغیر بات نہیں کرتے۔ جب تک ان سے کوئی کچھ پوچھے نہیں، کلام نہیں کرتے اور جب کوئی دریافت کرتا ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ آس پاس کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس کی بات کا جواب دے سکتا ہے تو پھر بھی چپ رہتے ہیں یہاں تک کہ بہت ہی مجبوری کی حالت میں لب کھولتے ہیں اور یہ لوگ سوال کے بغیر کلام میں ابتداء کرنے کو "تقریر کی خفیہ لذت" میں شمار کرتے تھے۔

---

[1] اسلامی نظام میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ (طلوع اسلام)

فتوے دینے میں احتیاط

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔ فرمایا کہ اس کا مقصد اپنا تعارف کرانا ہے۔
بعض سلف صالحین کا قول ہے کہ عالم حق وہ ہے کہ جب اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو اسے یوں محسوس ہو کہ گویا اس کی داڑھ نکالی جاتی ہے اور حضرت ابن عمرؓ فتویٰ دریافت کرنے والے کو کہتے تھے کہ تم لوگ ہمیں پل بنا کر دوزخ کی طرف عبور کرنا چاہتے ہو۔ ابوحفص نیشاپوریؒ فرماتے ہیں کہ عالم حق وہ ہے کہ فتویٰ کا جواب دیتے وقت اس بات سے ڈرے کہ کہیں قیامت کو یہ پوچھ نہ ہو کہ کہاں سے جواب دیا تھا؟ امام ابراہیم نخعیؒ سے اگر کوئی مسئلہ پوچھتا، تو روتے اور فرماتے کہ کیا تمہیں کوئی دوسرا نہیں ملا تھا کہ مجھ پر چڑھائی کی؟۔ ابوالعالیۃ الریاحیؒ، ابراہیم بن ادہمؒ، امام ابراہیم نخعیؒ اور امام سفیان ثوریؒ دو یا تین شخصوں یا معمولی جماعت کے سامنے مسائل بیان کرتے اور جب لوگ زیادہ ہوجاتے تو چلے جاتے۔

مَا اَدْرِیْ (میں نہیں جانتا) کا علمی مرتبہ

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ عُزَیر نبی ہیں یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ تُبّع (یمن کا قدیم بادشاہ) ملعون ہے یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا نہیں۔ اور جب آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ سب جگہوں میں بہتر کون سی ہے اور بدتر کون سی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی لَا اَدْرِی کہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے خبر دی کہ سب جگہوں میں بہتر مسجدیں ہیں اور ان میں بدترین جگہیں بازار ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ سے اگر کوئی دس مسئلے پوچھتا تو آپ ایک کا جواب دیتے اور نو کے جواب میں خاموش رہتے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نو کا جواب دیتے تھے اور ایک کے جواب میں سکوت اختیار کر لیتے۔ فقہا سلف میں سے کئی ایسے بزرگ تھے جو "ادری" کی بجائے "لا ادری" زیادہ کہتے تھے۔ ان میں امام سفیان ثوریؒ، امام مالک بن انسؒ، امام احمد بن حنبلؒ، فضیل بن عیاضؒ اور بشر بن حابثؒ شامل تھے۔
عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس مسجد میں ایک سو بیس صحابہ رضوان اللہ علیہم دیکھے ہیں اور جب بھی ان سے کوئی فتویٰ یا حدیث پوچھی جاتی تو ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا کہ دوسرا بھائی ہمیں اس سوال سے بچالے۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ جب ان میں کسی پر کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ اس کو دوسرے کے پاس بھیج دیتے اور وہ تیسرے کے پاس یہاں تک کہ پھرتے پھراتے وہ مسئلہ پھر پہلے صحابی کے پاس آجاتا۔ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اصحاب صفہؓ جو بڑی تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے میں سے کسی کے بکرے کی ایک بھنی ہوئی سری بطور تحفہ آئی۔ اگرچہ اسے اسکی سخت حاجت تھی لیکن اُس نے دوسرے ساتھی کو تحفے کے طور پر پیش کر دی اور دوسرے نے تیسرے کو۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ پھر پہلے صحابی کے پاس پہنچ گئی۔ تو غور کیجئے کہ اس زمانے میں علماء کا معاملہ کیسے الٹا ہو گیا ہے کہ پہلے

زمانے میں علماءِ حق جس چیز سے بھاگتے تھے وہ اب مطلوب ہو گئی ہے اور جو مطلوب تھا اس سے نفرت کرنے لگے۔

فتوے کیلئے سرکاری اجازت کی ضرورت

اور فتویٰ جاری کرنے سے بچنے کی خوبی اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ صرف تین شخص فتوے دے سکتے ہیں۔ ایک حاکم، دوسرا مامور، اور تیسرا متکلف۔ اور بعض اکابر فرماتے ہیں کہ صحابہ چار چیزوں سے پہلو تہی کیا کرتے تھے۔ اول امامت، دوم وصیت، سوم امانت، چہارم فتویٰ۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ کم علم شخص جلد فتویٰ دینے پر تیار ہو جاتا تھا۔ اور جو زیادہ پرہیزگار ہوتا تھا وہ فتویٰ کو سب سے زیادہ دوسروں پر ڈالتا تھا۔ اور صحابہ کرامؓ اور تابعین کا شغل پانچ چیزوں میں تھا۔ (۱) قرآن مجید کی تلاوت، (۲) مساجد کی آبادی۔ (۳) ذکر الہٰی (۴) امر بالمعروف (۵) اور نہی عن المنکر۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ انسان کی تمام باتیں اس کے حق میں نقصان دہ ہیں مگر تین (۱) امر بالمعروف، (۲) نہی عن المنکر۔ (۳) اور ذکر الہٰی۔ اور ارشادِ ربانی ہے۔ لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ من نجواھم اِلَّا مَنْ اَمَرَ بصدقۃٍ او معروفٍ او اصلاحٍ بین النّاسِ۔ ان کے اکثر مشوروں میں بھلائی نہیں مگر جو صدقہ یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے۔" کسی اہلِ علم نے کسی حنفی فقیہہ کو خواب میں دیکھا، اور پوچھا کہ تم جو فتوے دیا کرتے تھے اور قیاس سے فیصلے کیا کرتے تھے اس کا اللہ تعالےٰ کے نزدیک کیا حال پایا؟ تو اس نے ناک چڑھائی اور منہ پھیر لیا اور کہا کہ ہم نے اسے کچھ نہ پایا۔ اور اس کا انجام ہم کو اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اور ابن حصین کہتے ہیں کہ آجکل کے عالم ایسے سوال کا جواب دے دیتے ہیں کہ اگر وہ سوال حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوتا تو وہ اس کے جواب کے لئے تمام اہلِ بدر کو جمع کرتے۔ غرض کہ فتوے دینے میں خاموشی اختیار کرنا ہمیشہ سے علمائے حق کا دستور رہا ہے۔

خاموشی حکمت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ اسے خاموشی اور زہد عنایت ہوا ہے۔ تو اس کے قریب ہو کیونکہ اسے حکمت تعلیم کی جاتی ہے۔ اور بعض اکابر کہتے ہیں کہ علماء دو قسم کے ہیں ایک عام عالمِ دین جو مفتی ہے یہ لوگ بادشاہوں کے مصاحب ہوتے ہیں اور دوسرا خاص عالمِ دین جو توحید اور دل کے اعمال کا عالم ہے اور یہ لوگ علیحدگی اور تنہائی پسند ہوتے ہیں اور کہا جاتا تھا کہ امام احمد بن حنبل کی مثال دریائے دجلہ کی طرح ہے کہ ہر شخص اس میں سے چلو بھر لیتا ہے۔ اور بشر بن حارث کی مثال اوپر سے ڈھکے ہوئے میٹھے کنوئیں کی طرح ہے کہ اس کا قصد فرداً فرداً کیا جا سکتا ہے۔ لوگ پہلے یوں کہتے تھے کہ فلاں شخص عالم ہے اور فلاں فلسفی، اور فلاں مقرر، اور فلاں عمل میں زیادہ ہے اور ابو سلیمان فرماتے ہیں کہ معرفتِ الہٰی کلام کی نسبت خاموشی سے زیادہ قریب ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ جب علم زیادہ ہوتا ہے تو باتیں کم ہو جاتی ہیں اور جب باتیں زیادہ ہوتی ہیں تو علم کم ہو جاتا ہے۔ اور حضرت سلیمان فارسیؓ نے حضرت ابو الدرداءؓ کو ایک خط لکھا حضور

صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا کہ اے میرے بھائی! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ طبیب بن گئے ہیں اور مریضوں کا علاج کرتے ہیں مگر سوچ لو کہ اگر تم واقعی طبیب ہو تو پھر تو بولئے کہ آپ کی کلام میں شفا ہے اور اگر تم مصنوعی طبیب بن گئے ہو تو پھر خوف خدا کرو۔ اور کسی مسلمان کو جان سے نہ مارو۔ اس خط کے بعد حضرت ابوالدرداءؓ سے جب کوئی دوا پوچھتا تو آپ توقف کیا کرتے اور حضرت انسؓ سے کوئی سوال کرتا تو فرماتے ہمارے آقا حضرت امام حسن علیہ السلام سے دریافت کرو۔ اسی طرح اگر کوئی حضرت ابن عباسؓ سے پوچھتا تو فرماتے کہ حارث بن زیدؓ سے دریافت کرو۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے کہ سعید بن المسیبؒ سے پوچھو۔ اور حکایت بیان کی گئی ہے کہ ایک صحابی ؓ نے حضرت حسن بصریؒ کی موجودگی میں بیس احادیث بیان کیں۔ کسی نے ان کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ میں بجز روایت کے اور کچھ نہیں جانتا۔ حضرت بصریؒ نے ایک ایک حدیث کی تفسیر علیحدہ علیحدہ بیان فرمائی۔ لوگوں کو ان کی تفسیر اور یادداشت کی خوبی پر حیرت ہوئی تو صحابیؓ نے ایک مٹھی کنکروں کی اٹھا کر ان لوگوں کو ماری کہ تم مجھ سے علمی باتیں پوچھتے ہو حالانکہ سب سے بڑے عالم دین تمہارے درمیان موجود ہیں۔

[اس کے بعد مصنف نے باطن کے رموز و اسرار کے متعلق بہت کچھ تفصیل سے لکھا ہے۔ چونکہ ان امور کا تعلق علماء سے نہیں اس لئے ہم نے اس حصہ کو حذف کر دیا ہے اور سلسلہ کلام اس مقام سے آگے بڑھایا ہے جہاں سے پھر علماء سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔　طلوع اسلام]

———— (۰) ————

علمائے حق کی ایک علامت انکسار ہے

اور عالم حق کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ غمگین، انکسار کے ساتھ خاموش رہے۔ اس کی صورت و لباس اور سیرت و کردار، گفتگو اور خاموشی سب میں خوفِ الٰہی کا اثر ظاہر ہو کہ جب ہی اس کی صورت دیکھی جائے خدا یاد آئے اور اس کی صورت اس کے عمل پر دلالت کرے۔ اور علمائے حق اپنے چہرے کی فروتنی اور عاجزی سے پہچانے جاتے ہیں اور بعض اکابر کا قول ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بندے کو وقار کے ساتھ فروتنی کے لباس سے بہتر لباس نہیں پہنایا۔ کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کا لباس ہے۔ اور صالحین، صدیقوں اور علماء کی علامت ہے۔ اور زیادہ گفتگو کرنی، ہنسی مزاح میں غرق رہنا، اور حرکت اور کلام میں تیزی کرنی یہ سب علامتیں شیخی اور اللہ تعالےٰ کے زبردست عذاب و غضب سے بے خوف اور غافل ہو جانے کی ہیں اور دنیا دار علماء کا راستہ ہیں جو اللہ تعالےٰ کو بھولے ہوئے ہیں۔

علماء تین قسم کے ہیں

جناب سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ عالم تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے احکام سے واقف ہیں لیکن اس کے ایام (یعنی تاریخ عالم) سے نابلد ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو حرام و حلال کے فتوے دیتے ہیں۔ اس قسم کے علم سے خوف الٰہی پیدا نہیں ہوتا اور دوسرے

وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو تو جانتے ہیں لیکن اس کے احکام و ایام اللہ کا علم نہیں رکھتے۔ یہ عامۃ المومنین ہیں اور تیسرے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بھی پہچانتے ہیں اور اس کے احکام و ایام کا بھی علم رکھتے ہیں۔ یہ لوگ صدیق ہیں اور خوف اور عاجزی صرف انہی پر غالب ہوتی ہے۔ ایام اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں اور عقوبتوں کی تفصیلات ہیں جو اگلے اور پچھلے زمانے کے لوگوں پر رحمت ہوئیں اور وارد ہوئیں پس جس شخص کا علم ان چیزوں کو محیط ہوگا اس کا خوف اور عاجزی زیادہ ہوگی۔

علم کے لئے وقار اور حلم ضروری ہے

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرو اور علم کے لئے وقار اور حلم سیکھو۔ اور جن سے سیکھتے ہو ان کی تواضع کرو۔ اور جو شخص تم سے سیکھے وہ تمہاری تواضع کرے اور جابر علماء سے نہ ہو تاکہ تمہارا علم تمہاری جہالت کو کفایت نہیں کریگا اور کسی نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو علم کی دولت سے نوازتا ہے تو اسے علم کے ساتھ حلم، تواضع، خوش خلقی اور نرمی بھی عطا کرتا ہے اور اسی کا نام علم مفید ہے اور کسی بزرگ کا قول ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم، زہد، تواضع، اور حسن خلق کی نعمتیں عطا فرمائے تو وہ متقیوں کا امام ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ میری امت کے نیک لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ ظاہراً تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی وسعت کی وجہ سے ہنستے ہیں لیکن خفیہ اس کے عذاب کے خوف سے روتے ہیں۔ ان کے بدن زمین میں ہیں اور دل آسمان میں۔ ان کی روحیں دنیا میں ہیں اور ان کی عقلیں عقبیٰ میں وقار کے ساتھ چلتی ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حلم علم کا وزیر، نرمی اس کا باپ اور تواضع اس کا لباس ہے اور بشر بن حارثؒ کہتے ہیں کہ جو شخص علم سے ریاست کا طالب ہوا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے قریب کرنا پسند نہیں فرماتے۔ کیونکہ وہ زمین و آسمان میں مبغوض ہے۔ اور بنی اسرائیل کی حکایات میں مروی ہے کہ حکیم نے حکمت میں تین سو ساٹھ کتابیں تصنیف کیں۔ یہاں تک کہ وہ دانا شخص مشہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی پر وحی بھیجی کہ اس حکیم نے زمین کو نفاق سے بھر دیا۔ اور اس میں کسی چیز سے اس نے میری قربت کی نیت نہیں کی۔ اور میں اس کے نفاق سے کچھ قبول نہیں کرتا۔ جب اس دانا شخص کو اس کی خبر ہوئی تو وہ سخت شرمندہ ہوا۔ اور اسے چھوڑ کر عوام میں شامل ہو گیا۔ بازاروں میں گھوما اور بنی اسرائیل کے ساتھ کھانا پینا شروع کیا اور عاجزی اختیار کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی پر وحی فرمائی۔ کہ اس سے کہہ دو کہ اب تجھے میری رضامندی کی توفیق حاصل ہوئی۔

علمائے دین اور پولیس کا سپاہی

اور امام اوزاعیؒ بلال بن سعدؓ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی پولیس کا سپاہی دیکھتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے۔ لیکن علمائے دنیا کی طرف دیکھتا ہے جو لوگوں کے سامنے،

تصنع اور بناوٹ سے کام لیتا ہے، اور سرکاری عہدوں کے حصول کے شوقین ہیں تو ان کو برا نہیں سمجھتا۔ حالانکہ وہ اس سپاہی کی نسبت زیادہ قابلِ نفرت ہیں۔ اور مروی ہے کہ کسی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل عمل کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا۔ حرام چیزوں سے اجتناب کرنا اور ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی یاد میں رطب اللسان رہنا۔ پھر کسی نے پوچھا۔ کون سے ساتھی اچھے ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ساتھی کہ جب تک اللہ تعالےٰ کا ذکر کرو تو وہ تمہاری مدد کرے۔ اور اگر تم یادِ الٰہی سے غافل ہو تو وہ تمہیں یاد دلائے۔ پھر پوچھا گیا کہ کون سے ساتھی بُرے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم یادِ الٰہی سے غافل ہو جاؤ تو وہ تمہیں یاد نہ دلائے، اور اگر تم یادِ الٰہی میں مشغول ہو تو وہ تمہاری مدد نہ کرے۔ پھر آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ جو سب سے زیادہ اللہ تعالےٰ سے خوف رکھتا ہو۔ عرض کیا گیا کہ ہم سے جو بہتر لوگ ہوں ان کے متعلق ہمیں ارشاد فرماویں تاکہ ہم ان کی مجلسوں میں بیٹھا کریں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان پر نظر پڑے تو اللہ تعالےٰ کی یاد آوے۔

مفسد علماء شرالناس ہیں

پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب لوگوں میں سے بُرے انسان کون سے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ اے اللہ میں آپ کی بخشش چاہتا ہوں۔ صحابہؓ نے اصرار کیا کہ ہمیں ان کی بابت ضرور مطلع فرماویں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ علمائے دین ہیں کہ جب وہ مفسد بن جائیں تو تمام لوگوں سے بُرے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن سب لوگوں سے زیادہ مامون وہ شخص ہوگا جو دنیا میں زیادہ فکر کرتا تھا۔ اور آخرت میں سب سے زیادہ وہ ہنسے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ رویا ہوگا۔ اور سب سے زیادہ خوش وہ ہوگا جو دنیا میں لمبا عرصہ غمگین رہا ہوگا۔

دنیادار عالم کس طرح مفتی بنتا ہے

حضرت علیؓ نے اپنے ایک خطبہ میں یہ اعلان فرمایا کہ میرا ذمہ ہے اور میں اس کا ضامن ہوں کہ جس قوم میں تقویٰ ہے اس کی زراعت تباہ نہ ہوگی۔ اور ہدایت کے ہوتے ہوئے ان کی جڑ کے خشک ہونے کا خطرہ نہیں اور لوگوں میں جاہل تر وہ شخص ہے جسے خوفِ خدا کی قدر نہ ہو۔ اور اللہ تعالےٰ کے نزدیک سب سے بُری وہ مخلوق ہے جو ہر جگہ سے علم جمع کر کے فتنہ کی تاریکیوں میں اپنا مقام تلاش کرے۔ ایسے ویسے ذلیل لوگ اسی بُری مخلوق کا نام عالم دین رکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ علم میں ایک دن بھی سلامتی سے نہ رہا۔ صبح اٹھتے ہی وہ چیز (یعنی دنیاوی ساز و سامان) بڑی مقدار میں حاصل کرتا ہے کہ جس کی صرف تھوڑی مقدار ہی لینا اچھا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ سڑے پانی سے سیراب ہو جاتا ہے اور اکثر بے فائدہ باتیں کرتا ہے تو لوگوں کے واسطے مفتی بن بیٹھتا ہے۔ تاکہ لوگوں کو جن امور میں شبہ ہے انہیں خلاصی کی راہ بتائے۔ اور جب اس کے سامنے کوئی اہم مسئلہ پیش ہوتا

ہے۔ تو اس کے لئے اپنی رائے سے ایک نو قیاس بنا لیتا ہے۔ تو وہ شخص شبہات کو کاٹنے میں مکڑی کے جالے کی مانند ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ ٹھیک فیصلہ کیا یا غلط۔ وہ بہت سی جہالتوں کا مرتکب اور بے سمجھے بوجھے اٹکلیں دوڑاتا ہے جس مسئلے سے لاعلم ہے اس کے بارے اپنی لاعلمی کا عذر نہیں کرتا کہ بچ جائے اور نہ ہی علم کو دانتوں سے مضبوطی سے پکڑتا ہے کہ غنیمت حاصل کرے۔ خونِ ناحق اس کے ہاتھوں ہوتے ہیں اور اس کے فتووں سے زناکاری حلال ہو جاتی ہے۔ جو مسئلہ بھی اسے درپیش ہو اسے اسکے جواب کی قدرت حاصل نہیں اور وہ کسی معاملے کے سونپے جانے کے قابل نہیں۔ ایسے ہی مفتی سخت عذاب کے مستحق ہیں اور ساری عمر رونے کے لائق۔

یہ بھی حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جب تم علم کو سنو تو خاموش ہو جاؤ اور اسے فضول باتوں کے ساتھ شامل نہ کرو۔ ورنہ دل میں اس کی تاثیر نہ ہوگی۔ اور بعض سلف صالحین کا قول ہے کہ عالمِ دین جب ایک دفعہ ہنستا ہے تو اس کے منہ سے علم کا ایک حصہ خارج ہو جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اگر استاذ میں تین باتیں ہوں، تو ان کے سبب سے شاگرد پر پوری نعمت ہوگی۔ اول صبر، دوم تواضع اور سوم خوش خلقی۔ اور جب شاگرد میں تین صفات ہوں تو استاذ پر نعمت کامل ہوتی ہے۔ ایک عقل، دوسرے ادب۔ تیسرے حسنِ فہم۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید میں جن اخلاقِ فاضلہ کا ذکر ہے علمائے حق میں وہ پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ قرآنِ مجید کو صرف پڑھنے پڑھانے کے لئے نہیں سیکھتے۔ بلکہ اس پر عمل کرتے ہیں۔

علمی تکبر حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے ساری عمر اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ صحابہ کرامؓ کو قرآن مجید سے پہلے ایمان کی نعمت ملتی تھی۔ اور جب سورۃ نازل ہوتی تھی تو ہم اس کے حلال و حرام اور اوامر و نواہی کو معلوم کر لیتے تھے اور جس مقام پر شک پڑتا تھا تو اسے معلوم کر لیتے تھے اور اب میں ایسے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ انہیں ایمان سے پہلے قرآن ملتا ہے۔ وہ سارا قرآن مجید پڑھ جاتے ہیں لیکن اس کے اوامر و نواہی کا علم حاصل نہیں کر پاتے۔ بلکہ وہ تو یہ تک بھی نہیں جانتے کہ اسے سمجھ کر پڑھنا چاہیئے۔ اور ایک اور روایت میں اسی مفہوم کا مضمون ہے کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید سے پیشتر ایمان نصیب ہوا تھا۔ اور عنقریب تمہارے بعد کچھ ایسے لوگ آویں گے کہ ان کو ایمان سے پہلے قرآن ملے گا کہ وہ اس کے الفاظ و حروف تو درست کریں گے اور اس کے حقوق اور حدود یعنی احکامات کو ضائع کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے قرآن مجید پڑھا ہے ہم سے زیادہ پڑھنے والا کون ہے۔ اور ہم نے اس کا علم حاصل کر لیا ہے۔ ہم سے زیادہ علم حاصل کرنے والا کون ہے۔ یہ ہے قرآن مجید میں ان کا حصہ۔ اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یہ امت کے برے لوگ ہیں۔

———— (باقی) ————

خورشید عالم

انقلابی عربوں کا عالمی کردار

اکتوبر ۱۹۶۹ء کے "طلوعِ اسلام" میں عربوں کے عالمی کردار کا ایک حد تک جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اس میں بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح عربوں کو غلط رنگ میں پیش کیا جاتا رہا، اور پیش کیا جا رہا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ یہ کچھ عربوں ہی کا مقدر نہیں بلکہ انسان کے معاشرتی ارتقاء میں ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں داعیانِ انقلاب اُبھرے انہیں طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرنے اور ان کی دعوتِ انقلاب کو ناکام بنانے کی سعی لاحاصل کی جاتی رہی۔ انسان کا مسئلہ شروع سے یہی رہا ہے کہ طرزِ معاشرت میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن سے افرادِ معاشرہ کی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اور افراد یا مجموعۂ افراد کی فلاح و بہبود کے مقابلے میں اجتماعی بہبود کو فروغ حاصل ہو۔ قرآن نے اس کشمکش کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ہر پیغمبر کے ضمن میں قرآن نے بتایا ہے کہ دو گروہ اس کی دعوتِ انقلاب کے شدید مخالف رہے ہیں۔ ایک گروہ سردارانِ قوم کا ہوتا تھا اور دوسرا مذہبی پیشواؤں کا۔ دونوں کے مفاداتِ خصوصی کا تقاضا یہی ہوتا تھا کہ جو ہوتا چلا آ رہا ہے، وہی ہوتا چلا جائے تاکہ ان کی اجارہ داریاں قائم رہیں اور زیردست، ان کے ہم پلّہ ہو جانا تو بڑی بات ہے، ان کے ہم پلّہ ہونے کا سوچ بھی نہ سکیں۔ سردارانِ قوم اور پیشوایانِ مذہب نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور انقلاب کو روکنے کے لئے اپنی تمام تر قوت صرف کی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ داعیانِ انقلاب کو غلط رنگ میں پیش کر کے دکھایا ہے تاکہ جن مظلومین معاشرہ کی سربلندی کے وہ داعی ہیں وہ انہیں اپنا بدخواہ سمجھ کر ان کی دعوت پر لبیک نہ کہہ سکیں۔

عربوں کے خلاف یہی کچھ ہوا اور ہو رہا ہے ۔۔۔ اور عالمی سطح پر، چونکہ معاشرتی قوتیں محدود نہیں رہیں، عالمگیر ہو گئی ہیں، اس لئے سردارانِ قوم اور پیشوایانِ مذہب بھی عالمی سطح پر مخالفت اور تلبیسِ حق و باطل میں لگے ہوتے ہیں۔ اب سردارانِ قوم سردارانِ عرب بھی ہیں اور سردارانِ استعمار بھی۔ لہٰذا، پیشوایانِ مذہب دونوں کے دست نگر، آلۂ کار اور نقیب ہیں۔ وہ کبھی کبھی مقدس جھوٹ بول کر سردارانِ قوم کی حرف گیری بھی کر دیتے ہیں تاکہ عوام الناس کو اس دھوکے میں مبتلا کر رکھ سکیں

وہ جو کچھ کر رہے ہیں فی سبیل اللہ کر رہے ہیں لیکن وہ بالعموم کرتے یہ ہیں کہ اپنے سرداروں کے تمام تر کارہائے سیاہ کو قوم کے نامۂ اعمال میں ڈال دیں اور ان کی روسیاہی کا سامان بہم پہنچائیں۔ موجودہ صدی میں عربی سیاست کو دیکھا جائے تو وہ چند سرداروں کی سیاست دکھائی دے گی اور بس۔ یہ سردار استعمار کے آلۂ کار تھے اور اپنی مطلب برآری کے لئے عربوں کو استعمال کرتے تھے۔ عرب استعمار کے غلام بھی تھے۔ استعماری قوتوں نے انہیں حق خود ارادیت دلا کے ان کی آزاد سلطنتیں بھی قائم کیں۔ لیکن عربوں کا بھلا نہ بندگی میں ہوا نہ آزادی میں۔ بپ برسوں نے بہت رنگ بدلے لیکن عرب دنیا جہاں تھی وہیں رہی۔ چنانچہ عربوں کا کردار سرداران عرب کا کردار سمجھا اور سمجھایا جانے لگا۔ استحصال ہونے کی بنا پر سردار ہمیشہ معاشرے کا غیر صالح طبقہ رہے ہیں لیکن انہوں نے ہمیشہ معاشرتی اقتدار کو اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کیا ہے اور اپنے مفاد کو معاشرے کا مفاد جتایا ہے۔ عالمی استعمار کے دور میں ان کا کردار اور گھناؤنا ہو گیا ہے۔ اب وہ کچھ بھی کہیں وہ استعمار کے کارندے ہیں اور ان سے وفاداری استعمار سے وفاداری کے مترادف ہے۔ ان سرداروں کی کوشش یہی رہی اور اب تک ہے کہ ان کے سنگھاسن نہ ڈولیں۔ اور یہ ایسا بالادست طبقہ بنے رہیں جنہیں زیردست اپنے مفاد کا محافظ سمجھیں۔

ایک عرصہ استعمار کے ان شوردوں کو عوام اپنے برہمن سمجھتے رہے۔ وہ اس دھوکے میں مبتلا تھے کہ ۱۹۴۸ء کی قیامت آگئی اور استعماری سازش سے فلسطین کا ایک حصہ اسرائیل بن گیا۔ اس نے عالم عرب کو ہی نہیں عالم اسلامی کو بھی ہلا کے رکھ دیا۔ مسلمانانِ عالم کے لئے یہ تاریخی ابتلا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اقبال نے ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرتے کرتے جس آفتاب تازہ کے پیدا ہونے کی نوید سنائی تھی وہ ابھرتے ابھرتے ڈوب گیا ہے اور اب مسلمان کی رات سحر تو کیا ہوگی وہ مہتاب تک سے محروم رہے گی۔ یہ نتیجہ تھا سردارانِ عرب کے کردار کا۔ ان کے کردار کا یہ پہلو نہایت شرمناک اور اذیت بخش ہے کہ انہوں نے اسرائیل کا راستہ روکنے کے لئے محاذ کھولا تو گو وہ بظاہر اس دشمن کے خلاف لڑ رہے تھے لیکن دراصل وہ آپس ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے تاکہ ایک تو استعمار کی سازش ناکام نہ ہو جائے اور دوسرے اس کی میزان میں ان کی قیمت بڑھ جائے۔ اس سے عربوں اور عام مسلمانوں میں افسردگی اور شکست کے احساسات کا ہمہ گیر ہونا قابلِ فہم تھا۔ ان احساسات کو مذہبی پیشواؤں نے خوب خوب ابھارا۔ وہ ناصح مشفق و مقدس بن کر آئے اور ثابت کر دکھانے لگے کہ یہ نہ استعمار کی کارستانی ہے اور نہ استعمار کے نمک خوار سرداروں کی بلکہ یہ سزا ہے ان اعمالِ بد کی جن کے عرب مرتکب چلے آ رہے ہیں۔ یوں عیاری سے نمک خوارانِ استعمار اور اپنے مربیوں کے اعمالِ بد کی ذمہ داری عام عربوں پر ڈال دی گئی اور عربوں اور مسلمانانِ عالم کے دلوں میں یہ بات بٹھائی جانے لگی کہ قصور ان کا ہے کسی اور کا نہیں اور انہیں جو سزا دی گئی ہے وہ اس کے مستحق ہیں۔

قفس میں وعظ کے یہ مرجھائے ہوئے پھول رکھ کر پیشوایانِ مذہب سمجھتے تھے کہ وہ اپنے مربی سرداروں کے

پشت پناہ استعمار کو بری الذمہ قرار دینے میں کامیاب ہوجائیں گے اور اپنی مقدس قیادت کے زور سے عربوں کو استعمار کی اسیری گوارا کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ بظاہر ایسے ہی ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ۱۹۵۶ء کی اسرائیلی جارحیت نے اسے اور تقویت دی۔ جون ۱۹۶۷ء میں تو یقین سا کر لیا گیا کہ طوفانِ اسرائیل میں عربی سفینہ ڈوب ہی گیا ہے۔ یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ ایک لہر اٹھی اور وہ عربوں کے لئے سفینہ بن گئی۔ عربوں کی شکست کا چرچا کرنے والوں غیروں اور اپنوں کے سامنے یہ حقیقتِ منتظر کوئی بیس سال کے بعد لباسِ مجاز میں آئی جسے اقبالؒ نے اپنے انداز سے یوں پیش کیا ہے۔

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفاں
کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتادست

یہ موجِ بے باک جو عربوں کے لئے سفینہ بن گئی اور جس نے عربوں کے کردار کو دھو کے پاک کرنے کے سامان پیدا کر دیئے مجاہدینِ فلسطین تھے جو ۱۹۴۸ء میں لاکھوں کی تعداد میں بے گھر ہوئے۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا۔ انہیں نہ گھر میسر آسکا نہ وطن۔ مہاجر کیمپ ان کی ساری دنیا تھی۔ ان کیمپوں میں جوان بوڑھے ہوئے اور بوڑھے سسک کر مرے۔ بے سروسامانی میں نئی نسل ابھری۔ ۱۹۴۸ء اور اس سے کچھ پہلے اور بعد میں پیدا ہونے والے جوان ہوئے تو وہ بجلی کا کڑکا بن گئے۔ اس کڑکے سے استعمار، اس کا اڈہ اسرائیل اور اس کے نمک خوار سردارانِ عرب اور پیشوایانِ مذہب لرز اٹھے ہیں۔

اب عربوں کا کردار ان فدائیانِ مجاہدین کا کردار ہے اور یہ کردار ان تک ہی محدود نہیں رہا عام عربوں میں بھی سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اس کردار کو صحیح پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پس منظر کم وبیش یہ ہے۔

صیہونیت سامراج کا خود کاشتہ پودا بھی ہے اور سامراج ہی اس کی آبیاری بھی کرتا چلا آیا ہے۔ یہ تفصیل ان صفحات میں آچکی ہے کہ کس طرح امریکہ نے اقوامِ متحدہ کی وساطت سے بھی اور اس کے بغیر بھی پہلے فلسطین کو تقسیم کرا کے اسرائیل کا قیام ممکن بنایا پھر اس کی حدود میں توسیع کے سامان مہیا کئے۔ تا آنکہ آج اسرائیل دریائے اردن کے مغربی حصے، شام کے جنوبی حصے اور پورے سینائی کے علاقے پر قابض ہو گیا ہے اور اردن، شام، لبنان اور متحدہ جمہوریہ عربیہ کے اندرونی علاقوں پر اس کے حملے روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ یہ سنگین صورتِ حال ہے۔ وسیع عرب علاقوں کا اسرائیل کے قبضے میں آجانا اور وسیع تر عرب علاقوں کا اسرائیل ایسے دشمن کے حملوں کی زد میں آنا بجائے خود سنگین ہے لیکن یہ صورت کہیں زیادہ سنگین اس لئے ہے کہ یہ اسی طرح رہ نہیں سکتی۔ یہ تعطل ایک خوفناک دھماکے سے ٹوٹے گا۔ اس دھماکے کی زد میں عالمِ عرب تو ہو گا ہی، یہ دھماکہ عالمگیر بھی ہو سکتا ہے۔ امریکہ کی مضطربانہ اور مجنونانہ کوشش یہ ہے کہ یہ دھماکا نہ ہو۔ اس کا خیال ہے کہ دھماکا ٹلتا جائے تو سامراج اور صیہونیت تو غصب شدہ علاقوں کو اپنے تصرف میں رکھ کر اسکے تیل کے ذخائر سے متمتع ہوتے رہیں گے لیکن عرب ایسے پریشان حال رہیں گے کہ وہ اپنے وسائل کو مجتمع کرنے سے قاصر رہیں گے اور ان کے حریف نہیں ہو سکیں گے۔ عربوں کو پریشان حال بنائے رکھنے کے لئے عربوں کے خلاف یہ پراپیگنڈہ کرایا گیا اور اب تک کرایا

جا رہا ہے کہ انہوں نے نسل پرستی اختیار کرلی ہے۔ وہ بے حیائی اور بد اخلاقی میں لگ گئے ہیں۔ وہ اپنے معاشرتی مصائب
کا حل سوشلزم میں دیکھنے لگے ہیں لہذا وہ اسلام سے وابستہ نہیں رہے اور کفر کے دائرے میں شریک ہو گئے ہیں۔ یہ چرچا
اس لئے کیا جا رہا ہے کہ قیادت کا جو دھارا پھوٹ بہا ہے وہ خشک ہو جائے اور سیاسی اور مذہبی اجارہ داریاں استعمار
کے سائے میں پھیلتی اور بڑھتی رہیں۔ ایسی دلیلیں دینے میں وہ نام نہاد اسلامی حلقے پیش پیش ہیں جو فلسطین اور بیت المقدس
کے مسئلے کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس کے حل کے لئے مسلمان ممالک کی مشترکہ (مگر کاغذی) کارروائی پر زور
دیتے نہیں تھکتے۔ اگر یہ سامراجی دلیل تسلیم کرلی جائے تو صیہونی جارحیت کے شکار عرب ممالک مسلمانانِ عالم کی ہمدردی
اور حمایت کے مستحق نہیں رہتے۔ ظاہر ہے کہ مقابلہ یہود (اہل کتاب) اور عرب (کفار) میں ہو تو ہمدردی اہل کتاب سے
ہوگی نہ کہ کفار سے۔ فلسطین کو اسلامی مسئلہ قرار دینا، عربوں کو کافر ٹھہرانا اور مسلمان ممالک کو مسجد اقصیٰ کی بازیابی کے لئے
ایک مرکز پر لانے کی خواہش کرنا ایسے تضادات ہیں جو سامراجی منطق میں ہی روا رکھے جا سکتے ہیں۔ ضمنی طور پر حالیہ جدہ کانفرنس
کی قلعی کھولنے کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ ایسے ملک میں منعقد ہوئی جس کا کردار بین العربی اور بین الاقوامی میدانوں میں
قابل رشک نہیں اور جو سیکرٹریٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس کا سیکرٹری جنرل اس ملیشیا کا نمائندہ ہوگا جس
نے جنگِ ستمبر کے معرکہ حق و باطل اور مسئلہ موت وحیات میں بڑی ڈھٹائی سے پاکستان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور
الٹا اس نے پاکستان کے قیام تک کو محل نظر ٹھہرایا تھا۔

ایک طرف تو امریکہ یوں عربوں کی تضحیک اور تکفیر کے سامان کر رہا ہے اور دوسری طرف وہ سرتوڑ کوشش کر رہا
ہے کہ نہ تو اسرائیل مقبوضہ عرب علاقے خالی کرے اور نہ وہ جنگی نقطہ نگاہ سے اتنا کمزور ہو جائے کہ مقبوضہ عرب علاقوں
کو اپنے تسلط میں رکھنے کے قابل نہ رہے۔ اسرائیل امریکہ ہی کی چھاؤنی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ وہ بساطِ استعمار کا ایک
مہرہ ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ وہ جو کچھ ہے امریکہ کے دم سے ہے۔ رقبے کے لحاظ سے اسے چھوٹا امریکہ کہا جا سکتا ہے
اور عزائم کے لحاظ سے پورا امریکہ۔ اسرائیل امریکہ ہی کی کمان کا تیر ہے۔ فوجی، معاشی اور مالی طور پر اسرائیل کا تنور شکم
خوب خوب بھرا جاتا رہا اور بھرا جا رہا ہے۔ گو ان دنوں امریکہ یہ تاثر دینے کی سعی بیہودہ کر رہا ہے کہ وہ اسرائیل کو فوجی
امداد نہیں دے رہا ہے یا اس میں احتیاط سے کام لے رہا ہے تاہم وہ اسے اعلانیہ مالی امداد دے رہا ہے۔ امریکہ کے
افسانوی طور پر امیر یہودی دل کھول کر علیحدہ امداد دے رہے ہیں۔ امریکہ کی شہ نہ ہو تو یہ سوتے آج خشک ہو جائیں،
اور اسرائیل اپنی موت آپ مرجائے۔ یہ تو اسرائیل کو اپنے بلکہ امریکی پاؤں پر کھڑا کرنے کی ایک صورت ہے۔ سفارتی
طور پر امریکہ بڑی جانفشانی سے اسرائیل کی پشت پناہی کرتا چلا آرہا ہے۔ اسرائیل نے جس دیدہ دلیری سے عرب
علاقے ہتھیائے تھے اس کا تقاضا تھا کہ فوری طور پر اسے روک کر پسپا ہونے پر مجبور کیا جاتا۔ امریکہ نے ایسا نہیں
ہونے دیا اور فوری اور مؤثر کارروائی نہیں ہونے دی۔ اس نے ابتداء ہی سے یہ موقف اختیار کیا کہ عربوں اور اسرائیل کو

باہمی مذاکرات سے تصفیہ کرنا چاہیئے۔ اپنی امن پسندی اور معقول روش کا رعب جمانے کے لئے اس نے اقوام متحدہ میں یہ قرارداد منظور ہو جانے دی کہ اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کر دے لیکن وہ اس ادھیڑ بن میں رہا اور ہے کہ عرب، اسرائیل سے براہِ راست بات کریں۔ وہ یوں ایک تو اسرائیل کو عربوں سے تسلیم کرانا چاہتا ہے دوسرے وہی ڈھونگ رچانا چاہتا ہے جو کشمیر میں رچایا گیا۔ یہ ناجائز طور پر تقسیم کیا ہوا علاقہ اکیس سال سے امریکہ (اور اقوام متحدہ) کی امن پسندی اور امن خواہی کا ماتم کر رہا ہے۔ امریکہ ایک حد تک یہی صورت عربوں کے لئے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حالات امریکہ کے بس میں نہیں اور یہ کامیابی اتنی وقیع ثابت نہیں ہو رہی جتنی امریکہ کو توقع تھی۔

یہ دیکھ کر کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومیں عربوں کی موید ہیں اور اسرائیلی انخلاء کے لئے مصر ہیں، امریکہ نے ایک اور ڈھونگ رچایا اور یہ تصفیہ چار بڑوں کے سپرد کر دیا۔ امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ جیسے بڑے نہ منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں اور نہ ان کا فیصلہ عربوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ فیصلہ کرنا ان بڑوں کا مقصود بھی نہیں۔ وہ اس بہانے اپنی اپنی مطلب براری کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی آنکھوں میں یہ دھول جھونکنے کے علاوہ کہ قضیئے کا پُرامن حل تلاش کیا جا رہا ہے امریکہ اس قضیئے کو چار سے کہیں زیادہ دو تک محدود کر لینا چاہتا ہے۔ وہ یہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ روس، عربوں کی حمایت میں اس حد تک آگے نہ نکل جائے کہ امریکہ سے براہِ راست تصادم تک نوبت پہنچ جائے۔ روس کے متعلق یہ اطمینان کر کے امریکہ دل جمعی سے اس قضیئے کو ٹال جا سکتا ہے۔ اس مہلت کا اسرائیل کو یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ وہ عربوں کو ڈرا دھمکا کر اور ان پر حملے کر کے انہیں براہِ راست مذاکرات پر مجبور کر دے۔ عرب اس فریب میں کیا آتے، وہ تو الٹا اور بے قابو ہونے جا رہے ہیں، البتہ روس کی طرف سے امریکہ کو خاصا اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ روس نے عربوں کا بہت دم بھرا لیکن اس کا بہت جلدی پتہ چل گیا کہ وہ ایک حد تک سے آگے جانے کے لئے تیار نہیں۔ روس کے رویّے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عربوں کو شکست سے بچانے کا کوئی خاص خواہشمند نہیں تھا۔ وہ انہیں صرف یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہے اور ان کی ممکن مدد کرے گا۔ وہ یوں عربوں کا اعتماد حاصل کر کے بحر روم اور عالمِ عرب میں اپنا وہ مقام حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے وہ زاروں کے زمانے سے خواب دیکھتا چلا آیا ہے۔ یہ کامیابی روس نے واقعی حاصل کی۔ اس کامیابی سے البتہ عربوں کا نہ بھلا ہو سکتا تھا نہ ہوا۔

فلسطین میں فلسطین سے جو کچھ کیا گیا اس پر نگاہ بازگشت ڈالی جائے تو یوں لگے گا جیسے ایک شطرنج کا کھیل کھیلا جاتا رہا۔ کھیلنے والے ہیں امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، اقوام متحدہ وغیرہ۔ عرب ممالک کے سربراہ یعنی شیوخ اور سلاطین میں سے بعض کبھی کبھی یہ کھیل کھیلنے لگ جاتے تھے ورنہ بالعموم وہ مہروں کا کام دیتے رہے ہیں اور کھلاڑیوں کے ہاتھوں آپس میں ہی ایک دوسرے ہی کو مات دینے میں لگے رہے۔ کسی نے نہیں دیکھا، نہ سوچا کہ بساط کس کے

سینے پر بھی ہے۔ اور گو اس کی مُشکیں کس کے اسے اس حد تک بے جان بنا دیا گیا ہے کہ اس سے بے پروا ہو کر کھیل کھیلا اور جاری رکھا جا رہا ہے لیکن اس تنِ بے جان میں جانِ رفتہ آ سکتی ہے اور جب آئے گی تو اس بساط کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گی۔ بساطِ فلسطین کے کھلاڑی بھول رہے تھے کہ انہی کی بساط ویٹ نام میں الٹی جا چکی ہے اور اس اہتمام سے کہ پھر سے ویٹ نام میں بچھائی جا سکے گی نہ اس ویٹ نامی زمین پر کہیں اور۔ فلسطین کے ایک حصے پر اسرائیلی غاصب کو برطانوی سامراج کی مدد اور امریکی سامراج کی تائید سے مسلط کیا گیا تو لاکھوں فلسطینی بے گھر ہو گئے۔ انسانوں کے اس سیلاب کو مہاجر کیمپوں میں مسدود کرنے کی عیارانہ اور ظالمانہ کوشش کی گئی۔ ان بے در و دیوار گھروں میں ان انسانوں کو سامراجیوں، سامراج کے گماشتوں اور قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ حالات کے اس بے رحم گرداب میں ان کا حوصلہ، ان کا عزم، ان کا احساسِ آبرو غرق ہو جانا چاہیئے تھا۔ یہ بے خانماں، مفلوک الحال، ـــ بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں، مرد، ڈوبے ـــ اور ڈوبتے ہی گئے۔ جب یقین ہونے لگا کہ غرقِ گرداب ہو چکے ہیں تو بھنور کی گرہ کھلتی دکھائی دی۔ گرہ کھلتی گئی کھلتی گئی ـــ تا آنکہ ایسی موجِ تند و جولاں ابھر آئی جس کی زد سے کسی نہنگ کا نشیمن محفوظ نہیں رہا۔ مہاجر کیمپوں میں حالات کے شکار مردہ ایک ایک دو دو کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "کیف تحی الموتیٰ" کی صداقتِ ازلی کے منکر گمان بھی نہ کر سکے کہ کیا قیامت برپا ہونے لگی ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک ایک دو اٹھنے والے فوج در فوج ہو گئے۔ عربوں کی سلطنتیں کانپنے لگیں۔ اسرائیل پاگل ہونے لگا۔ سامراج نے امن کی دہائی دی۔ مجاہدین کی مذمت کی جانے لگی۔ ان کے راستے روکے جانے لگے۔ ان کے کئے کی سزا لبنان، اردن اور مصر کو دی جانے لگی تاکہ یہ ممالک مجاہدین سے براہِ راست متصادم ہوں اور جو کھیل بگڑ چکا تھا اُسے پھر سے شروع کیا جا سکے۔

امریکہ نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اگر خود سر گوریلے باز نہ آئے تو اسرائیل کو لگام دینا مشکل ہو گا۔ اور جیسے اس نے جون ۱۹۶۷ء میں عربوں کو شکست دے کر ان کے وسیع علاقے ہتھیا لئے تھے، وہ پھر سے بھرپور حملہ کر کے مزید علاقے ہتھیانے پر مجبور ہو گا تاکہ مجاہدین کی جد و جہد کو ختم کیا جا سکے اور علاقے میں امن قائم کیا جا سکے۔ روس نے بھی عافیت اسی میں دیکھی کہ مجاہدین کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ ان کی بجائے حکومتوں کی مدد کی جائے اور انہیں در پردہ مجبور کیا جائے کہ مجاہدین کی حوصلہ شکنی کریں اور اقوامِ متحدہ کی نامنصفانہ اور عیارانہ "مصالحانہ" تجاویز کو قبول کر کے انہیں عملی جامہ پہنائیں۔ عرب حکمران بھی یہ کہنے لگے تھے کہ اگر اسرائیل جون ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ علاقے خالی کر دے تو اس کے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء کے جارحانہ غصب کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنے کی توفیق مجاہدین کو ہوئی ـــ اور مجاہدین ہی کو ہو سکتی تھی ـــ کہ اسرائیل سامراج کا اڈہ ہے، اسے ختم ہونا چاہیئے اور پورے فلسطین کو آزاد ہونا چاہیئے۔ یہ تھی تو درماندہ راہرو کی صدائے دردناک لیکن یہ آوازِ رحیلِ کارواں بن گئی۔ اس کی زد تنہا اسرائیل پر ہی نہیں تھی جس کا استیصال مقصود تھا۔ اس کی زد امریکہ پر بھی تھی جس کے سامراجی ہاتھوں نے اسرائیل کی کیل سینۂ عرب میں پیوست کر رکھی تھی۔ اس کی زد روس پر بھی

تھی جو عربوں کی دوستی کا دم بھر کے اور انہیں عسکری اور معاشی مدد دے کر زاروں کی حسرتِ دیرینہ کی تکمیل کرتے ہوئے عالمِ عرب میں اپنے استحکام میں منہمک تھا۔ اس کی زد ان عرب حکمرانوں پر بھی تھی جو فلسطین کے اڑتے ٹکڑوں سے اپنی حدودِ سلطنت میں اضافہ کر کے مگن ہو بیٹھے تھے کہ بڑی طاقتیں اقوامِ متحدہ کے ذریعے یا اس کے بغیر اسرائیل سے کبھی کچھ تصفیہ کرا ہی دیں گی۔

مجاہدین کے خروج سے مسئلہ فلسطین میں کچھ تبدیلی آئی اور اس کی عنان ان ہاتھوں میں آئی جو اس بھولے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانا بھی چاہتے ہیں اور لے جا بھی سکتے ہیں۔ پہلی بار فدایانِ فلسطین نے اپنے عمل سے یہ جتایا کہ وہ اپنے دشمن کو پہچان گئے ہیں اور دشمن ملک کے اندر ہو تو اور ملک کے باہر ہو تو دشمن ہے۔ سام حضرت نوحؑ کا بیٹا ہو کے بھی بیٹا نہیں رہتا۔ بوجہل و بولہب حسب نسب میں اپنے لیکن معاشرتی جدوجہد میں دشمن ہیں۔ مجاہدین کی جدوجہد کی زد اندر اور باہر دور دور تک پڑتی ہے۔ اسی لئے اس کے استخفاف کی کوشش اندر سے بھی ہوئی اور باہر سے بھی۔ اس جہاد کو سمجھا تو عوامی جمہوریہ چین نے سمجھا جس کے پاس اپنی دلولہ انگیز جدوجہد تو کی کی بھی میزان تھی اور ویت نام کی روح پرور جدوجہد قومی کی میزان بھی۔ ان دونوں میزانوں میں مجاہدینِ فلسطین کو پورا اترتے دیکھ کر چین کی انقلاب بدوش اور انقلاب پرور قیادت نے مجاہدین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور دوستی کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بے ملک کے مجاہدین کو اس نے اپنے ہاں لے جانے کا سلسلہ شروع کیا اور انہیں تربیت بھی دی اور مسلح بھی کیا۔ چین ان مجاہدین کو بدستور تربیت دیئے چلا جا رہا ہے اور مسلح کئے چلا جا رہا ہے۔ عرب اور غیر عرب مسلمان آج تک ان مجاہدین کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ان کی ضرورت کیا ہے؟ چھوٹے ہتھیار، کپڑے، خوراک، دوائیاں۔ یہ ایسی ضرورتیں ہیں جو مسلمانانِ عالم حکومتی اور غیر حکومتی ذرائع سے بطریقِ احسن پوری کر سکتے ہیں لیکن نہیں کر رہے۔ مسلمان ممالک زیادہ سے زیادہ بعض عرب حکومتوں کی مدد کو پہنچ سکے ہیں۔ سرکاری اور باقاعدہ فوجوں کو تربیت اور اسلحہ ہم پہنچانا نظریہ ظاہر کرنے کا کام ہے۔ لیکن یہ فوجیں دشمن سے کم اور آپس میں زیادہ لڑتی ہیں۔ اب یہ فوجیں (لبنان اور اردن میں مثلاً) مجاہدین سے بھی الجھنے لگی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے عناصر حکومت معیشت اور معاشرت میں پیش پیش ہیں جو اپنے عوام سے منہ موڑ کر ان بیرونی عناصر سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں جو نہ عربوں کے بہی خواہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ یہ فلسطین کے حادثے کی برکت ہے کہ قیادت عوام سے ابھرنے لگی ہے۔ یہ قیادت اتنی جری اور بے پناہ ہے کہ اسے کوئی طاقت ـــ کیا اندرونی کیا بیرونی ـــ دبا نہیں سکتی۔ یہ قیادت ابھری تو فلسطین سے ہے لیکن اس کا اثر تمام عالمِ عرب میں محسوس کیا جانے لگا ہے۔ کئی عرب ملکوں میں سیاست کے دھارے بدل چکے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس بے پناہ عوامی رَو سے ہم آہنگ کرنے لگے ہیں۔

یہ مجاہدین آنے والے کل کے عرب ہیں۔ مجاہدین سے مراد لڑنے والے گوریلے ہی نہیں عرب عوام بھی ہیں جو تیزی سے

منظم اور بغاوت آمادہ ہو رہے ہیں۔ گوریلا جنگ چند تربیت یافتہ اور کفن بردوش مجاہدوں کی کارروائی تو ہوتی ہے لیکن ان کی کامیابی کا دارومدار مقامی آبادی کے تعاون پر ہوتا ہے۔ مقامی آبادی گوریلوں کا ساتھ نہ دے تو وہ کبھی مؤثر کارروائی نہ کر سکیں۔ فلسطینی مجاہدین کی کارروائیوں کو دیکھ کر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام عرب آبادی ان کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دینے لگی ہے۔ اور یہ بڑی خوش آئند صورتِ حال ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ گزشتہ سال ۲۱ اگست کو مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی گئی تو ۲۲ اگست کو مقبوضہ فلسطین میں دس لاکھ فلسطینیوں نے کاروبار بند کر کے مکمل ہڑتال کی۔ حال ہی میں لبنان میں سرکاری فوج نے مجاہدین سے ٹکر لی تو عوام نے لبنان کی شمالی بندرگاہ طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ جب تک حکومت نے اپنا رویہ بدل کے مجاہدین سے مفاہمت نہیں کر لی یہ شہر خالی نہیں کیا گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مجاہدین کے حملے تعداد میں زیادہ اور نوعیت کے اعتبار سے شدید ہوتے جا رہے ہیں۔ دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر کرامہ کے مقام پر مارچ ۱۹۶۹ء میں مجاہدین نے پندرہ ہزار دشمن فوج کو شکست دی تھی۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں یعنی ایک مہینے میں مجاہدین کے حملوں کی تعداد ۲۰۸۲ بتائی گئی ہے اور یہ اندازاً پچھلے چھ ماہ کے حملوں کے برابر ہے۔ بعض حملوں میں مجاہدین کی جمعیت تنظیم میں بہتر اور تعداد میں دشمن سے زیادہ تھی اور انہوں نے خوب نقصان پہنچایا۔ مجاہدین کی قوت کا اب یہ عالم ہے کہ انہی دنوں "الفتح" کے سربراہ یاسر عرفات نے اعلان کیا ہے کہ اردن میں تیس ہزار مجاہدین ہیں اور اب اسرائیل کو اردن پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ اعلان اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جارحانہ کامیابی کے بعد یہ عام طور پر قیاس کیا جاتا تھا کہ اردن اسرائیل کے رحم و کرم پر ہے اور وہ کسی وقت بھی اس پر قابض ہو سکتا ہے۔

یہ بھی مجاہدین کی روزافزوں قوت اور ہمت کی دلیل ہے کہ یاسر عرفات نے حال ہی میں روس کا بھی دورہ کیا اور چین اور شمالی ویت نام کا بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدین کو ایک عالمی قوت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور اب یہ ویت نام کے حریت پسندوں کا سا مقام حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مجاہدین اس عالمی انقلابی تحریک سے متعلق ہو گئے ہیں جو ایشیا اور افریقہ اور لاطینی امریکہ میں قومی اور بین الاقوامی طور پر لڑی جا رہی ہے۔ اس قوت اور کامیابی کا نتیجہ ہے کہ متعدد گوریلا تنظیمیں ایک مرکزی قیادت کے تحت آ گئی ہیں۔ اب وہ نام نہاد تنظیمیں اپنی موت آپ مر جائیں گی جو دشمنانِ جہاد نے تحریکِ جہاد کو ناکام بنانے کے لئے کھڑی کر دی تھیں۔

اسرائیل، جس کا دماغ جون ۱۹۶۷ء کی حیران کن کامیابی سے ایسا خراب ہو گیا تھا کہ وہ عربوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور چلتے چلتے یوں بات کر جاتا تھا جیسے وہ چاہے تو عرب ممالک کو مکمل شکست دے کر اپنے قبضے میں لے لے، اب بدلے ہوئے لہجے میں بات کرتا ہے۔ وہ یہ کہنے پر آ گیا ہے کہ لڑائی لمبی اور تھکا دینے والی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے

بجٹ کا ایک تہائی جنگی تیاریوں پر صرف کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے وہ عرب عوام کے غیظ و غضب کا تو کیا مقابلہ کرے گا اس کی اپنی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ مالی عدم توازن کا شکار ہے اور اس کا اندرونی مالی اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔ یوں تو اسے مسلط بھی سامراج نے کیا اور برسراقتدار بھی سامراج ہی نے رکھا تاہم اب اس کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ سامراج کے زیادہ سے زیادہ سہارے کا محتاج ہے۔ یہ سہارا اسے ملے گا اور ملتا جائے گا لیکن یہ سہارا اسے بچا نہیں سکیگا۔ سامراج اور سامراج کا کارندہ 'اسرائیل' دونوں فلسطین میں بے نقاب ہو رہے ہیں اور دونوں عوام کے بے پناہ غضب کا نشانہ بنتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے انجامِ بد کو پہنچ کے رہیں گے۔

مجاہدینِ فلسطین نے اس صداقت کو پالیا ہے کہ بقول اقبالؒ ؎

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

زمانہ شیوخ و سلاطین کی نمود کو دیکھتا رہا اور عربوں کی شکست کے چرچے کرتا رہا۔ امتِ عربیہ میدانِ جنگ میں اتری ہی کب تھی! یہ امت اب میدان میں اترنے لگی ہے۔ اب اس امت کے کردار کا ایک عالم کو پتہ چلے گا اور یہ صداقت ابھر کر عربوں ہی کے سامنے نہیں استحصال کے شکار دنیا بھر کے انسانوں کے سامنے آئے گی کہ اصل قوت عوام ہیں۔ وہ بیدار، منظم اور سرگرم عمل ہو جائیں تو استعمار اور استحصال کی کوئی طاقت ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ دشمن ملک کے اندر ہو یا ملک کے باہر عوام کے ہاتھوں شکست کھا کے رہیگا۔ مجاہدینِ فلسطین اسی صداقتِ ازلی کو تازہ تر کر رہے ہیں اور استحصال اور استعمار کے شکار انسانوں کو یہ تابندہ سبق دے رہے ہیں کہ ؎

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

شیر آیا! ـــــ شیر آیا!!

بالآخر کب تک؟

پاکستان میں طلوع اسلام کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ یہ جنوری اور فروری کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں "محاسبۂ نفس" کے عنوان کے تابع ہم نے حکومت کی توجہ اس اہم معاملہ کی طرف منعطف کرائی کہ حکومت کی مشینری میں کچھ ایسے لوگ گھس آتے ہیں جو یہاں بد دلی پھیلاتے اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس پاکستان دشمن عنصر کا ازالہ فوری طور پر نہ کیا گیا تو آگے چل کر ان کا فتنہ ایسی شکل اختیار کر جائے گا جو نہ معلوم کس قدر تباہی کا موجب بن جائے۔

اسی ماہ قائداعظمؒ نے اپنی ڈھاکہ کی ایک تقریر میں فرمایا۔

> میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپئے تخریب ہیں۔ میں آپ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذب توجہ وعظوں سے فریب میں نہ آجائیں۔ (روزنامہ ڈان۔ کراچی۔ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۸ء)

اسی تاریخ کو کراچی میں وزیر خزانہ ملک غلام محمد (مرحوم) نے ایک پریس کانفرنس کے دوران کہا۔

> مجھے یقین ہے کہ ملازمین کا طبقہ دل کا کھرا ہے۔ لیکن ان پر ایک ایسا طبقہ اثر انداز ہو رہا ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کا دشمن اور بیرونِ پاکستان قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ حکومت کو بعض ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں کا علم ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ سرکاری ملازمین کو حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے لئے اکسائیں۔ ان میں سے بعض ہمارے معاشرتی نظام کے دشمن اور تشدد آمیز انقلاب کے حامی ہیں۔ ... ان میں

سے بعض کے متعلق ہمیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ وہ باہر سے ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ کوئی حکومت بھی ایسے عناصر کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمارے ملازمین حکومت کو محتاط رہنا چاہیئے۔ کہ وہ اس قسم کے لوگوں کے دامِ فریب کا شکار نہ ہو جائیں۔

(ڈان ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۹ء)

ازاں بعد وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے ۱۲ اپریل کو اپنے ایک بیان میں کہا۔

بعض سازشی گروہ (ففتھ کالم) ملازمینِ حکومت کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مقاصد براری میں استعمال کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے شومہ عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ملازمین کے دل میں کھوٹ نہیں۔ وہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمین میں انتشار اور سرکشی پیدا کر کے نظامِ حکومت کو مفلوج کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملازمینِ حکومت کی غالب اکثریت ان لوگوں کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ ہے۔ (روزنامہ ڈان ۔ ۱۳ اپریل)

ان بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے مئی ۱۹۴۹ء کے لمعات میں لکھا کہ

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اربابِ حکومت کی یہ تشخیص بالکل درست ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اپریل کی اشاعت میں بصراحت لکھا تھا، دشمنانِ پاکستان کی فتنہ انگیزیوں کا علاج فقط اس قدر نہیں کہ عوام یا ملازمین سے کہہ دیا جائے کہ ان کی چالوں میں نہ آئیں ...... اگر دشمنانِ ملک و ملت سرکاری ملازمین کو گمراہ کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی سازشوں کا جال کہیں زیادہ وسیع ہو گا۔ ہمیں خوشی ہے کہ حکومت اسقدر ہوشیار ہے کہ اسے ایسی دشمنِ پاکستان جماعتوں کا علم ہے۔ لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے مدافعت کی کیا صورت اختیار کی ہے۔

اس کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ حکومت نے اس فتنہ انگیز عنصر کے خلاف کیا کاروائی کی --- بات آگے بڑھ گئی، دفاتر میں (WHISPERING CAMPAIGN) شروع ہو گئی۔ اس دوران میں مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ حکومتِ پاکستان کی وفاداری کا حلف لیں۔ بعض سرکاری ملازمین نے جو جماعتِ اسلامی وابستہ تھے امیر جماعت سے استصواب کیا۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ یہ حلف اُس وقت تک ناجائز ہے جب تک نظام پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے۔ چنانچہ بعض سرکاری ملازموں نے اس مشورے کے مطابق حلف لینے سے انکار کر دیا اور اُن کے خلاف محکمانہ کاروائی ہوئی۔ مثلاً روزنامہ نوائے وقت کی ۲ ستمبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں یہ خبر

شائع ہوئی کہ

سول سیکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے حکومت پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظام حکومت شرعی ہو۔

معاملہ یہیں تک نہیں رکا۔ نوائے وقت بابت ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت کی مجلس شوریٰ کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ

موجودہ حکومت پاکستان غیر اسلامی ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔

خود امیر جماعت اسلامی نے بھی اس کی صراحت کی کہ

فوج میں تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے شمولیت کا مشورہ (ارکان جماعت کو) ہم صرف اُس صورت میں دے سکتے ہیں، جبکہ حکومت، ریاست اور فوج کے اسلامی ہونے کا دستوری اعلان کر کے، گو مگو کی موجودہ حالت کو ختم کر دے۔

اس سلسلے میں نوائے وقت نے اپنی ۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں ایک اداریہ شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا۔

جب تک انگریزوں کی حکومت تھی، تو مودودی صاحب کے ہمدرد، معاون، معتقد، سرکاری افسر اور اہل کار، انگریزی حکومت کی وفادارانہ خدمت کرتے رہے، اور مودودی صاحب نے انہیں نہ روکا۔ نمائشی پروپیگنڈا دوسری چیز ہے۔ لیکن کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون و سرپرست رہے اور مودودی صاحب کو اُن سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب تک انگریز کا راج تھا، اُس وقت مودودی صاحب نے نہ تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لئے فوج میں بھرتی حرام ہے، نہ یہ اعلان کیا کہ میرے معاونوں اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ لیکن پاکستان آکر انہوں نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا بنایا کہ پاکستان کے انتہائی مشکلات کے دور میں بھی قدم قدم پر اُن کا حکومت سے تصادم ناگزیر ہو گیا۔ حلف وفاداری کے مسئلے پر حکومت پنجاب سے ان کی چپقلش اسی بنا پر ہوئی اور فوجی بھرتی کا قضیہ بھی اسی وجہ سے پیش آیا۔

حکومت کیطرف سے اس کے بعد بھی کوئی محسوس اقدام سامنے نہ آیا لیکن عوام میں یہ خیال پھیلتا چلا گیا کہ جن پاکستان دشمن عناصر کی نشاندہی قائداعظمؒ، وزیرِ خزانہ اور وزیراعظم نے کی تھی، اگر وہ مختص طور پر جماعت اسلامی نہیں بھی، توکم از کم اس جماعت کا شمار ان عناصر میں ضرور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر لوگوں میں یہ خیال بھی عام ہوتا گیا کہ اس جماعت کے روابط کسی بیرونی طاقت سے ضرور ہیں۔ جب ۱۹۵۵ء میں مودودی صاحب نے کھلے بندوں امریکہ سے کہا کہ اگر وہ مسلمان ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ مسلمان حکمرانوں سے معاملہ کرے اُسے چاہیئے کہ مسلمان قوم کے ساتھ معاملہ کرے۔ (تسنیم بابت ۱۶، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)۔ اس سے یہ خیال اور تقویت پکڑ گیا کہ اس جماعت کا رابطہ امریکہ سے ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی مستند ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا۔

جب ۱۹۶۳ء میں مودودی صاحب کیخلاف مقدمہ چلایا گیا تو اُس سلسلے میں حکومتِ پاکستان کے وزیرِ امورِ داخلہ حبیب اللہ خان نے اعلانیہ کہا کہ حکومت کے پاس اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ جماعت اسلامی کو ایک پاکستان دشمن حکومت سے مالی امداد ملتی ہے۔ لیکن اس کے بعد نہ تو وہ ثبوت ہی پبلک کے سامنے آیا اور نہ ہی اُسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ ایسی ذمہ دار شخصیت کیطرف سے اس قسم کا صحیح اعلان اور اُس کے بعد ایسی بے طرح خاموشی سے ملک میں جو تاثر پیدا ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔

اب انتخابات کے سلسلے میں سیاسی پارٹیوں نے جو "مادر پدر آزاد" سرگرمیاں شروع کی ہیں، ان میں ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کے ضمن میں قریب قریب ہر پارٹی نے دوسری پارٹیوں کے متعلق کہا ہے کہ انہیں بیرونی طاقتوں سے امداد ملتی ہے۔ ان پارٹیوں کے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں اعلانیہ اس الزام کو دہراتے چلے آ رہے ہیں اور لوگ محوِ حیرت ہیں کہ اس قدر سنگین الزام کے باوجود حکومت نہ کوئی تحقیق کراتی ہے نہ کسی کا مواخذہ کراتی ہے۔

لیکن بات یہیں نہیں رکی، اس سے آگے بڑھی اور اُس مقام تک جا پہنچی جس سے آگے ملکی سیاست میں کوئی اور مقام ہی نہیں۔ یعنی خود صدرِ مملکت جنرل یحییٰ خان نے بھی فرما دیا کہ انہیں شبہ ہے کہ ملک کی بعض سیاسی پارٹیوں کو بیرونی طاقتوں سے امداد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر اے۔ بی۔ اعوان نے جو پہلے حکومتِ پاکستان کے انٹیلیجنس بیوریو کے ڈائریکٹر جنرل تھے اور اُس کے بعد وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری رہے، انہوں نے (اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد) یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ بات اُن کے علم میں ہے کہ ملک کی بعض سیاسی پارٹیوں کو بیرونی ملکوں سے امداد ملتی ہے۔ دوسری طرف (ریٹائرڈ) میجر جنرل امراؤ خان نے (جو حال ہی میں جماعت اسلامی کے حلقۂ متفقین سے وابستہ ہوئے ہیں) لائل پور کی ایک تقریر میں کہا ہے کہ انہیں خود شبہ ہے کہ بعض پارٹیوں کو بیرونی طاقتوں سے امداد ملتی ہے۔ اِدھر سے جماعت اسلامی کے سربراہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اس امر کی تحقیقات کی جائے کہ وہ کونسی جماعتیں

ہیں جنہیں بیرونی ممالک سے امداد ملتی ہے۔ دوسری طرف سے مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ "آٹھ برس تک مجھے بھی حکومت سے وابستہ رہنے کا موقع ملا ہے اور اگر حالات کے تقاضے کے تحت اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں بھی بیرونی سرمایہ پاکستان میں خفیہ طریقوں سے بھجوانے کے بارے میں، کئی سربستہ رازوں کا انکشاف کروں گا۔" (حوالوں کے لئے دیکھئے ہفتہ وار چٹان بابت یکم جون ۷۰ء، مشرق۔ لاہور بابت ۲ جون ۷۰ء، اور امروز لاہور بابت ۸ جون ۱۹۷۰ء)۔

ایوانِ حکومت سے لیکر موچی دروازہ کے میدان تک سے یہ آوازیں مختلف گوشوں سے بلند ہو رہی ہیں۔ عوام انہیں دانتوں میں انگلی دبائے سن رہے ہیں۔ بیرونی ممالک میں اس کے چرچے ہو رہے ہیں لیکن (ان سطور کی تسوید تک) حکومت کی طرف سے کسی قسم کا کوئی اعلان سامنے نہیں آیا کہ وہ اس باب میں کیا اقدامات کر رہی ہے۔ واضح رہے کہ ملک کے کسی فرد یا کسی پارٹی کے کسی بیرونی طاقت کے ساتھ خفیہ روابط اور مالی اعانت کوئی ایسا الزام نہیں کہ اسے یونہی ہنس کر ٹال دیا جائے۔ یہ ایسا سنگین الزام ہے جس سے بڑا الزام کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے ثابت ہونے کی صورت میں ایسا سنگین جرم جس سے زیادہ سنگین جرم تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ اب خود صدر مملکت کی طرف سے بھی یہ اعلان ہو رہا ہے کہ انہیں بھی شبہ ہے کہ بعض جماعتوں کو بیرونی طاقتوں سے مالی امداد مل رہی ہے۔ ہم حکومتِ پاکستان سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اس کے بعد وہ اس سلسلے میں ضروری تحقیقات اور اقدامات کے لئے کون سی چیز کی منتظر ہے۔

اور ہم ملک کے اُن لیڈروں سے پوچھنا چاہتے ہیں جو پاکستان کے اس قدر بہی خواہ بننے کے مدعی ہیں کہ کیا انہیں اسکا احساس نہیں کہ یہ الزامات کس قدر سنگین ہیں اور انہیں ان کی تحقیقات کے لئے حکومت سے متحدہ طور پر مطالبہ کرنا چاہیئے کہ اگر ملک فی الواقع اتنے غداروں سے پٹا پڑا ہے تو آپ کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں سے حاصل کیا ہے۔

اور ہم ملک کے عوام سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب آپ کے سامنے ایک لیڈر کھلے بندوں یہ کہتا ہے کہ اُسے معلوم ہے کہ کس پارٹی کو کس بیرونی طاقت سے مالی امداد مل رہی ہے، آپ اُس سے یہ مطالبہ کیوں نہیں کرتے کہ جب تک تم اپنے اس دعویٰ کو ثابت نہیں کرتے ہم تمہارا ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں۔

اور ہم ملک کے اخبارات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ جب اس قسم کے الزامات کو شہ سرخیوں کے ساتھ اور چوکھٹوں کے اندر شائع کرتے ہیں تو اُس کے بعد ان الزام لگانے والوں سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ جب تک آپ اس الزام کو ثابت نہیں کر دینگے، ہم آپ کے متعلق ایک لفظ بھی اپنے اخبار میں شائع نہیں کرینگے۔

آسمان کی آنکھ نے اس سے بڑھ کر حیرت افروز اور عبرت انگیز نظارہ شاید ہی کبھی دیکھا ہو کہ ایک ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہو کہ ملک میں ایسی غدار جماعتیں موجود ہیں جنکے روابط خارجی طاقتوں سے ہیں اور ان سے انہیں مالی امداد بھی ملتی ہے اور اسکے بعد اس قسم کے الزام لگانے والے بھی دندناتے پھریں اور جنکے خلاف الزام لگائے جائیں وہ بھی سینہ تانے معتبر کے معتبر بنے رہیں۔ نہ کوئی ان سے [illegible]

محترم عبدالحکیم خان۔ مردان

طلوعِ اسلام کا سبق

[پروانہ شمعِ قرآنی عبدالحکیم خان ادف مردان کی وفات حسرت آیات کی خبر فروری ۱۹۷۰ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکی ہے آج اتفاق سے گزشتہ کنونشنز کے خطابات کے مسوّدات کی ورق گردانی کرتے ہوئے خان صاحب مرحوم کی دو تقاریر کے مسودات ملے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ ہم ان نوادرات میں سے ایک تقریر اشاعتِ حاضرہ میں زینت دہ اوراق کرتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۶۶ء کی کنونشن کے لئے تحریر فرمائی تھی۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ موت کے ہاتھوں ہم کس قدر متاعِ گراں بہا سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم کی دوسری یادگار تقریر کسی دوسرے وقت پیشِ خدمت کی جائے گی۔ طلوعِ اسلام]

عزیز بھائیو! میرے اس مقالے کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے سامنے "طلوعِ اسلام" کی تعلیم کا کچھ وہ حصہ پیش کروں جو ہمارے روزمرہ کی زندگی میں اُس پر بحث اور گفتگو کے مواقع ملتے ہیں اس مقالے کے تین اجزاء ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اِس تعلیم کے پیش کرنے کا طریقہ۔

۲۔ سامعین کا اِس پر اعتراض ـــــ اور

۳۔ ہماری طرف سے اس کا جواب۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہر آدمی سے گفتگو کرتے وقت اُس کی علمی سطح کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے پہلی جماعت کے طالبِ علم سے "دو دونے چار" میں باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اور دسویں جماعت والے سے "اے سکوئر اِنٹو بی، سکوئر" میں پوچھنا پڑتا ہے۔ اس لئے گفتگو شروع کرنے سے قبل مخاطب کے علم کا اندازہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ مفید نتیجہ کبھی نہیں نکل سکے گا۔ بحث کا یہ پہلو عموماً ہمارے سامنے رہتا ہے اور اس کا نتیجہ اکثر تسلی بخش نکلتا ہے۔

مُردے کو تلاوت کا ثواب

ایک دفعہ ایک محفل میں مردے کو قرآن کریم کی تلاوت کا ثواب پہنچانے کا ذکر چھڑ گیا۔ اہل علم اوسط درجے کے تعلیم یافتہ تھے، میں نے کہا کہ قرآن کریم ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں زندہ لوگوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے قوانین درج ہیں اِس لئے یہ زندہ لوگوں کو سنانا چاہیئے اور پھر اس کا مطلب بھی سمجھانا چاہیئے تاکہ یہ

زندہ لوگ علم و عرفان کے خزانے سے کچھ حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو سنوارتے ہیں۔ یہی ثواب ہے۔ باقی رہا مردہ؛ تو اُس پر منوں مٹی پڑی ہوتی ہے اُس تک ہماری یہ خفیف آواز پہنچ ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے۔ وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ - (فاطر) یعنے تو ان کو جو قبروں میں ہیں نہیں سنا سکتا۔ اب اگر حضورؐ اپنی بات مُردوں تک نہیں پہنچا سکتے تو ہماری کیا حیثیت ہے۔ اِس پر کہا گیا کہ مردہ شاید دوسری باتیں نہ سن سکتا ہو لیکن قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے یہ تو ضرور سنا جا سکتا ہے عرض کیا گیا کہ حضورؐ بھی تو اللہ کا پیغام اور کلام ہی سنا رہے تھے۔ (بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ -)

(اور تھوڑی دیر کے لئے اگر فرض بھی کیا جائے کہ اُس نے قرآن کریم کے الفاظ سن بھی لئے تو کیا حاصل؟ زندگی میں اُسے معنے معلوم تھے نہ مطلب، اب سن کر کیا فائدہ اٹھائے گا۔ پھر اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ مرنے کے بعد مُردہ عربی دان بھی بن جاتا ہے اور قرآن دان بھی، تو اس فہم و دانش کا ماحصل کیا۔ حافظ اُسے سناتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ - اے مومنو! جب تم آپس میں ایک معین وقت تک کچھ لین دین کرنے لگو تو اس کو ضبطِ تحریر میں لایا کرو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مُردے کو جب یہ آیت سنائی جاتی ہے تو وہ اِس کے عمل پر مکلف ہے؟ آیا وہ وہاں قرض کا کچھ لین دین کر سکتا ہے، ضرورت پڑنے پر مکان یا زمین رہن رکھ کر کچھ رقم کسی سے حاصل کر سکتا ہے ___؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس آیت اور اس جیسی سینکڑوں دیگر آیات کے سنانے کا آخر مقصد کیا ہے؟

ایک صاحب بولے کہ خدا کا کلام اگر سنایا جائے تو کیا مُردے کو ثواب بھی نہیں پہنچتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک صحیح واقعہ بیان کرتا ہوں پھر آپ منصفانہ فیصلہ کریں۔

۱۹۱۹ء میں ایک بڑے خان فوت ہو گئے جس کی نیکیاں صفر کے برابر تھیں۔ اُس وقت سے لے کر اب تک (سنہ ۱۹۶۶ء) سینتالیس برس ہو چکے ہیں۔ دو حافظ اُس دن سے آج تک قبر کے سرہانے بیٹھے تلاوت میں مصروف ہیں اور بقول آپ کے مُردے کو باقاعدگی کے ساتھ ثواب پہنچا رہے ہیں۔ بخلاف اسکے اسی دن ایک دوسرا غریب آدمی بھی فوت ہو چکا ہے اس کی نیکیاں مثلاً ایک سو تھیں لیکن وارثوں کی ناداری اور تنگدستی کی وجہ سے خیر خیرات اور تلاوت کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ آپ کے نظریئے کے مطابق خان کے ثواب میں موت کے بعد تو روزانہ اضافہ ہو رہا ہے، لیکن غریب کا کھاتہ بند ہے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ خان کا ثواب جمع ہوتے ہوتے صفر سے بڑھ کر کئی سو .... تک پہنچ جائے گا اور اِس طرح اس بدکردار خان کو ایک نیک کردار غریب پر ثواب کے لحاظ سے کئی گنا فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ اب آپ بتائیے کہ

کیا یہ جائز اور عدل و انصاف ہے؟ قرآن کریم کا مُردوں کے بارے میں اٹل فیصلہ ہے۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ (۲/۱۳۴) یعنی مُردوں کو اُن کے عمل کے نتائج ملیں گے اور تم کو تمہارے عمل کے۔ خیر خیرات اور عمل کا نتیجہ عمل کرنے والے کو ملتا ہے، دوسرے کو نہیں۔ بیٹے کی ورزش سے باپ کی صحت اچھی نہیں ہو سکتی ہے۔ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ - اچھے عمل کا نتیجہ اچھا ملے گا، بُرے عمل کا بُرا ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

اُس وقت تو وہ خاموش ہو گئے اور اُس کے تاثرات مجھے معلوم نہ ہو سکے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کئی محفلوں میں وہ یہی دلائل دیتے رہے۔

فرشتے اور چوکیدار

میں پچھلی اگست اپنے ایک عزیز دوست اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے ایک نڈر سپاہی کی دعوت پر اسکے گاؤں گیا۔ انہی دنوں اُن کے ایک گاؤں کا ایک آدمی فوت ہو گیا۔ یہ جمعرات کا دن تھا۔ خیر خیرات کے لئے گھر والوں کو دو سَو روپے قرض لینے پڑے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہاں بلا سود کوئی قرض روپیہ نہیں دیا کرتا ہے اور قرض دینے والے بھی صرف دو طبقے ہیں گاؤں کا خان اور گاؤں کا مولوی۔ (پاکستان بننے سے قبل یہ کام ہندو کیا کرتے تھے) گاؤں میں سوائے ان دو لوگوں کے کسی دوسرے کے پاس پیسے ہوتے بھی نہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ خیر خیرات کی رسم اور جس گاؤں کے یہی خان اور مولوی آپس میں تقسیم کر کے ثواب مُردے کو بخش دیتے ہیں۔ وہ بھی خوش یہ بھی خوش — خیر اس قسم کی خُرد بُرد تو ایک جانی پہچانی مکر ہے جو بڑی مدت سے چلی آرہی ہے لیکن ایک انوکھی بات میں نے وہاں دوسری دیکھی۔ ایک آدمی کو اُسی دن (جمعرات) کو مولوی صاحب کے حکم سے قبر کے پاس بٹھا دیا گیا (وہاں کے مولویوں کا بیان کردہ مسئلہ ہے کہ جب قبر پر بطور چوکیدار آدمی بٹھایا جائے تو فرشتے یعنی منکر نکیر نہیں آسکتے ہیں) تاکہ سوال و جواب لینے کے لئے فرشتے آج نہ آسکیں۔ اور کل چونکہ جمعہ کا مبارک دن ہے جس میں حساب کتاب ہو ہی نہیں سکتا ہے (مولویوں کا یہ مسئلہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ جمعہ کے مرنے سے قیامت تک حساب کتاب نہیں لیا جاتا ہے) میرے دوست نے دوسرے دن مولوی صاحب سے پوچھا کہ جب فرشتے اس چوکیدار سے ڈر کر قبر میں نہیں گھس سکتے ہیں تو ملک الموت اتنے زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں مُردے کے پاس کیسے آسکا اور

اُس کی روح قبض کر لی، وہ بھی تو فرشتہ ہی ہے نا. مولوی صاحب نے حسب معمول کہا کہ تم لوگ ہر بات میں دین کا مذاق اُڑاتے ہو ـــــ بہت خوب!

؎ برعکس نام زنگی نہند کافور!

نسخۂ طلوعِ اسلام

مردان میں ایک ڈاکٹر صاحب پچھلے چند سالوں سے پریکٹس کر رہے ہیں. پریکٹس اچھی ہے، مذہب سے بھی انہیں کافی دلچسپی ہے. دو تین سال کی بات ہے میرا پروگرام اُن دنوں سے یہ رہا ہے کہ ہر ماہ ایک یا دو رسالے متفرق دوکانداروں کو دیا کرتا ہوں اور پھر چند دنوں کے بعد اُس کے تاثرات معلوم کیا کرتا ہوں. یہ طریقہ اچھا ہے اس کے کئی فائدے ہیں. مثلاً

۱. غور و فکر والے انسان ہمارے ہمنوا بن جاتے ہیں.

۲. ناواقف اس کے متعلق سوچنا شروع کر لیتے ہیں ـــ اور

۳. مخالفین پر ایک بار پھر ظاہر ہو جاتا ہے کہ "طلوعِ اسلام" زندہ ہے.

پروگرام کے مطابق میں اِس ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا، جان پہچان تو تھی ہی. مریضوں سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوئے. میں نے کہا کہ آپ روزانہ دوسروں کو نسخے دے رہے ہیں آج میں آپ کو ایک نسخہ دے رہا ہوں اور بغیر فیس کے میں نے "پرچہ" اُن کی طرف بڑھایا ـــ "طلوعِ اسلام" کا نام دیکھتے ہی ہاتھ واپس کھینچا اور کہنے لگے. "مجھے اس سے معاف رکھیں" ـــ میں نے بھی ہاتھ روک لیا اور سلام علیکم کہہ کر وہاں سے اُٹھ آیا ـــ اب تین سال کے بعد کوئی دو چار مہینے کی بات ہے کہ ایک نجی مجلس میں اُن سے ملاقات ہو گئی وہ چار پانچ ہم خیال دوست تھے. بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھنے لگے. "آپ ذرا پرویز صاحب کے خیالات پر روشنی ڈالیں وہ کیا کہا کرتے ہیں": . . . .

. . . . میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! میں نے تو تین سال قبل آپ کی خدمت میں "رسالہ" پیش کیا تھا. تاکہ پرویز صاحب کے خیالات سے آپ روشناس ہو جائیں. اُس وقت اگر آپ "طلوعِ اسلام" لیکر پڑھتے تو اب پوچھنے کی ضرورت نہ پڑتی. خیر اب بھی خدا کا شکر ہے کہ آپ کی توجہ اِس طرف ہو گئی ہے. میں نے کہا کہ پرویز صاحب کے خیالات ایک ایک مضمون پر اتنی وسعت سے پھیلے ہوئے ہیں کہ اُن کا احاطہ اِس تھوڑے سے وقت میں نہیں کیا جا سکتا ہے. ہاں اگر آپ کسی ایک خاص بات کی وضاحت چاہتے ہوں تو عرض کر دوں گا.

انہوں نے احادیث کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ مختصر الفاظ میں پرویز صاحب کا نظریہ یہ ہے۔ کہ حدیث غلط بھی ہو سکتی ہے صحیح بھی۔ اس کی کسوٹی قرآن کریم ہے۔ اگر یہ قرآنِ کریم کے خلاف نہ ہو تو پرویز صاحب اُسے بسر و چشم تسلیم کرتے ہیں وہ کہنے لگے کہ اس قسم کا تجزیہ گذشتہ تیرہ سو سال میں سوائے پرویز صاحب کے اور کسی کو نہیں سوجھا؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ تو اللہ کی دین ہے اگر اللہ نے یہ سعادت انہیں عطا کر دی ہے تو آپ خفا کیوں ہوتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ نہیں کہ یہ پرویز صاحب کو کیوں سوجھی کسی اور کو کیوں نہیں، بلکہ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ حدیث کے بارے میں پرویز صاحب کا یہ نظریہ غور طلب ہے یا نہیں۔ اور پھر یہ کلیہ کہاں تک مبنی برحقیقت ہے کہ اگر پہلے کسی بات کی تحقیق نہ کی گئی ہو، یا تحقیق کی ضرورت ہی نہ پڑی ہو تو بعد میں اُس کے متعلق سوچنا اور تحقیق کرنا ناقابلِ معافی جرم ہے؟ کیا آج سائنس کا خلائے اعظم کی فتح اور چاند ستاروں کی تسخیر کی کوشش اس لئے صحیح اور قابل قبول نہیں کہ یہ کام پہلے کیوں نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی یہ فرمائش کہ تیرہ سو سال میں پرویز صاحب جیسے کوئی ناقد کیوں پیدا نہیں ہوئے تو گذارش یہ ہے کہ کئی لائق پیدا ہوئے ہیں لیکن بنو اُمیّہ اور بنو عباسیہ اور دیگر ادوارِ ملوکیت و شاہنشاہیت میں قرآن مجبور رہا ہے۔

اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَہۡجُوۡرًا ۝ (فرقان ۳۰)

قرآن کریم کو مسلمان نے جکڑ کر باندھ رکھا ہے۔

یعنی: وہاں تو کوئی پیش کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی پیش کرتا بھی تو اُسے مانتا کون؟ اس سے تو ان کی ملوکیت ختم ہو رہی تھی۔

اس مختصر گفتگو کے بعد وہ جانے لگے البتہ انہوں نے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر لیا۔

اشتراکیت کا لیبل

آج کل سرکاری دفتروں، نیم سرکاری اداروں، عدالتوں، ہسپتالوں غرضیکہ کوئی ادارہ ایسا نہیں جس میں رشوت خوری کی گرم بازاری نہ ہو۔ یہ ہر حساس دل کو متأثر کئے بغیر نہیں رہتی ہے۔ کئی لوگوں کے ناجائز کام رشوت کے طفیل پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں اور کئی جائز کام رشوت نہ ملنے کی وجہ سے سالوں تک معلق رہتے ہیں۔ قرآن کریم کا حکم ہے۔ وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ۔ (بقرہ ۱۸۸) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے نہ کھاؤ۔ وَ تُدۡلُوۡا بِہَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ۔ اور نہ اس کے ذریعے حاکموں تک پہنچو۔ لیکن قرآن کریم کو ماننے والے اور اس کو سینے سے لگانے والے اس کے یہ کھلے احکام

پاؤں تلے روندے ہیں اور ان کو اس کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ ایک وبائی صورت اختیار کرنے کی وجہ سے اکثر سنجیدہ محفلوں میں زیرِ بحث آتا ہے۔ اس کے سبب اور علاج پر باتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی اس میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ملازم کی تنخواہ کی کمی اس کی وجہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ معیارِ زندگی کی بلندی اور وسائل کی محدودیت اس کا سبب ہے، کوئی کہتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی کثرت اور آمدنی کی قلت اس کی علت ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس ـــ لیکن ہم کہتے ہیں کہ بڑی بڑی تنخواہوں اور بڑے بڑے وسائل والے بھی اس لین دین میں کسی سے پیچھے نہیں، اس لئے یہ جواب تسلی بخش نہیں ہوسکتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ جاگیردارانہ نظام ختم ہوجائے۔ ذاتی ملکیت کے عزائم دفن ہوجائیں اور انفرادی مفاد پرستیاں کالعدم ہوجائیں۔ اور آج اسی وقت رشوت کا جنازہ اٹھ جائے گا ـــ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ رشوت کی رقم سے ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کی جارہی ہوتی ہیں ـــ بلکہ زمین خریدنی، بڑے بڑے بلڈنگ کھڑے کرکے ان پر ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لکھنے اور چھوٹے موٹے کارخانے چلانے پر صرف ہوتی ہے۔ جب ذاتی مفاد کی کشش ہی قطع کی جائے تو رشوت لے کوئی کس لئے ـــ جواب میں فوراً کہا جاتا ہے کہ یہ تو اشتراکیت کا نظام ہے۔ ہماری طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہے قرآنی نظام، لیکن قرآن کے ماننے والوں نے جب سے قرآن سے ثواب کا کام لینا شروع کیا ہے، تو اسے بھلا دیا ہے۔ اب ان کی لاعلمی کی یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ اپنے اعلیٰ اور ارفع قرآنی نظام کو دوسروں کو منسوب کر رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو وہی بات ہوئی کہ مثلاً اشتراکی نظام میں جھوٹ بولنا منع ہے لیکن ہمارے مسلمان بھائی عام طور سے جھوٹ بولا کرتے ہیں، اور نیک مقصد کے لئے جھوٹ بولنا تو بقولِ مودودی صاحب واجب ہوجاتا ہے۔ اب اگر ہم جھوٹ کو قانوناً منع کریں تو کیا اسے اشتراکی قانون کہا جائے گا۔

ایسی بحث کا نتیجہ عموماً تسلی بخش نکلا ہے۔

قربانی کا فریضہ

عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے متعلق عموماً بحث ہوتی ہے۔ یہ قربانی عام طور سے ہر آدمی خواہ اس کی استطاعت ہو یا نہ، اسے ایک ضروری فریضہ سمجھتا ہے۔ یہ گوشت اپنے ہی رشتہ داروں کے گھروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ میں بھی کئی سال تک اس رسم کا پابند رہا ہوں۔ میرے گھر سے رشتہ داروں کے گھر گوشت جاتا اور ان کے گھروں سے میرے گھر ـــ گوشت میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ بدلے کی

بات تھی۔ اب میں نے یہ رسم ختم کرلی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سوائے میرے ایک بھائی کے اور کسی کے گھر سے گوشت نہیں آتا ہے اور ہر جانب سے یہ اعتراض کئے جاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ اگر تم یہ تقسیم ناجائز سمجھتے ہو۔ تو اپنی قربانی کا سب گوشت فقیروں میں بانٹا کرو۔ دوسرا کہتا ہے تم صاحب نصاب ہو تم اس فریضے کو کیوں ادا نہیں کرتے۔ میں اُن کو کہتا ہوں کہ پہلے تو نصاب کی طرف آیئے۔ بقول آپ کے یہ ایک خاص رقم مثلاً پچاس روپے ہیں۔ اگر یہ کسی کے پاس فالتو ہوں اور اس پر ایک سال گذر جائے تو اس پر قربانی واجب ہے۔ اب آپ اس پر غور کریں۔ یہ نصاب تیرہ سو سال سے ہمارے ائمہ کرام کا مقرر کردہ بتایا جاتا ہے۔ کیا تیرہ سو سال قبل امام ابوحنیفہ رح کے زمانے میں پچاس روپے کی اتنی قیمت تھی جتنی آج ہے؟ اس وقت قربانی کے دنبے کی قیمت آٹھ دس آنے سے زیادہ نہیں تھی اور آپ پچاس روپے میں سے یہ بخوشی خرچ کر سکتے تھے۔ لیکن آج اُسی دُنبے کی قیمت اسی روپے ہے۔ اب بتایئے کہ پچاس روپے کا صاحب نصاب اسی روپے کا دُنبہ تب قربانی کرے گا کہ تیس روپے کسی دوسرے آدمی سے قرض لے لے۔ کیا اس فریضے اور اس نصاب کو آپ کی عقل درست کہہ سکتی ہے؟ یہ نصاب اس زمانے میں پانچ ہزار روپے ہونا چاہیئے ---!

اس قسم کی بحث معمولی تعلیم یافتہ لوگوں سے کرنے کے بعد کم از کم نصاب کی حقیقت ان کی سمجھ میں آجاتی ہے اور نصاب کے تحت قربانی پر ضرور سوچنے لگ جاتے ہیں۔

پچھلے سال اسی موضوع پر مردان میں ایک فرقے کے بہت سے بزرگ اور انکی جماعت کے مبلغ میاں صاحب سے ---- گفتگو ہوئی جب برائے تبلیغ وہ یہاں تشریف لائے تھے (میاں صاحب کئی سال سے غیر ممالک میں تبلیغ کا فریضہ ادا کر رہے ہیں)، یہاں اُن کی دو تقریریں ہوئیں۔ رات کے کھانے کا انتظام بھی تھا، جس میں مجھے بھی دعوت دی گئی۔ وقت مقررہ پر ہم چار پانچ دوست وہاں پہنچ گئے۔ میزبان نے میرا تعارف میاں صاحب کے ساتھ نمائندہ "بزم طلوع اسلام" مردان کی حیثیت سے کیا۔ ہم نے دیکھا کہ میاں صاحب اور اُن کے فرقے کے قریباً بیس تیس چیدہ چیدہ افراد بیٹھے ہوئے ہیں کھانے سے قبل گفتگو کا سلسلہ جاری ہوا۔ ایک مقامی وکیل صاحب نے میاں صاحب سے جو میر مجلس تھے پوچھا کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہر گلی کوچے میں بلا ضرورت جانور ذبح کرنے کے بجائے اگر ان جانوروں کی قیمت ضرورتمندوں کو نقد دے دی جائے تو کیا یہ قربانی کا بدل ہو سکتی ہے؟ میاں صاحب فرمانے لگے کہ قربانی کے لئے خون بہانا شرط ہے۔ چونکہ نقد رقم میں یہ نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ جائز نہیں۔ وکیل صاحب نے اسے تسلیم کرلیا اور خاموش ہو گئے۔ میں چپ نہ رہ سکا ---

گر ببینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

میں نے عرض کیا کہ کسی عمل کو جائز یا ناجائز ٹھہرانے کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ضابطہ و قانون ملا ہے جو قرآن کریم ہے۔ اس لئے جو فیصلہ آپ نے صادر فرمایا ہے اس کی تائید میں کیا آپ قرآن کریم کا حوالہ پیش کر سکیں گے۔ اُن کے ساتھ ایک حافظ بھی تھے۔ حافظ کو سورۃ الحج کی آیت متعلقہ کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ وہ یہ آیت تلاوت کرنے لگے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ط

یعنے ہم نے ہر امت کے لئے قربانی مقرر کی ہے تاکہ مویشی جو اللہ نے اُن کو عطا کر رکھے ہیں اُن کو اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کیا کرو۔

میں نے کہا کہ قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ پہلے ایک عام حکم دیا جاتا ہے۔ پھر اُس کی تفصیل دیتے ہوئے حکم کے کئی پہلوؤں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن فرماتا ہے ـــــ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ـــــ یعنی اے مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہاں ساری اُمت سے خطاب ہے۔ لیکن دوسری آیت میں فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اور عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کو اِس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اِسی طرح آپ کی پیش کردہ آیت میں اُمت کو عام حکم دیا گیا ہے لیکن پھر اسی سورۂ حج میں دیگر تفصیلات کے ساتھ اُمت کے مخصوص افراد کو قربانی کا حکم دیا جاتا ہے، سب کو نہیں ارشاد ہوتا ہے:-

وَ اَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۙ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ٥ ... ... ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ٥

ملاحظہ فرمائیں، اُمت میں سے مخصوص افراد کو قرآن کریم مندرجہ ذیل احکام دیتا ہے :-

(۱) تم حج کے اجتماعات میں شرکت کرنے کے لئے جایا کرو۔

(۲) قربانی کے جانور پر اس طرف سے سوار ہو کر جایا کرو، اور وہاں خوراک کی ضرورت کے پیش نظر انہیں ذبح کیا کرو۔ (اللہ میاں تو کہتا ہے کہ تم اُس زندگی میں قربانی کے زندہ جانور پر سوار ہو کر خانہ کعبہ جایا کرو

لیکن مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قیامت کے دن قربانی کے مردے جانور پر سوار ہو کر پل صراط کو عبور کروگے۔

(۳) اس ذبیحہ کا مقصد یہ ہے کہ خود بھی اس سے کھاؤ اور دیگر ضرورت مندوں کو بھی کھلاؤ۔

(۴) مقام ذبح بیت العتیق یعنی خانہ کعبہ ہے۔

میں نے کہا کہ اتنے واضح احکام کے ہوتے ہوئے ہم کہاں تک حق بجانب ہیں کہ ایک تو بلا ضرورت مویشیوں کو ذبح کرتے جائیں اور پھر قرآن کریم کے بتائے ہوئے مقام خانہ کعبہ کو چھوڑ کر مردان کی گلی کوچوں میں بے حد و شمار جانور کاٹتے چلے جائیں۔ کیا یہ قرآن کریم کی نافرمانی نہیں ؟

میاں صاحب نے میری گزارشات کے جواب میں بس اتنا فرمایا کہ تم لوگ احادیث کے قائل نہیں ورنہ یہ قربانی کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔

نعتِ رسولؐ اور لاٹری

کچھ عرصہ قبل میرا معمول تھا کہ میں شام کے وقت ایک سرائے میں جایا کرتا تھا۔ وہاں چند کمیونسٹ قسم کے لوگ بیٹھتے تھے، ان سے باتیں ہو جاتی تھیں۔ میں ان کو کبھی پرچہ، کبھی پمفلٹ اور کبھی کوئی کتاب مطالعہ کے لئے دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک میدان میں کوئی چالیس پچاس کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک اسٹیج بھی سجا ہوا تھا، لاؤڈ اسپیکر بھی فٹ کیا گیا تھا اور بیس پچیس آدمی بھی جمع تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں بھی اس طرف گیا۔ جب پہنچا تو نعتِ رسولؐ کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ ؎

اگر اے نسیمِ سحر تیرا ہو گزر دیارِ حجاز میں !
میری چشمِ تر کا سلام کہنا حضورِ بندہ نواز میں !

اس اثناء میں دریافت کرنے پر معلوم ہو گیا کہ "شہباز" لمیٹڈ کی آج لاٹری نکل رہی ہے۔ یہ سب اہتمام اسی ضمن میں ہے۔ (شہباز اور اسی طرح دوسرے ناموں سے کچھ عرصہ قبل "لمیٹڈ جعلی کمپنیاں" وجود میں آئی تھیں۔ اس کے ممبر پانچ روپے ماہوار چندہ دیا کرتے تھے۔ مہینے میں ایک بار لاٹری نکالی جاتی تھی جس کے نام لاٹری نکل آتی اس کو پانچسو روپے دیئے جاتے تھے۔ دو چار آدمیوں کو روپے دینے کے بعد جب خوب شہرت حاصل ہوئی اور ممبروں سے کافی رقم ہاتھ آئی، تو یہ کمپنیاں غائب ہو گئیں) جب ریکارڈ ختم ہو گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا، جلسے کے منتظم سے کچھ بولنے کی اجازت مانگی۔ اس نے ناواقفیت میں بڑی خوشی

سے مجھے اسٹیج پر بلایا اور لاؤڈ اسپیکر میرے سامنے کر دیا۔ میں نے کہا بھائیو! مجھے بہت افسوس ہے، کہ تم یہاں جوئے اور حرام کی کمائی کے نتائج کے سلسلہ میں جمع ہو گئے اور پھر اس ناجائز اجتماع میں شمولیت کی دعوت دیتے ہو حضورؐ کے نام سے۔ بہت سارے فلمی فحش ریکارڈ بازار میں موجود ہیں جو اس مجلس کے حسبِ حال ہیں۔ اُن کو کیوں نہیں بجایا کرتے۔ تم لوگ روپوں کے لالچ میں حضورؐ کا بھی مذاق اڑانے لگ گئے ہو۔ سب نے شور مچایا، لاؤڈ اسپیکر میرے سامنے سے ہٹایا، لڑنے جھگڑنے تک نوبت پہنچ گئی۔ لیکن پنڈیان پیچان کے آدمی بیچ میں آگئے اور بات آگے نہیں بڑھی، منتظم صاحب بہت غصے کی حالت میں مجھ سے کہنے لگا، تمہیں معلوم ہے ہمارے پاس اِس کاروبار کے لئے حکومت کا لائسنس ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہوگا۔ لیکن حکومت کے لائسنس سے کبھی حرام چیز حلال نہیں ہو سکتی ہے۔ کیا لائسنس کے ذریعہ عصمت فروشی جائز ہو جاتی ہے؟

یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ دوسرے دن جب سرائے کی طرف جا رہا تھا تو سرائے کے پاس ایک دکاندار دکان سے اُٹھ کر میرے پاس آیا اور میرے کل کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میرے ہاتھ چوم لئے اور رقت آمیز لہجے میں میری درازیٔ عمر کی دعا کی ہے۔

یہ میرے لئے کافی تھا۔ میں سمجھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

کراچی سے درسِ قرآن

میں کئی سالوں سے صبح کے وقت کراچی سے درسِ قرآن سنا کرتا ہوں۔ کچھ عرصے کی بات ہے ریڈیو پر ایک مفتی صاحب درس دے رہے تھے۔ زیر درس سورۂ یوسف کی یہ آیتیں تھیں — وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ؕ۔ اس کی تفسیر میں فرمانے لگے کہ اس آیت میں ایک لفظ برہان آیا ہے جس پر سابق مفسرین نے کافی روشنی ڈالی ہے اور یہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ برہان کے دو مفہوم ہیں۔

پہلا مفہوم — جب حضرت یوسف بھی عزیز مصر کی بیوی کی خواہش پورا کرنے کے لئے (استغفر اللہ) تیار ہو گئے تو اس اثنا میں جب ان کی نظر سامنے کی دیوار پر پڑی تو ان کو اپنے والد کا شبیہ نظر آیا، جو خفگی اور پریشانی کے عالم میں ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور انگلی ہلا ہلا کر ان کو منع فرما رہے تھے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ یہ دیکھ کر پشیمان ہو گئے اور اپنے ارادہ سے باز آ گئے۔

دوسرا مفہوم — جب عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسفؑ اس اختلاط کے لئے تیار ہو گئے تو عزیز مصر کی بیوی نے اُس بت کو کپڑے سے ڈھانپا جو وہاں نصب تھا۔ حضرت یوسفؑ نے جب یہ دیکھا

تو اُن کو بھی غیرت آگئی اور کہنے لگے کہ جب عزیز مصر کی بیوی کو ایک بُت سے شرم آتی ہے جو نہ دیکھ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے تو مجھے اُس خدا سے کیوں شرم نہ آئے جو بصیر بھی ہے اور سمیع بھی۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے انکار کیا: (استعاذباللہ: ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

یہ تھی وہ تفسیر جو مفتی محمد شفیع صاحب اپنی زبانِ فیض رسان سے کی اور ریڈیو پاکستان، کراچی نے اُسے ساری دنیا میں نشر کرنے کی سعادت حاصل کی۔

میں نے ریڈیو کراچی کو مفتی صاحب کی اِن گمراہ کن اور دور از کار تاویلات کے متعلق لکھا۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم تصریف آیات کا اصول بتاتا ہے اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ (انعام ۶۵) اس اصول کے تحت اگر مفتی صاحب تھوڑی تکلیف کرتے اور برھان کا لفظ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر دیکھ لیتے تو اسرائیلیات کے اِن عقل سوز اور حیا سوز قصے کہانیوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

میں نے لکھا کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کو کئی اسماء سے موسوم کر کے ہماری راہ نمائی کی کوشش کی ہے کہیں نُوْرٌ مُّبِيْنٌ کہا ہے، کہیں بَصَائِرُ لِلنَّاسِ کہا ہے، کہیں هُدًى وَّرَحْمَةٌ ہے اور کہیں ذِكْرٌ وَّمَوْعِظَةٌ ہے اور اِسی طرح دیگر کئی نام ــــ انہی ناموں میں قرآن کا ایک نام بُرھان بھی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ (۴/۱۷۵) ــــ یعنے اے دنیا کے لوگو تمہاری تمہاری ربوبیت کرنے والے کی طرف سے تمہارے پاس برہان آئی ہے جو سراسر نور ہے۔ دوسرے مقام پر اسی نور کو کتاب بھی کہا ہے ــــ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۵/۱۵) اس سے صاف معلوم ہوا کہ برہان کا مطلب ہے وحی الٰہی، قانونِ الٰہی، احکام الٰہی اور ضابطۂ الٰہی وغیرہ ــــ اگر مفتی صاحب قرآن کی رُو سے یہی مطلب پیش کرتے تو حضرت یوسفؑ کی عصمت بھی اِن کے ہاتھوں بچ جاتی اور خود قرآن کریم کی بدنامی بھی ان کی زبان سے نہ ہوتی۔

اب ملاحظہ فرمایئے وہ ترجمہ جو ترجمہ بھی ہے، مفہوم بھی ہے اور تفسیر بھی ــــ جو ہمیں طلوع اسلام نے دیا ہے۔"...... لکھا ہے کہ عورت حضرت یوسفؑ کے پیچھے پڑ چکی تھی اور (حالت ایسی ہو گئی تھی کہ بے قابو ہو کر) حضرت یوسفؑ بھی اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا اگر اُس کے سامنے اپنے پروردگار کا یہ اخلاقی قانون نہ ہوتا"۔

مجھے اِس کا جواب حسبِ معمول اُن سے موصول نہ ہوا۔ حسبِ معمول اس لئے کہ میں نے اس سے قبل بھی کئی بار قرآن کریم کی ایسی گمراہ کن "توضیحات" پہ اُن کو متنبہ کیا تھا اور جواب نہیں ملا تھا۔ لیکن مجھے اطمینان ہوا کہ

میں نے اپنا فریضہ ادا کیا۔

ابجد اور قرآن شریف

آخر میں اپنے ایک محترم پروفیسر صاحب (جو کالج کے زمانے میں میرے پروفیسر تھے) کے ایک اخباری مضمون کے متعلق لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انہوں نے اخبار "شہباز" میں ایک طویل مضمون پشتو میں بعنوان "سید عبدالقادر جیلانی اور قرآن شریف" لکھا۔ فرمانے لگے "ایک دن قرآن کی تلاوت کر رہا تھا سورۂ کہف میں جب میں وَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا کے مقام پر پہنچا، تو میں اس ٹکڑے پر غور کرنے لگا کہ یہاں ولی اور مرشد کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ چنانچہ اس ہستی کو معلوم کرنے کیلئے میں نے وَلِيًّا مُّرْشِدًا کے عدد ابجد کے حساب سے معلوم کئے تو یہ ۹۷۷ نکلے۔ پھر عبدالقادر جیلانی کے عدد نکالے تو یہ بھی ۹۷۷ نکلے۔ پس مجھے یقین ہو گیا کہ اس آیت میں ولی اور مرشد کا اشارہ سید عبدالقادر جیلانی کی طرف ہے"

کیا خوب ! ؏

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی !

میں نے اسی اخبار میں دوسرے دن پشتو میں پروفیسر صاحب کے جواب میں لکھا کہ کیا ابجد کا حساب کتاب ایسا ہی مستند ہے جیسا کہ خود قرآن شریف، اور کیا قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آیتوں کے عدد نکالے جائیں اور پھر کسی پیر فقیر کے نام پر منطبق کر کے اصلی ولی اور مرشد کا سرٹیفکیٹ دے دیا جائے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک پروفیسر کو زیب نہیں دیتا کہ ایسی لایعنی اور بے مطلب باتوں کے پیچھے پڑ جائے۔ علاوہ ازیں اس کا کیا ٹھکانا ہے اگر کل کو معین الدین اجمیری" کا کوئی مرید ان کے نام کے عدد نکالنا شروع کر دے۔ اور کھینچ تان، جمع تفریق سے ۹۷۷ برابر کر جائے تو پھر اصلی و نقلی ولی و مرشد کا فیصلہ غالباً قرعہ اندازی سے کیا جائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

"پیراں نمی پرند مریداں می پرانند"

میں نے اپنے طویل مضمون میں "طلوعِ اسلام" کی قرآنی بصیرت کی روشنی میں اولیاء اللہ پر بھی بحث کی اور آخر میں لکھا کہ آپ اپنے آپ اور عوام پر رحم نہیں کرتے تو کم از کم عبدالقادر جیلانی پر رحم کریں کیونکہ ان کو بھی آپ کے اس غلط اور بے بنیاد دعوے کی صفائی میں قیامت کے دن پیشی دینی پڑے گی اور اپنی صفائی میں ان کو کہنا پڑے گا۔ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ (۵/۱۱۶) تیری ذات پاک ہے۔ یہ مجھ سے کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں تیری شان میں

وہ بات کہوں جو میرا حق نہیں۔

میں کافی دنوں تک اخبار میں ان کے جواب کا منتظر رہا لیکن بے کار۔ البتہ مجھے کئی ایک خطوط نامعلوم حضرات سے ملے جنہوں نے میرے خیالات کی تائید کر کے میری ہمت بڑھائی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب ایک پروفیسر کی یہ کیفیت ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اَن پڑھ اور کم تعلیم یافتہ عوام کس قدر پیروں، فقیروں اور قبروں سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ؎

جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

طلوعِ اسلام کی برکات

اللہ کے حضور میرا سر بے اختیار جُھک جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے "طلوعِ اسلام" کے میرِ کارواں کی درازیٔ عمر کے لئے دعا نکلتی ہے کہ اُن کی قرآنی تعلیم و بصیرت نے مذہب کے کتنے تاریک اور دبیز پردوں کو ایک ایک کر کے ہٹا دیا۔ اور قرآنی نور و تجلّے سے اس تیرہ و تار راستے کو کس طرح منور کر لیا۔ اِن پردوں میں کہیں مرشد و پیر کا بُت تھا، تو کہیں مُلّا و فقیر کا۔ کہیں مزار پرستی تھی تو کہیں شخص پرستی۔ کہیں ورد وظیفوں کے گورکھ دھندے تھے تو کہیں تسخیر و عملیات کے پھندے۔ کہیں کسی مست قلندر کی بددعاؤں کا خوف و ہراس تھا، تو کہیں صاحب جبّہ و دستار کی دعاؤں کی آس ــــ غرض تین سو ساٹھ بت تھے جو ہمارے اِس چھوٹے سے کعبۂ دل پر مستولی اور قابض ہو چکے تھے۔ "طلوعِ اسلام" نے نہ صرف ہمارے قلوب و اذہان کو اس سے پاک و صاف کیا بلکہ ایک اللہ یعنے توحید کے سبق سے بھی لبالب بھر دیا اور پھر کمال یہ ہے کہ اتنے بتوں کے توڑنے والے نے اپنے .... بُت کو ہمارے دلوں کے کسی گوشے میں نصب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ بار بار کہتا رہا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھو اگر وہ اسے صحیح کہے تو صحیح ورنہ غلط۔

یہ ہے بھی درست ــــ صرف قرآن کریم کا بتایا ہوا راستہ صحیح ہو سکتا ہے۔ صرف اُس کا سہارا قابلِ اعتماد ہے۔ دیگر سب سہارے عین وقت پر فریب دے جاتے ہیں۔ ؎

تمام عمر سہاروں پہ آس رہتی ہے ۔ تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں

قرآنی زندگی

آخر میں اتنا مزید عرض کرتا ہوں اور یہی ہے غرضِ حقیقی میرے اس مقالے کا کہ ایک صحیح راہ کا معلوم کر لینا

وقت تک مفید نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس پر چل کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش نہ کی جائے۔
اب طلوعِ اسلام کے ذریعہ دین کا صحیح اور مستقیم شاہراہ معلوم ہو گیا ہے۔ کرنے کا کام اب یہ ہے کہ راہ کو عملاً اختیار کیا جائے اور اس پر چل کر منزل پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ پیاسے کو اگر پانی کی موجودگی کا علم ہو لیکن وہ اٹھ کر پانی پینے کی سعی نہیں کرتا ہے تو محض پانی کی موجودگی کا علم اُس کی پیاس نہیں بجھا سکتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ "طلوعِ اسلام" کا ہر رکن قرآن کریم کے احکام کا جیتا جاگتا عملی نمونہ ہو۔ ہر قول میں، ہر فعل میں، وعدہ وعید میں، یاس و امید میں، کامرانی کی تجلیات میں یا ناکامی کی ظلمات میں — غرض جو حال بھی ہو ہمارا قدم قرآن کریم کی صراطِ مستقیم سے ہٹنے نہ پائے۔ "طلوعِ اسلام" کا رکن اپنے گاؤں، اپنے شہر، اپنے محلہ، اور اپنے حلقہ میں ہر آدمی سے منوائے اور کہلوائے کہ یہ آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیونکہ یہ "طلوعِ اسلام" کا رکن ہے۔ یہ دھوکا اور فریب نہیں دے سکتا — چونکہ یہ "طلوعِ اسلام" کا ممبر ہے۔ یہ رشوت، حرام اور دوسروں کا مال نہیں کھا سکتا — کیوں کہ یہ طلوعِ اسلام کا خریدار ہے — یہ بے حیائی کا فعل نہیں کر سکتا — کیوں کہ یہ "طلوعِ اسلام" سے وابستہ ہے۔ یہ اپنے قول و عہد سے ہٹ نہیں سکتا ہے کیونکہ یہ طلوعِ اسلامی ہے اور آخر کار یہاں تک ہے کہ یہ قرآن کا مکمل تابعدار ہے کیوں کہ یہ "پرویزی" ہے۔ اگر یہ اعزاز ہم میں سے کسی کو نہ ملے تو یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ ہمارا عمل نہ قرآنی ہے اور نہ ہم "طلوعِ اسلامی" ہیں ؎

ہر آنکہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست

اگر ہمارا مطلب صرف برائے نام طلوعِ اسلامی کہلوانا ہو، قرآن قرآن کے الفاظ صرف ہماری زبان تک ہوں، پرویز صاحب کی تصنیفات کا مطالعہ صرف ہماری دماغی عیاشی تک محدود ہو، کنونشن سے صرف سیر و تفریح کا مقصد لوپا کرنا ہو، تو برادرِ عزیز! ؎

ایں راہ کہ تو می روی بترکستان است

اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ اس تحریک سے علیحدگی اختیار کریں۔ یہ آپ کے لئے بھی مفید اور تحریک کے لئے بھی سود مند۔ اگر ایک مسلک سے علیٰ وجہ البصیرت انکار کیا جائے تو یہ اتنا قابلِ مواخذہ جرم نہیں لیکن زبان سے اقرار اور دل سے انکار بڑی سخت خیانت ہے اور ضمیر کُشی ہے۔

منکرِ حق نزدِ ملّا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

بابُ المراسلات

زمانے کے تقاضے اور قرآن

محترم ایجنسی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر (۲) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ؛ اس میں جناب ...... کا ایک مفید مضمون بعنوان قرآن کی تصویر (؟) نظر سے گزرا۔ وہاں پر انہوں نے ایک محترم بزرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے الحق کے یہ معنی کئے ہیں کہ حق وہ جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے لغات القرآن جلد دوم میں نے نکالی تو وہاں پر بھی یہ عبارت ملی۔ معلوم ہوا کہ محترم بزرگ سے ان کا مطلب آپ ہیں۔ یہ سطور اس شبہ کو دور کرنے کا باعث بنے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن الحق ہے اور زمانے کے تقاضے تو کبھی غلط اور کبھی درست ہوتے ہیں۔ تو غلط تقاضے قرآن کس طرح پورے کرے گا۔ صاحبِ مضمون نے کہا ہے کہ حق زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ زمانہ مجبور ہوتا ہے کہ حق کے مطابق چلے، لہٰذا بذریعہ طلوع اسلام اس اہم بات کو واضح کر دیں۔

جواب :۔ میں نے نہ تو سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر دیکھا ہے اور نہ ہی محولہ بالا مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ لیکن صاحب مکتوب نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے، اس کا ازالہ ضروری ہے —— ان امور کی وضاحت پہلے بھی متعدد بار کی جا چکی ہے۔ بایں ہمہ ان کی مزید وضاحت فائدے سے خالی نہیں ہوگی۔

لغات القرآن کے بارے میں پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ میں نے اس میں کسی لفظ کے معنی اپنی طرف سے نہیں دیئے۔ تمام معانی عربی زبان (بالخصوص قرآن کریم) کی مستند کتب لغت کی رُو سے دیئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے ساتھ ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جہاں تک لفظِ حق کا تعلق ہے۔ میں نے اس کے معانی صرف یہی نہیں دیئے کہ وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا کرتا ہے بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ حق اپنے مقام پر محکم، اٹل اور امر ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ حق باطل کی ضد ہوتا ہے۔ اتنی سی بات سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو چیز باطل کی ضد ہو وہ باطل کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔

امام راغب نے حق کے معانی کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے۔

الحق (حق) کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ
دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فِٹ آجاتی ہے کہ وہ سہولت
کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مثال ایسی برجستہ ہے کہ اس سے اصل مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ دیوار اپنے مقام پر محکم ہوتی ہے لیکن وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس دروازے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقام پر محکم بھی ہوتا ہے لیکن دیوار کی طرح جامد نہیں ہوتا۔ جب آپ اندر آنا یا باہر نکلنا چاہیں تو وہ کھل جاتا ہے اور جب آپ چاہیں کہ نہ کوئی اندر آسکے اور نہ باہر جاسکے تو وہ بند کیا جاسکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا پورا کرنا۔

اب دیکھئے کہ قرآنِ کریم کی نسبت سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اسے دو تین مثالوں سے سمجھئے۔

(۱) قرآن کریم میں ہے کہ نماز سے پہلے وضو کرو۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جب پانی نہ ملے یا بیماری کی حالت ہو تو وضو کی بجائے تیمم کرو۔ آپ نے دیکھا کہ بدلنے والے حالات کے مطابق قرآن کریم نے خود ہی دو الگ الگ حکم دے دیئے۔ اپنے اپنے حالات میں دونوں احکام حق ہیں۔

(۲) قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق کہیں یہ کہا گیا ہے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ۔ انہیں معاف کر دو۔ ان سے درگذر کرو اور کہیں کہا گیا ہے۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ۔ انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔ یہ دو احکام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اپنے اپنے مقام پر دونوں حق ہیں۔ جہاں حالات کا تقاضا درگزر کرنے کا ہو وہاں درگزر کرنا حق ہے اور جہاں اُن کے خلاف جنگ کرنا ضروری ہو وہاں جنگ کرنا حق کا تقاضا ہے۔

(۳) اپنی مملکت کی سرحدوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ "امکان بھر اپنی تیاری رکھو۔ اور سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے متعین کر کے ان کی حفاظت کرو" (۸/۶۰)
ظاہر ہے کہ یہاں اصل مقصد اپنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ جب تک یہ حفاظت گھوڑوں کے رسالوں سے ممکن تھی، یہی طریق حق کا تقاضا تھا۔ آج کے زمانے میں یہ تقاضا توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ اب یہ طریق اختیار کرنا حق ہے۔

(۴) اوپر کی مثال میں ایک طریق کار (گھوڑوں کے رسالوں) کا تعین قرآن نے خود کر دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے بیشتر احکامات ایسے ہیں جن میں صرف ایک اصول دیا گیا ہے۔ ان اصولوں کی عملی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ مثلاً اسلامی نظام کے متعلق اُس نے اصولاً کہا ہے۔ وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸) یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ مشاورت کا کوئی طریقہ قرآن نے متعین نہیں کیا۔ اس سے

مقصود یہ ہے کہ یہ طریقہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، امت خود تجویز کریگی۔ اور ہر وہ طریق جس سے مشاورت کا مقصد حاصل ہو جائے ''حق'' کا تقاضا پورا کرے۔ حضرت ابو بکرؓ صدیق کی خلافت کے انتخاب میں مشاورت کا طریق اور تھا، آج اس کا طریقہ اور ہو گا۔ بالفاظ دیگر جس طریق سے مشاورت کا مقصد پورا ہو گا، وہ الحق ہو گا اور جس طریق سے مشاورت کی نفی ہوگی وہ باطل ہو گا۔

ان مثالوں سے آپنے دیکھ لیا ہو گا کہ ایسا کہنے کا مفہوم کیا ہے کہ حق بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق، باطل کا ساتھ دیتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ حق ایک اصول دیتا ہے اور اس اصول پر عملدرآمد زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وقت اُس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے یا بدل دیا جائے تو وہ پروگرام باطل ہو جائے گا۔ اسکے برعکس اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس اصول پر عمل کرنے کے لئے جو طریق کسی زمانے میں وضع ہوا تھا وہ غیر متبدل ہے اور خواہ وہ زمانے کے تقاضے پورے کرے یا نہ کرے، ہمیں اسی کے مطابق عمل کرنا ہو گا، تو یہ تصور بھی حق کے مفہوم کے خلاف ہے۔ قرآن کے اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو جزئی قوانین وضع اور اختیار کئے جائینگے، جب زمانے کے حالات مقتضی ہوں، تو ان میں تبدیلی کی جا سکے گی۔ دروازہ اپنے مقام پر قائم رہیگا۔ حالات کے مطابق اُسے بند کیا جائیگا اور جب ضرورت پڑے کھولا جائے گا۔ اگر دروازہ جامد ہو جائے تو وہ دروازہ ہی نہیں رہتا۔ یوں اسلام کا نظام اپنے مقام پر اٹل اور محکم بھی ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا ہے۔ زمانے کو بے شک پھر پھرا کر قرآنی اصولوں کی طرف آنا ہے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہی ہوا جائے گا۔ اقبالؔ نے اسی کو ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے تعبیر کیا ہے۔ دروازہ کی مثال سے یوں سمجھیئے کہ دین کھلنے اور بند ہونے والا دروازہ ہوتا ہے اور جب وہ بند ہو کر منجمد ہو جاتا ہے تو اُسے مذہب کہا جاتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہوگی۔ میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ چیز فرصت کی محتاج اور منتظر ہے۔

(پرویز)

معذرت

طلوع اسلام کالج کے لئے عطیات کی فہرست جگہ کی قلت کی وجہ سے زیر نظر شمارہ میں شائع نہیں کی جا سکی۔ ہم معطی حضرات سے معذرت خواہ ہیں۔

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

حقائق وعبر

صحیح علاج

ذیل کی خبر ملاحظہ فرمایئے۔

"صدر مملکت جنرل جان اونگینا نے گزشتہ رات ارجنٹائن کے ممتاز اخبار "لاکرونیکا" کو بند کر دینے کے احکام جاری کر دیئے۔ اس اخبار پر الزام یہ ہے کہ اُس نے کورڈوبا میں پولیس اور طلبار کے درمیان تصادم میں ایک طالب علم کی موت کی غلط خبر شائع کی تھی جس سے ملک کی فضا مکدر ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ صدر نے اس الزام میں متعدد دیگر اخبارات اور رسالوں کی اشاعت عارضی طور پر روک دی ہے (بحوالہ امروز۔ ۲۵/۵)

اس قسم کے احکام کا اجرا پاکستان میں بھی ہو سکتا! اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح یہاں کے قریب قریب ت ہی بند کرنے پڑیں گے لیکن فضا کے تکدر کو دور کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

ئے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

...نامہ امروز کی ۲۷ مئی ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

جماعت اسلامی مشرقی پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی نجات صرف اُن کے لئے جداگانہ وطن کے قیام میں ہے۔

...سے تیس سال پہلے جب یہی آواز مسلم لیگ اور اُس کے قائد کی طرف سے بلند کی جاتی تھی تو یہی جماعت ...ں آواز کا گلا گھونٹنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی تھی اور اس نظریئے کو کافرانہ اندازِ زیست سے ...تی۔ اب تیس سال کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات ...گانہ وطن ہی میں مضمر ہے۔

...ن یہ جماعت مسلم لیگ کی اُس آواز کو اب بھی کافرانہ ہی کہے جائے گی۔ کیونکہ وہ اِن کی طرف سے بلند ...ہی تھی۔

بصیرت افروز۔ انقلاب آفریں لٹریچر

(۱) لغات القرآن۔ (پرویز) یہ محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری نہیں۔ اس میں

(۱) تمام قرآنی الفاظ کے معانی عربی زبان کی مستند کتب لغت اور قرآن کریم کی روشنی میں متعین کئے گئے ہیں۔
اتنے حصے کو آپ لغات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی ان آیات کا مفہوم وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ اس اعتبار سے
یہ حصہ تفسیر القرآن کا ہے۔

(۳) دین کے تمام بنیادی تصورات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے اس لحاظ سے یہ حصہ دین کی بنیادی تعلیم کا نصاب ہے

(۴) شروع میں عربی زبان کے بنیادی قواعد و اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصہ عربی زبان کا معلم ہے۔ اور

(۵) تمام قرآنی الفاظ کی ایک جامع فہرست میں ہر لفظ کے سامنے اسکا مادہ دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا انڈکس ہے۔

آپ ایک مرتبہ اس لغات کو شروع سے اخیر تک پڑھ جائیں تو قرآن کریم کے سمجھنے اور دین کے بنیادی اصولوں کو جاننے کے لئے آپ کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کتاب چار جلدوں میں بڑے پاکیزہ ٹائپ میں شائع ہوئی ہے پہلی تین جلدیں۔ پندرہ روپے فی جلد، چوتھی جلد۔ بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی قیمت۔ پچاس روپے۔

(۲) معراج انسانیت۔ (پرویز) سیرتِ صاحبِ قرآن خود قرآن کے آئینے میں۔ حضور خاتم الانبیاءؐ کی سیرتِ طیبہ تمام نوعِ انسانی کے لئے جگمگاتا مینارہ ہے جس سے ہر رہ گم کردہ زندگی کے ساحلِ مقصود کا صحیح صحیح پتہ پا سکتا ہے۔ حضورؐ کی سچی اور قابلِ اعتماد سیرت (جسے نوعِ انسانی کیلئے بہترین نمونہ بننا ہے) قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے۔ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی حیاتِ مقدسہ کا وہی نقشہ قابلِ اعتماد ہوگا جسے قرآن کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہو۔ یہ کتاب اسی اندازِ ترتیب کی کامیاب پیش کش ہے جسمیں کسی مقام پر بھی تاریخی روایات کے دھندلکوں کو قرآنی حقائق پر اثر انداز نہیں ہونے دیا گیا۔ سیرت مقدسہ پر حسین ترین تصنیف۔ ختم نبوت کا عظیم فلسفہ۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ اب مصنف کی نظر ثانی نے اسے جدید پیکر عطا کیا ہے۔ ضخامت قریب ۵ سو صفحات قیمت۔ بیس روپے۔

(۳) انسان نے کیا سوچا؟۔ (پرویز) سقراط اور افلاطون سے لے کر برٹرنڈ رسل اور ٹوئن بی تک مختلف مفکرین۔ مدبرین۔ مؤرخین اور سائنسدانوں نے کائنات اور انسانی دنیا کے متعلق جو خیالات پیش کئے ہیں انہیں اس انداز میں سامنے لایا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار اٹھتا ہے کہ انسان وحی کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کسی زبان میں اس انداز کی کتاب نہیں مل سکیگی۔ دسواں ایڈیشن۔ قیمت بارہ روپے۔

(۴) اسلام کیا ہے؟۔ (پرویز) یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟۔ قیمت:۔ قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے۔ سستا ایڈیشن۔ چار روپے۔

(۵) جہانِ فردا۔ (پرویز) ہر شخص اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا جواب ملے گا اس کتاب سے جس میں قرآن کریم کی رو سے موت۔ قبر۔ برزخ۔ حشر۔ نشر۔ قیامت۔ اعمال نامہ۔ جہنم۔ جنت وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں۔ قیمت:۔ اعلیٰ ایڈیشن۔ دس روپے۔ سستا ایڈیشن۔ چھ روپے۔

(۶) شعلۂ مستور۔ (پرویز) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوائفِ حیات۔ کیا آپ بن باپ پیدا ہوئے؟ کیا یہودا نے واقعی آپ کو فروخت کر دیا تھا؟ کیا آپ آسمانوں پر زندہ ہیں؟ کیا آپ پھر نازل ہوں گے؟ آپ کی صحیح تعلیم کیا تھی؟ ایک نئے زاویئے سے عجیب و غریب حقائق کی نقاب کشائی اور رسم خانقاہیت کی عبرت آموز داستان۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت، مجلد، چھ روپے۔

(۷) خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کریم کے معاشی نظام سے کیا جاتا۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت۔ مجلد نو روپے۔

(۸) نظامِ ربوبیت۔ (پرویز) نظام سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے کیا ... ان سے نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے! اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی

تفصیل اس کتاب میں ملے گی اور جس کی رُو سے دنیا میں کوئی شخص نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ نہ کوئی امیر رہیگا نہ غریب۔ نہ کوئی قارون ہوگا نہ بھکاری۔ یہ ہمارے دور کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

(۹) فردوسِ گم گشتہ۔ (پرویز) محترم پرویز صاحب کے ان مضامین اور تقاریر کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ہے۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دیں گی۔ قیمت، آٹھ روپے

(۱۰) سلسبیل۔ (پرویز) قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا دوسرا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت، آٹھ روپے

(۱۱) بہارِ نو۔ (پرویز) یہ جناب پرویز کے مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے جس سے ذہنوں میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت پانچ روپے

(۱۲) سلیم کے نام خطوط۔ (پرویز) سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملّا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے بیزار کر دیا ہے۔ اس کے دل میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک مشفق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوط کی شکل میں دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی رُو سے خالص قرآنی فکر کی روشنی میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت: حصہ اوّل۔ آٹھ روپے۔ قیمت حصہ دوم و سوم۔ چھ چھ روپے۔

(۱۳) طاہرہ کے نام خطوط۔ (پرویز) عائلی زندگی کے بنیادی اور اُلجھے ہوئے مسائل۔ ان مسائل کے بارے میں جناب پرویز نے اپنی ملّت کی طاہرہ بیٹیوں کو مخصوص مشفقانہ انداز سے مخاطب کیا ہے۔ اور انہیں بتایا ہے کہ خدا کا دین انہیں کس قدر بلند مقام عطا کرتا ہے اور ان سے کن ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ آنسوؤں اور آہوں کے جہنم میں کیونکر جنتی معاشرے کی صبحِ بہار نمودار ہو سکے گی۔ یہ کتاب خواتینِ ملّت کے قلب و نگاہ میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کرتی ہے۔ اس کتاب کے آخری باب میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی کی عمر چھ سال کی تھی۔ قیمت: چھ روپے۔

(۱۴) قرآنی قوانین۔ (پرویز) ایک مختصر لیکن جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ جج صاحبان اور وکلاء حضرات کے لئے بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مستقل اقدار

کو بھی مدون کر دیا گیا ہے جن کی روشنی میں امت، عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی۔
قیمت: تین روپے۔

(۱۵) جہاد ۔ (پرویز) جہاد کیا ہے؟ جنگ اور جہاد میں کیا فرق ہے؟ مومن اور مجاہد کس طرح مترادف الفاظ ہیں۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق مخالفین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔ ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔ بصیرت افروز۔ حیات آموز۔ قیمت: دو روپے۔

(۱۶) مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں ۔ (پرویز) مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گزریں اور آج ان کی کیا حالت ہے۔ اس کتاب میں اس سوال کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔ نیز اس میں یہودیت، عیسائیت، زرتشتی مذہب، ہندومت، بدھ مت، جین مت، چین اور جاپان کے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ محفوظ چلا آرہا ہے۔ قیمت: تین روپے۔

(۱۷) اسبابِ زوالِ امت ۔ (پرویز) ملّا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت: ۱ روپیہ پچاس پیسے۔

(۱۸) اسلامی معاشرت ۔ (پرویز) اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کے دلوں میں صحیح اسلام کی تعلیم نقش کرنے کے لئے، نیز کم تعلیم یافتہ حضرات اور عورتوں کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ انداز بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے

(۱۹) اقبالؒ اور قرآن ۔ (پرویز) جس جہانِ نو کا تصور ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اس کے خد و خال سامنے لانے کے لئے ضروری کا ہے کہ آپ اس مجموعہ کو دیکھیں جس میں اقبالؒ اور قرآن بیک وقت آپ کے سامنے آجاتے ہیں۔ قرآن کے حقائق اور اقبالؒ کا بیانِ حسن و حقائق کا اس سے دلکش مرقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ قیمت: دو روپے۔

زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کا

قربانی۔ ترکہ۔ وصیت۔ نکاح۔ طلاق۔ اوقاف۔ شراب۔ جوا۔ حرام وحلال یا مثلاً شب برات۔ عید میلاد۔ قرآن کی حفاظت۔ ناسخ و منسوخ۔ تصویر کشی۔ موسیقی۔ سینما۔ مشاعرے۔ عذاب قبر۔ حیات بعد الممات۔ قومی ملکیت۔ نبی اکرمؐ وعلم غیب۔ حضورؐ کا معراج۔ ولی اور الہام۔ تاریخ اور قرآن۔ مرکز ملت۔ غلام اور لونڈیاں وغیرہ بیسیوں باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق آپ کو علم نہیں کہ قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک جگہ اس کتاب میں مل جائے گا۔ قیمت جلد اول، دوم ۳/۲۵ روپے فی جلد۔ جلد سوم۔ تین روپے فی جلد۔

(۲۱) مقام حدیث یہ وہ کتاب ہے جس نے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے؟ رسول اللہؐ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے؟ اقرار و انکار حدیث سے کیا مراد ہے؟ علم حدیث کے متعلق یہ جامع کتاب اس قدر پُر از معلومات ہے کہ آپ بیسیوں کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ قیمت:۔ چار روپے۔

(۲۲) منزل بہ منزل تحریک طلوع اسلام دراصل قرآنی فکر کے عام کرنے کی ایک تنظیمی کوشش ہے۔ یہ تحریک کن کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ وہ کون سے عناصر ہیں جو اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہے، اور کھڑے ہیں۔ قرآنی فکر کی یہ تحریک ان موانعات کو کس طرح دور کرتی اور امت کو کیسے قرآن مجید کے قریب لاتی ہے۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام کے سالانہ اجتماعات نے کیا نمایاں خدمات سرانجام دیں، ان اجتماعات میں اس تحریک کے بانی جناب پرویز نے قوم کو کیا پیغام دیا۔ یہ اس قافلہ قرآنی کی جادہ پیمائی کی نہایت حسین و سادہ اور بے حد جاذب و پرکشش داستان ہے جسے نہایت حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت:۔ چھ روپے۔

(۲۳) قرآنی دستور پاکستان قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کردہ قرارداد مقاصد و بنیادی اصول وحقوق اور دستور کے مسودات۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ۔ جماعت اسلامی کی دستوری سفارشات اور ان کی فکر و نظر کے تضادات پر تبصرہ۔ غرضیکہ اس مجموعہ میں وہ سب کچھ آگیا ہے جسے تدوین دستور پاکستان کے سلسلہ میں آپ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن اصولی طور پر اس کی افادیت اب تک باقی ہے۔ قیمت ۲/۵۰ روپے

(۲۴) ... سب سے خطرناک رہزنی وہ ہے جو خدا اور رسولؐ کے نام پر مذہب

ہوتی ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ لوگ کس طرح مذہب کے نام پر اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جماعتِ اسلامی کے عزائم کیا ہیں اور وہ کس طرح قوت حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور اس کے امیر کی ڈکٹیٹرشپ پر اتنا مواد اور اس انداز سے مربوط شکل میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔

قیمت چار ۴/ روپے۔

(۲۵) قتلِ مرتد۔ غلام اور لونڈیاں

کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؟ کیا اسلام جنگ کے قیدیوں کو غلام اور قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے، بلا تعداد گھروں میں ڈال لینے اور بازاروں میں فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ قرآن کی رو سے ان اہم سوالات کا جواب کیا ہے؟ مدلل اور مسکت بحث۔ اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ مصر ہے کہ جب پاکستان میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا تو اس میں یہی قوانین رائج ہوں گے۔ قیمت ۔ ۵۰/۱ روپے۔

(۲۶) عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا۔ (پرویز)

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کئی ایک ایسی باتیں رائج ہیں جنہیں وہ حقیقت سمجھتے ہیں لیکن در اصل وہ افسانے ہیں۔ جناب پرویز نے ان افسانوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ہٹا کر حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ بڑی دلچسپ اور بصیرت افروز کتاب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

(۲۷) انسانیت کا آخری سہارا۔ (پرویز)

یہ وہ بصیرت افروز خطاب ہے جس سے جناب پرویز نے دسویں طلوعِ اسلام کی کنونشن کے الوداعی اجلاس کو نوازا جس کے جذب و انہماک اور اثر و کیف کا یہ عالم تھا کہ کوئی قلب نہ تھا جو وجد میں آگیں اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ قیمت ۔ ایک روپیہ۔

(۲۸) عربی خود سیکھئے۔ (رفیع اللہ)

قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اس لئے ایک ایسی مختصر اور سلیس کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جاتے جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ دوسرا ایڈیشن ۔۔۔

قیمت ۔ ۵۰/۴ روپے

(۲۹) دھتکارے ہوئے انسان۔ (عنایت اللہ)

جیل کی سلاخوں کے پیچھے کی دنیا کے پراسرار حالات۔ قاتلوں۔ ڈاکوؤں۔ گرہ کٹوں اور سنگین مجرموں کے جرائم کا پس منظر۔ جیل میں بسنے والی دنیا کے مہیب، دہشتناک، حیرت انگیز لیکن عبرت آموز حالات جو طلسم ہوش ربا سے زیادہ دلچسپ اور گلستانِ سعدی سے زیادہ سبق آموز ہیں۔

قیمت:- ۵/- روپے

(۳۰) الفتنۃ الکبریٰ۔ (طٰہٰ حسین مصری)

حضور رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے پچیس سال بعد ہی امیرالمومنین حضرت عثمان رضؓ کس طرح دن دہاڑے شہید کر دیئے گئے۔ اور امتِ مسلمہ کو کن مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ ان حوادث کے محرکات کیا تھے اور ان کا پس منظر کیا۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔

قیمت:- ۶/- روپے

(۳۱) فجر الاسلام۔ (احمد امین مصری)

مصر کے نامور مؤرخ علامہ احمد امین کی معرکہ آراء تصنیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام کے پراز معلومات حالات۔ اسلام کے قرنِ اول کی روشن داستان۔ ہر بات مستند۔ ہر دعویٰ مدلل۔ تاریخ اسلام پر ایسی کتاب اس سے پہلے شائع نہیں ہوئی۔

قیمت:- جلد اول۔ دوم۔ چار چار روپے۔

(۳۲) اسلام پر کیا گزری؟۔ (احمد امین مصری)

علامہ احمد امین مصری کے سلسلۂ تاریخ اسلام کی دوسری کڑی۔ بنی امیہ و عباسیہ کے زمانے میں اسلام کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ کیسے ہوا۔ اس میں کون کون سی باتیں باہر سے آکر مل گئیں۔ یہ ساری کہانی بڑی بصیرت افروز اور عبرت آموز ہے۔ قیمت:- پانچ روپے۔

(۳۳) پاکستان کا معمار اول۔ (صفدر سلیمی)

سرسید کی صحیح عظمت اور ہماری سیاسی زندگی میں اس کا مقامِ بلند ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ سرسید کا صحیح مقام نہایت دلکش انداز میں اس مختصر لیکن جامع تصنیف میں دیکھئے۔ قیمت:- صرف -/۳ روپے۔

(۳۴) تاریخ الامت۔ (اسلم جیراجپوری)

امت کی تمام سرگذشت۔ مختصر، سلیس

اور سادہ انداز میں۔

جلد اول	سیرت رسولؐ	قیمت	۲/۵۰ روپے
" دوم	خلافت راشدہ	"	۲/۵۰ "
" سوم	خلافت بنی امیہ	"	۲/- "
" چہارم	خلافت عباسیہ	"	۲/۵۰ "
" پنجم	خلافت عباسیہ	"	۳/- "
" ششم	تاریخ مصر	"	۲/۵۰ "
" ہفتم	آلِ عثمان	"	۲/- "
" ہشتم	قرآن و تاریخ اسلام	"	۲/۵۰ "

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان
سالانہ ——— دس روپے

ہندوستان
سالانہ ——— پندرہ روپے

غیر ممالک
سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ——— ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵۔ بی۔ گلبرگ۲ لاہور

جلد ۲۳ | اگست (۱۹۷۰ء) | نمبر ۸

فہرست

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ... ط ...

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۴ اگست کی یاد میں

وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ
انہیں خدا کے دنوں کی یاد دلاؤ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نبی اکرم کے عہدِ سعید میں مدینہ کے یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ حضورؐ کے استفسار پر بتایا گیا کہ اس دن بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی تھی اس لئے وہ اس تقریبِ مسرت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے شکرانِ نعمت کے طور پر اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر حضورِ رسالتمآبؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ بھی اس تقریب میں یہودیوں کا ساتھ دیں اور عاشورہ کا روزہ رکھا کریں۔ کیونکہ کسی قوم کی غلامی سے نجات، اُسی قوم کے لئے وجہِ مسرت نہیں بلکہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لئے باعثِ شرف و سعادت ہے۔ حضورِ رسالتمآبؐ نے یہ واضح کر دیا کہ غلامی ایک ایسی لعنت ہے جو قوموں کو شرفِ انسانیت سے محروم کر دیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

۱۴ اگست کو ہماری حیاتِ ملی میں یومِ آزادی کی حیثیت حاصل ہے اور اس دن پاکستان کے

طول و عرض میں آزادی کا جشن مسرت بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ جشنِ آزادی کچھ ہمیں سے مخصوص نہیں، دنیا کی اکثر و بیشتر قومیں اپنے اپنے ہاں یوم آزادی کی تقریب اسی وفور مسرت سے مناتی ہیں۔ اس دن کی یاد میں انکے ہاں بھی فضا میں مسرت کے نغمے گونجتے ہیں۔ خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔ فضا جشنِ چراغاں سے بقعۂ نور بن جاتی ہے اور مسرت کے ان ہنگاموں میں چاروں طرف یہ احساس کارفرما ہوتا ہے کہ اس دن ان کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹی تھیں۔ ان کی بے بسی اور محکومی کے بندھن کٹ گئے تھے۔ انہیں دوسروں کے استبداد سے نجات ملی تھی اور اب وہ اس قابل ہیں کہ اپنی مملکت کے دائرے میں اپنی مرضی کے مطابق آئین و قوانین رائج کرسکیں۔ اپنی منشار کے مطابق احکام کا نفاذ عمل میں لاسکیں۔ ان کی آزادی پر خارج سے کوئی پابندی عائد نہ ہو۔

یہاں یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری آزادی کا مفہوم اور منشار و مقصود بھی یہی تھا؟ یعنی ہم جو جشنِ آزادی کی تقریب مناتے ہیں تو کیا یہ بھی آزادی کے اسی تصور کی آئینہ دار ہے جو دیگر اقوام میں رائج ہے؟ پاکستان کو آزادی حاصل کئے تیئیس برس ہوگئے۔ کہا جائے گا کہ اتنے سالوں کے بعد اس انوکھے سوال کو اٹھانے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ ہم نے کئی سال تک اپنی آزادی کی جنگ لڑی۔ اس جنگ میں کامیابی حاصل کی اور اپنی آزاد مملکت میں زندگی بسر کرتے اتنے سال گذر گئے۔ اب یہ سوال کہ "ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟" کیوں اٹھایا جائے۔

پیشتر اس کے کہ ہم اپنی آزادی کے منشار و مقصود کے اہم اور بنیادی سوال کی طرف آئیں، ہم تمہیداً اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ سوال ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حصول پاکستان کے بعد اکثر و بیشتر ان عناصر نے بھی پاکستان میں ڈیرے ڈال دیئے جو تحریک پاکستان کے دوران اس کی مخالفت میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو اپنی جائے پناہ بنالیا اور یہاں اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ کر اس قسم کا پروپیگنڈہ شروع کردیا جو مایوسی اور ذہنی انتشار کا باعث ہو، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم نے کم و بیش دس برس تک حصولِ پاکستان کے لئے مسلسل جد وجہد کی۔ لیکن جب یہ حاصل ہوگیا تو ہم نے ایک دوسرے سے یہ پوچھنا شروع کردیا کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اس مطالبے سے ہمارا مقصد کیا تھا؟ اور ذہنی انتشار کی یہ کیفیت یہاں تک پہنچ گئی کہ چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک نے کہا۔ ارے صاحب! پاکستان تو ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ کشادہ دلی سے کام لیتے تو پاکستان کے بننے اور نہ بننے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ گویا پاکستان کی بنیاد کسی مثبت جذبہ پر نہیں تھی۔ یہ محض ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف سے آواز آئی کہ حضرت! یہ انگریز کی ایک چال تھی۔ وہ چاہتا ہی تھا کہ ہندوستان سے ایسی حالت میں رخصت ہو کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ہمیشہ لڑتے رہیں۔ چنانچہ اس نے پاکستان

کا تصور پیدا کیا اور مسٹر جناح کو اس مقصد کے لئے آگے بڑھا دیا۔ گویا مسٹر جناح انگریز کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے آلۂ کار تھے۔ یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کے متعلق اس کے بدترین دشمنوں کو بھی اس امر کا اعتراف تھا کہ وہ کسی قیمت پر کسی کے ہاتھ بک نہیں سکتا۔

یہ لوگ تو خیر تھے ہی تحریکِ پاکستان کے مخالفین۔ تحریکِ پاکستان کی کامیابی کو انہوں نے اپنے لئے ایک گہرے زخم کے طور پر قبول کیا اور اس کی کسک سے انہیں آج تک چین نصیب نہیں ہوا۔ اس لئے یہ حضرات جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ غیر متوقع نہیں۔ لیکن ہمیں انتہائی قلق (بلکہ صدمہ) اس بات کا ہے کہ ہمارے اکابرینِ ملت' جو تحریکِ پاکستان میں شامل تھے اور جن کے متعلق ذہنوں میں یہ تصور جاگزین ہے کہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کیا تھی اور اسے کس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا، ان کی طرف سے بھی اسی قسم کی باتیں سننے میں آ رہی ہیں — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے! — چونکہ ہماری نئی نسل یہ سمجھتی ہے (اور ایسا سمجھنے میں وہ بالکل حق بجانب ہے) کہ یہ بزرگانِ کرام جو کچھ کہتے ہیں وہ تو یقیناً مبنی بر حقیقت ہوگا۔ اس لئے ان حضرات کے ارشادات' جس قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں' ان کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس کی بنا پر ہم نے، اس جشنِ آزادی کی تقریب پر اس بنیادی سوال کو ایک بار پھر سامنے لانے کی ضرورت سمجھی کہ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کیا تھی اور اس مملکت کے حصول اور قیام سے مقصود کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا رہینِ منت ہے۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کے اس تصور کا محرک جذبہ کیا تھا۔

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اقبالؒ پاکستان میں اسلام کو "مذہب" کی حیثیت سے نہیں بلکہ "دین" کی حیثیت سے نافذ العمل دیکھنا چاہتے تھے۔

دین اور مذہب کا فرق

"مذہب" (جسے عام طور پر RELIGION کہہ کر پکارا جاتا ہے) خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی، عمرانی، سیاسی، معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ایک عیسائی اپنے گرجے میں، ایک پارسی اپنے آتشکدہ میں، ایک ہندو اپنے مندر میں اور (اسی خیال کے مطابق) ایک مسلمان اپنی مسجد میں — بلکہ یوں کہئے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے کسی کونے میں یا پہاڑ کے کسی غار میں — اپنے طور پر قائم کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے مذہب کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی تمدنی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ تو ہے مذہب کا تصور۔ لیکن اس کے برعکس، "دین" خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں بلکہ یہ زندگی کا ایک ضابطہ اور نظامِ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔

اقبالؒ اور خطبہ الہ آباد

۱۹۳۰ء میں جب اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا تو اس میں فرمایا۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے .... حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان، جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی بلند و بالا ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر وقیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اور یہ مقصد اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا) اسی لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

نیشنلسٹ علماء کا تصورِ آزادی

ہمارے ہاں کے اُس وقت کے نیشنلسٹ علماء جن کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کی آزادی کا تصور وہ تھا جس کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے مسلمان ہے آزاد

چنانچہ مولانا مدنی (مرحوم) کے ایک اخباری بیان کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبالؒ مرحوم نے کہا تھا کہ۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے میں کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جن کی بنیادیں انہیں اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو

یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن
اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو
مسلمان آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا۔ بولنا، روپیہ
صرف کرنا۔ لاٹھیاں کھانا۔ جیل جانا۔ گولی کا نشانہ بننا، سب کچھ حرام اور قطعی حرام
سمجھتا ہوں۔

قائدِ اعظمؒ

علامہ اقبالؒ کے بعد قائدِ اعظمؒ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کے قیام کی جدوجہد میں سالارِ کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے پاکستان اور اس کے نظامِ مملکت کے بارے میں بعینہٖ وہی تصور تھا، جو علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں وہ شروع سے آخر تک اس حقیقت کو دہراتے چلے گئے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

> پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی۔ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے۔ کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ نظریۂ زندگی کی وضاحت فرمائی بلکہ دین اور مذہب کے فرق کو بھی نمایاں کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا۔

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور میں' جہاں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی تھی، تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے کہا۔

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے ہندو اور مسلمان، مذہب کے

ہر معاملے میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے یہ
دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی
قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر
اس نظام کو پاش پاش کر دے گا۔ جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا جائے گا۔

ان تصریحات کے ساتھ لاہور کے تاریخی اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دس کروڑ مسلمانوں نے اُسے اپنے ملّی نصب العین اور تقاضائے دین و ایمان کی حیثیت سے نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اس کے لئے آخری خندق تک لڑنے کے لئے کارزارِ سیاست میں نکل آئے۔

اس قرارداد کو قومی نصب العین کی صورت اختیار کئے ابھی ڈیڑھ سال نہیں گزرا تھا کہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران طلباء نے قائداعظمؒ سے بڑے اہم اور بنیادی سوالات کئے جن کے جوابات قائداعظم نے ایسے متعین، دو ٹوک اور نکھرے ہوئے انداز میں دیئے کہ مملکتِ پاکستان کے حصول کا منشاء و مقصود پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگیا۔ اورینٹ پریس کے نمائندے نے اس ملاقات کی جو رپورٹ مرتب کی اس کے ضروری حصے سوالات و جوابات کی صورت میں درج ذیل ہیں۔

سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن، خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک 'مذہب' کا یہ محدود اور مقید مفہوم اور تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور ضابطۂ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں، بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔"

قرآنی مملکت

قائداعظمؒ کا اپنے متعلق اعتراف و اعلان یہ تھا کہ "میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے"۔ لیکن اسلامی نظام کی اصل و بنیاد کے متعلق جو کچھ انہوں نے سمجھا اور کہا ہے، ذرا غور کیجئے کہ دینیات میں مہارت کے کتنے مدعی ہیں جو اسلام کے متعلق اس گہرائی تک پہنچ پاتے ہیں؟

سترِ خدا کہ زاہد و عابد بکس نہ گفت
در حیرتم کہ دُرد کشاں از کجا شنید!

اشتراکیت

سوال :- اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟

جواب :- "اشتراکیت. بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا"۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ روس کی کمیونزم ہو یا مغرب کی ڈیماکریسی۔ یہ سب اسلامی نظام کے مختلف اجزاء کی بھونڈی سی نقلیں ہیں جب تک ان میں علامہ اقبال کے الفاظ میں 'خدا' شامل نہ کر دیا جائے یہ نوعِ انسانی کے لئے کبھی ایسے منفعت بخش نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو اسلامی نظام کا خاصہ ہیں۔

اب اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے جو ہمارے نزدیک اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ غور سے سنیئے۔

سوال :- اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے ؟

جواب :- اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے"۔

صرف قرآن کی اطاعت

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم، مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت 'اسلامی' کس طرح بنتی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ اس کے سوا کسی اور کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کسی اور کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منوائے۔

لیکن خدا تو ایک اَن دیکھی، مطلق ذات کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہوگی ؟ کیسے معلوم کیا جائیگا کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام

اور اصول میں ؛ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔ (۷/۳) جو کچھ تمہاری طرف خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتباع مت کرو۔" بالفاظِ دیگر، اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے ؛ اسی کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ یہی چیز کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔

(۰)

قائداعظمؒ کی اس دو ٹوک وضاحت سے مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کے نزدیک مملکتِ پاکستان کے آئین و قوانین کی اساس قرآنِ کریم کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت ان کے دل و دماغ پر کس حد تک اثر انداز تھی اس کا اندازہ ان کے اکثر بیانات سے سامنے آئے گا۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں عید کی تقریب سعید پر قوم کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

قرآن کی جامعیت

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانتک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن، مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے، جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو، یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

یہ تھی قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت، جس پر قائداعظم کا ایمان تھا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسلی اور صوبائی تعصب بھی موجود تھا۔ خود پاکستان کو جن دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہونا تھا یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان۔ ان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ لسانی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے بھی ان دونوں خطوں کے رہنے والوں میں

مسلمانوں کی وجۂ جامعیت

کوئی وجۂ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہِ اختلاف کے باوجود وہ کون سی قدرِ مشترک تھی جو ان باہمدگر متضاد عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی؟ اس کا جواب قائد اعظمؒ کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (دسمبر ۱۹۴۳ء واقع کراچی) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

> وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔
>
> ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک امت۔

(۰)

حصولِ پاکستان کے بعد

مطالبۂ پاکستان کے منشاء و مقصود کی وضاحت کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے حصولِ پاکستان تک مختلف مواقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا اس کے چند گوشے آپ کے سامنے آگئے۔ اب حصولِ پاکستان کے بعد کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ لوگ جو حصولِ پاکستان کے مقاصد کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے درپے ہیں، یہ کہتے سنائی دیں گے کہ حصولِ پاکستان سے قبل بے شک قائد اعظمؒ نے یہی کچھ کہا تھا لیکن اس کے حصول کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ نہ صرف قائد اعظمؒ کی عظمتِ کردار پر گھناؤنا الزام ہے بلکہ واقعات و حقائق کے سراسر منافی بھی۔ حصولِ پاکستان کے بعد بھی قائد اعظمؒ کے موقف میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے کراچی کے خالق دینا ہال میں افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے

پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پاسکیں اور جہاں اسلام کے عدل عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جاسکیں۔

پاکستان کا آئین

حصہ ۱۔ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ آئین مملکت کی ترتیب و تدوین کا تھا۔ اسلام کے نام پر ایک نئی مملکت نقشۂ عالم میں اپنا مقام پیدا کر چکی تھی اور ایک دنیا کی نگاہیں یہ دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں کہ اس مملکت میں کس قسم کا آئین متشکل ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب کے کروڑوں انسان گوش برآواز تھے کہ اس سلسلے میں کارفرمایانِ مملکت کی طرف سے کوئی واضح اور دوٹوک اعلان سن سکیں۔ خود قائداعظمؒ نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی اور فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے فرمایا۔

پاکستان کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو، بہرحال یہ امر مسلمہ ہے کہ پاکستان

تھیاکریسی نہیں ہوگی

میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت کیوں؟

قائداعظمؒ کا یہ اعلان مذہبی پیشوائیت کے لئے پیامِ موت سے کم نہیں تھا۔ پاکستان کے قیام سے یہ حضرات اس خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جب یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا تو شرعی احکام و قوانین

اور فیصلوں کے لئے مختارِ مطلق بہرحال وہی قرار پائینگے. لیکن قائدِ اعظمؒ نے دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ قرآنی نظام کسی ایسے گروہ کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتا. یہیں سے یہ حقیقت سامنے آ گئی ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں کیوں اغیار کے آلۂ کار بن کر آگے بڑھے تھے اور ان کی مخالفت کا یہ سلسلہ دراز آج تک کیوں نئے نئے فتنے بکھیرتا چلا آرہا ہے. تیئیس سال سے یہاں اسلامی نظام کے نقاب میں جو کچھ کہا اور کیا جارہا ہے وہ اس کے سوا کیا ہے کہ یہاں وہ تھیاکریسی قائم ہو جس میں اقتدارِ اعلیٰ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور جس میں انسانیت کا بُری طرح گلا گھٹتا ہے. ان حضرات نے مذہب کے نام پر جو انتشار پیدا کر رکھا ہے، اگر ملت کو اس سے نجات مل جاتی تو اس کا سفینۂ حیات کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا. انہی کے پیدا کردہ انتشار کا نتیجہ ہے کہ قوم حصولِ پاکستان کے مقاصد سے دور ہٹتی چلی گئی اور اس کے لئے یہ سمجھنا تک مشکل ہو گیا ہے کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اور قوم کے اسی انتشارِ ذہنی سے فائدہ اٹھا کر ہمارے بزرگ لیڈر بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا. ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ معمارانِ پاکستان، علامہ اقبالؒ، اور قائدِ اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ سے ہمارا مقصد کیا ہے. انہوں نے اس مقصد کو اس قدر وضاحت سے بیان کیا اور اس طرح باصرار و تکرار دہرایا تھا کہ ہندوستان کا ہندو تک بھی اس سے بخوبی آشنا ہو گیا تھا. مثلاً یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں "اکھنڈ بھارت کانفرنس" کے صدارتی خطاب میں مشہور کانگریسی رہنما مسٹر منشی نے کہا تھا کہ

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے (HOME LANDS) بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے. مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی. (ٹربیون. ۱ نومبر ۴۱ء)

جب ان حضرات کے سامنے یہ حقائق پیش کئے جاتے ہیں تو ان سے اس کے جواب میں اور تو کچھ بن نہیں پڑتا وہ کمال جرأت و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ

منافقت کا الزام

پاکستان کی تشکیل کا اصل مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا. لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اس سے عوام کی تائید حاصل ہو سکے.

یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اقبال ؒ اور جناح ؒ کے عطا کردہ پاکستان میں رہتے ہوئے کوئی "پاکستانی" ان جلیل القدر شخصیتوں پر ایسا الزام عاید کرسکیگا جس کی جرأت غیروں کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس الزام کی زد سب سے زیادہ قائدِ اعظم ؒ پر پڑتی ہے کہ "انہوں نے سیاسی اور معاشی اقتدار کے حصول کے لئے مطالبۂ پاکستان کو جذباتی اور مذہبی نقاب پہنایا اور اصل غرض و غایت سب کی نگاہوں سے اوجھل رکھی"! سنیئے کہ جناح ؒ کے بارے میں غیروں کی رائے کیا تھی۔ مشہور کتاب (VERDICT ON INDIA) کے مصنف بیورلی نکلس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک بیان میں کہا تھا۔

> میں نے بیس سال پہلے پاکستان کی حمایت میں قلم اٹھایا اور ایک دنیا میری مخالف ہوگئی لیکن میں نے پاکستان کی حمایت میں جو کچھ لکھا تھا اُس کی صداقت پر مجھے اس لئے یقین تھا کہ میں مسٹر جناح کو جانتا تھا اور اگر پاکستان کی نئی نسل کے دل میں پاکستان کی محبت کم ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جناح سے واقف نہیں۔

یہ ہے جناح کی عظمتِ کردار کی شہادت غیروں کی بارگاہ سے۔

ہماری قومی زندگی کا المیہ اب یہی نہیں رہا کہ نئی نسل جناح سے واقف نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر دلدوز حادثہ یہ ہے کہ انہیں اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ ساری عمر منافقت سے کام لیتا رہا اور سیاسی و معاشی اقتدار کے لئے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلتا رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

لیکن نئی نسل کو جناح کی شخصیت سے اس قدر بے خبر رکھنے کا ذمہ دار کون؟ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں کہ ہم نے نئی نسل کو تاریخ کی یہ عظیم حقیقت سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ اس مملکت کا حصول جناح کی درخشندہ سیرت و کردار کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ اس کی سیرت و کردار کی بلندی تھی جو انگریز اور ہندو کی منظم قوتوں کو شکست پر شکست دیتی چلی گئی۔

اقبال ؒ نے قرآن کریم کے گہرے مطالعہ سے اس حقیقت کو پالیا کہ اسلام کبھی ایک زندہ دین (نظامِ حیات) نہیں بن سکتا جب تک اسے عمل میں لانے کے لئے ایک آزاد مملکت نہ ہو۔ قائدِ اعظم ؒ نے اس حقیقت کو اقبال سے سمجھا اور انہیں اس کا ایسا پختہ یقین ہوگیا کہ اس نظریے نے ان کے نزدیک ایمان کی حیثیت اختیار کرلی۔ جناح کے کیرکٹر کا یہ تابندہ پہلو، دوست دشمن ہر ایک کے سامنے تھا کہ وہ اپنی گفتار و کردار میں منافقت نہیں برتتے تھے وہ جب تک نیشنلزم کے قائل رہے کھلے بندوں کانگریس کے ساتھ رہے۔ جب ان پر اس نظریہ کا ابطال واضح ہو گیا تو وہ (کانگریس میں اتنی بلند پوزیشن کے باوجود) سب کچھ چھوڑ چھاڑ الگ ہوگئے۔ اور جب ان کے سامنے اسلام کا یہ تصور آیا تو وہ اسی قلندرانہ انداز میں، لگی لپٹی رکھے بغیر، مطالبۂ پاکستان کے داعی بن گئے۔ لہٰذا مطالبہ

پاکستان کی بنیاد :-

(۱) نہ ہندو کی تنگ نظری تھی اور نہ ہی انگریز کی کوئی حکمتِ عملی۔

(۲) نہ اس سے مقصد محض معاشی اور سیاسی اقتدار حاصل کرنا تھا، اگرچہ ظاہر ہے کہ جب اپنی آزاد مملکت وجود میں آئے گی تو اس میں سیاسی اور معاشی اقتدار لازماً حاصل ہو جائیگا۔ لیکن کسی اسکیم میں اس قسم کے مفادات کا تبعاً حصول اور بات ہے، اور ان کا اساس و بنیاد ہونا اور بات۔

(۳) مطالبۂ پاکستان کی اساس و بنیاد یہ حقیقت تھی کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے جب تک ہماری اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ اسلام سے مراد تھیاکریسی نہیں جس میں امورِ مملکت کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا آخری اختیار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم اسی اشاعت میں چند صفحات آگے چل کر بتائیں گے۔ اسلامی مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس میں امت، قرآنی اصولوں کی غیر متبدل چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے، قوانین و ضوابط خود مرتب کرتی ہے۔ اسی کا نام نظریۂ پاکستان ہے۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔ اسی سے قرآن کا معاشی نظام مرتب ہوگا۔ اور (قائداعظم رح کے الفاظ میں) قرآن کے یہی غیر متبدل اصول، ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کریں گے۔

جب تک اہلِ پاکستان، قرآن کریم کو اپنی سیاست کی اساس قرار نہیں دیتے، نہ ملک میں پیدا شدہ موجودہ انتشار ختم ہو سکتا ہے۔ نہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے، نہ کوئی ایسا آئین وضع ہو سکتا ہے جسے اسلامی کہا جا سکے۔ اور نہ ہی ایسے قوانین مرتب ہو سکتے ہیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر کیا جا سکے۔ اور نہ ہی وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ یہی ۱۴ اگست کا پیغام ہے۔

باقی رہے ہمارے یہ خزاں رسیدہ بزرگ، جو اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے ذریعے، مطالبہ پاکستان کی اصل و غایت کے متعلق بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ ان کی خدمت میں ہم عرض کرینگے کہ ان کی حیثیت اب آثارِ قدیمہ کی سی ہے، جن کی خاموشی میں ان کے وقار کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ خاموشی سے زندگی کے باقی دن پورے کریں۔ اور اس قسم کی غلط بیانیوں سے نہ قوم کو بہکائیں اور نہ ہی اپنی عاقبت خراب کریں۔ مطالبہ پاکستان کی غرض و غایت ان کے بیانات کی رہینِ منت نہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے پاکستان میں کافی سرمایہ موجود ہے (اگرچہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس سے چنداں فائدہ نہیں اٹھایا)۔ باقی رہا طلوعِ اسلام، سو اسے، اس مقصد کے لئے، کسی گوشے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے اُس زمانے کے فائل اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں اور قوم نے جب بھی تحریکِ پاکستان کی صحیح اور قابلِ اعتماد تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی اس شہادت کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

پاکستان اور قرآن کا رشتہ، ارتباطِ لفظ و معنیٰ، اختلاطِ جسم و جاں کا سا ہے۔ اس سے قرآن کو جدا کر دینے کا مطلب یوں سمجھئے جیسے سورج سے روشنی اور حرارت کو الگ کر دیا جائے۔ اس کے بعد یہ زیادہ سے زیادہ بے جان پتھروں، بے برگ و گیاہ صحراؤں اور بھیانک غاروں کا نگاہ فریب چاند بن کر رہ جائے گا۔ انسانیت کے لئے زندگی اور روشنی کا سرچشمہ نہیں بن سکیگا۔

———— (۰) ————

خانہ بر انداز چمن

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ ۔ (۵۹/۲)

وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو تباہ کر رہے ہیں۔

آنے والا مؤرخ جب مملکتِ خداداد پاکستان کی بربادی کی عبرت انگیز و خونچکاں داستان رقم کریگا تو اس میں شیخ مجیب الرحمٰن کا نام سرفہرست دکھائی دے گا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ قیامِ پاکستان سے تمہیں ہندو کی غلامی سے آزادی مل جائے گی۔ یہ بات قابلِ فہم تھی۔ لیکن شیخ صاحب نے خود پاکستان کے ایک حصہ (مشرقی بنگال) میں بسنے والے مسلمانوں کے دل میں یہ زہر بھرنا شروع کیا کہ تمہیں غیر بنگالی مسلمان کھا گئے ہیں۔ میں تمہیں ان کی غلامی سے نجات دلاؤں گا۔ خود ایک مملکت میں بسنے والے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف تعصب، نفرت اور عداوت کی یہ آگ اس طرح سلگائی گئی کہ رفتہ رفتہ وہ شعلہ جوالہ بن گئی اور باہمی منافرت کو اس شدت تک لے جا کر، شیخ صاحب نے اپنے چھ نکات پیش کر دیئے جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی حصہ کو ایک جداگانہ آزاد مملکت بنا دیا جائے۔

اُدھر یہ آگ بھڑکائی گئی اور ادھر یہ تحریک چلائی گئی کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو توڑ کر اس خطہ کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس تحریک کی ذمہ داری بھی شیخ صاحب کے سر پر عاید ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مغربی پاکستان کے جن لوگوں کی طرف سے یہ مطالبہ ابھارا گیا تھا وہ چل رہے تھے شیخ صاحب کے نقشِ قدم پر ہی۔ شیخ صاحب کی اسکیم تو آنے والے آئین کی منتظر ہے لیکن وحدتِ پاکستان کو کالعدم قرار دینے کی اسکیم پہلے ہی بروئے کار آچکی ہے۔ اس وحدت کے ٹوٹنے کے بعد، شیخ صاحب ادھر تشریف لائے ہیں اور ان صوبوں کے کان میں یہ سحر پھونک رہے ہیں کہ جس قسم کی خودمختاری بنگال کو حاصل ہوگی اسی قسم کی آزادی،

ہم تمہیں بھی دلائیں گے۔ اس اسکیم کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ یہاں ایک کے بجائے پانچ خود مختار ریاستیں وجود میں آ جائیں گی، اور جسے مملکتِ پاکستان کہا جاتا ہے اس کا وجود ختم ہو جائے گا ـــ مملکت نام ہی ایک مضبوط مرکز کا ہوتا ہے۔ جب مرکز کی حیثیت ایسی رہ جائے جیسے خط پر رسمًا ۷۸۶ لکھا جاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی مملکت کا عدم و وجود برابر ہوتا ہے۔ جس روزِ بد کو یہ اسکیم (خاکم بدہن) عمل میں آئے گی، ہندوؤں کے ہاں گھی کے چراغ جلیں گے۔ اور دیگر ممالک جن کی آنکھوں میں پاکستان کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، مسرت کے شادیانے بجائیں گے ـــ آسمان کی آنکھ نے، امتِ مرحومہ کی تباہی اور بربادی کے بڑے بڑے جگر پاش اور الم انگیز مناظر دیکھے ہیں لیکن ہمارے نزدیک، اس سانحۂ ہوش ربا سے بڑا حادثۂ فاجعہ، اس نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا ـــ وہ مملکت جسے اس قدر حسین تمناؤں، اور مقدس آرزوؤں کی آماجگاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا، وہ ربع صدی سے بھی پہلے یوں خواب پریشاں بنکے رہ جائے، ایسے قیامت خیز حادثہ کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

یہ ہیں شیخ مجیب الرحمٰن صاحب۔ اور اس سادہ دل قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ ان کے جلوس نکالتی ہے اور ان کے اعزاز میں استقبالئے دیتی ہے۔ لیکن اس میں قوم کا کیا قصور؟ اس قوم کے "لیڈروں" نے اس میں اتنا سیاسی شعور بیدار ہی نہیں ہونے دیا کہ یہ سمجھ سکے کہ فلاں تحریک کا مقصود کیا ہے اور فلاں اسکیم کا مآل کیا؟ اس وقت کرنے کا کام یہ تھا کہ یہ حضرات قوم کو اس اسکیم کے مضمرات سے آگاہ کرتے اور انہیں بتلاتے کہ اس سے کس طرح پاکستان کا نام و نشان تک صفحۂ تاریخ سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ جائیگا۔ لیکن ان لیڈروں کو اس سے کیا غرض۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد ہے۔ اور وہ یہ کہ آنے والے الیکشن میں انہیں زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل ہو جائیں تاکہ اقتدار کی کرسیاں ان کے ہاتھ میں آجائیں۔ پاکستان جائے بھاڑ میں اور قوم پڑے چولہے میں!

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے؟

لیکن ان حضرات کی کوتاہ نگہی اور ہوسِ اقتدار کی فریب انگیزی انہیں اتنی سی بات سمجھنے کی بھی فرصت نہیں دیتی کہ جب پاکستان کا خطۂ زمین ہی نہیں رہے گا تو تمہارے اقتدار کی کرسیاں بچھیں گی کہاں؟

سچ ہے جس قوم کی تباہی کے دن قریب ہوں، اس کے اربابِ دانش کی عقلوں کے چراغ گُل ہو جاتے ہیں اور انہیں امنڈتے ہوئے سیلاب بھی دکھائی نہیں دیتے! یا للعجب!! (محررہ ۵ جولائی ۱۹۷۰ء)

(اس وقت ہم اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ لکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ون یونٹ کی تنسیخ اور مجیب الرحمٰن صاحب کی اسکیم کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں لکھیں گے۔)

ـــــ (۵) ـــــ

کفر و اسلام کی جنگ

قرآنِ کریم نے، مدعیانِ خدا پرستی کے ایک گروہ کے متعلق کہا ہے کہ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا (۱۱/۹۲) تم نے خدا کو ایک طرف بطورِ ظِهْرِيًّا رکھ چھوڑا ہے۔ عرب اپنے قافلے میں احتیاطاً ایک آدھ اونٹ فالتو رکھ لیتے تھے کہ عندالضرورت اس سے کام لے لیا جائے۔ اسے وہ ظِهْرِيًّا کہتے تھے۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے (EXTRA) کہیں گے۔ جیسے کھیل کی ٹیم میں، یا فلموں میں اکسٹرا رکھے جاتے ہیں۔ وہ خدا پرستی کے ان مدعیوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ خدا سے ویسے تو کوئی واسطہ نہیں رکھتے لیکن احتیاطاً اسے ساتھ رکھ چھوڑتے ہیں کہ جب اور حربے فیل ہو جائیں تو اس سے کام لے لیا جائے۔ مذہب پرست طبقہ کے نزدیک خدا کا یہی مقام ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں، اور جب دیکھتے ہیں کہ وہ ذرائع ناکام ہو رہے ہیں تو پھر خدا کا نام سامنے لے آتے ہیں۔ آجکل ہمارے ہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اس وقت مختلف پارٹیوں کی قوتیں، الیکشن جیتنے کے لئے صرف ہو رہی ہیں۔ اس کے لئے ہر پارٹی، اپنی اپنی بساط کے مطابق مختلف ذرائع استعمال کر رہی ہے۔ لیکن مذہب کے اجارہ داروں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جہاں اپنا پلڑا ہلکا دیکھتے ہیں اور فریقِ مخالف کا بھاری، فوراً پکار اٹھتے ہیں کہ یہ کفر اور اسلام کی جنگ ہے، ہم اسلام کی خاطر مصروفِ پیکار ہیں اور فریقِ مخالف کفر کے راستے پر گامزن ہے۔ یوں یہ لوگ اسلام کو بطورِ ظِهْرِی استعمال کر رہے ہیں۔

یاد رکھئے۔ یہاں کفر اور اسلام کی کوئی جنگ نہیں۔ یہاں اسلام ہے ہی نہیں تو اس کی کفر کے ساتھ جنگ کیا ہوگی؟ یہاں ـــ مسلمان بستے ہیں اور کسی پارٹی کا یہ کہنا کہ ہم مومن ہیں اور دوسرے کافر، محض دھاندلی ہے۔ ہم میں اچھے لوگ بھی ہیں اور بُرے بھی، اور اچھے اور بُرے مختلف پارٹیوں کے اندر بھی ہیں اور ان سے باہر بھی۔ لہٰذا، کسی پارٹی کا یہ دعویٰ بھی ادعائے باطل ہے کہ ملک کے تمام اچھے لوگ ہم نے چُن لئے ہیں اور بُرے دوسروں کے حصے میں آ گئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے دعویٰ کرنے والوں کے ہاں 'بُرے لوگوں کی تعداد' دوسروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی نکلے۔

جہاں تک نماز، روزے کا تعلق ہے، سو اس باب میں حضرت عمرؓ کا وہ قول کسے یاد نہیں۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں آدمی بڑا نیک ہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس سے لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس پر بھی اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ پھر تم نے اسے مسجد میں سر اٹھاتے سر جھکاتے دیکھا ہوگا۔ تم یہ کہو کہ وہ بڑا نمازی ہے۔ یہ کیوں کہتے ہو کہ بڑا نیک

اور شریف ہے۔

اب رہا یہ دعویٰ کہ ہم یہاں اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری پارٹیاں کفر کا نظام ـــــ سو یہ بھی ایک طرف پندارِ نفس اور دوسری طرف تہمت تراشی ہے۔ ملک کی کوئی پارٹی بھی ایسی نہیں جس نے یہ کہا ہو کہ وہ اسلامی نظام نہیں چاہتی، کفر کا نظام لانا چاہتی ہے۔ نہ ہی ان میں سے کسی پارٹی کے سربراہ نے یہ کہا ہے کہ اس کا اسلام پر ایمان نہیں۔ اس سلسلہ میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ یہ درحقیقت کفر کا نظام لانا چاہتے ہیں لیکن زبان سے ایسا کہتے نہیں۔ سو یہ پہلے سے بھی شدید تر زیادتی ہے۔ آپ نے کیا ان کا سینہ چیر کر نفاق و اخلاص کی پرکھ کر لی ہے؟ اور اگر سوال تمہارے قیاس کا ہے، تو یہی کچھ فریقِ مخالف آپ کے متعلق کہہ سکتا ہے۔

لہٰذا، آپ ان لوگوں کے فریب میں نہ آیئے جو کہتے ہیں کہ یہاں کفر اور اسلام کی جنگ برپا ہے۔ یہاں مسلمانوں کی مختلف پارٹیوں میں الیکشن کے لئے رسہ کشی ہو رہی ہے جس کا کفر اور اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ "خدا" ان میں سے کسی کے بھی ساتھ نہیں۔ جہاں تک "سوشلزم" کے خلاف محاذ کا تعلق ہے، سو (جیسا کہ ہم متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں) سوشلزم کے حامی اس اصطلاح کو اختیار کرنے میں اجتہادی غلطی کر چکے ہیں اور اب اپنی بات کی پچ میں اس پر اڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ ہم اسلام کو تیاگ کر پاکستان میں وہ ملحدانہ فلسفۂ زندگی رائج کرنا چاہتے ہیں جسے مارکس اور لینن نے وضع اور اختیار کیا تھا۔ اس کے برعکس یہ حضرات بار بار اسلام پر اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اس امر کا اعلان کر دیں کہ سوشلزم سے ہماری مراد وہ فلسفۂ حیات نہیں جو اسلام کی ضد ہے۔ اس سے ہمارا مقصد صرف وہ معاشی نظام ہے جسے سوشلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جو قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ اگر یہ حضرات ایسا اعلان کر دیتے تو فریقِ مخالف کو ان کے خلاف اس قدر غلط فہمیاں پھیلانے کا موقع نہ ملتا۔ بایں ہمہ جب یہ لوگ بار بار اعلان کرتے ہیں کہ اسلام پر ہمارا ایمان ہے تو کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کرے۔ جہاں تک سوشلزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، اسے تو جماعتِ اسلامی بھی اپنے منشور میں اختیار کر چکی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ سوشلزم کے حامی کھلے بندوں ایسا کہتے ہیں اور یہ حضرات حسبِ معمول اپنی "حکمتِ عملی" کی اوٹ میں ـــــ چوں زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید!

باقی رہا فتویٰ، سو اگر آج امریکہ کی چین کے ساتھ صلح ہو جائے تو سوشلزم کا کفر اسلام سے بدل جائے گا۔

ان خدا پرستوں کے کفر اور اسلام کے متعلق، غالب بہت پہلے کہہ گیا ہے کہ

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

ـــــ ([illegible]) ـــــ

بیس سال پہلے کی بات

جشنِ آزادی

تشکیل پاکستان کے بعد چند سالوں تک، ہم ہر سال، ۱۴ اگست کے جشنِ آزادی کی تقریب پر قوم کے سامنے ایک آئینہ رکھا کرتے تھے تاکہ وہ اس میں دیکھ سکے کہ ہم نے گزشتہ سال میں کیا کیا ہے اور آج ہماری حالت کیا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے پہلے جشنِ آزادی کی تقریب پر ہم نے جو محاسبۂ خویش پیش کیا تھا، اسے ہم دو سال پہلے انہی صفحات پر دوبارہ سامنے لا چکے ہیں۔ اشاعتِ حاضرہ میں ہم ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کے جشنوں کی تقاریب پر پیش کردہ محاسبہ کو دہراتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ آج سے بیس سال پہلے ہماری حالت کیا تھی اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اگر صورت یہ ہے کہ اس بیس سال کے عرصہ میں ہم پہلے سے بھی زیادہ گہری پستیوں میں گر چکے ہیں، تو اس سے ہم اپنے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس کے دل سے پوچھیے، اس کے جگر سے پوچھیے
آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو!

۱۹۴۹ء میں، عید الفطر اور یوم آزادی کے جشن یکے بعد دیگرے منائے گئے تھے اس لئے اُس سال ہمارا پیغام بھی دہرا تھا۔ آپ ان پیغامات کو پڑھیے، اور پھر اس آئینہ میں اپنی آج کی شکل دیکھیے۔

شاید کہ خود را باز آفرینی!

(۱)

"زیر نظر پرچہ جب آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو آپ ایک جشن منانے سے فارغ ہو چکے ہوں گے اور دوسرا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ ایک "دینی" جشن، ایک "دنیاوی" جشن۔ ایک عید الفطر کا جشن اور دوسرا ۱۵ اگست کو جشنِ آزادی۔ طرب و نشاط کے مواقع اور جشن و مسرت کی تقاریب پر آلام و مصائب کے تذکرے اور دکھ اور درد کی داستانیں موزوں نہیں سمجھی جایا کرتیں۔ لیکن

دل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ دہِ راز نہ ہو

وہ آنسو جو آنکھ کے آبگینے سے بے اختیار چھلک پڑے اسے خونابۂ دل کی طرف واپس لوٹا دینا کس کے بس کی بات ہے۔ جب سینہ، ہجوم مصائب اور انبوہِ آلام سے تمام داغ داغ ہو رہا ہو تو اس ناسور کو رسنے سے کون روک سکتا ہے۔ جشن و مسرت کے اس قسم کے ہنگامے تو بربطِ تحت الشعور میں سوئے ہوئے المیہ نغمات کے لئے اُلٹے مضراب بن جاتے ہیں اور جب کیفیت یہ ہو کہ

نغمے بیتاب ہوں تاروں سے نکلنے کے لئے

تو پھر ہمارے یہ دکھ بھرے گیت آپ کی طرب نشاط کی محفلوں کو سوگوار بنا دیں تو ہم معذور ہیں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا

اگر آپ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں اور جھوٹی ہنسی کا نام شگفتگیٔ قلب اور بشاشتِ نگاہ رکھ لیتے ہیں تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔

جشن عید

آپ ابھی ابھی جشن عید سے فارغ ہوئے ہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں اور آپ سینہ پر ہاتھ رکھ کر ہمیں بتائیے کہ کیا آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ بالآخر یہ عید ہے کیا اور اس تقریب کو کیوں منایا جاتا ہے ــــ رمضان کیا ہے؟ اور روزے کس لئے رکھے جاتے ہیں۔ اگر آپ نے ان امور کو درخورِ غور و تفکر نہیں سمجھا اور عید کی تقریب اس لئے مناتے ہیں کہ یہ اسی طرح سے منتی چلی آ رہی ہے تو کیا آپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے فی الواقعہ جشنِ مسرت سے تعبیر کریں۔

قوم کے ایک کثیر طبقہ کی (جس میں غریبوں کی اکثریت ہوتی ہے) "مذہب" سے شیفتگی اور وابستگی کا اب تک یہ عالم ہے کہ گھر میں کھانے کو نہیں، حتیٰ کہ گھر تک بھی نہیں، سر چھپانے کا آسرا نہیں۔ پیہم فاقوں سے بدن میں قوتِ مدافعت نہیں، جسم میں خون کا نشان تک نہیں۔ دن بھر چلچلاتی دھوپ میں مشقت کرتے ہیں تو بمشکل نانِ جویں نصیب ہوتی ہے۔ وہ بھی التزاماً نہیں۔ یہ حالات ہیں اور "مذہب" سے وابستگی کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان آتا ہے تو نہایت پابندی

غریبوں کے روزے

سے روزے رکھتے ہیں۔ سحری کے لئے اٹھتے ہیں تو بسا اوقات صرف پانی پی کر روزے کی نیت باندھ لیتے ہیں کیونکہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں۔ اگر کچھ ملتا ہے تو وہ سوکھی روٹی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یوں روزہ رکھتے ہیں اور دن بھر دھوپ میں محنت کرتے ہیں۔ شام کو انہیں دیکھئے تو ضعف و اضمحلال

سے ان پر مردنی چھا رہی ہوتی ہے۔ افطار کے لئے انہیں نمک سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ دن بھر کی کمائی سے بمشکل دال روٹی نصیب ہوتی ہے۔ رات کو گیارہ بجے تک نماز اور تراویح سے فارغ ہوتے ہیں۔ تین چار بجے پھر اٹھ بیٹھنا ہوتا ہے اور دن بھر سونے کے لئے کوئی وقت نہیں ملتا۔ ان حالات میں اللہ کے یہ بندے روزے رکھتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جس قوم کا عزم ایسا راسخ ہو اور تکالیف برداشت کرنے کی ہمت ایسی کوہ شکن، وہ قوم دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ لیکن مولوی ان کا خیال تک بھی اس طرف آنے نہیں دیتا۔ وہ انہیں یہ کہہ کر سلائے رکھتا ہے کہ یہ تمام "اعمال" تمہارے "اعمال نامہ" میں لکھے جا رہے ہیں۔ قیامت میں ان سب کا "وزن" ہوگا۔ اور جس کا پلڑا بھاری ہوگا اُسے جنت میں بھیجد یا جائے گا۔ باقی رہی یہ دنیا، سو دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ یہاں کوئی جس قدر ذلیل و خوار ہوگا، خدا کی

سب کچھ آخرت پر

نظروں میں اسی قدر مقبول و محبوب قرار پائے گا۔ یہاں جتنا غریب مفلوک الحال ہوگا وہاں اتنا ہی غنی اور مرفہ الحال ہوگا۔ یہاں کی دولت و ثروت کافروں اور "دنیا داروں" کا حصہ ہے جن کے لئے آخرت میں کچھ نہیں۔ وہ اس طرح امیروں اور سرمایہ داروں کا آلۂ کار بن کر ان غریبوں اور محتاجوں کو افیون پلائے جاتا ہے۔ اور وہی قوم جسے ان ہی نمازوں اور روزوں کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ملوکیت، برہمنیت اور سرمایہ داری کے ہر ملعون نظام پر برق خاطف بن کر گرنا تھا، اس نظام کے استحکام و استبقار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

یہ وہ انسانیت کش حربہ تھا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں ایجاد ہوا۔ اور اب ہزار برس سے متوارث و متواتر چلا آرہا ہے۔ اور "اسلاف کے مسلک" کا لیبل اپنے اوپر لگا کر، مقدس و متبرک بن چکا ہے کہ جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے اس کی آنکھ نکال دی جائے۔ کوئی خدا کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ جن "اعمال" کو خدا نے آخرت سے پہلے، اسی دنیا کی بہترین متاع کا ذریعہ قرار دیا تھا، جن کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ان کا لازمی اور حتمی نتیجہ دنیا کی بادشاہت بھی ہے، جن کے حاملین کے متعلق برملا کہہ دیا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت انہیں مغلوب نہیں کر سکے گی جس نظام کے متعلق ساری دنیا میں اعلان کر دیا تھا کہ یہ نظام، تمام دیگر نظاہائے زندگی پر غالب رہے گا اور صرف بتا ہی نہیں دیا تھا بلکہ اس قوم نے

اس دنیا کی بادشاہت

جس نے سب سے پہلے ان "اعمال" کو ضابطۂ زندگی بنایا تھا، انہوں نے دکھا دیا تھا کہ کس طرح چند سالوں کے عرصہ میں، ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی صحرانشین قوم، قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کی مالک بن جاتی ہے۔ ان "اعمال" کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ انہیں دنیاوی جاہ و ثروت، عزت و تکریم، دولت و حشمت، قوت و حکومت سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ سب شان و شوکت جھوٹے لوگوں کی مینا کاری ہے جو کافروں اور "دنیا داروں" کو جہنم کی طرف لے جانے کے لئے شیطان نے وضع کر رکھی ہے۔" اللہ والے وہی ہونگے جو سب سے زیادہ خراب خستہ حالت میں رہیں گے۔ یہ ہے وہ افیون جسے ملوکیت، برہمنیت اور تارونیت کی ملی بھگت نے وضع کیا اور جس سے قوم کے قوائے عملیہ کو اس درجہ

(حاشیہ صفحہ ۱۹ پر)

مفلوج و مشلول کر دیا گیا ہے کہ اب وہ اسی موت کو عین زندگی اور اسی خواب کو عین بیداری سمجھ رہے ہیں۔

کہئے کہ یہ مقامِ ماتم ہے یا ہنگامِ مسرت!

جب امت کے سامنے ان احکامِ قرآنی کی حقیقت بے نقاب تھی تو اس وقت یہی نماز اور روزے کیا نتائج مرتب کیا کرتے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۲ھ میں پہلی بار روزے فرض ہوئے۔ انہوں نے قوم کے اندر وہ انقلاب پیدا کیا

انہی روزوں نے انقلاب برپا کر دیا تھا

کہ ابھی سترہ روزے بھی پورے نہ کئے تھے کہ پوری کی پوری ملت (جو اس وقت صرف تین سو تیرہ نفوس پر مشتمل تھی) مخالفین کی متحدہ قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بدر کے میدان میں پہنچ چکی تھی۔ روزے قوم کی صلاحیتوں کو کس طرح بیدار اور اجاگر کرتے ہیں، اس کی شہادت بدر کے ذرات آج تک دیتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی روزہ داروں کی وہ جماعت کہ جب وہ اس طرح فاتح و منصور واپس لوٹی ہے تو وہ اس انقلابِ عظیم پر وجد و مسرت سے اپنے رب کے حضور والہانہ طور پر سجدوں میں گر گئی۔ اس تقریب کا نام تھا "جشنِ عید"۔ اس لئے کہ جس قوم کے ذمہ ساری دنیا سے ظلم و استبداد مٹا کر اس کی جگہ عدل و انصاف قائم کرنے کا فریضہ عاید ہو رہا ہو، ان کے جشن منانے کے انداز بھی دنیا سے نرالے ہوتے ہیں۔ ساری دنیا کا قاعدہ ہے کہ جشنِ کامرانی کو عیش و عشرت کے تنوعات سے منایا جاتا ہے۔ لیکن انہیں اس موقعہ پر بھی یہ کہا گیا تھا کہ دیکھنا! فتح کی خوشی اور کامیابی کے غرور میں اپنے نصب العین کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ۔ جب خدا کی تائید و نصرت اور فتح و کامرانی سے تم بہرہ یاب ہو، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْہُ۔ تو اپنے خدا کے نظامِ ربوبیت کو موجبِ حمد و ستائش بنانے کے لئے، اور جذب و انہماک سے سرگرداں ہو جاؤ۔ (تسبیح) اور اس سے توفیق مانگو کہ تمہارے اعمالِ حسنہ کے بھرپور نتائج تمہاری چھوٹی چھوٹی تدبیری کوتاہیوں کے اثرات کو زائل کر دیں۔ (استغفار) اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔ کہ اس کا قانون یہی ہے کہ جب تم غلط راہوں سے منہ موڑ کر صحیح راستہ پر آ جاؤ تو ہر قدم پر منزل قریب تر ہوتی جائے گی۔ (توبہ)

یہ تھا وہ جشنِ مسرت جو اس فاتح و منصور قوم کو بتایا گیا تھا۔ یہ تھی پہلی عید، اور اس کے چھ سال بعد وہ عید جو فتح مکہ کے جشن کی تقریب میں منائی گئی۔ وہ مکہ جس سے یہی قوم، آٹھ سال پہلے اس طرح نکالی گئی تھی جس طرح تمہیں دو سال اُدھر دہلی اور مشرقی پنجاب سے نکالا گیا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں اس مشقت اور تکلیف سے روزے رکھنے والوں اور اس کے بعد جشنِ عید منانے والوں سے کہ کیا تمہارے روزے وہی نتائج پیدا کر رہے ہیں جو ان سے مقصود و منصور تھے؟ اور اگر ان سے وہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے ہیں تو کیا تمہیں کبھی اس طرف خیال کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ ہماری اس قدر شاقہ محنت جو

---

(۱) مذکرہ صاحب عزیز کیلئے میں دیکھئے۔ فرعون، ملوکیت کا علمبردار تھا، ہامان، برہمنیت (PRIESTHOOD) کا نمائندہ اور قارون سرمایہ داری کا مجسمہ ہے۔ اور ان تمام بتوں کو توڑنے کے لئے عصائے موسویؑ۔

یوں منائے جارہا ہے، اسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے کیا کیا جائے۔ یاد رکھئے! اس کا صحیح جواب آپ کو مولوی[1] کی بے روح وعظوں اور بے جان خطبوں سے نہیں ملے گا۔ کہ "مولویت" اس نظام ملوکیت و سرمایہ داری کی مؤید و مبلغ ہے جس نے اس کی تخلیق کی تھی۔ اس کا صحیح جواب آپ کو ملے گا قرآن سے جو اس نظامِ برہمنیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔"

(۹)

جشنِ آزادی

"اس دینی جشن" کے بعد اب آئیے اپنے "دنیاوی جشن" کی طرف جسے آپ جشنِ آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوموں کی زندگی میں بعض واقعات ایسے آتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن "یاد" کوئی بت نہیں ہوتی کہ اس کی پرستش کی جائے۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے شعورِ ملّی میں اس انقلاب کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا جس کی یاد قائم رکھی جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں اسی قسم کا ایک انقلاب آفریں دن آیا جسے ہم یومِ آزادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دن درحقیقت ایک حدِ فاصل تھا ہماری گزشتہ اور آئندہ زندگی میں۔ یہ دن تھا اس عہد کا کہ ہماری آنے والی زندگی گزشتہ زندگی سے یکسر مختلف ہوگی۔ ہماری گزشتہ زندگی تھی غیروں کے بنائے ہوئے نظام کے تابع چلنے کی۔ وہ نظام جو موجب تھا ہمارے اخلاقی تسفّل اور تعلیمی تنزل کا۔ جس نے ہمیں انسانیت سے یکسر بے بہرہ بنا رکھا تھا جس نے انسانوں کی دنیا کو درندوں کا بھٹ بنا رکھا تھا۔ جس میں ہر سرمایہ دار غریبوں کی محنت کے اثمار و نتائج پر سانپ بن کر بیٹھا رہتا تھا جس میں مزدوروں کے خون کی سُرخی، اربابِ ثروت کے عشرت کدوں کی رنگینی کا سامان فراہم کرتی تھی جس میں غریبوں کی ہڈیاں، امراء کے قصرِ تعیش کے لئے چونہ بنتی تھیں۔ وہ نظام جس نے ہمیں انسانیت سے بہت نیچے گرا کر، حیوانیت کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا، بلکہ اس سے بھی نیچے۔ دو لفظوں میں یوں کہیئے کہ وہ نظام جس نے ہمیں خیر و برکت کے سرچشمۂ ابدی (ذاتِ خداوندی)

کسوٹی تبدیل؟

سے بہت دور پھینک دیا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اس اعلان کا دن تھا کہ جاء الحق وزھق الباطل۔ وہ انسانیت سوز نظام ختم ہوا اور اب اس کی جگہ ایک نئے نظام کا دور شروع ہوا جس کا سرنامہ "احترامِ آدمیت" ہے۔ کسی کو اس اعلان پر شبہ ہو تو ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قوم نے اس اعلان کو بالکل ایسا سمجھا تھا۔ اس نے دس سال اسی "اعلان" کی خاطر جد و جہد کی تھی۔ ہم نے اپنے دعوے کی بنیاد اسی اعلان پر رکھی تھی اسلئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اسی اعلان و اعلام کا دن تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو

---

[1] واضح رہے کہ مولوی سے ہماری مراد کوئی خاص شخص یا اشخاص کی جماعت نہیں بلکہ یہ اس ذہنیت کا نام ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور جس نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اس نظامِ زندگی کو پھر سے زندہ اور مستحکم کر دیا جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ذہنیت، تقلیدِ آباء کی اندھی روش سے متوارث چلی آرہی ہے اور اس کے مظہر کا نام ہے مولوی۔

اس کی پہلی سالگرہ منائی گئی۔ اور اب ۱۵ اگست ۱۹۷۱ء کو دوسری منائی جارہی ہے۔

ہم کسی تفصیل میں الجھے بغیر، پاکستان کے تمام اصاغر و اکابر سے خدا کے نام پر پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الواقعہ ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء کا دن تمہاری پہلی اور بعد کی زندگی میں حد فاصل بن گیا تھا اور کیا اس کے بعد ان دو برسوں میں تم نے اس حد سے دو قدم آگے بڑھائے ہیں؟ اس کا جواب باہر سے نہ مانگئے، خود اپنے دل سے مانگئے۔ اقراء کتابک و کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا. (۱۷/۱۴) اپنا اعمالنامہ پڑھو ـــ کہ یہ گھڑی حشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے ــــ اور پھر کسی اور سے شہادت طلب نہ کر، بلکہ اپنے آپ سے پوچھ کہ آج خود تیری ذات تیرے محاسبہ کے لئے کافی ہے۔ یوں محاسبہ کر اور پھر سوچ کہ کیا تیری غیرت گوارا کرتی ہے کہ تو اس مزعومہ حد فاصل کی یاد میں جشنِ مسرت منائے؟ اگر آپ کا دل فی الواقعہ گواہی دیتا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء کا دن، ہماری زندگی میں ایک حد فاصل بن گیا تھا اور اس کے بعد ہم اس حد سے برابر آگے بڑھتے جارہے ہیں تو آپ کو زیب دیتا ہے کہ اس دن کی یاد میں چراغاں کیجئے، جشن منایئے۔ ساری دنیا کو اس انقلاب عظیم پر دعوتِ فکر و نظر پیش کیجئے۔ اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے سر اٹھا کر چلئے۔ لیکن اگر آپ کا دل اس کی گواہی نہیں دیتا تو اپنے آپ کو دھوکہ میں نہ رکھیئے کہ یہ دھوکہ تمہیں اپنوں اور بیگانوں سب کی نظروں میں ذلیل کردے گا۔

ہے کوئی خدا کا ایسا بندہ جو اپنے دل کی سچی سچی گواہی کو ۱۵ اگست کے دن ساری ملت کے سامنے اعلانیہ پیش کر دے!

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!"

ـــــــ (۰) ـــــــ

جشنِ آزادی ۱۹۵۰ء

ظہر الفساد فی البر و البحر

زندگی کے ہر گوشہ میں ناہمواریاں نمودار ہوگئیں

"مقامِ مسرت و اطمینان ہے کہ علی رغم انف عدو سرزمین پاکستان پر زندگی کا تیسرا سال بھی خیریت سے گزر گیا اور اس کے بدخواہوں نے اس سرزمین کی تباہی کے لئے جو منصوبے باندھ رکھے تھے وہ ان کی ہزار آرزوؤں اور کوششوں کے باوجود خاسر و نامراد رہے۔

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

دوسروں کے لئے پاکستان کی سرزمین شاید اس لئے عزیز ہو کہ یہاں انہیں جان اور مال کی سلامتی کا گوشہ یا ان کی خوش حالیوں اور ترقیوں کا ذریعہ مل گیا۔ یہ امر بجائے خویش کچھ کم گراں قدر نہیں۔ دنیا میں امن و سلامتی کی ضمانت

اور بہبودیوں اور مرفہ الحالیوں کی کفالت ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن طلوع اسلام کے نزدیک پاکستان اس سے کہیں زیادہ عزیز تر ہے، اسلئے کہ اسکے تصورات کے مطابق، یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہمیں یہ امکانی قوت حاصل ہے کہ ہم چاہیں تو اس قرآنی نظام کو پھر سے مشہود صورت میں سامنے لے آئیں جو نوع انسانی کی فلاح و سعادت کا موجب ہے اور جس کی عدم موجودگی سے انسانیت اس قدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ مصور پاکستان حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے جب ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو اس کا یہی مقصد بتایا تھا کہ اس سے مسلمان اس نہج کی زندگی بسر کرنے کا امکان حاصل کرلیں گے جو ان کے لئے ان کے خدا نے متعین کی اور جسے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ان کے رسول نے متشکل کر کے دکھا دیا۔ طلوع اسلام اسی پیغام حقیقت کشا کا نقیب اور اسی دعوتِ انسانیت ساز کا علمبردار ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک پاکستان کی سرزمین عزیز ترین متاعِ حیات ہے کہ اسی خاک سے وہ اس شجرِ طیب کی نمود بالیدگی کی توقعات رکھتا ہے جس کے متعلق خالقِ فطرت نے کہا ہے کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔

پھر یہ حقیقت ہے کہ جو شے جس قدر زیادہ عزیز ہوتی ہے، اسی قدر اس کی حفاظت کی فکر زیادہ گہری ہوتی ہے۔ جس بوڑھے باپ کا ایک ہی بچہ ہو اور اس بچے کے ساتھ اس کی زندگی کی تمام آرزوئیں وابستہ، وہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یوسف کی محبت دیدۂ یعقوب ہی سے پوچھی جا سکتی ہے۔

لیکن وہ محبت، محبت نہیں، دشمنی ہے جس میں تربیت کو نظر انداز کر دیا جائے یا اپنے آپ کو غلط اطمینان سے فریب میں رکھا جائے اور اس طرح حقائق سے چشم پوشی کرلی جائے۔ جس بچے سے محبت ہوتی ہے اسے کسی وقت چھینک بھی آ جائے تو اس کا باپ فوراً کسی حکیم کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بچے کو تپ دق ہو رہی ہو اور وہ اس پر بھی یہ سننے کے لئے تیار نہ ہو کہ بچہ بیمار ہے۔ یہی تقاضائے محبت ہے جس نے آج تک طلوع اسلام کو پاکستان کی داخلی خرابیوں کیطرف سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔

کشتی کی خیریت

کشتی کا سوراخ صرف ملاحوں کا نقصان نہیں ہوا کرتا بلکہ کشتی کے مسافروں کا بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس لئے جو مسافر کشتی میں سوراخ ہوتے دیکھ کر اس لئے خاموش رہے کہ اس سے میرا کیا بگڑتا ہے، کشتی خراب ہوتی ہے تو نقصان ملاحوں کا ہے، اس سے زیادہ ناداں کوئی نہیں۔ اور جب صورت یہ ہو کہ وہی مسافر اور وہی ملاح ہوں تو پھر ایسے وقت میں اغماض اور خاموشی نادانی ہی نہیں، جرم بن جاتی ہے۔ طلوع اسلام اپنے اس فریضہ کا پوری طرح احساس رکھتا ہے اور یہی احساس ہے جو اسے اس پر مسلسل آمادہ رکھتا ہے۔ وہ پاکستان کی داخلی کمزوریوں کو تنقیدی نگاہ سے پرکھتا ہے تاکہ مرض کا علاج شروع ہی میں ہو جائے۔ آج کی صحبت میں بھی جو کچھ عرض کیا جائے گا، وہ اسی احساس کا نتیجہ اور اسی فریضہ کا مظاہرہ ہوگا۔

آپ کراچی سے خیبر اور کوئٹہ سے لاہور جہاں جی چاہے چلے جایئے (اور یہی حال مشرقی پاکستان کا ہے) سفر

میں ، حضر میں ، شہروں میں ، بستیوں میں ، جنگلوں میں ، پہاڑوں میں ، دفتروں میں ، بازاروں میں ، گھروں میں ، محفلوں میں ، خلوتوں میں ، جلوتوں میں ، ریلوں میں ، لاریوں میں ، سڑکوں میں ، گلیوں میں کسی مقام پر جائیے ، اور کسی سے بات کیجئے آپ

ہر شخص نالاں

کو بالعموم ہر شخص نالاں و گریاں دکھائی دے گا کہ پاکستان میں ظلم ، ناانصافی ، رشوت ستانی ، بددیانتی ، اعزہ پروری ، اقربا نوازی ، بداخلاقی ، بے حیائی عام ہو گئی ہے ۔ عدالتوں میں ، دفتروں میں ، بازاروں میں ، غرضیکہ جہاں بھی انسان کو انسان سے واسطہ پڑتا ہے ، کوئی معاملہ بھی اصول اور قانون کے ماتحت طے نہیں پاتا ۔ بلکہ ذاتی مفاد پرستیوں اور شخصی مصلحت کوشیوں کے مطابق فیصل ہوتا ہے ۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر صاحب اختیار اپنے اختیارات کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے ۔ رشوتوں کے چرچے کھلے بندوں ہوتے ہیں ۔ مراعات کی خرید فروخت علی الاعلان ہوتی ہے ، اور جو چیزیں بازاروں میں علی الاعلان بکتی نہیں وہ ذخیرہ اندوزی کی کوٹھڑیوں میں بلیک مارکیٹ کی سیاہ چادر کے نیچے فروخت ہوتی ہیں ۔ دفاتری شعبوں میں حکامِ بالا ماتحتوں کی نالائقی اور کام چوری سے نالاں ہیں ، اور ماتحت افسرانِ بالا کی حرام خوری اور اعزہ نوازی کے شاکی ۔ محتسبین کے متعلق شکایت ہے کہ سوئی کی چوری پر کہرام مچا دیا جاتا ہے اور پہاڑ کے پہاڑ نہایت صفائی سے ہضم کرا دیئے جاتے ہیں ۔ یہ باتیں ہر شخص کی زبان پر ہیں ۔

اس میں شک اسی کو ہو سکتا ہے جو کبھی اپنے محلات کی خلوتوں سے باہر نکل کر عوام سے ملا جلا نہیں یا اگر کبھی باہر آتا ہے تو ان سرکاری نمائندوں کے نرغے میں گھرا رہتا ہے جن کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ نہ عوام کو ان کے قریب آنے دیں ، نہ ان کی کوئی بات ان کے کان تک پہنچنے دیں اور ہر سوال کے جواب میں " ہر طرح خیریت ہے " کہہ کر ان کے حسنِ انتظام اور شائستگی نظم و نسق کے قصیدے پڑھتے رہیں ۔ سنا ہے کہ پچھلے زمانے میں بادشاہ راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کے حالات معلوم کیا کرتے تھے اور یہ سنا کرتے تھے ۔ کہ کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا ——— ہمارا خیال ہے کہ ہر وہ صاحبِ اقتدار جسے ان حقائق کی صداقت میں جو اوپر گزارش کئے گئے ہیں ، کچھ شبہ ہو ، اس طرح سے بھیس بدل کر سنے کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں ، تو وہ خود اس کی شہادت دے گا کہ لوگوں کے احساسات اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں ۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں سے عام طور پر ضابطے اور اصول کا احترام اٹھتا جا رہا ہے اور ان کے دلوں سے پاکستان کی حکومت کا اعتماد روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے ۔ وہ عناصر جو شروع سے پاکستان کے مخالف چلے آ رہے تھے لیکن آج اپنی مصلحت کوشیوں کے تحت پاکستان کی کھلی کھلی مخالفت نہیں کر سکتے ، وہ اس صورتِ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو اور مشتعل کر رہے ہیں ۔ اس سے کسی کے پیشِ نظر (خاکم بدہن) خود پاکستان کی تخریب ہے اور کسی کے سامنے حکومت کی کرسیوں پر خود متمکن ہونے کی آرزو ۔ ایک مردِ مومن نے کہا تھا کہ

سفینۂ برگِ گل بنا لیگا قافلہ مورِ ناتواں کا

اور دوسرے مرد مومن نے اس نیک فال کو پورا کر کے دکھا دیا۔ کہ

ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ طوفاں سے پار ہوگا!

لیکن آج کاروانِ مورِ ناتواں کی یہ نرم و نازک کشتی ہے اور ہزاروں مضر صورت * بدخواہ اس میں سوراخ کرنے کے درپئے

اس سے سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں

اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی ان جرأتوں کا راز صرف اس میں ہے کہ یہاں وہ صورتِ حالات پیدا ہو گئی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

اگر کسی کو فطرت کے اس اٹل قانون پر یقین نہ بھی ہو کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا اگر اس میں ہر شے اپنے اصل مقام سے ہٹ چکی ہو، تو بھی کم از کم تاریخ کی شہادتیں ہی اس کو اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے کافی ہونی چاہئیں، کہ جو حالات ہمارے ہاں پیدا ہو چکے ہیں وہ بعینہٖ وہ نقشہ پیش کرتے ہیں جو سلطنتوں کے زوال کے وقت ہوا کرتا ہے۔ گبن کی " انحطاط سقوط رومۃ الکبریٰ " کی تاریخ اٹھائیے وہ اس عظیم الشان سلطنت کے زوال کے وقت اسی قسم کی صورتِ حالات بتاتا ہے۔ دور نہ جائیے۔ ابھی کل کی بات ہے سلطنتِ مغلیہ کو دیکھئے۔ اس کے آخری ایام میں ملک کی یہی حالت ہو چکی تھی۔ دنیا میں کمزور اور طاقتور سلطنتوں کے حالات کا موازنہ کیجئے، وہی سلطنتیں کمزور دکھائی دیں گی جن میں اس قسم کے حالات پیدا ہو چکے ہونگے۔ بیشک سامان اور اسلحہ بڑی چیز ہے۔ لیکن جس ملک میں اخلاقی بنیادیں اس درجہ کھوکھلی ہو چکی ہوں، وہاں سازوسامان اور آلات و اسلحہ بھی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر قلبِ حساس کو خون کے آنسو رُلا دینے کے لئے کافی ہے کہ تاریخ میں جو صورت سلطنتوں کے انجام کے وقت پیدا ہوتی تھی، ہمارے ہاں وہ صورت آغاز ہی میں پیدا ہو گئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سوائے ان بدنہادوں کے جو پاکستان کی مخالفت کا چور دل میں لئے بیٹھے ہیں، کوئی پاکستانی بھی پاکستان کی تخریب کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔ عوام نہیں ہو سکتے کہ انہیں سر چھپانے کے لئے کوئی اور جگہ نہیں۔ خواص نہیں ہو سکتے کہ ان کا موجودہ عروج پاکستان ہی کی بدولت ہے ــــ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے ــــ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اصلاح کا طریق یہ سمجھا گیا ہے کہ عوام اربابِ نظم و نسق کو کوستے رہتے ہیں اور اوپر کے طبقے والے عوام کی شکایات کرتے رہتے ہیں حالانکہ دونوں طبقے مل کر قوم بنتے ہیں اور جو حالات اس وقت پیدا ہو چکے ہیں وہ ساری قوم کے ہیں، کسی ایک طبقہ کے

ساری قوم کی خرابی

نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری یہ تمام قومی خرابیاں دبی ہوئی تھیں، اب انہیں ابھرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پہلے فسادِ خون اندر تھا۔ اب وہ پھوڑے پھنسیاں بن کر جلد پر نمودار ہو گیا ہے۔ خون کا فساد کسی ایک حصۂ جسم تک محدود نہیں ہوا کرتا، سارے جسم

میں یکساں طور پر موجود ہوتا ہے۔ ایک بات البتہ ضرور قابلِ لحاظ ہے۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ ذمہ داریوں کا بوجھ خود بخود انسان کو راہِ راست پر لے آیا کرتا ہے۔ ذمہ داریوں کو اپنے سر لینے والوں سے اس قسم کی توقع بھی بے جا نہیں ہوا کرتی۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ چونکہ ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے حکومت نہیں کی تھی اس لئے ہمیں ابھی حکومت کے سلیقے نہیں آتے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ نالائقی (INEFFICIENCY) کا ظہور ہونا چاہیئے۔ فقدانِ سیرت (CHARACTERLESS-NESS) کا نہیں۔ سیرت (CHARACTER) کی بہت سی خامیاں ضبط سے دور ہو جایا کرتی ہیں اور اگر انسان چاہے تو اپنے اندر ضبط پیدا کر سکتا ہے۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ اربابِ نظم و نسق اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے اپنے اندر ضبط پیدا کریں گے اور اس ضبط سے نظم و نسق کی وہ خرابیاں دور ہو جائیں گی جو عدم ضبط سے پیدا ہوا کرتی ہیں لیکن اس وقت تک کے شواہد اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اربابِ نظم و نسق ضبطِ نفس پیدا نہیں کر سکے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو ان کی مثال سے عوام بھی اپنے اندر نظم و ضبط (DISCIPLINE) پیدا کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بڑی حد تک اربابِ حل و عقد کو قوموں کی تباہی اور کامیابی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

لیکن اس مشکل کا حل یہ بھی نہیں کہ فلاں گروہ اپنے اندر فلاں بات پیدا نہیں کر سکا تو اس کو مطعون کر دیا جائے۔ مسافروں کی ناعاقبت اندیشی سے یا ملاحوں کی خرابئ فکر و نظر سے کشتی میں چھید ہو رہے ہیں۔ اور سوال صرف یہ ہے کہ یہ چھید کس طرح بند ہوں۔ اگر یہ چھید بند نہ ہوئے تو نہ مسافر ہی باقی بچیں گے نہ ملاح۔

اس قسم کے حالات میں ایک طریقِ کار یہ ہوا کرتا ہے کہ قوم میں کوئی ایک شخصیت ایسی پیدا ہو جائے جو پورے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اپنے فیصلوں کو بچوں کے استاد کی طرح ناطقانہ طور پر منواتی چلی جائے۔ ایسی شخصیت محض اپنی صلاحیت اور بلندئ کردار کی بنا پر زمامِ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ اسے عوام کی سستی مقبولیت (CHEAP POPULARITY) کی قطعاً فکر نہیں ہوتی۔ وہ ایک مشفق جراح ہوتا ہے جو مریض کی

کسی بلند ہستی کی نمود

چیخ و پکار کی پرواہ کئے بغیر لاعلاج حصوں کو کاٹ کر الگ کر دیتا ہے اور قابلِ اصلاح زخموں میں نشتر پیوست کئے چلا جاتا ہے۔ ترکی کی مثال شاہد ہے کہ ایسے گئے گزرے حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اس قسم کی شخصیت کا ابھر کر اپنی قوم پر نمودار ہو جانا قوم کی زندگی کا موجب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی شخصیت قوم کی پیداوار نہیں ہوا کرتی۔ مصطفےٰ کمال، خلیفہ عبدالحمید اور خلیفہ عبدالمجید کی ترکی کی پیداوار نہ تھا۔ لہٰذا یہ بھی کوئی طریقِ علاج نہ ہوا۔ اس لئے کہ جو دوائی اپنے اختیار کی نہیں اس کا تریاق ہونا کس کام کا۔ اس کے لئے تو یہی کہہ کر خاموش ہو جانا پڑتا ہے کہ جس طرح ہنگامی طور پاکستان کی زمین مل گئی اسی طرح اتفاقی طور پر اسے سنبھالنے والا بھی پیدا ہو جائے گا۔

لہٰذا بات یہاں آکر ٹھہری کہ ان حالات میں اصلاح کی صورت کیا ہو؟ یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ہمارا موجودہ اوپر کا طبقہ اپنے اندر غالباً کسی تبدیلی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ یہ طبقہ بالعموم سن رسیدہ ہے اور اس عمر میں اس قالب کا توڑنا بڑی ہمت کا کام ہوا کرتا ہے جس میں انسان کی عادات و اطوار ڈھل چکی ہوں۔ لہٰذا ان سے کسی تبدیلی کی توقع کرنا بیکار ہے۔ نہ ہی یہ تدبیر کچھ مفید مطلب ہو سکتی ہے کہ ان کی جگہ دوسرے آدمی لائے جائیں۔ اسلئے کہ وہ بھی انہیں قالبوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ آپ نے سندھ میں وزارتوں کی تبدیلیوں اور پنجاب میں اس کے تعطل کو بھی آزما دیکھا۔ قوم ساری ایک جیسی ہے اور کسی طبقہ کا یہ دعویٰ کہ اسے دوسرے گروہ پر کوئی افضلیت حاصل ہے، محض انتخابی مہم کی تکنیک ہے خواہ اس پر شریعت کے لیبل لگا دیئے جائیں یا سرمایہ داری کی مخالفت کے۔ صورتوں کی تبدیلی سے سیرتیں نہیں بدل جایا کرتیں۔ اگر آج قوم میں کوئی ایسا گروہ موجود ہے جسے اپنی بلندیٔ سیرت کا دعوے ہو تو وہ انتخابی راستوں سے ہی اصلاح نہیں کر سکتا۔ سیرت کی بلندی تو جس مقام پر بھی ہو، اپنا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ چندن، قصرِ کسریٰ اور فقیر کی جھونپڑی میں یکساں طور پر خوشبو پھیلاتا ہے۔

ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے انکے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے یدِ بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطۂ زمین کے مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ تین تین پیغمبر ان کے اندر موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ قوم جہاں تھی وہیں رہی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا گیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ صرف اتنا انتظام کر دو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ ہو جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں اور اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے اُبھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے جن میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان والوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی

آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم

نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ روئیے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے، نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رُو سے کس قدر خام ہے۔ روئیے اس بات پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق

کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جاسکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی رہی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، وہ یہ نہیں کہ آپ قریہ قریہ میں اسکول کھول دیجئے اور ہر اسکول کا نتیجہ سو فی صدی دکھا دیجئے۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہونگی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہوگی، اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر سعی و کاوش اور جذبِ انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ۔ کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے، تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی فطری صلاحیتوں کی بالیدگی (یزکّیھم) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لیٹروں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشو و نما ہو جاتی ہے، اس لئے جس کسی کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے، اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کے لئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے ان اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیرکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں

نہیں مل سکیگا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں کو ہی رفع کرسکیں گے بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائینگے۔

قانونِ شریعت کا سلوگن

تقسیم کے بعد قوم کو "قانونِ شریعت کو نافذ کرو" کا سلوگن دیا گیا۔ عوام کے تقلیدی ذہن نے اسے بڑا خوش آئند سمجھا اور یہ سلوگن بڑا مقبول ہو گیا۔ اس سلوگن کے پیچھے جو جذبہ محرکہ تھا وہ انتخابات کے قریب آنے سے بے نقاب ہوتا چلا گیا۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی یہ حقیقت غور طلب تھی کہ قانونِ شریعت سے مراد کیا ہے اور اس کے نفاذ سے حاصل کیا ہوگا؟ اس چیز کو آج تک کسی نے متعین کر کے نہیں بتایا۔ اس لئے کہ اس سلوگن کو پیش کرنے والے اس کاروباری راز (TRADE SECRET) کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ پہلے ہمیں برسرِ اقتدار کر دو پھر ہم بتائیں گے کہ قانونِ شریعت کیا ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قانونِ شریعت سے مراد وہ تعزیری سزائیں ہو سکتی ہیں جو بعض جرائم کی پاداش میں نافذ کی جا سکتی ہیں، یا نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق مسائل۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر اس قانون کو نافذ بھی کر دیا جائے تو اس سے کون سی اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ آج بھی تو (چند مستثنیات کے سوا) وہ تمام کام جرائم شمار کئے جاتے ہیں جنہیں ہماری شریعت جرائم قرار دیتی ہے اور ان جرائم کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ ان سزاؤں کی نوعیت میں کچھ فرق سہی لیکن بہر حال سزائیں تو موجود ہیں۔ ان سزاؤں کی موجودگی سے اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی۔ اسلئے اگر ان کی جگہ شرعی سزائیں نافذ کر دی جائیں تو پھر کونسی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بالآخر ایسے ممالک بھی تو ہیں جہاں اس قسم کا قانونِ شریعت نافذ ہے۔ وہاں کے معاشرتی حالات ہم سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔ قرآن ایک نظامِ زندگی متعین کرتا ہے۔ اور یہ نظام متشکل نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ قوم کے دل و دماغ کی تعمیر ان خطوط پر نہ ہو جو اس نظام کے قیام اور بقاء کے ذمہ دار بن سکتے ہیں اور یہ خطوط تعلیم ہی کے ذریعے سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اصل مطالبہ صحیح قرآنی تعلیم کے اجراء کا ہونا چاہیئے۔ پھر سن رکھیئے کہ قرآنی تعلیم سے مفہوم فنِ تجوید یا قرآن کی تفاسیر پڑھانا نہیں۔ اس تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے سامنے وہ اقدار لائی جائیں جو قرآن متعین کرتا ہے۔ تاریخی شواہد اور آفاقی حوادث کی روشنی میں یہ بتایا جائے کہ یہ اقدار کس طرح انسانیت کی نشو و ارتقا کا موجب بن سکتی ہیں۔ اور اس سے مختلف اقدار کیوں ایسے نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم نے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کر لیا تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا خطہ ہی محفوظ رہ جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اسی خطہ کے بسنے والوں کو نصیب ہو جائے۔

قرآنی تعلیم

اگر قوم صحیح معنوں میں موجودہ صورتِ حالات میں تبدیلی کی خواہاں ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اربابِ نظم و نسق کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ

ہیں صحیح قرآنی تعلیم نافذ کریں جس سے صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ قوم نے تین سال بے معنی کوششوں میں ضائع کر دیئے۔ اگر ہم آج بھی اپنی کوششوں کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کریں تو بھی ہماری بگڑی کو بنتے کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اگر قوم اس ضرورت سے متفق ہے کہ وہ حکومت سے صحیح تعلیم کا مطالبہ کرے اور اگر حکومت اس ضرورت کا احساس رکھتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کام کس طرح کیا جائے تو اس باب میں ہم ہر طرح کی معاونت کے لئے تیار ہیں۔ سب سے پہلا کام مرکز میں ایک ایسی مجلس (کمیٹی) کا تعین ہے جو اس مسئلہ کی جانچ پڑتال کرے، اور اس کے بعد ملک کے لئے ایک مکمل نصاب تعلیم تجویز کرے۔ اگر حکومت کو ضرورت ہو تو ہم یہ بھی بتا سکیں گے کہ ہمارے خیال کے مطابق اس اہم کام کے لئے کون کون سے لوگ موزوں ہیں۔

لیکن اگر قوم نے اس بنیادی ضرورت کا احساس نہ کیا اور ارباب حکومت نے اپنے پیش نظر صرف یہی رکھا کہ قوم کو کس طرح سے خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ ہوگا یہ کہ ایک طرف سرکاری مدارس سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو صرف روٹی کمانے کے لئے مشینوں کی جگہ کام میں لگائے جائیں گے اور دوسری طرف مذہبی تعلیم کے دارالعلوم کھلیں گے جن میں وہ لوگ پیدا ہوں گے جنہیں روٹی کمانے کا سلیقہ بھی نہیں آئیگا۔ پاکستان کی حالت یہ ہوگی کہ دنیا کے دوسرے "اسلامی ممالک" کی طرح اقوام مغرب کے رحم و کرم پر دنیا کے نقشہ پر موجود رہیگا اور جب ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہوگا تو اس نقشہ سے اس کا نام بھی مٹا دیا جائیگا۔ یلیتنی مت قبل ھذا۔ وکنت نسیًا منسیًا "

(ختم)

اعلان

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ نیز پرچہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک آپکو پرچہ نہ ملے تو ۱۵ تاریخ تک اسکی اطلاع دفتر میں بھیج دیا کریں۔

ضرورت رشتہ

تین نیک سیرت دوشیزگان جن کی تعلیم بالترتیب ایم۔ اے (اردو)، بی۔ ایس سی، اور ایم - اے - ایل - ایل - بی ہے، کے لئے شریف اور برسر روزگار نیک سیرت نوجوانوں کے رشتے مطلوب ہیں۔ ذات پات کی کوئی پابندی نہیں۔ خط و کتابت درج ذیل پتہ پر کیجائے۔

ش۔م۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی گلبرگ۲ - لاہور

اپنی بہنوں کے نام

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد

میری عزیز بہنو! سلامِ مسنون!

میں اس خطاب کا آغاز، اُس روایتی آہ و فغاں اور وراثتی شکوہ و شکایت سے نہیں کرنا چاہتی کہ مردوں نے ہمارے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ انہوں نے ہمیں اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہمیں اپنے ہمدوش چلنے نہیں دیتے۔ انہوں نے ہمیں اپنا دست نگر، فلہذا اپاہج اور مفلوج بنا چھوڑا ہے۔ میں یہ حکایتیں اور شکایتیں لے کر آپ کے سامنے نہیں آئی۔ میں تو آپ سے صرف اتنا پوچھنے کے لئے حاضر ہوئی ہوں کہ جو حقوق ہمیں حاصل ہیں، ہم نے ان سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے اور انہیں کس حد تک استعمال کیا ہے؟ یہ دور آئینی حکومتوں کا ہے اور آئینی حکومتوں میں حقوق کا تحفظ قانون کی رُو سے ہوتا ہے۔ یہ قوانین، قانون ساز اسمبلیوں میں مدون ہوتے ہیں۔ یہ اسمبلیاں مشتمل ہوتی ہیں ان ارکان پر جنہیں قوم منتخب کرتی ہے۔ پاکستان میں پہلے ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ ہوا، اور اس کے بعد ۱۹۶۲ء کا۔ ان میں کہیں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان صرف مرد ہوں گے، عورتیں نہیں ہوں گی۔ ان دساتیر کی رُو سے، عورتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی ایسا ہی حاصل تھا جیسا مردوں کو، اور اسمبلیوں کی نشستوں کے لئے عورتیں بھی اسی طرح انتخاب لڑ سکتی تھیں جس طرح مرد۔ ملک میں عورتوں کی آبادی کم و بیش نصف کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے، ان اسمبلیوں میں زیادہ نہیں تو آدھی نشستیں عورتیں حاصل کر سکتی تھیں۔ ملک میں ایسی خواتین کی کمی نہیں جو قابلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے مردوں سے پیچھے ہوں۔ اس کے باوجود سوچئے کہ ملک میں کتنی عورتیں تھیں جنہوں نے اپنے اس حق کا استعمال کیا اور اسمبلیوں کی نشستوں کے لئے انتخاب لڑا؟ اس کے برعکس کتنے مرد امیدوار تھے جنہیں ہم نے اپنے ووٹوں سے کامیاب کرایا اور وہ مجالس قانون ساز کے ممبر بن گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے (آپ کے ووٹوں کے صدقے ممبر بن کر) کیا کیا؟ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ جن عائلی قوانین کی رُو سے آپ کو کچھ تھوڑے بہت حقوق حاصل ہوئے تھے انہیں منسوخ کرا

جائے۔ وہ تو یوں کہیئے کہ ملکی سیاست کے بحران کی وجہ سے ان حضرات کو اپنی سی پڑ گئی اور انہیں ان امور کیطرف توجہ دینے کی فرصت نہ مل سکی، ورنہ اس سے بہت پہلے عائلی قوانین کا جنازہ نکل چکا ہوتا۔ ناواقف لوگ سمجھتے ہوں گے کہ معلوم ان قوانین کی رُو سے عورتوں کو کس قدر اختیارات دے دیئے گئے تھے جو مرد اس قدر خوف زدہ اور بدحواس ہو گئے اور انہوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ انہیں کسی نہ کسی طرح منسوخ کرا دیا جائے۔ سنیئے کہ ان قوانین کی رُو سے طبقۂ نسواں کو کیا "خصوصی حقوق اور امتیازی اختیارات" دیئے گئے تھے۔ ان قوانین میں کہا گیا تھا کہ

(۱) نکاح کے وقت طے شدہ شرائط، نکاح نامہ میں درج کی جائیں اور یہ نکاح نامہ رجسٹرار نکاح کے دفتر میں رجسٹر کرا لیا جائے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو۔

(۲) نکاح بالغ لڑکے اور بالغ لڑکی کا کیا جائے۔

(۳) نکاح نامہ میں عورت اپنے اس حق کو محفوظ کرالے کہ اگر خاوند ظلم اور تشدد پر اُتر آئے تو وہ طلاق حاصل کر کے اس سے گلوخلاصی کرا سکے گی۔

(۴) میاں بیوی میں کشیدگی ہو جائے تو ثالثی کونسل کوشش کرے کہ ان میں باہمی مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے۔ اگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو تو پھر نکاح فسخ ہو جائے۔

(۵) میاں صاحب اگر دوسری بیوی لانا چاہیں، تو اس کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہوگی۔

یہ تھے وہ "خصوصی حقوق" جو عائلی قوانین کی رُو سے عورتوں کو دیئے گئے تھے اور جن کے خلاف مردوں کی طرف سے قیامت برپا کر دی گئی تھی۔ اُس وقت تو یہ قوانین کسی نہ کسی طرح بچ نکلے تھے لیکن اب یہ کہا جا رہا ہے کہ نئی اسمبلیوں میں سب سے پہلا وار انہی قوانین پر کیا جائے گا اور انہیں منسوخ کرا دیا جائے گا۔

میں اپنی ان بہنوں سے جنہیں فطرت نے دلِ بیدار اور چشمِ بینا عطا کی ہے، عرض کرنا چاہتی ہوں کہ وہ غور کریں کہ اس سے پوزیشن کیا سامنے آتی ہے؟ یہ کہ ہم خود اپنے ووٹوں سے، ان نشستوں کے لئے جو ہمارے قبضے میں آسکتی ہیں، ان مردوں کو ممبر منتخب کراتی ہیں جو ہمارے ہی گلے پر چھری چلاتے ہیں۔ اگر ہم خود پارلیمان میں چلے جائیں تو کم ازکم اپنے حقوق کی نگہداشت تو کر سکیں۔ لہٰذا، اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ آئندہ الیکشن میں، موزوں خواتین صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی نشستوں کے لئے خود انتخاب لڑیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں وہاں پہنچیں۔

اس سلسلہ میں، ایک اور دلچسپ چیز بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ آئین کی رُو سے، اسمبلی میں آٹھ دس نشستیں عورتوں کے لئے مخصوص کر دی جاتی ہیں۔ ان نشستوں کے متعلق عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ اس امتیازِ خصوصی سے عورتوں کی زبوں حالی پر رحم کیا گیا ہے جس کے لئے انہیں مردوں کا شکر گزار ہونا چاہیئے، حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو اس رعایت کی حیثیت بھیک کے ٹکڑوں کی سی ہے جنہیں کسی محتاج گداگر کی جھولی میں ڈال دیا جائے ــــ اور معلوم ہے

کہ بھیک کے ان ٹکڑوں کی قیمت کیا وصول کی جاتی ہے۔ یہ کہ ان نشستوں کے لئے عورتوں کا انتخاب مرد اراکین کرینگے۔

میں اپنی بہنوں سے عرض کرونگی کہ اس قسم کی "رعایت" عورت کے لئے وجہ ہزار تذلیل ہے۔ مردوں کی درحقیقت انتہائی کوشش یہ رہی ہے اور آج بھی ہے کہ عورت کے دل میں یہ تأثر راسخ کر دیا جائے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی رہین منت ہے اور ایسی کمزور و نحیف ہے کہ مرد کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔

میں اپنی بہنوں سے گزارش کروں گی کہ وہ اس رعایت خصوصی کو بہ تشکر واپس کر دیں اور تمام نشستوں کے لئے امیدوار ہو کر خود الیکشن لڑیں اور یوں اپنے حقوق کا تحفظ آپ کریں۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

(۰)

مذہب پرست طبقہ عائلی قوانین کی شدت سے مخالفت کر چکا ہے۔ اس لئے اسے اب عورتوں سے ووٹ طلبی کے سلسلہ میں کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اس جھجک کو مٹانے کے لئے یہ حربہ اختیار کر رہا ہے کہ وہ عورتوں سے کہتا ہے کہ عائلی قوانین تو تہذیب مغرب کی نقالی تھی۔ ہم تمہیں وہ حقوق دلائینگے جو مسلمان عورت کو خدا اور رسول نے عطا کئے ہیں۔ اور وہ حقوق، ان حقوق سے کہیں بلند اور بہتر ہیں جو تقلید مغرب میں تمہیں دیئے گئے تھے۔ وہ اس قسم کے مقدس الفاظ استعمال کرینگے لیکن کبھی واضح طور پر نہیں بتائینگے کہ وہ حقوق ہیں کیا جنہیں وہ از روئے شریعت عورتوں کو دلائینگے؟ اس سلسلہ میں، میں گزارش کروں گی کہ آپ ان لوگوں سے حسب ذیل سوالات پوچھئے اور ان سے کہیئے کہ وہ ان کا متعین طور پر جواب تحریر میں دیں۔

(۱) کیا آپ اسے جائز سمجھتے ہیں کہ ایک نابالغ لڑکی کی شادی ایک نوجوان لڑکے سے کر دی جائے اور وہ اس لڑکی سے جنسی اختلاط بھی کرے؟

(۲) کیا آپ مرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ جب جی چاہے، اپنی بیوی کو طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر الگ کر دے۔ اور اسکے بعد اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو اور بیوی کو دوبارہ نکاح میں لانا چاہے تو وہ اس کے نکاح میں نہ آسکے جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح کر کے، شب باشی کے بعد، اس سے طلاق حاصل نہ کر لے! یعنی اس طرح طلاق دینے کی حماقت تو مرد کرے اور اس کی اس قدر شرمناک سزا عورت بھگتے کہ وہ ایک شب کسی غیر مرد کے آغوش میں بسر کرے! (اسے حلالہ کہتے ہیں)۔

(۳) کیا آپ عورت کو بھی اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ جس مرد کے نکاح میں نہ رہنا چاہے، عقدِ نکاح کو اسی طرح ختم کر دے جس طرح مرد ختم کر سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر، کیا آپ عورت کو بھی اسی طرح حق طلاق دیتے ہیں جس طرح مرد کو

حق حاصل ہے۔

(۴) کیا آپ مرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ جب جی چاہے، بیک وقت چار تک بیویوں سے شادی کرلے۔

(۵) کیا آپ مرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ عندالضرورت بیوی کو مار پیٹ بھی سکتا ہے؟

آپ یہ سوالات ان حضرات سے پوچھئے اور ان کا متعین جواب تحریری طور پر لیجئے۔ آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سے حقوق ہیں جو یہ حضرات آپ کو دینگے! آپ ان کے اس قسم کے وعدوں میں نہ آجائیے کہ اسلام عورت کو بڑے وسیع حقوق دیتا ہے اور ہم آپ کو اسلامی حقوق دلائیں گے۔ یہ سب الیکشن کے حربے ہیں۔ جو سادہ لوح بہنیں انہیں حقیقت سمجھتی ہیں، میں ان سے اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ

اس فریبِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

——— (۵) ———

لہٰذا، میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ:-

(۱) جو بہنیں، صلاحیت، ہمت اور استطاعت رکھتی ہوں وہ صوبائی اور مرکزی پارلیمان کی نشستوں کے لئے الیکشن لڑیں۔ یاد رکھیئے۔ مذہب پرست طبقہ اس پر قطعاً اعتراض نہیں کر سکتا۔ جب وہ محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کے منصبِ صدارت کے لئے الیکشن لڑنے کو ازروئے شریعت جائز سمجھتا تھا تو کسی عام نشست کے لئے عورت کا بطور امیدوار کھڑے ہونا کس طرح خلافِ شریعت قرار پا سکتا ہے۔

(۲) مخصوص نشستوں کے لئے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش نہ کریں۔ یہ گداگری ہے اور وجۂ تذلیلِ نسائیت۔

(۳) ووٹ دینا ہو، تو صرف اس امیدوار کو ووٹ دیجئے جو یہ تحریر دے کہ میں عائلی قوانین کی تائید کرونگا اور انہیں برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

سردست کم از کم اتنا تو کیجئے۔ یاد رکھیئے۔ موجودہ معاشرہ میں جو اپنے حقوق کا تحفظ آپ نہیں کرتا، اس کی حفاظت کوئی نہیں کرتا۔ وہ روندا جاتا ہے، کچلا جاتا ہے۔

والسّلام!

دردمند دلوں کی دھڑکن
"نفیرہ"

——— (✻) ———
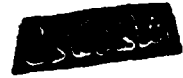
"مودودی صاحب کا انتقامی اسلام"

طلوعِ اسلام نے اپنی جولائی ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا جو نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے اس سے بہت سے حقائق پر پڑے ہوئے پردے اٹھ گئے ہیں اور فکر کی نئی راہیں روشن ہو گئی ہیں۔ مودودی صاحب کی شخصیت سمٹ کر ایک لفظ کے اندر آجاتی ہے اور وہ لفظ ہے 'انانیت'۔ جب انانیت کو شکست ہوتی ہے تو اس سے انتقام کا جذبہ اُبھرتا ہے اور چونکہ مودودی صاحب نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اسلئے اُن کا اسلام اس جذبہ کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ جو اُن کا ہمنوا ہے اُس کا کفر بھی اسلام ہے اور جس سے وہ انتقام لینا چاہتے ہیں اُس کا اسلام بھی کفر ہے اگرچہ اس کی مثالیں ان کی ساری زندگی پر پھیلی ہوئی ہیں لیکن بہ غرضِ اختصار ہم گزشتہ دس سالہ دور سے چند ایک مثالیں پیش کرینگے۔ یا یوں کہیے کہ چونکہ انہیں سب سے بڑی زد صدر ایوب کے زمانے میں پہنچی اس لئے اس دور میں اُن کے اس انتقامی اسلام کے نمونے زیادہ شدت سے اُبھر کر سامنے آگئے۔

۱۔ صدارتی نظام

پارلیمانی نظام میں صدرِ مملکت کو ویٹو کا حق نہیں ہوتا۔ صدارتی نظامِ حکومت میں اُسے یہ حق حاصل ہوتا ہے جس زمانے میں مودودی صاحب کے سامنے یہ سوال آیا کہ اسلام کی رُو سے امیرِ مملکت کو ویٹو کا حق حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں تو انہوں نے لکھا:

> جب امیر کو چُن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہونگے مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اُس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا

اقلیت کے ساتھ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

(اسلام کا سیاسی نظریہ۔ صفحہ ۴۹۔۵۰)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں انہوں نے ترجمان القرآن کی جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا استعمال کر سکیگا۔ (ص۲۳)

جماعت اسلامی نے پاکستان کے آئین کے سلسلے میں جو دستوری خاکہ مرتب کیا تھا اُس کی دفعہ ۳۶ میں کہا گیا تھا کہ

امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔

(دو دستوری خاکے صفحہ ۲۸)

اس کے بعد صدر ایوب برسر اقتدار آگئے اور انہوں نے صدارتی نظام نافذ کر دیا۔ مودودی صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی اور ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۶۵ء میں سورۃ الشوریٰ کی آیت وامرھم شوریٰ بینھم کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے اسلام کا یہ فیصلہ سامنے آجاتا ہے کہ

جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے لیا جائے یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ "ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ دے دینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی ایک ہی آیت کی تفسیر صدر ایوب کے دورِ حکومت سے پہلے کیا کی گئی تھی اور اُس کے بعد جو تفسیر کی گئی وہ کس طرح پہلی تفسیر کی بالکل ضد تھی۔ کیونکہ اب سامنے صدر ایوب تھا۔

۲۔ عورت کی سربراہی

ایک اور مثال لیجئے۔ جب شروع شروع میں پاکستان کی مجلس دستور ساز میں آئین کا مسئلہ زیرِ غور آیا تھا تو مودودی صاحب نے بھی اپنی دستوری تجاویز پیش کی تھیں۔ اُن میں ایک شق یہ بھی تھی۔

مجالس دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔

اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظام ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے اور یہ فرائض عورتوں کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں۔

جب ان کی اس تجویز پر اعتراض ہوا تو انہوں نے ترجمان القرآن کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں اس کا تفصیلی جواب دیا اور قرآن و احادیث سے ثابت کیا کہ عورتوں کے لئے ملکی انتظامات میں حصہ لینا ... اور آخر میں لکھا کہ

اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں اور کوئی چیلنج کرے تو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں۔ مگر اول تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا۔ دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لئے تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی تعمیل کرنے سے پہلے اور تعمیل کے لئے شرط کے طور پر عقلی دلائل کا مطالبہ کرے ..... تعمیل حکم کے لئے عقلی دلائل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے، نہ کہ اُسکے اندر۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ منصب صدارت کے انتخاب کے لئے صدر ایوب کے مقابلہ میں محترمہ مس فاطمہ جناح (مر... امیدوار کھڑی ہوگئیں۔ مودودی صاحب نے صدر ایوب کی بہر حال مخالفت کرنی تھی اور مخالفت کے معنی کے بالمقابل جو امیدوار کھڑا ہو اُس کی حمایت کی جائے لیکن یہاں مشکل یہ آن پڑی کہ مودودی صاحب خو... کا یہ فیصلہ منظر عام پر لا چکے تھے کہ عورت سیاسی امور میں حصہ لے ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ جب یہ مسئلہ جماعت... نمائندگان کی مجلس میں پیش ہوا تو (جماعت کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ میں) اس کشمکش کا نقشہ ... میں کھینچا گیا۔

جب یہ مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ مس فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا ہے جسے قبول کرنا اُن شرعی احکام کی موجودگی میں، ہمارے لئے مشکل تھا جن کی رُو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد دورن خانہ کیا ہوا، اس کا ہمیں صحیح علم نہیں لیکن باہر بات یہ آئی کہ جماعت اسلامی محترمہ مس... کی حمایت کرے گی۔ جب یہ اعتراض کیا گیا کہ اس سے پہلے مودودی صاحب خود اسے ناجائز قرار دے چکے ہیں... صاحب نے جو کچھ کہا، اُسے روزنامہ مشرق نے اپنی ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں درج...

اپوزیشن کی صدارتی انتخاب کی امیدوار محترمہ مس فاطمہ جناح پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے چیلنج کیا ہے کہ کوئی شخص یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شرع عورت کا سربراہِ مملکت ہونا قطعی حرام ہے اور اس سلسلہ میں استثناء کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر رہی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلام کو کس دھڑلے سے بدل دیا گیا۔

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح حیدر آباد کی مجلسِ اسوۂ رسولؐ کی دعوت پر میلاد النبیؐ کے جلسے میں شرکت کے لئے تشریف لے گئیں تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ترجمان القرآن میں لکھا گیا۔

لیکن آپ کو یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ اس مجلسِ اسوۂ رسولؐ نے اسوۂ رسولؐ بیان کرنے کیلئے جس عالمۂ کتاب و سنت اور پیکرِ اسوۂ رسولؐ کو دعوت دی تھی وہ مس فاطمہ جناح ہیں چنانچہ اخبارات نے غالباً موصوفہ کی پیروی اسوۂ رسولؐ ہی کو نمایاں کرنے کے لئے اُن کی تقریر کے ساتھ اُن کی تصویر بھی شائع کی ہے تاکہ مسلمان خواتین اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسوۂ رسولؐ دراصل یہ ہے جس پر ملاؤں نے پردہ ڈال دیا تھا اور جو پاکستان بننے کے بعد اب بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت جولائی۔ اگست ستمبر ۱۹۵۰ء)

لیکن جب وہی محترمہ صدر ایوب کے مقابل منصبِ صدارت کے لئے کھڑی ہوئیں تو مودودی صاحب نے فرمایا۔

اگر کسی امیدوار میں اس کے سوا اور کوئی خامی نہ ہو کہ وہ عورت ہے اور دوسری طرف مرد امیدوار میں اس کے سوا کوئی خوبی نہ ہو کہ وہ مرد ہے تو اس صورت میں اسکے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ خاتون امیدوار کی حمایت کی جائے۔ (ایشیا۔ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

ضمناً جماعتِ اسلامی کو اس سے بڑی شکایت پیدا ہوئی ہے کہ کونسل مسلم لیگ کے بعض سربراہوں نے انہیں انتہا پسند کہہ دیا ہے۔ آپ مندرجہ بالا الفاظ پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اس سے بڑی انتہا پسندی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے!

۳۔ زرعی اصلاحات

ایک اور مثال لیجئے، صدر ایوب نے جب زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں زمین کے رقبے کی ملکیت کی حدبندی کی تو جماعتِ اسلامی نے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا کیونکہ مودودی صاحب اس سے پہلے (اپنی کتاب مسئلہ ملکیتِ زمین) زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی کو اسلام کی رُو سے قطعاً ناجائز قرار دے چکے تھے، اس کے ساتھ ہی انہوں نے اُس کتاب میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ صنعتوں کو نیشنلائز کرنا ایک ایسا ظلم ہے جس سے بڑھ کر

انسانیت کش نظام ابلیس ایجاد نہیں کر سکا۔

اس کے بعد صدر ایوب کا دورِ حکومت ختم ہوا تو مودودی صاحب کے جذبۂ انتقام میں کچھ برودت آگئی اور ساتھ ہی ان کا اسلام بھی بدل گیا اور اب جماعتِ اسلامی نے اپنے منشور میں ملکیتِ زمین یا رقبہ کی حد بندی اور صنعتوں کو نیشنلائز کرنے کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔

۴۔ عائلی قوانین

اب ہم ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس کی ایک ایک شق سے یہ واضح ہوگا کہ جن چیزوں کو مودودی صدر ایوب کے برسرِاقتدار آنے سے پہلے اسلام کی رُو سے نہایت ضروری قرار دیتے تھے، جب انہی چیزوں کو صدر نافذ کیا تو انہوں نے ان میں سے ایک ایک کی مخالفت کی اور انہیں خلافِ اسلام قرار دے دیا۔ ہمارا مطلب عائلی قوانین سے ہے۔ عائلی قوانین کے خلاف جماعتِ اسلامی نے جو قیامت برپا کی تھی، اُس کی آوازیں آج تک فضا میں گونج رہی ہیں۔

---(۰)---

ہمارے ملک میں عائلی قوانین کا نفاذ کوئی اچانک قدم نہیں تھا بلکہ پچھلی پوری صدی سے حالات اس کا تقاضا کر رہے تھے۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ ہماری عائلی زندگی کے بعض اہم قوانین ملوکیت سے متاثر تھے اور جب ملوکیت دم توڑنے لگی تو عائلی زندگی میں بھی تبدیلیاں ناگزیر ہوگئیں۔ اس سے متعلق سب سے پہلے اصلاحی اقدام مصر اور دوسرے عرب ممالک میں کئے گئے۔ لیکن یہ اصلاحات اتنی ہی تھیں کہ اصلاح طلب معاملات میں حنفی فقہ کو ترک کر کے دوسرے فقہی مذاہب کے قوانین کو اختیار کر لیا گیا۔ پاکستان میں بھی عائلی قوانین کے تحت کم و بیش وہی اصلاحات نافذ کی گئیں جو عرب ممالک میں چالیس سال پہلے اختیار کی جا چکی تھیں۔

ہمارے ہاں اکثریت حنفی فقہ کی پابند تھی۔ اسلئے ہماری لاکھوں بیٹیوں اور بہنوں کی زندگیوں کو اُجڑتے دیکھنے کے باوجود کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس فقہ کی مخالفت میں آواز اٹھائے۔ مودودی صاحب نے جب مصر اور دوسرے عرب ممالک میں عائلی اصلاحات کا خوشگوار استقبال دیکھا تو انہوں نے مصر میں رائج شدہ اصلاحات کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب "حقوق الزوجین" تصنیف فرمائی۔ اس کتاب میں انہوں نے عائلی اصلاحات کی مخالفت کرنے والے علماء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

> قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ سب سے پہلے ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز

کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو. کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبیؐ کی سنت تمہارے پاس اسلئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا، تم کو کیا حق تھا کہ اسے شکل بناتے. ہم نے تم کو قرآن اور محمدؐ کی پیروی کا حکم دیا تھا. تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا. آپ سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو. اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے گی۔

(حقوق الزوجین. طبع ششم صفحہ ۹۸)

فقہی قوانین کی رُو سے ہمارے گھروں کی زندگیاں کس قدر جہنم زار بن چکی تھیں، اس کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا تھا۔

اس افسوس ناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم پچھتر فیصد گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے کی زندگیاں تلخ بلکہ برباد کر دی ہیں۔

(ایضاً. صفحہ ۹)

ہمارے گھروں کی تلخ زندگیوں کا یہی احساس تھا جس کے پیشِ نظر صدر ایوب کے زمانے میں عائلی قوانین نافذ کئے گئے تھے. مودودی صاحب کو سب سے پہلے ان قوانین کا استقبال کرنا اور حکومت کو مستحق مبارکباد قرار دینا چاہیئے تھا. لیکن بدقسمتی یہ کہ یہ قوانین صدر ایوب کے ہاتھوں نافذ ہوئے. اسلئے مودودی صاحب کیطرف سے ان کی مخالفت (ان کے جذبۂ انتقام کا تقاضا تھا. آپ دیکھئے کہ عائلی قوانین میں کیا کہا گیا تھا. ان قوانین کے نفاذ سے پہلے مودودی صاحب اس ضمن میں خود کیا لکھ چکے تھے اور پھر اس کے بعد انہوں نے اُن کی کس طرح مخالفت کی۔

نکاح کی رجسٹری

نکاح کے وقت فریقین کے درمیان کچھ شرائط طے پاتی ہیں. اس سے پہلے یہ شرائط بالعموم زبانی طے پاتی تھیں. اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعد میں بڑے جھگڑے اُٹھتے تھے ایک فریق کچھ دعویٰ کرتا تھا دوسرا فریق اس سے انکار کر دیتا تھا. یہ جھگڑے بالعموم مہر کے متعلق ہوتے تھے جو فوری ادا نہیں کیا جاتا تھا. مودودی صاحب نے اس کا یہ حل بتایا کہ

اگر وہ (مہر) مؤجل ہو تو لازم قرار دیا جائے (کہ اس دستاویز کو رجسٹر کرایا جائے) اور زرِ مہر پر پچاس فیصد کا اسٹامپ لگایا جائے. اسٹامپ کے بغیر یا پچاس فیصد سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویزِ مہر قابلِ ادخالِ دعویٰ نہ ہو. اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے

تو مہر موجل کا یہ سراپا عیب بہ آسانی مسدود ہو جائیگا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۲۵)

عہد ایوب نے یہ ضابطہ بنا دیا اور عائلی قوانین کی رُو سے نکاح کی دستاویز کا رجسٹر کرانا لازمی قرار دے فرق کے ساتھ کہ مودودی کی تجویز کی رُو سے اس دستاویز پر اتنی گراں قیمت اسٹامپ لگانی پڑتی تھی اور عا کی رُو سے یہ دستاویز دو تین روپوں میں رجسٹر ہو جاتی تھی۔ لیکن مودودی صاحب نے اس کی سخت مخالفت کہ اس قسم کے نجی معاملے میں عدالت کو خواہ مخواہ دخل انداز کر لیا گیا ہے۔

تعدد ازدواج

عائلی قوانین میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کرنے کے لئے یہ شرط ا گئی ہے کہ اس کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ ایسی ا حاصل کرنے کے بعد معاملہ ثالثی کونسل کے سامنے جائے گا۔ اگر ثالثی کونسل مطمئن ہو کہ مجوزہ شادی ضرو کے تقاضے کے مطابق ہے تو وہ ایسی شرائط کے تحت جنہیں وہ مناسب خیال کرے مطلوبہ منظوری دے کونسل کے فیصلے کے خلاف نگرانی کی درخواست بھی دی جا سکتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ دوسری شادی کے لئے یہ شرائط پہلی بیوی کے حقوق کی کسی حد تک حفاظت کرتی کھلی چھٹی نہیں دی جاتی کہ وہ جب جی چاہے، دو تین چار تک بیویاں کرلے۔ پہلی بیوی یا اس کے متعلقین کی حاصل کرنے کا ثبوت خود نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے برسر منبر فرما بن مغیرہ نے مجھ سے اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی حضرت علیؓ سے کر دیں۔ میں ہرگز ہرگز اس نہیں دوں گا۔ ہاں اگر ابنؓ ابی طالب ایسا کرنا چاہتے ہیں تو میری بیٹی کو طلاق دے کر اُن کی بیٹی سے نکا میرا جگر گوشہ ہے۔ جو بات اُسے تکلیف پہنچاتی ہے وہ میرے لئے بھی باعث تکلیف ہے۔ جو اُس کے لئے ہے وہ مجھے بھی ایذا پہنچاتی ہے (بخاری۔ کتاب النکاح)۔ اس سے واضح ہے کہ دوسری شادی کے لئے پہلی کے متعلقین کی رضامندی سنتِ رسول اللہ کے مطابق ہے۔ اور اس کے لئے ثالثی کونسل سے منظوری کا لیا کو بڑی حد تک انصاف کے قریب کر دیتی ہے۔

لیکن مودودی صاحب نے اس کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیا اور کہا کہ جب اسلام مرد کو بلا شرط چا سے نکاح کرنے کی اجازت دیتا ہے تو حکومت کون ہوتی ہے جو اس میں دخل دے۔ اور ایسا کہتے وق گئے کہ وہ اس باب میں اس سے پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ

> قرآن مجید میں تعدد ازدواج کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص عدل نہ کرے تو اُسے اس مشروط اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ خود اس آیت میں جہاں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے، صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر

سکو تو پھر ایک ہی بیوی رکھو .... اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زاید بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا اور ایک طرف جھک کر دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے، وہ ظالم ہے۔ تعددِ ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے۔ قانون کو ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے۔

(ایضاً صفحہ ۴۱ - ۴۲)

مودودی صاحب نے خود اس کی سفارش کی اور جب عائلی قوانین میں پہلی بیوی کے لئے دادرسی پانے کا حق دیا گیا تو دہائی مچا دی کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ محض اس لئے کہ یہ قانون اس شخص کیطرف سے نافذ کیا گیا تھا جس کے خلاف مودودی صاحب کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔

عورت کا خُلع کا شرعی حق

مودودی صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھا تھا کہ شرعِ اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ نباہ نہیں کر سکتا، اسے طلاق دیدے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہے اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کر سکتی ہو، اس سے خلع حاصل کرلے۔　　　　(ایضاً ص۶۰)

آپ نے دیکھا کہ بات کتنی صاف ہے۔ لیکن جب عائلی قوانین میں یہ شق رکھی گئی تو مودودی صاحب نے قیامت برپا کر دی کہ عورت کو اس کا حق دینا اسلام کے خلاف ہے۔

تین طلاقیں

مسلمانوں کی خانگی زندگی کو جس مسئلے نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ "تین طلاق" کا مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے "طلاق، طلاق، طلاق" کہدے۔ (یعنی لفظِ طلاق کو تین مرتبہ دہرادے) تو اس سے اس بیوی پر اس قسم کی طلاق پڑ جاتی ہے کہ یہ میاں بیوی پھر آپس میں نکاح نہیں کر سکتے، بجز اس کے کہ وہ عورت بےچاری کسی اور مرد سے ایک رات کے لئے نکاح کرے، اور وہ مرد اسے شب باشی کے بعد دوسری صبح کو طلاق دے۔ اس کے بعد یہ اپنے پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ جس قدر تباہ کن ہی نہیں بلکہ شرمناک ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سب سے پہلے حکومتِ مصر نے جرأت مندانہ قدم اٹھا کر اسکا خاتمہ کیا۔ ہمارے ہاں بھی حکومتِ مصر کے اس اقدام کی بڑی تعریف کی گئی اور دعا کی گئی کہ اللہ تعالٰی ہمیں بھی وہ دن جلد از جلد دکھائے جب ہم اس لعنت کا خاتمہ کر سکیں۔"

(ملاحظہ ہو نکاحِ محمدی۔ از مولانا محمد بن ابراہیم جوناگڑھی مرحوم۔ صفحہ ۱۴۲ - ۱۴۱)

اس قسم کی طلاق کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھا تھا کہ

یک وقت تین طلاق دیکر عورت کو جدا کر دینا نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اُس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اُسکے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔

(صفحہ ۱۵۴)

اس لعنت کو ختم کرنے کے سلسلے میں آپ نے یہ تجویز فرمایا تھا کہ

ہمارے زمانے میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ کسی فوری جذبہ کے تحت لوگ اپنی بیویوں کو جھٹ تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی سے بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدِباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ (ایضاً ۱۵۵)

لیکن جب عائلی قوانین میں اس قسم کی پابندیاں لگا دی گئیں تو اس کی مخالفت کرنے والوں میں مودودی صاحب پیش پیش تھے۔ انہوں نے اس پابندی کا ذکر کرتے ہوتے کہا۔

بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب[1] کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کیخلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدت عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے جب تک کہ اسکی تحلیل[2] نہ ہو جائے اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہؒ اور مذہب حنفی کے ائمہ و فقہا کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آجکل کے

---

[1] مودودی صاحب نے "کتاب و سنت" کہنے کے بجائے دانستہ محض غلط فہمی پیدا کرنے کے لئے بعض فقہی مذاہب لکھ دیا ہے۔

[2] یہ "رسوائے عالم حلالہ" کے لئے خوبصورت اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ تفصیل ذرا آگے چلکر سامنے آئیگی۔

قانون سازوں پر نہیں۔　　(عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحہ ۱۹-۱۸)

جب مودودی صاحب نے یہ لکھا تھا کہ اس قسم کی طلاق نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے اور اسکے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور یہ تجویز کیا تھا کہ ایسی طلاق پر قانونی پابندیاں عاید کرنا ضروری ہے تو اُس وقت یہاں حنفی مذہب بھی موجود تھا اور اس کے پیرو بھی موجود تھے۔ اُس وقت مودودی صاحب کو اس قسم کا کوئی خیال نہیں آیا۔ لیکن جب صدر ایوب کیطرف سے نافذ کردہ عائلی قوانین کی رُو سے مودودی صاحب کی مجوزہ پابندی لگا دی گئی تو انہوں نے حنفی فقہ کی متبع عظیم اکثریت کو یہ کہہ کر صدر ایوب کیخلاف بھڑکایا کہ دیکھو یہ شخص ایسے قوانین نافذ کر رہا ہے جو فقہ حنفی کے خلاف ہیں۔ بتاؤ تم امام ابو حنیفہؒ کی پیروی کرنا چاہتے ہو یا صدر ایوب کی ؟

آپنے دیکھا کہ یہ شخص کس قدر خطرناک ہے اور اسلام کو کس طرح ایک کھلونا بنا کر اپنے مخالفین کے خلاف ہینڈ گرینیڈ کیطرح استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔

حلالہ

مودودی صاحب نے تین طلاق بہ یک وقت کو فقہ حنفی کی رُو سے جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کے بعد حلالہ کر لیا جائے تو پھر سابقہ شوہر کے ساتھ نکاح جائز قرار پا جاتا ہے۔ اس میں حلالہ کا ذکر ایسا سرسری طور پر کیا گیا ہے جیسے یہ کوئی چھوٹی سے بلنٹنے کی رسم ہو جسے ادا کر لینے کے بعد سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس "ارتقائی اسلام" سے پہلے یہی صاحب حلالہ کے متعلق کیا کہتے تھے؛ سنیئے اور حیرت سے اپنی انگلی دانتوں میں دبا لیجئے۔ انہوں نے اپنی کتاب حقوق الزوجین میں لکھا تھا

> فی الواقعہ اس طرح کے نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیرت اُن علماء پر ہوتی ہے جو اس صریح حرام اور نہایت شنیع اور شرمناک حیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔ (صفحہ ۶۰-۵۹)

یعنی وہی فعل جو مودودی صاحب کے نزدیک حرام، نہایت شنیع، شرمناک اور زنا تھا جب ان کے فریق مخالف نے اُس پر پابندی لگائی تو وہ بالکل جائز قرار پا گیا۔ اور پابندی لگانے والے کی مخالفت یہ کہہ کر شروع کر دی گئی کہ وہ شریعت حقہ کے خلاف قوانین رائج کر رہا ہے۔ مودودی صاحب نے اُن علماء کے متعلق حیرت کا اظہار کیا ہے جو اس قسم کے شرمناک حیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ علماء کون ہیں۔ یہ علماء اسی حنفی مذہب کے متبع ہیں جسے پاکستان میں رائج کرنے کا مشورہ مودودی صاحب دے رہے ہیں۔ حنفی فقہ کی مشہور و معتبر کتاب ہدایہ میں ہے۔

> اگر حلالہ کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا گیا تو وہ نکاح مکروہ ہوگا کیونکہ حضورؐ نے جہاں حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والوں پر اللہ کی لعنت بھیجی ہے تو اس سے یہی حلالہ مراد ہے۔ تاہم اگر اس حلالہ کے نکاح کے بعد کوئی شخص عورت سے بعد از مباشرت اُسے طلاق دے دے تو وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائیگی کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے۔　　(ہدایہ اولین مجیدی ص ۳۹۱)

مرد کا حقِ طلاق

عائلی قوانین میں مرد کے حقِ طلاق پر اتنی سی پابندی عاید کی گئی ہے کہ اس مقصد کے لئے اُسے یونین کونسل کے چیئرمین کو اطلاع دینی ہوگی جو فریقین میں مصالحت کی کوشش کرے گا۔ اور اگر وہ اس کوشش میں ناکام ہوگا تو پھر تین ماہ کے بعد طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

مودودی صاحب نے شور مچا دیا کہ یہ پابندی مداخلت فی الدین ہے جس کا حکومت کو کوئی حق حاصل نہیں۔ انہوں نے کہا۔

> ایک آیت میں تو صاف الفاظ میں بیدہٖ عقدۃ النکاح کا فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نکاح کو برقرار رکھنا یا توڑ دینا شوہر کے اختیار میں ہے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے کے لئے وہ قطعاً کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنے کا پابند نہیں ہے۔
>
> (عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۵)

لیکن اس سے پہلے مودودی صاحب نے "حقوق الزوجین" میں لکھا تھا کہ

> اگر اُس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں یعنی اولی الامر کو حق حاصل ہوگا کہ شوہر کو اُس کے اختیار سے محروم کر کے بطورِ خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہا کی ایک جماعت نے بیدہٖ عقدۃ النکاح سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں اور اس قاعدہ میں کوئی استثنا نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں ہے کہ اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ <u>لیکن قرآنِ مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔</u> (صفحہ ۱۰۸)

یعنی مودودی صاحب قرآنِ مجید کی جس آیت سے یہ ثابت کرتے تھے کہ طلاق کے معاملہ میں عدالت کو مداخلت کا حق حاصل ہے، عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد اُسی آیت سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ عدالت کو مداخلت کا ہرگز حق نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ قوانین اُس شخص کے عہدِ اقتدار میں نافذ ہوئے تھے جس کے خلاف ان کے دل میں عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ عائلی قوانین میں بھی نہ تو مرد سے حقِ طلاق سلب کیا گیا اور نہ ہی عدالت کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مرد کی رضامندی کے بغیر خود طلاق نافذ کرے۔ اُس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ مرد اس کی اطلاع یونین کونسل کے چیئرمین کو دے تاکہ وہ فریقین میں مصالحت کی کوشش کر دیکھے۔ [مودودی] صاحب کے "حقوق الزوجین" کے فتویٰ کی رُو سے عدالت کو اس کا حق حاصل ہے کہ خاوند کی رضامندی کے

فسخ نکاح کر دے. لیکن صدر ایوب کے نافذ کردہ عائلی قوانین کی اتنی سی پابندی بھی خلاف شریعت قرار دے دی جاتی ہے کہ کونسل کا چیئرمین فریقین میں مصالحت کی کوشش کرے، حالانکہ مصالحت کا حکم خود قرآن کریم نے دیا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مودودی صاحب، خدا کی کتاب کے ساتھ کس قسم کا مذاق کرتے ہیں۔

صغر سنی کی شادی

صغر سنی کی شادیوں سے مسلم معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں، ہر خاص و عام کو اس کا احساس تھا۔ اس کے خلاف مصر میں انقلابی قدم اٹھایا گیا اور شادی کے لئے بالغ ہونے کی شرط لازم قرار دی گئی۔ یہ قانون فقہی مذہب کے ایک امام ابن شبرمہ کے مسلک کے مطابق تھا۔ ان کا یہ مسلک بڑا مشہور ہے اور حنفی فقہ کی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ علامہ سرخسی نے بھی اپنی مشہور کتاب المبسوط (جلد چہارم صفحہ ۱۹۳ پر) لکھا ہے۔

> امام ابن شبرمہ اور ابوبکر اصم نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکی کی شادی کو جائز قرار نہیں دیتے۔ ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ حتیٰ اذا بلغوا النکاح۔ اگر بلوغت سے پہلے نکاح جائز ہوتا تو یہ آیت بے سود تھی۔

عائلی قوانین میں بھی شادی کے لئے بلوغت کی شرط لازم قرار دی گئی تو اس پر طوفان مچا دیا گیا کہ "یہ قرآن کے صریح حکم کے خلاف اور ان مصالح سے متصادم ہے جنہیں شریعت نے اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید میں بالفاظ صریح ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے جس کو ابھی تک حیض نہ آیا ہو۔"

(عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات۔ ص۱۹)

حالانکہ اس سے پہلے خود مودودی صاحب یہ ارشاد فرما چکے تھے۔ کہ

> اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتداء میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں، بری عادتوں۔ اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔
>
> (حقوق الزوجین۔ صفحہ ۱۱۹)

یعنی جس چیز کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس پر پابندی لگانا نہایت ضروری ہے، جب عائلی قوانین میں وہ پابندی لگائی گئی تو اس پابندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر پابندی لگانے والے کے خلاف قیامت برپا کر دی گئی۔

(۰)

آپ نے ان چند مثالوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ مودودی صاحب اسلام کے خلاف کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور جس شخص کے خلاف ان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکے، اسکے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں یہ کس حد تک آگے بڑھ

جاتے ہیں۔ ہمیں نہ مصدرا یوب سے کوئی تعلق ہے نہ عائلی قوانین سے براہِ راست کوئی واسطہ۔ ہم اس مثال
صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک مثال کو مودودی صاحب خود خلافِ اسلام قرار دے کر سفارش کرتے ہیں کہ اُس
لگا دی جائے۔ جب اُس پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ تو چونکہ بدقسمتی سے وہ پابندی اُس شخص کی طرف
ہوتی ہے جو ان کا فریق مخالف ہے، اس لئے مودودی صاحب خود اس پابندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر
دیتے ہیں کہ لوگو دیکھو! یہ شخص تمہارے اسلام پر کس طرح ڈاکہ ڈال رہا ہے اور تمہاری مقدس شریعت کی
کر رہا ہے۔

ہمیں مودودی صاحب پر چنداں افسوس نہیں کہ اُن کے سامنے زندگی کا صرف ایک مقصد ہے ا
اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین۔ اس کے لئے وہ ہر جائز و ناجائز حربے کو بلا دریغ استعمال کرتے ہیں اور اپنے ہر ا
عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے انکے متبعین پر جن میں بہرحال پڑھے لکھے لوگ بھی ش
وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مودودی صاحب کس طرح خود اپنی تحریروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ جس چیز کو آ
اسلام کہتے ہیں کل اُسی کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں جسے آج شریعت کا حکم اور خدا اور رسولؐ کا
کہتے ہیں اُسے دوسرے وقت میں کفر و الحاد سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے
حیرت ہے کہ اس کے خلاف ایک لفظ تک زبان پر نہیں لاتے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ان میں سے ہر ایک کی
ہے کہ

زر بر سرِ فولاد نہی نرم شود

ان میں ایسے لوگ بھی تو ہوں گے جنہیں روپے پیسے کا لالچ نہیں ہوگا۔ حیرت اُن پر آتی ہے کہ ان کی عقل و
درجہ مفلوج کر دی گئی ہے کہ وہ مودودی صاحب کی دو متضاد تحریروں کو آمنے سامنے رکھ کر اتنا فیصلہ کر
بھی قابل نہیں رہے کہ جو شخص آج کچھ کہتا ہے اور کل کچھ، اور اپنی ان دونوں باتوں کو مطابقِ اسلام بتاتا
کا ساتھ کس طرح دیا جاسکتا ہے۔ عقل و بصیرت اور دیانت و امانت تو اس قسم کی رفاقت کی کبھی اجا
دے سکتی۔ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے، یہ وہ راز ہے جس کا سمجھنا کم از کم ہمارے جیسے "سادہ دل
کے تو بس کی بات نہیں۔

(۔۔۔)

اسلامی مملکت میں
مذہبی پیشوائیت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی

ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے کہ دنیاوی امور کے فیصلے تو حکومت کی طرف سے کئے جائینگے، لیکن دینی معا
کے متعلق ہمیں بہرحال علماء کرام کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس غلط فہمی میں، جہلا ہی نہیں، اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ
بھی مبتلا ہیں (مثلاً) پچھلے دنوں، کراچی کے روزنامہ جنگ میں "دینی مسائل" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع
ہوا ہے جس میں اس خیال کی تائید اور وضاحت کی گئی ہے۔ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ صا
مقالہ کا پورا منشاء قارئین کے سامنے آ جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہمارے دینی مسائل پر رائے دینے کا حق کس کو حاصل ہے؟ ان لوگوں کو جو دینی علوم پر عبور رکھتے ہیں، یا ایسے
لوگوں کو جو اور تو سب کچھ جانتے ہیں مگر دین کے متعلق کچھ نہیں جانتے؟

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا دین کے بارے میں ایسے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں یا نہیں جن کے بارے میں کسی سے
رائے لینا ضروری ہو؟ جس طرح انسانی زندگی سے متعلق دوسرے معاملات میں اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں
اسی طرح دینی مسائل کے بارے میں بھی اختلافات کا پیدا ہونا امر فطری ہے۔ کون سا دین ایسا ہے جس کے سلسلے میں
اختلافات پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ اختلافات ضرور پیدا ہوتے رہے ہیں۔ البتہ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے ہر د
نظام میں ایسے اداروں کا بندوبست رہتا ہے جو ان اختلافات کے بارے میں ٹھیٹھ دینی علوم کی روشنی میں فیصلے
صادر کرتے رہیں۔ ان اداروں میں ہمیشہ ایسے لوگوں کو رکھا جاتا ہے جو عالم دین ہوں۔

عیسائیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کا ایک پوپ ہے جو مذہبی امور میں سپریم کورٹ کی حیثیت رکھ
ہے۔ پوپ کے نیچے کارڈینل۔ آرچ بشپ اور بشپ ہوتے ہیں۔ ان مناصب پر ادھر سے ادھر سے پکڑ کر لوگوں کو نہ
بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہاں پر صرف ایسے لوگوں کو بٹھایا جاتا ہے جو چوٹی کے عالم دین ہوں اور جنہوں نے اپنی زند

کا بیشتر حصہ تحصیلِ علمِ دین میں صرف کر دیا ہو۔ یہ لوگ جب کسی دینی مسئلہ کے بارے میں فیصلہ دیتے ہیں تو اس دین
تعلق رکھنے والی جملہ اقوام کو وہ فیصلہ ماننا پڑتا ہے۔ اٹلی رومن کیتھولک مذہب سے وابستہ ہے۔ وہاں دینی م
کے بارے میں فیصلہ کا اختیار رومن کیتھولک دینی اداروں کو حاصل ہے۔ وہاں یہ نہیں ہوتا کہ دینی ادارے تو ایک
فیصلہ دیں اور صاحب اثر لوگ، لیڈر یا وزیر یہ اعلان فرما دیں کہ "ہم یہ فیصلہ اسلئے نہیں مانتے کہ ان لوگوں کا کا
ہی ہے جھوٹے فتوے صادر کرنا۔ مثلاً فلاں دور میں انہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا، یا فلاں بڑے آدمی کو فلاں
میں انہوں نے کافر قرار دیا تھا۔ اگر اس قسم کی گستاخی کسی بڑے آدمی سے سرزد ہو جائے تو اس کے لئے کیتھولک
سوسائٹی میں رہنا ناممکن بن جائے۔ اس کو نہ کیتھولک قبرستان میں جگہ ملے گی، نہ اس کا مذہبی رسوم کے مطابق
شادی بیاہ ہو سکے گا۔ نہ اس کی بیوی اس کے پاس رہے گی نہ مرنے کے وقت اسکو SACRAMENTS مل سکیں
گویا وہ زندہ رہا تو اپنے قبیلے سے باہر، اور مرا تو جانور کی طرح۔ سولہویں صدی میں انگریز بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنے رو
کیتھولک چرچ کے بعض فیصلے نہیں مانے تو اس کی پاداش میں نہ صرف بادشاہ کو بلکہ ساری قوم کو جس نے پوپ کے
فیصلہ کے خلاف اپنے بادشاہ کا ساتھ دیا، کیتھولک مذہب سے خارج ہونا پڑا۔ وہاں یہ نہیں ہوا کہ بادشاہ ہنری
انگریز قوم یہ موقف اختیار کرلے کہ "ہم رہیں گے تو تمہارے مذہب میں مگر فیصلے تمہارے نہیں مانیں گے۔

اسی طرح یہودی قوم کا بھی یہ قانون ہے کہ مذہبی امور میں مذہبی پیشواؤں اور علمائے دین کا فیصلہ ہی آخر
فیصلہ ہوتا ہے۔ کسی حاکم یا فردِ واحد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کے فیصلوں کا تمسخر اڑائے یا ان کی ذات پر حملہ کرے۔

خود ہماری اپنی تاریخ اس بات کی بہترین گواہ ہے کہ جب اسلام آزاد تھا تو مذہبی امور میں وقت کے بادشاہ
کو بھی علماء اور قاضیوں کے فیصلے ماننے پڑتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ "جس کا کام وہی جانے" علم دین علمائے دین ہی
جانتے تھے، لہٰذا دینی معاملات میں ان کے فیصلوں پر ہی عمل کیا جاتا تھا۔

تو اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اصول یہ ٹھہرا کہ اگر کسی شخص کو اپنے کو کسی دین کا پیرو کہلانا ہے اور اس د
کی سوسائٹی میں رہنا ہے تو اس کو لازماً اسی دین کے قوانین ماننے پڑینگے اور ان قوانین کی تشریح اور ان کا نفا
صرف وہی لوگ کرینگے جو دینی قانون کے ماہر ہونگے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ رہیں تو اسلامی سوسائٹی میں اور اسلا
معاملات میں چلائیں اپنی!

ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ آپ پاکستان میں رہتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ پاکستان کی عدالتوں کے فیصلے
اس بنا پر نہیں مانیں گے کہ یہ عدالتیں کبھی کبھی غلط فیصلے بھی دیتی رہی ہیں۔ اگر آپ کو پاکستان کا شہری بن کر رہنا
تو آپ کو لازماً پاکستان کی عدالتوں کے فیصلے ماننے ہیں، چاہے وہ فیصلے صحیح ہوں یا کبھی کبھی غلط بھی۔ بعینہٖ یہی
پوزیشن ہے مذہبی قانون کی۔ اگر آپ کسی مذہب سے وابستہ ہیں تو آپ کو اس مذہب کا قانون ماننا پڑے گا اور ا

قانون کو سمجھنے اور نافذ کرنے کا حق ان کو حاصل ہوگا جو اس قانون کے ماہر ہونگے۔

آپ عدالتوں میں کن لوگوں کو رکھتے ہیں؟ ان ہی لوگوں کو جو قانون کے ماہر ہوتے ہیں۔ اور جو قانون کو پڑھتے اور سمجھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دینی معاملات میں بھی فیصلہ دینے کے اہل وہ لوگ ہیں جو دین کو جانتے ہیں"۔

(روزنامہ جنگ۔ بابت ۲۷ ۷)

اور آخر میں لکھا ہے کہ۔

" اصول یہ ہے کہ جس طرح دنیوی معاملات کے بارے میں فیصلہ دینے کا حق عدالتوں کو حاصل ہے اسی طرح دینی معاملات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق علماء دین کو حاصل ہے۔ آپ ان کے اس حق کو چیلنج نہیں کرسکتے۔

اس مقالہ کے لکھنے والے ہیں پیر علی محمد راشدی۔ راشدی صاحب کا شمار بہر حال ملک کے لکھے پڑھے حضرات میں ہوتا ہے۔ وہ ممالک غیر میں پاکستان کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ملک کا کس قسم کا طبقہ اس بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ طلوع اسلام اپنے یوم تاسیس سے آج تک اس موضوع پر مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آرہا ہے۔ لیکن زیر نظر مقالہ سے اندازہ ہوا کہ اس پر بار بار لکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کا احساس ان سطور کی تسوید کا محرک ہے۔

———— (۰) ————

راشدی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، سیکولر اسٹیٹ میں کیفیت بیشک یہی ہوتی ہے۔ انہوں نے یورپ کی (یا مسیائی مذہب کے پیروؤں) کی جو مثال دی ہے، خود اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ ان کے ذہن میں سیکولر سٹیٹ کا تصور ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں، دین اور دنیا، دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ دنیاوی معاملات کے فیصلے، مملکت کی طرف سے ہوتے ہیں اور مذہبی امور کے فیصلے مذہب کے علماء کی طرف سے۔ مسلمانوں میں، جب، صدر اول کے بعد، ملوکیت آگئی تو دین اور سیاست کی یہی ثنویت ان کا بھی معمول بن گئی۔ یعنی انکے ہاں، مملکت اسلامی ہونے کے بجائے سیکولر ہو گئی جس میں خود قانون دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ پرسنل لاز (شخصی قوانین) پر مشتمل اور دوسرا حصہ، پبلک لاز، مدنی امور سے متعلق۔ پرسنل لاز میں دائرۂ اقتدار علماء کا تسلیم کر لیا گیا اور پبلک لاز مملکت کے حیطۂ اقتدار میں رہے۔ یہی انداز مملکت و سیاست مسلمانوں کے ہاں آج تک چلا آرہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ انداز ہی سرے سے غیر اسلامی ہے۔ نہ قرآن کریم میں کہیں زندگی کو دین اور دنیا کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور نہ ہی عہد رسالتمآب اور خلافت راشدہ میں اس قسم کی تقسیم و تفریق کا کوئی نشان تک دکھائی دیتا ہے۔ اس میں آپ نے کہیں یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ دنیاوی امور کے فیصلے تو

مملکت کی طرف سے نافذ ہوتے ہوں اور دینی معاملات کے لئے علماء کیطرف رجوع کیا جاتا ہو۔ اس دور میں کا کوئی الگ وجود ہی نہیں تھا۔ اس وقت تو نماز کی امامت بھی عمالِ حکومت کی ذمہ داری تھی اور جمعہ کا خطبہ امیر المؤ یا گورنر دیا کرتے تھے۔ اس وقت "حکومت کے فیصلے" اور "علماء کے فتاوی" کی الگ الگ اصطلاحات بھی وجو میں نہیں آئی تھیں حتیٰ کہ اس زمانے میں تعبدی (یعنی وہ معاملات جن کا تعلق "عبادت" سے ہو) اور غیر تعبد امور کی تفریق بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھی۔ اس وقت "عبادت" سے مراد تھی احکام و قوانین خداوندی کی اطا خواہ ان کا تعلق صوم وصلوٰۃ سے ہو اور خواہ کاروباری معاملات سے۔ اور ان تمام احکام و قوانین کا نفاذ حکوم کیطرف سے ہوتا تھا اور وہی اختلافی معاملات میں فیصلے دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں نہ اعتقا اور فقہی اختلافات پیدا ہوتے تھے اور نہ ہی مذہبی فرقوں کا وجود تھا۔ (فرقہ بندی کو تو قرآن نے شرک قرار د ہے' اس لئے اسلامی نظامِ زندگی میں فرقے پیدا کیسے ہوسکتے تھے؟) جب احکام و قوانین کے نفاذ کا مرکز ایک ہو اور ان احکام و قوانین کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہو' تو پھر باہمی اختلافات کا کیا سوال اور مذ فرقوں کا کیا تصور؟ اسلام' دین تھا' اور دین میں نہ کسی قسم کا تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے' نہ کوئی گروہ بندی وجود میں آسکتی ہے۔

یہ تھا نقشہ اسلامی مملکت کا۔ اس کے بعد (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) جب' اسلامی مملکت کی جگ مسلمانوں کی سیکولر اسٹیٹ نے لے لی' تو مذہب اور سیاست دو الگ الگ اور ناقابلِ اتصال' شعبوں میں بٹ گئے۔ اس وقت مذہبی پیشواؤں کا گروہ بھی پیدا ہو گیا اور مذہبی امور کے فیصلوں کے لئے ان کی طرف رجو کرنے کی ضرورت بھی لاحق ہو گئی۔ چونکہ پاکستان میں بھی حکومت سیکولر چلی آرہی ہے اسلئے اس میں دنیاوی او مذہبی امور کی ثنویت اور تفریق بھی موجود ہے' اور علماء کا الگ گروہ بھی۔

یہاں تک صورتِ حال قابلِ فہم ہے۔ لیکن ہماری غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ اسلامی مملک میں بھی کیفیت یہی ہو گی۔ یہ تصور غلط ہے۔ سیکولر اسٹیٹ اور اسلامی مملکت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی مملک میں' زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت قرار پاتی ہے جس میں دنیاوی معاملات اور دینی معاملات الگ الگ نہیں ہو اس میں دنیا کا ہر معاملہ جو احکامِ خداوندی کے مطابق طے پائے' دینی قرار پاتا ہے۔ اسلئے اس میں' زندگی کے ہر معام کے متعلق فیصلہ کن اتھارٹی حکومت ہی ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کی مشیری اُنہی اربابِ علم و بصیرت اور اعیانِ فکر و نظر پر مشتمل ہوگی جو دنیاوی امور پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہوں اور یہ بھی جانتے ہوں کہ خدا کی عطا کر راہ نمائی میں ان کے فیصلے کس طرح کئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگ صحیح نظامِ تعلیم پیدا کر سکیگا۔ اس وق ہمارا نظامِ تعلیم بھی سیکولر ہے۔ اس میں دنیاوی تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور "دینی" تعلیم کت

ون میں۔ اس وقت سکالر اور ہوتے ہیں اور علماء اور۔ قانون دان (وکلاء) اور ہوتے ہیں اور مفتیانِ
ں" اور۔ عدالت کا فیصلہ اور ہوتا ہے اور فتویٰ اور۔ اسلامی نظام مملکت و معاشرت میں اس قسم
نہیں ہوگی۔ اس میں ایک ہی درس گاہ ہوگی جس میں دنیاوی علوم اور دینی تصورات کو بیک وقت سامنے
جس میں یہ بتایا جائے گا کہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کا حل، قرآنِ کریم کی روشنی میں کیا ہوگا۔ عام درسگاہوں
ں درس گاہوں میں قانون کی تعلیم دی جائے گی۔ اس میں بتایا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں، ہمارے
نون سازی کے سلسلہ میں کیا کیا کوششیں کیں اور ہم، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قرآنِ کریم
غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے قوانین و ضوابط کس طرح مرتب کر سکتے ہیں۔
قانون دان (فارغ التحصیل طلباء) آگے چل کر، قوانین ساز بھی ہوں گے اور حکومت کے مشیر بھی، سپریم
ہوں گے اور عدلیہ کے سربراہ بھی۔ اس وقت نہ علماء کرام اور مفتیانِ عظام کا الگ وجود ہوگا، نہ اُن
کوئی ضرورت۔ اس وقت ہر معاملہ کا فیصلہ حکومت کی طرف سے ہوگا اور مملکت کے قانون کی حیثیت
ل۔ اس وقت نہ الگ ائمہ مساجد ہوں گے نہ جداگانہ خطیب۔ نہ انفرادی واعظ ہوں گے نہ پیشہ ور مبلغ۔ یہ
لامی معاشرہ کی طرف سے ہوگا جس کا دوسرا نام اسلامی مملکت یا حکومتِ خداوندی ہے۔ اس حکومت
ز قوانینِ مملکت) کی پابندی لازمی ہوگی اور ان کی خلاف ورزی جرم، جو مستوجب سزا ہوگا۔ اس وقت
فر کا فتویٰ لگا سکے گا، نہ کسی کو اپنے طور پر اپنے مسلمان ہونے کی سند پیش کرنے کی ضرورت ہوگی اس
ہی حکومت یہ طے کرے گی کہ مسلم کسے تسلیم کیا جائے گا اور غیر مسلم کسے، اس لئے کہ ان دونوں میں
امورِ مملکت کے سلسلہ میں ضروری ہوگا۔

نقشہ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ کی اسلامی مملکتوں کا، اور یہی نقشہ ہوگا اس اسلامی مملکت
ود جہاں بھی قائم ہوگی۔ پاکستان اسی قسم کی مملکت کے قیام کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ تحریکِ پاکستان
یادی وجہ نزاع تھی۔ آزاد ہندوستان میں (انگریزی عملداری کی طرح) سیکولر حکومت قائم کی جاتی
ارباب بصیرت کی نگاہ اسلامی تقاضوں پر تھی، ان کے نزدیک اس حکومت میں مسلمان، اسلامی
یں کر سکتا تھا۔ اسی لئے وہ ایک الگ، آزاد مملکت کا تقاضا کرتے تھے جو (سیکولر کی بجائے) اسلامی
شکل ہو۔ وہاں علماء کی اکثریت، تحریکِ پاکستان کی مخالف تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیکولر حکومت
ں قوانین کے دائرے تک ہی سہی) ان کا اقتدار قائم رہے گا اور اسلامی حکومت میں ان کا جداگانہ
ہوجائے گا۔ پاکستان وجود میں آگیا لیکن یہاں بھی علماء حضرات نے (اپنے اقتدار اور وقار کی خاطر)
ست کا صحیح نقشہ سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ یہاں تھیا کریسی انداز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

جو اپنے نتائج کے اعتبار سے سیکولر حکومت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ اس میں 'مذہبی پیشوائیت' ہیئت حاکمیہ کی پوزیشن کرلیتی ہے اور ہر معاملہ میں اقتدار اعلےٰ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہے وہ علماء کو "انبیاء بنی اسرائیل" کا درجہ دیتے اور منبر رسولؐ اللہ کا وارث ٹھہراتے ہیں۔ اپنی ہستی کو لاینفک ثابت کرنے کے لئے وہ اس قسم کے دلائل دیتے رہتے ہیں (جنہیں راشدی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں دہرایا ہے)

"بات سیدھی ہے۔ آپ بیمار ہوتے ہیں تو حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ آپ کو مکان بنانا ہوتا ہے تو معمار کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ مشینری کا معاملہ ہوتا ہے تو مکینیکل انجینئر بلاتے ہیں۔ ہوائی جہاز چلانا ہوتا ہے تو پائلٹ کا انتظام کرتے ہیں۔ حجامت کروانی ہوتی ہے تو باربر شاپ سے استفادہ کرتے ہیں۔ سبزی گوشت خریدنا ہوتا ہے تو مارکیٹ جاتے ہیں۔

اب اگر اسلام کے بارے میں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ کس کی طرف دیکھیں گے؟ کس کی رائے آپ حاصل کریں گے؟ انہیں لوگوں سے جو اسلام جانتے ہوں یا کسی اور سے؟"

یہ (سطحی سی) دلیل اس قدر نگاہ فریب اور مغالطہ آفریں ہے کہ اچھے اچھے ذہن بھی اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہاں صاحب! دینی معاملات کا فیصلہ علماء کرام ہی کو کرنا ہوگا۔ ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ سیکولر حکومت میں تو یہ تقسیم موجود ہوتی ہے لیکن اسلامی حکومت میں یہ نظریہ بالکل باطل ہے۔ اس میں ڈاکٹر، وکلاء، انجینئر، پائلٹ وغیرہ حکومت کے مشیر ہوتے ہیں، فیصلہ کن اتھارٹی نہیں ہوتے۔ اس میں انجینئر یہ مشورہ تو دیتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں قسم کا پُل زیادہ مضبوط رہے گا۔ اس امر کا فیصلہ حکومت ہی کرتی ہے کہ پُل کس جگہ بنانا چاہیئے اور کس قسم کا۔ اس میں ایک وکیل یہ تو بتا سکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں قانون کیا کہتا ہے۔ قانون بنانا یا قانون کے مطابق فیصلہ دینا، وکیل کا کام نہیں ہوتا۔ یہ اختیارات حکومت ہی کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح، اسلامی حکومت میں، علوم دین سے واقف حضرات، حکومت کے مشیر یا اس کی طرف سے متعین کردہ عمال ہوں گے۔ فیصلہ کن اتھارٹی کے حامل نہیں ہوں گے۔ فیصلہ کا اختیار حکومت ہی کو ہوگا۔

یہ ہے فرق اسلامی حکومت اور سیکولر حکومت میں علماء کی پوزیشن میں۔ اور اسی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا غلط فہمی ہے جس کا (عوام تو ایک طرف) ہمارے خواص بھی بُری طرح شکار ہیں اور اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے ہمارا نوجوان طبقہ یہاں تک کہنے پر اتر آیا ہے کہ اس قسم کی تھیاکریسی کے مقابلہ میں سیکولرازم ہزار درجہ بہتر ہے ہم ان نوجوانوں کو کوسنے تو لگ جاتے ہیں لیکن یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کے دلوں میں اس قسم کے خیالات پیدا کرنے کا موجب خود ہم ہی ہیں جو یہ تصور عام کررہے ہیں کہ اسلامی حکومت میں " دین کے معاملات میں اقتدار اعلیٰ علماء کو حاصل ہوگا۔ جب تک ہم اس یکسر غیر اسلامی تصور کو مٹاتے نہیں، نہ موجودہ کشمکش دو

ہو سکتی ہے نہ کوئی ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی پائیدار حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ علماء کا طبقہ اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا ہے اور ہم (شعوری یا غیر شعوری طور پر) انہیں اہمیت دے دے کر ان کی گرہیں اور مضبوط کئے چلے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی اور بھی لاحق ہوتی ہے سمجھا یہ جاتا ہے کہ دینی معاملات کے متعلق احکام پہلے سے مرتب شدہ رکھے ہیں اور علماء کو ان کا علم ہوتا ہے، اس لئے جس معاملہ کے متعلق ہمیں معلوم کرنا ہو کہ شریعت کا حکم کیا ہے، اس کے لئے ہمیں لامحالہ علماء کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ کیونکہ وہی جانتے ہیں کہ اس باب میں شریعت کا حکم کیا ہے۔ یہ کیفیت بھی سیکولر حکومت میں ہوتی ہے جس کا کام دنیاوی امور سے متعلق احکام و قوانین وضع کرنا ہوتا ہے۔ دینی امور کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان سے متعلق تمام احکام پہلے سے طے شدہ ہیں، اسلامی حکومت میں کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں (چند احکام کو چھوڑ کر) ابدی اور غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود مرتب کرے۔ انہیں احکام شریعت کہا جائے گا۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ احکام عند الضرورت، بدلتے رہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فلاں معاملہ میں شریعت کا فیصلہ کیا ہے، حکومت کی طرف سے شائع کردہ ضوابطِ قوانین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جن حضرات کو ان ضوابط پر زیادہ عبور ہوگا انہیں قانون دان کہا جائے گا۔ لہٰذا، اسلامی حکومت میں اس مقصد کے لئے بھی موجودہ تصور کے علماء کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

—— (۰) ——

اسی ضمن میں ایک سوال اور بھی سامنے لایا جاتا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنے) کا فریضہ تو بہرحال ایسا ہے جس کی ادائیگی علماء کرام ہی کریں گے۔ اس لئے اس مقصد کے لئے تو علماء حضرات کی ضرورت باقی رہے گی۔ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں، لیکن تجدید یادداشت کے لئے اسکا اس مقام پر دہرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اسلام نام ہے اس طریق یا نظام کا جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ مرنے کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل

بھی ہو جاتا ہے۔ یہ طریقِ زندگی تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کردہ ہے اور ہمیشہ کے لئے نافذ رہنے کے لئے دیا گیا ہے۔ نہ اسلام کے سوا کوئی اور طریقِ زندگی اس عظیم مقصد کو پورا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کسی تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے۔ یہ انسانیت کے لئے خدا کی طرف سے مکمل اور آ نظامِ حیات ہے۔ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور طریق اختیار کریگا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائیگا ۔ ۳/۸۵) سے یہی مراد ہے۔

نبی اکرمؐ نے اسی اسلام کی دعوت تمام نوعِ انسان کو دی۔ یعنی یہ دین نہ قومی تھا نہ خاندانی، نہ نسلی تھا وطنی۔ بلکہ ان کی دعوت خون، نسل، رنگ، قوم، زبان، وطن کی حدود و قیود سے ماوراء پوری کی پوری نو انسان کے لئے تھی۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (۷/۱۵۸) "تم پوری نوعِ انسان سے پکا کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" یہ دعوت نہایت حکیمانہ اور حسن کارانہ انداز سے دی جاتی

تمام نوعِ انسان کی طرف رسول

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔ (۱۶/۱۲۵)۔ اور علم و بصیرت اور دلائل و پر مبنی ہوتی تھی۔ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ۔ (۱۲/۱۰۸) جو لوگ اس طرح دل اا کے پورے اطمینان کے ساتھ اس دعوت کو قبول کر لیتے تھے، وہ اس جماعت کے افراد بن جاتے تھے جو اپنی ز اسلام کے مطابق بسر کرنے کے لئے وجود میں آتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، ا لوگ (جماعتِ مومنین) اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے تھے ان پر کچھ پابندیاں عاید ہو ق یعنی یہ کہ انہیں فلاں کام ضروری کرنے ہیں اور فلاں باتوں سے رکنا اور بچنا ہے

معروف و منکر

لوگوں کے لئے جن امور کا سرانجام دینا ضروری تھا، قرآنِ کریم نے انہیں "معروف" اصطلاح سے تعبیر کیا ہے ——— یعنی وہ باتیں جنہیں وہ نظام صحیح تسلیم (RECOGNISE) کرتا ——— اور جن باتوں سے بچنا ضروری تھا، وہ انہیں "منکر" کہہ کر پکارتا ہے ——— یعنی ایسی باتیں جو اس نظا نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس بات کو افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا جاتا جس طرح جی چاہے "معروف" پر عمل کریں اور "منکر" سے رکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے متعین کر کہ "معروف" کیا ہے اور "منکر" کیا۔ اور "معروف" پر عمل کرنے کی شکل کیا ہوگی اور "منکر" سے رکنے کیا۔ بالفاظِ دیگر، یہ سب کچھ نظم و نسق کے تابع ہوگا۔ اس نظم و ضبط کو، دورِ حاضر کی اصطلاح میں نظامِ مم کہتے ہیں۔ لہٰذا دین اس نظامِ مملکت کا نام ہے جس میں افرادِ مملکت کو اسلام کے مطابق چلایا جاتا ہے۔

انہیں "معروف" کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور "منکر" سے روکا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح اصولی طور پر آئی ہے۔ یعنی معروف اور منکر کی تفصیلات قرآن نے خود مرتب نہیں کر دیں۔ اسے اسلامی حکومت پر چھوڑا ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے اصولات، اقدار اور احکام کی روشنی میں معروف اور منکر کی جزئیات اور تفصیلات خود متعین کرے۔

آگے بڑھنے سے پہلے دو تین باتوں کا دہرا لینا ضروری ہے جو تصریحات بالا سے مستنبط ہوتی ہیں۔ یعنی

(۱) اسلام کی طرف دعوت، تمام نوعِ انسان کو دی جائے گی۔ یہ صرف "دعوت" ہوگی جبر نہیں ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اسلام کو لوگوں تک پہنچا دیا جائے گا اور اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ چاہے اسے اختیار کریں، چاہے اس سے انکار کر دیں۔

(۲) جو لوگ، بطیبِ خاطر، دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ، اس دعوت کو حق سمجھ کر اختیار کر لینگے، وہ جماعتِ مومنین کے افراد بن جائینگے۔

(۳) یہ جماعت ایک نظامِ مملکت کے تابع زندگی بسر کریگی جو انہیں "معروف" کے مطابق چلنے اور "منکر" سے رُکنے کے لئے ضروری احکام نافذ کریگا۔

نظم و ضبط

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان احکام سے یہ مطلب نہیں کہ وہ نظامِ مملکت افراد کی زندگی کو قدم قدم پر قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیگا۔ چونکہ یہ جماعت وہ ہوگی جس نے اچھی طرح سے سمجھ سوچ کر، قلب اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اس طریقِ زندگی کو اختیار کیا ہوگا۔ اس لئے معروف کے اتباع اور منکر سے اجتناب کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھریگا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ ان کا ہر قدم، بلا تکلف و بلا تامل، از خود، معروف کے مطابق اٹھے گا اور منکر سے رُکے گا۔ اس طریقِ زندگی کا منتہیٰ و مقصود ہی یہ ہے کہ وہ انسانی سیرت و کردار کو اُس سانچے میں ڈھال دے جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہوتا ہے جو اس مملکت کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" درحقیقت معاشرہ میں نظم و ضبط کے لئے ہوگا۔

——— (۰) ———

اب آگے بڑھیئے۔

حضورؐ کا فریضہ

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، نبی اکرمؐ کا ایک فریضہ یہ تھا کہ نوعِ انسان کو اسلام کی دعوت دیجائے۔ اس اعتبار سے حضورؐ "داعی الی اللہ" (۳۳/۴۶) اور اولین مبلغِ اسلام تھے (ؐ)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کا فریضہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بھی تھا۔ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ

عَنِ الْمُنْکَرِ ۔ (۳/۱۰۳) ۔ پہلا فریضہ عام انسانوں (غیر مسلموں) کو اسلام کی دعوت دینے کا تھا۔ دوسرا فریضہ ا
مملکت میں، معروف کو عملاً نافذ کرنے اور منکر سے عملاً روکنے کا۔
نبی اکرمؐ کے بعد یہ دونوں فرائض امت کی طرف منتقل ہو گئے۔ یعنی غیر مسلموں کو اسلام کی طرف
دینا اور اسلامی مملکت میں" امر بالمعروف و نہی عن المنکر"۔ (چونکہ اس وقت ہمارے پیش نظر موضوع ۔
بالمعروف و نہی عن المنکر ــــ ہے اس لئے ہم سر دست پہلے فریضہ (تبلیغ و دعوت) کی تفصیل میں نہیں جا

امت کا فریضہ

اس فریضہ کے متعلق کہا گیا۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا ال
اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ ءَ
الْاُمُوْرِ ۔ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائ
کریں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے ۔ اور ان کے تمام کام، انجام کار، اللہ کیلئے

اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ

(۱) اقامتِ صلوٰۃ ،
(۲) ایتائے زکوٰۃ ،
(۳) امر بالمعروف ۔ اور
(۴) نہی عن المنکر

ہوگا۔ (اس وقت ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رُو سے" اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے ز
بھی تمکن فی الارض (اسلامی حکومت) ضروری ہے۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اسلامی مملکت کا فر
بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور چونکہ اسلامی حکومت پوری کی پوری امت کی ہوتی ہے (وَاَمْرُھُمْ
بَیْنَھُمْ ۔ ان کی حکومت باہمی مشاورت سے ہوتی ہے) نہ کہ کسی خاص فرد یا گروہ کی، اس لئے اس فر
امت ادا کرتی ہے۔ ان کی کوئی خاص جماعت نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے دیگر مقامات پر اس کی واضح الف
تصریح کر دی ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ
عَنِ الْمُنْکَرِ ۔ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ۔ (۳/۱۰۹)

تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔
تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو (اس لئے کہ) تم اللہ پر ایمان
رکھتے ہو۔

اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امت کا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (۹/۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں۔ یہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے۔ کسی خاص گروہ کا نہیں۔ حتیٰ کہ اس میں مومن عورتیں بھی مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر عام مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور اس ضمن میں کہا گیا ہے۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (۹/۱۱۲) "وہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں۔"

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر تمام امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔

(۲) یہ امت اس فریضہ کو حکومت کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔ حکم (امر) ایک حکومت ہی دے سکتی ہے۔ اور حکومت ہی کسی کو غلط باتوں سے روک سکتی ہے۔ "روکنے" کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

قرنِ اول میں

اسلام کے قرنِ اول میں جب دین اپنی حقیقی شکل میں قائم تھا، اسلامی حکومت اس فریضہ کو انجام دیتی تھی، اور چونکہ یہ حکومت ساری امت کی صحیح نمائندہ ہوتی تھی اس لئے درحقیقت خود امت اس فریضہ کو سرانجام دیتی تھی۔ نہ اس کے لئے کوئی الگ جماعت تھی اور نہ ہی غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے (تبلیغ) کے لئے کوئی خاص گروہ۔ یہ فریضہ بھی ہر مسلمان سرانجام دیتا تھا اور اسکے لئے اس کے پاس سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ خود اس کی سیرت و کردار تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ اس کا حسنِ معاملہ، اسکے دین کی صداقت کی محکم دلیل اور زندہ شہادت تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس زمانے میں امت میں کوئی گروہ ایسا نہیں تھا جس کے ذمے "امورِ مذہبی" کی سرانجام دہی ہو۔ اُس وقت امت "مذہب" کے لفظ تک سے آشنا نہیں تھی ان کے پاس "دین" تھا جس میں مذہبی اور سیاسی امور کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد جب ہمارے ہاں (دین کا نظام گم ہو جانے سے) مذہب اور سیاست کی ثنویت عمل میں آئی تو امورِ مملکت، حکمران طبقہ نے اپنی تفویض میں لے لئے اور مذہبی امور کے لئے ایک الگ گروہ وجود میں آگیا۔ چونکہ ان کے پاس حکومت کا اقتدار نہیں تھا، اس لئے ان کے نزدیک "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا مفہوم اتنا ہی رہ گیا کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے، اچھے کام کرنے کی تلقین کی جائے اور بُرے کاموں سے بچنے کی تاکید۔ اس طرح ایک طرف حکومت ایک خاص طبقہ کی ملکیت بن گئی اور دوسری طرف "امر بالمعروف و نہی

عن المنکر کا واعظانہ فریضہ بھی ایک خاص گروہ کے اندر محدود ہو گیا۔ امت نہ اُس میں شریک رہی نہ امر حکومت میں "حکمران طبقہ" اپنے آپ کو "ہم" اور امت کو "تم" کہہ کر پکارتا تھا۔ اور مسجد میں واعظ اور خطیب کرتا تھا۔ یعنی امت الگ تھی اور یہ دونوں گروہ الگ اور امت سے بالا۔ یہی کیفیت آج تک چلی آرہی ہے۔ اس کے بعد دین کا نظام (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) پھر قائم نہیں ہوا۔

یہاں تک بات بالکل واضح اور صاف ہے۔ لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے ایک الگ گروہ کے جواز بلکہ وجوب کے لئے قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے سند پیش کی جاتی ہے۔ وہ سورۂ آل عمران کی حسب ذیل آیت ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (۳/۱۰۴)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

اور چاہئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہے جو نیک کاموں کی طرف بلاتی رہے اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے۔ یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس حقیقت کو اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل بتایا ہے۔ آپ ان تمام آیات پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری امت کا فریضہ بتایا ہے (اور جنہیں پہلے درج کیا گیا ہے)۔ اور اس کے بعد سوچئے کہ اگر اس آیت کا مطلب لیا جائے (کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں بلکہ امت کے ایک خاص گروہ کا ہے) تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ یعنی ایک طرف تو قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے اور ایک آیت کہہ دیتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں، امت کے ایک خاص گروہ کا ہے! قرآن کریم کے دیگر مقامات تو ایک طرف اسی سورۂ آل عمران کے اسی رکوع میں جس میں آیت (۳/۱۰۴) آئی ہے، پانچ آیتوں کے بعد وہ آیت موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ .... (۳/۱۰۹)

تم بہترین امت ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔

کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم پہلے یہ حکم دیتا ہو کہ تم میں ایک گروہ ایسا رہنا چاہئے

اور نہی عن المنکر کرے۔ اور پھر پانچ ہی آیات بعد یہ کہے کہ نہیں! یہ فریضہ تم میں سے کسی ایک گروہ کا نہیں، ساری کی ساری امت کا ہے۔ اور پھر متعدد مقامات پر اس دوسری آیت کی تائید کرتا جائے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ پہلی آیت (۳/۱۰۴) کا مطلب دیگر آیات کے مطابق ہی ہونا چاہیئے اور ان کے مطابق ہی ہے۔ اس میں غلط فہمی "مِنْكُمْ" سے پیدا ہوتی ہے۔ (مِنْ + كُمْ) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "تم میں سے"۔ اس کا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ عربی زبان میں (مِنْ) "میں سے" کے معنوں میں بھی آتا ہے (اسے تبعیض کہتے ہیں۔ یعنی کل میں سے بعض)۔ جیسے قرآن کریم میں ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ..... (۲/۲۵۳)۔ یہ وہ رسول ہیں جنہیں ہم نے بعض سے بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔ یعنی ان میں سے بعض کی یہ خصوصیت تھی۔ یہ تبعیض کی مثال ہے۔

لیکن یہی "مِنْ" پوری کی پوری جنس کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (اسے تبعیین کہتے ہیں[1]) جیسے سورۂ بقرہ میں ہے وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ (۲/۲۳۱) اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ نے "کتاب و حکمت" میں سے جو نازل کیا ہے۔ اس کے معنی کتاب و حکمت ہیں۔ علامہ سیوطی نے (الاتقان میں) اس کی اور مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (۱۸/۳۱) اس کے معنی "سونے کے کڑے" ہیں۔

علاوہ بریں آیت (ولتكن منكم امة .....) کے آخر میں ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔ اگر "امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو ایک الگ گروہ کے ساتھ مختص" کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے یہ خاص گروہ ہی فلاح پائے گا۔ باقی امت نہیں۔ یہ بدیہی غلط ہے۔ قرآن کریم نے فلاح و سعادت کی راہ کو تمام مومنین کے لئے کھلا رکھا ہے، نہ کہ ان میں سے کسی خاص کے لئے۔ فلاح و سعادت کو ایک خاص گروہ کے اندر محدود کر دینے کا تصور تو اسلامی تعلیم کو جڑ اور بنیاد سے دیتا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ آیت (ولتكن منكم امة..) سے مراد تمام جماعت مومنین ہے، اس کوئی الگ گروہ نہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے "امور مذہبی اور تبلیغ اسلام" کے لئے ایک الگ مخصوص گروہ کا تصور پیدا ہوا جب سیاست کو دین سے الگ کر لیا گیا۔ یعنی جب مملکت سیکولر (SECULAR) ہو گئی ہر سیکولر اسٹیٹ میں امور مذہبی کے لئے الگ شعبہ (ECCLESIASTICAL DEPARTMENT) ہے۔ اسلامی مملکت میں پوری کی پوری مملکت "امور مذہبی" کے لئے وقف ہوتی ہے۔ یعنی مملکت کا تمام

---

[1] دیکھیے لغات القرآن - باب "مِنْ"۔

قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتا ہے، اس لئے وہ دینی ہو جاتا ہے۔ جب تک کسی مملکت یا
کے لئے ایک الگ گروہ مخصوص رہے گا وہ مملکت سیکولر رہے گی۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر، پوری کی پوری امت کا فریضہ ہے، امت میں کسی الگ گروہ کا نہ
(۲) امت' اس فریضہ کو اپنی حکومت کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔ ان کی یہ حکومت اس انداز کی
میں ہر فرد امت' بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہوتا ہے اور اس کا سارا کاروبار قرآنی حدود
پاتا ہے۔
(۳) لہٰذا' اسلامی مملکت میں' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے لئے بھی مذہبی پیشوائیت کی

حادثۂ ارتحال

حکیم ذکی احمد خاں مالک جدید پریس بلی ماراں دہلی نے ۷ر جولائی ۱۹۷۰ء کو بعارضہ ضیق النفس
۷۷ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ مرحوم ۱۹۱۷ء میں مدرسہ طبیہ دہلی سے فارغ التحصیل
اور سات سال حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب کی پیشکاری میں رہ کر معالجات کا عملی تجربہ
کیا۔ ۱۹۲۵ء میں جدید پریس کی بنیاد رکھی جو آج بہت بڑا آفسٹ پریس ہے۔ معالجات میں مرحوم
مقام حاصل تھا۔ علاج بالغذا میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ہندوستان، پاکستان میں کثیر تعداد
لوگ ان کے معالجات کے گرویدہ تھے۔ ان کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا وہ بظاہر پر ہونا مشکل
مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیوہ، چار لڑکے چار لڑکیاں شامل ہیں۔ خداوند کریم مرحوم کو جنت
میں جگہ عطا فرمائیں اور پسماندگان و اعزہ کو صبر جمیل!

غمگسار
حکیم شمس الرحمان خان برادر۔ ۱۱ مئی،

ادارۂ طلوع اسلام اس حادثۂ فاجعہ میں شریک غم ہے۔ حکیم صاحب مرحوم' طلوع اسلام (قبل از تقسیم)
اولین ناشر اور پرنٹر تھے۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے!

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۰ء) حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے۔

فہرست "ب" (عطیات برائے کالج فنڈ)

نمبر	نام	مقام	رقم
(۱)	محترم میاں خدا بخش صاحب۔	گجرات	۰۰ ر ۲۰۰ روپے
(۲)	" چوہدری فیض احمد صاحب۔	"	۰۰ ر ۵۰۰ "
(۳)	" بشیر احمد بٹ صاحب۔	"	۰۰ ر ۱۰۰ "
(۴)	" مرزا عطاء الرحمٰن صاحب	"	۰۰ ر ۳۰۰ "
(۵)	" چوہدری محمد حسین صاحب	"	۰۰ ر ۵۰ "
(۶)	" فضل علی صاحب۔	"	۰۰ ر ۵۰ "
(۷)	" سید حاکم شاہ صاحب	"	۰۰ ر ۵ "
(۸)	" ملک حبیب اللہ صاحب	"	۰۰ ر ۵ "
(۹)	میسرز احمد خان محمد شفیع صاحب	"	۰۰ ر ۱۰ "
(۱۰)	محترم محمد کمال صاحب	"	۰۰ ر ۲ "
(۱۱)	" ماسٹر محبوب الٰہی صاحب۔	"	۰۰ ر ۱ "
(۱۲)	" قلندر حسین شاہ صاحب۔	ڈیونہ منڈی (گجرات)	۰۰ ر ۲ "
(۱۳)	" محمد انور صاحب (پنشنر)	"	۰۰ ر ۱۰ "
(۱۴)	" ماسٹر محمد انور صاحب	"	۰۰ ر ۱۰ "
(۱۵)	" چوہدری محمد اکبر صاحب	"	۰۰ ر ۱۰ "
(۱۶)	" ڈاکٹر شفقت احمد صاحب	"	۰۰ ر ۱۰ "
(۱۷)	" صوبیدار فتح خان صاحب	"	۰۰ ر ۲۰ "
(۱۸)	" چوہدری نذیر حسین صاحب	"	۰۰ ر ۲۰ "
(۱۹)	" محمد اشرف بابر صاحب	"	۰۰ ر ۱۰ "
(۲۰)	" ملک اللہ دتہ صاحب	"	۰۰ ر ۱۰ "
[illegible]	" [illegible]	"	۰۰ ر ۵ "

نام	مقام	رقم
(۲۲) محترم چوہدری نذیر احمد صاحب	ہڑپہ والا (گجرات)	۲۰۰,۰۰ روپے
(۲۳) " مولانا یعقوب حسین صاحب	کابل	۲۰۰,۰۰ "
(۲۴) " ناصر حسین صاحب	بھوپال والا (سیالکوٹ)	۴۰,۰۰ "
(۲۵) محترمہ بیگم چوہدری تجمل صاحبہ	گجرات	۵۰۰,۰۰ "
(۲۶) محترم محمد مشتاق علی خان صاحب	ساہیوال	۱۰۱,۰۰ "
(۲۷) " سید عبدالرشید صاحب	لاہور	۵۰,۰۰ "
(۲۸) " ظہور الدین بھٹی صاحب	"	۱۰,۰۰ "
(۲۹) " محمد شریف میر صاحب	"	۱۰,۰۰ "
(۳۰) " محمد عبداللہ ارائیں صاحب	چک ۱۶۱/۴ ای۔بی (ملتان)	۲۰۰,۰۰ "
(۳۱) محترم الیف بخش صاحب	بلفاسٹ	۳۶۳,۲۸ "
(۳۲) ضلع لائلپور کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام شائع نہیں کرانا چاہتے۔		۲۰۰,۰۰ "
(۳۳) محترم شمس تبریز صاحب	لاہور	۵,۰۰ "
(۳۴) " قمر پرویز صاحب	"	۵,۰۰ "
(۳۵) " لیفٹیننٹ کرنل ایس۔ ڈی طور صاحب۔	"	۱۰۰۰,۰۰ "
(۳۶) محترمہ بیگم میاں نصر اللہ صاحب۔	کراچی	۱۰۰,۰۰ "
(۳۷) محترم طارق مصطفیٰ صاحب	"	۱۰۰۰,۰۰ "
(۳۸) " خالد صاحب	ابوظہبی	۲۵,۰۰ "
(۳۹) " ماسٹر محمد ارشاد صاحب	گگھڑ لو گلی	۴,۰۰ "
(۴۰) " اختر عباس سعید صاحب۔	کوئٹہ	۱۰,۰۰ "
(۴۱) محترمہ مسز بلند اقبال صاحبہ	لاہور	۵۰,۰۰ روپے
(۴۲) محترم فصیح محمد صاحب۔	کراچی	۵,۰۰ "
(۴۳) " عبدالعزیز صاحب	"	۲۰,۰۰ "
(۴۴) " محمد اکرم صاحب	"	۱۰۰,۰۰ "
(۴۵) " عابد حسین قریشی صاحب	"	۱۰۰,۰۰ "
(۴۶) بزم طلوع اسلام۔	کراچی	۴۴۰,۰۰ "

(۴۷) محترم داؤد حسن صاحب و دیگر احباب	کراچی	۲۰،۰۰	روپے
(۴۸) محترمہ زبیدہ بیگم صاحبہ	"	۵،۰۰	روپے
(۴۹) " نہمیدہ رشید صاحبہ	"	۱۰،۰۰	روپے
(۵۰) " مسز رابعہ ڈار صاحبہ	لندن	۱۴۰،۰۰	روپے
(۵۱) محترم رحمٰن صاحب و خادم صاحب	بریڈ فورڈ	۸۰،۰۰	روپے
(۵۲) لندن کے ایک صاحب جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔		۱۰۰،۰۰	روپے
(۵۳) محترم اللہ دتہ صاحب۔	بریڈ فورڈ	۲۰،۰۰	روپے
(۵۴) " محمد رشید صاحب	"	۲۰،۰۰	روپے
(۵۵) " نور محمد کٹی صاحب	"	۲۰،۰۰	روپے
(۵۶) " کرامت حسین صاحب	"	۱۰۰،۰۰	روپے
(۵۷) میسرز ایس۔ این احمد اینڈ کمپنی۔	شمالی آئرلینڈ	۵۶۰،۳۱	روپے

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)

حقائق وعبر

۱- یہ ہوگا آپ کا اسلام

روزنامہ مشرق "اسلام پسند" گروہ کا ترجمان ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ یہ جماعت اسلامی کا نقیب ہے۔ اس جہت سے اس میں اکثر اسلام سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کا اسلام ان صفحات میں پیش ہوتا ہے، جب کل کو (خدانکردہ) پاکستان کا دروبست "اسلام پسند" گروہ کے ہاتھ میں آگیا تو وہی اسلام آپ کی مملکت کا مذہب قرار پائے گا۔ وہ اسلام کس قسم کا ہوگا اس کی ایک جھلک اس مقالہ کے سامنے آسکے گی جو اس اخبار کی ۱۸ جون ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں، آفتاب طریقت سید شمس تبریز سبزواری ملتانی کے تذکرہ کے سلسلہ میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

۶۶۴ھ میں آپ کے والد سید صلاح الدین محمد نوربخش نے جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر آپ بغداد پہنچے اور ایک سرائے میں اقامت فرمائی۔ یہاں کے علماء نے آپ پر بے دینی کا الزام لگایا اور شاہ احمد نکودار سے درخواست کی کہ انہیں شہر بدر کیا جائے۔ بادشاہ کو آپ سے بعید عقیدت تھی۔ اس نے علماء سے کہا کہ یہ خدا رسیدہ بزرگ ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بیٹے محمد پر کوئی آفت نہ آجائے۔ علماء نے جواب دیا کہ شہزادے کا بال تک بھی بیکا نہ ہوگا۔ اگر کچھ ہوا تو ہمارا ذمہ ہے۔ چنانچہ شاہ شمس قاضی شرع کے حکم سے بغداد کو چھوڑ کر کاظمین تشریف لے گئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شہزادہ فوت ہوگیا۔ بادشاہ سخت پریشان ہوا اور علماء کو حکم دیا کہ فوراً فقیر سے معذرت طلب کرو تاکہ خداوند عالم میرے بچہ کو دوبارہ زندگی عطا فرمائے ورنہ میں تم سب کو قصاص میں قتل کردوں گا۔ چنانچہ علماء جمع ہوکر حضور کی خدمت میں پہنچے اور معذرت چاہی۔ بعد میں بہت منت سماجت کے آپکو بغداد لے آئے۔ یہاں آپ نے دعا کی اور بچہ اللہ کے فضل سے کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھا۔ اب علماء نے آپ پر تکفیر کا الزام لگادیا اور کھال اتروانے کے درپئے ہوئے۔ آپ نے کملی اوڑھ کر کھال اتار دی۔ جو بعد میں سارے شہر میں نمائش کرکے پھرائی گئی۔ شام کو آپ نے واپس لے کر مثل لباس کے زیب تن کرلی۔

بغداد سے روانہ ہونے کے بعد کیا ہؤا، اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے۔

یہ مرشد و مرید براستہ دیبل ۶۶۵ھ میں ملتان آپہنچے۔ ان دنوں یہاں شیخ الاسلام غوث بہاء الحق والدین قدس سرہٗ مسند ارشاد پر فائز تھے۔ جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو آپ کے خلاف ایک کہرام برپا ہو گیا۔ آپ نہایت صبر و سکون سے لوگوں کے طنز آمیز جملے سنتے رہے اور روڑے کنکروں کی بارش میں سے گزرتے وہاں جا پہنچے جہاں آجکل ریلوے اسٹیشن ہے۔ اہل طریقت کے حلقوں میں آپ کے متعلق جو روایات مشہور ہیں ان کے مطابق احمد نکودار کا فرزند بھوک سے سخت نڈھال تھا۔ آپ نے اس مقام پر پہنچکر حضرت نے ایک نعرہ لگایا جس سے بیابان کی ایک ہرنی نمودار ہوئی۔ اس کے تھن دودھ سے لبریز تھے۔ آپنے شہزادے کو پینے کا اشارہ کیا۔ پھر آپنے تکبیر کہہ کر ہرنی کو ذبح کیا اور ضرورت کے مطابق اس کے پیٹ سے گوشت نکال کر باقی جسم کو سی دیا۔ ہرنی کو قم باذن اللہ کہہ کر کھڑا کیا اور وہ چھلانگیں مارتی ہوئی چلی گئی۔

گوشت مل گیا تو سوال پیدا ہؤا کہ اسے پکائیں کس طرح؟ سو اس مشکل کا حل یوں پیش کیا۔

آپنے شہزادے کو حکم دیا کہ جاؤ شہر سے آگ لے آؤ تاکہ اس گوشت کو بھون کر کھائیں۔ شہزادہ سارے شہر میں آگ کی تلاش میں پھرا مگر کسی اہل دل کو رحم نہ آیا۔ بلکہ ایک ستم ظریف حلوائی نے تو اتنا ظلم کیا کہ جب یہ مسافر بچہ آگ لینے کے لئے اس کے ہاں پہنچا تو اس نے گرم تیل کا چمچہ اس کے گلاب جیسے چہرے پر دے مارا۔ نازنین شہزادہ شدتِ درد سے چلّا اٹھا اور روتا ہؤا مرشد کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ آپ نے اپنے عزیز ترین مرید اور روحانی فرزند کی یہ حالت دیکھی تو غصے سے کانپ اٹھے۔ بدن کے عضو عضو میں قہر و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ جلال کی حالت میں آسمان کی جانب نگاہ کی۔ سورج کو دیکھا اور فرمایا۔ او شمس! دیکھ میں بھی تیرا ہم نام ہوں اور ملتان کے لوگ مجھے گوشت بھوننے کے لئے آگ نہیں دیتے۔ ذرا نیچے آتا کہ میں تیری حرارت سے اس معصوم بچے کے لئے گوشت بھون سکوں۔ روایات ہیں کہ اسی وقت بلا کی گرمی پڑی جسے لوگ آفتاب سوا نیزے پر آنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لوگ گرمی سے تڑپنے لگے۔ شہر کے علماء، صلحا اور زہاد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور معذرت طلب کی اور ملتان میں رہائش کے لئے اپنے مکانات پیش کئے۔ اس پر آپ کا غصہ فرو ہؤا، اور آفتاب سے کہا۔ باز برو۔ تب کہیں جا کر ملتان کی سرزمین ٹھنڈی ہوئی اور خلقِ خدا کے تن بدن میں سکون آیا۔ کہتے ہیں اس دن سے ملتان کی گرمی مشہورِ عالم چلی آتی ہے۔ اگرچہ اب یہ کیفیت نہیں رہی۔

سات آٹھ سو سال کے بعد جا کر کہیں اہلِ ملتان کی تقصیر معاف ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ورودِ ملتان سے پہلے حضرت صاحب

افریقہ کے صحراؤں میں بھی اسی طرح گوشت بھونتے چلے آئے ہونگے۔ کیونکہ وہاں کا درجۂ حرارت تو ملتان سے ڈگریاں زیادہ ہوتا ہے۔

(۰)

۲۔ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ!

تقسیم ہند کے زمانہ سے لیکر آج تک مسلمانانِ کشمیر جن قیامت خیز تباہیوں اور بربادیوں کی آماج گاہ بنے آرہے ہیں، پاکستان، مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں جس طرح مسلسل وتعب اضطراب ہے اور گرداب میں گھری کشتی کی طرح، ایک ہی نقطہ کے گرد، محو گردش ہے، ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی میں جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے، ان سب کی ذمہ دار ایک اور صرف ایک شخصیت ہے اور وہ ہیں خیر سے شیخ محمد عبداللہ جو کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے موجب بنے۔ ہم نے جب ان کی اس انسانیت سوز حرکت اور ملت فروش سازش پر انہیں غدارِ ملت کہا اور عبدالطاغوت قرار دیا، تو خود پاکستان کے بعض حضرات، کہ گویا شیخ پرستی کی محبت جن کے دل کی گہرائیوں تک میں اتر چکی تھی، اس پر چیں بجبیں ہوئے۔ لیکن ہم نے نہ اُس وقت اس رائے کی تبدیلی کے لئے کوئی اطمینان بخش وجہ پائی اور نہ ہی اس تئیس سال کے عرصہ میں، اس بارے میں کوئی شک و شبہ لاحق ہوا۔ حتیٰ کہ جب چند سال ادھر شیخ صاحب، بھارت کے پیامبرِ مصالحت بن کر آئے تو ہم نے اپنے عزیزانِ وطن کو کھلے الفاظ میں متنبہ کیا کہ وہ اس شخص کے جھانسے میں نہ آجائیں۔ کہ اب شیخ صاحب نے خود ہی اپنے اس جرمِ عظیم کا اعتراف کر کے، ہماری رائے کی تصدیق کر دی ہے۔ ۲۷ جون کے پاکستان ٹائمز میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

(لندن۔ ۲۶ جون) کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ نے، اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق پر رضامندی سے ایک بہت بڑی حماقت کا ارتکاب کیا تھا (انہو نے کہا، کہ یہ حماقت اتنا بڑا جرم ہے جس کی پاداش میں وہ ہر قسم کی سزا کے مستحق ہیں۔

اس امر کا اعتراف انہوں نے کشمیر کنونشن میں کیا جو حال ہی میں سرینگر میں منعقد ہوئی ہے، جس کی کارروائی لندن کے ہفتہ وار اخبار مشرق میں شائع ہوئی ہے۔

شیخ صاحب نے کہا کہ ان سے یہ حماقت اس لئے سرزد ہوئی کہ انہوں نے پنڈت نہرو پر اعتماد کر لیا تھا۔ انہوں نے پنڈت نہرو کو اس درجہ قابلِ اعتماد سمجھ لیا تھا کہ انہیں اس کا تصور تک نہیں ہو سکتا تھا کہ پنڈت جی اپنے مقدس وعدوں اور محکم قول و قرار سے یوں پھر جائینگے۔ پنڈت نہرو کشمیر

کو اہلِ ہند کی کالونی بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے جو انہوں نے اقوامِ متحدہ کی حفاظتی کونسل سے کئے تھے۔ اس مقام پر شیخ عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور انہوں نے کہا کہ میری یہ حماقت ایسا سنگین جرم ہے کہ قوم کو حق پہنچتا ہے کہ اس کی سزا کے طور پر وہ مجھے شکر لے دے۔ میں انتہائی تأسف سے اس کا اعتراف کرتا ہوں۔

شیخ صاحب کا یہ اعتراف ان کے ضمیر کی آواز سہی لیکن اس سے اب فائدہ؟ کسی کی آنکھ میں چاقو مار کر اسے اندھا کر دینے کے بعد آنسو بہانے سے حاصل کیا ہو سکتا ہے۔ بعض جرم ہوتے ہی ایسے ہیں جن کا نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔

اور پھر جرم بھی ایسا جس سے کسی ایک فرد کا نقصان نہیں ہوا جس نے پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دیا اور پاکستان کی مملکت کو ہر قسم کے خدشات وخطرات کے گرداب میں پھنسا دیا۔ اقبال نے جب انتہائی کربِ الم سے چیخ کر کہا تھا کہ

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا ست
بندۂ غدّار را مولا کجا ست

تو وہ اسی جگر پاش احساس کی صدائے بازگشت تھی۔

——— (ﷺ) ———

بقیہ "بابُ المراسلات" صفحہ ۷ سے مسلسل

افقِ سیاست سے ابھری اور اسے لاکھوں روپے کے خرچ سے کامیاب بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف وہاں کے ہندو جو تباہیاں مچا رہے ہیں، ان کا یہاں کوئی چرچا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ان کی یاد تک بھی ذہنوں میں باقی نہیں رہی۔ فرمائیے "شوکتِ اسلام ڈے" اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے یا نہیں؟ شیخ صاحب محترم کا دل تو خدا کے حضور جواب دہی سے لرز رہا ہے لیکن میں یارانگا ہوں میں مودودی صاحب نے جواب دینا ہے وہاں سے وہ نہایت سرخرو اور شاد کام لوٹے ہونگے۔ اپنا اپنا یوم الحساب اور اپنا اپنا حسیب ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ دوست
فکرِ ہرکس بقدرِ ہمتِ اوست

——— (ﷺ) ———

بابُ المراسلات

گوسالۂ "شوکتِ اسلام ڈے"

محترم شیخ عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ سپریم کورٹ (لاہور) ایک مرنجاں مرنج، انسان دوست، فرقہ وارانہ افتراق سے بلند اور گروہ بندانہ اختلافات سے مبرّا۔ دل دردِ ملّت سے لبریز اور دماغ سے سرشار۔ ۳۱ مئی کو ملک میں "شوکتِ اسلام ڈے" کے نام سے جو ڈھونگ رچایا گیا، اس نے حساس دل پر جو تاثر لیا، اس کا اظہار انہوں نے امیر جماعت اسلامی کے نام ایک خط میں فرمایا اور بھیجدی جسے شیخ صاحب کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ہم نے شیخ صاحب کی خدمت کہ اگر انہیں مودودی صاحب کیطرف سے کوئی جواب موصول ہو تو اس کی ایک نقل ہمیں بھی مرحمت فر ان کی طرف سے ہمیں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی جس سے مترشح ہوتا ہے کہ انہیں مودودی صاحب کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ محترم شیخ صاحب کا مکتوب ملاحظہ فرمائیے۔

لاہور۔ ۲۵ جون ۱۹۷۰ء

جناب مولانا صاحب! السلام علیکم۔ شوکتِ اسلام جلوس جسکی قیادت آ ناقص رائے میں صرف بے محل اور بے موقع ہی نہیں تھی، بلکہ اس کے کارکنوں کے دل سے احسا جانے کا بین ثبوت تھا۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر جن حالات سے مسلمان دوچار ہیں آن آنی چاہیئے نہ کہ اُسے ملی شوکت کا راگ الاپ کر خوشی و مسرت کے شادیانے بجانے کا مو کسی سے یہ بات مخفی نہیں کہ ملک کے اندر کسی کی جان، مال و آبرو محفوظ نہیں ہے۔ ہماری معص کا صرف تنہا گھر سے باہر جانا ہی خطرہ سے خالی نہیں، گھروں کی چاردیواری کے اندر بھی وہ محفوظ نہ واقعات دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں کہ کسی لڑکی کو جبراً اٹھالیا گیا اور اس پر وہ تہذیب سوز گئے کہ خدا کی پناہ۔ طرّہ یہ کہ ایسے قبیح افعال کے ارتکاب سے وہ لوگ بھی مبرا نہیں جن پر نظم و اور اس کے معنبوط کرنے اور رعایا کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ ملک سے وہ ایک الگ جانکاہ داستان ہے۔ ہندوستان میں مساجد کی بے حرمتی تو الگ رہی، معصوم

ماؤں کی آنکھوں کے سامنے ذبح کئے جاتے ہیں اور زندہ جلائے جاتے ہیں۔ اور مستورات کی آبروریزی تو وہاں کا معمول ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۸ ہزار نوجوان مسلمان لڑکیاں جنہیں تقسیم ملک کے وقت "شوکتِ اسلام کے پرستاران" اپنی بے غیرتی کا احساس نہ کرتے ہوئے وحشی درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے تھے، ان وحشیوں کی ہوس کا شکار ہو کر دم توڑ چکی ہیں اور بعض ممکن ہے ابھی تک اس زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ اسرائیلی شیطان ہمارے مقامات مقدسہ پر قابض ہے اور خاکم بدہن، حضور سرورِ کائنات کے روضۂ مبارک پر قبضہ کر کے اسکی بے حرمتی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ لاکھوں عرب مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں اور لاکھوں بے خانماں ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ روز بروز بڑھ رہا ہے مگر آپ کو عالمِ دین ہونے کے باوجود ان حالات میں شوکتِ اسلام کی جھلک نظر آتی ہے۔

ایں چہ بوالعجبی است ؟

اُس ماں سے پوچھئے جس کا بچہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا گیا ہے یا جس کی جواں عمر دوشیزہ دختر کی آبروریزی کی گئی ہے اور پھر سوچئے کہ آپ کے اس جلوس کی کیا حیثیت اور اسکے کیا معنی ہیں۔ ہم لوگ قیامت کے روز حضورؐ کو کیا منہ دکھائیں گے اور خدائے قدوس کو کیا جواب دیں گے۔ آپ تو اپنی ذہانت کی بنا پر اپنے لئے کوئی حجت شاید نکال لیں، دوسروں کے لئے تو ندامت کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ خدارا دوسروں کو اس ندامت سے بچائیں۔

راقم - عبدالحق ایڈووکیٹ - لاہور

مکرر۔ شوکتِ اسلام جلوس کے بعد فوراً میں یہ خط لکھنا چاہتا تھا مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے تاخیر ہوتی گئی!

(عبدالحق)

———— (۰) ————

طلوعِ اسلام

جن جگر پاش تاثرات کا اظہار محترم شیخ صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں فرمایا ان میں ملت کا ہر دلِ درد آگیں برابر کا شریک ہے۔ لیکن جس مقصد کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا تھا، اس میں مودودی صاحب کو یقیناً کامیابی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کا سلسلہ یوں تو شروع سے جاری ہے لیکن گزشتہ اپریل۔ مئی میں ان کی تباہ کاریاں اور خونریزیاں انتہائی شدت اختیار کر گئی تھیں جن کی وجہ سے مسلمانانِ پاکستان کے دل میں، ہندوستان کے خلاف، نفرت و عداوت کے جذبات بڑی تیزی سے بھڑک اٹھے تھے۔ یہ چیز ان عناصر کے مشئوم عزائم کے خلاف جاتی تھی جو بھارت و پاکستان کو پھر سے "ایک کرنے" کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ ان کی مصلحت کوشیوں کا تقاضا تھا کہ پاکستانی مسلمانوں کے جذبات کا رُخ کسی اور طرف موڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے "شوکتِ اسلام ڈے" کی اسکیم

(باقی صفحہ پر)

رفیع اللہ

علمائے کرام ——— امام غزالیؒ کی نگاہ میں

(قسط سوم)

قسط دوم طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکی ہے!

علمائے حق کے پانچ اخلاق

اور بعض نے کہا ہے کہ علمائے حق کی علامات پانچ اخلاق ہیں جو قرآن مجید کی پانچ آیات سے سمجھے جاتے ہیں۔ اول خشیتِ الٰہی۔ دوم خشوع۔ سوم تواضع۔ چہارم حسن خلق۔ پنجم آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا۔ اور یہ زہد ہے۔ (۱) خشیت اس آیت سے ثابت ہوتی ہے یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ (اللہ کے بندوں سے اس سے ڈرنے والے علماء ہیں)۔ (۲) خشوع اس آیت سے۔ خَاشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ (ڈرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے اور اس کی آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے۔ (۳) تواضع کا ذکر اس آیت شریف میں ہے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۴) اور اس آیت شریف میں حسن خلق کی طرف اشارہ ہے۔ فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم (تو اللہ کی رحمت سے ان کے لئے نرم دل بنا)۔ (۵) اور زہد[1] اس آیت سے۔ وقال الذین اوتو العلم ویلکم ثواب اللہ خیرٌ لِمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا۔ (اور اہل علم نے کہا، تمہارے لئے ہلاکت۔ اللہ کا ثواب ایمان لانے اور نیک کام کرنے والوں کے لئے بہتر ہے)

جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں) تو کسی نے عرض کیا کہ اس

---

[1] زہد کا لفظ سارے قرآن میں صرف ایک مقام پر آیا ہے جہاں کہا ہے کہ اہل قافلہ چونکہ حضرت یوسف سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے اسلئے انہوں نے اسے چند سکوں کے عوض بیچ دیا۔ (۱۲/۲۰)۔ (طلوع اسلام)

سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جس وقت نور کسی دل میں ڈالا جاتا ہے تو سینہ اس کے لئے کھل جاتا ہے۔ عرض کیا گیا کہ اس کی کیا پہچان ہے؟ آپ نے فرمایا کہ دارالغرور یعنی دنیا سے علیحدہ رہنا اور دارالخلود یعنی آخرت کی طرف رجوع کرنا، اور موت کے وقت سے پہلے اس کے لئے تیاری کرنا۔

اور علمائے حق کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان کی زیادہ بحث علم اعمال کے متعلق ہو اور جو چیزیں عمل کو فاسد، دلوں کو پریشان، وسواس پیدا کرتی اور شر کو ابھارتی ہیں، ان کی حقیقت سے واقف ہو۔ کیونکہ دین کی اصل شر سے بچنا ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال فعلی ہوتے ہیں اسلئے آسان ہوتے ہیں۔ اور ان میں سب سے اعلیٰ عمل دل و زبان کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے ذکر میں مداومت اختیار کرنا ہے اور اس کی خوبی جب ہے کہ جو چیز اعمال کی مفسد اور دل کو پریشان کرنے والی ہو، اسے پہچانے۔ کیونکہ اس کی بہت سی شاخیں اور ٹہنیاں ہیں اور آخرت کے راستے پر چلنے کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی رہے علمائے دنیا تو وہ مقدمات اور ان کے فیصلوں کے بارے باریکیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور ان کی ایسی ایسی صورتیں فرض کرتے رہتے ہیں جن کے واقع ہونے کا صدیوں تک امکان نہ ہو۔ اور اگر واقع بھی ہوں تو ان کے بتانے والے اور بہت ہیں۔ لیکن جو چیزیں ان کے ساتھ لازم ملزوم ہیں اور رات دن ان کے دلوں، وسوسوں اور اعمال میں پیش آتی رہتی ہیں انہیں چھوڑ چکے ہیں اور جس نے اللہ تعالےٰ کی قربت حاصل کرنے کی بجائے لوگوں میں مقبول ہونے کے لئے اپنے اہم کام کو چھوڑ کر دوسرے کے کمتر کام کی طرف توجہ کی تو اس سے زیادہ نیک بختی سے کوئی دور نہ ہوگا اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کا بدلہ یوں ملیگا کہ نہ تو وہ مخلوق کے نزدیک مقبول ہو کر کوئی دنیاوی نفع حاصل کر سکیگا، بلکہ الٹا دنیاوی مصائب کی وجہ سے اس کی زندگی اس پر تنگ ہو جائے گی۔ اور پھر قیامت میں بھی وہ حرماں نصیب ہوگا۔ اور اللہ کے مقرب بندوں اور باعمل لوگوں کی کامیابی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھے گا۔ اور یہ اس کے لئے بڑا خسارے کا سودا ہے۔

بدی سے بچنے کے لئے اس کی پہچان ضروری ہے

حضرت حسن بصریؒ کا طرز گفتگو انبیاء علیہم السلام کے طرز گفتار کے مشابہ تھا اور ہدایت میں صحابہ کرامؓ کے زیادہ قریب۔ ان باتوں پر ہمارے اکابر کا اتفاق ہے۔ آپ کی وعظ و نصیحت زیادہ تر دلوں کے خطروں اعمال کی خرابیوں، نفس کے وسوسوں اور شہوات نفسانی کے باریک اور خفیہ اوصاف کے بارے میں ہوا کرتا تھا کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ ایسی گفتگو فرماتے ہیں جو ہم اوروں سے نہیں سنتے۔ آپ نے یہ طرز تکلم کس سے سیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا حذیفہؓ بن یمان سے۔ اور حضرت حذیفہؓ سے کہا گیا تھا کہ آپ ایسی گفتگو کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرام میں دوسروں سے نہیں سنتے۔ آپ نے فرمایا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس تقریر سے مخصوص

فرمایا تھا۔ لوگ آپ سے خیر کا حال پوچھتے تھے اور میں آپ سے بدی کا حال دریافت کیا کرتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اور میں نے یہ جان لیا تھا کہ مجھے خیر کا علم ہو جائے گا۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا کہ میں نے پہچان لیا کہ جو شخص برائی کو نہیں پہچانتا وہ بھلائی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ ایک دوسری روایت میں آپ نے فرمایا کہ لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کرتے تھے کہ جو شخص نیک کام کرے اس کو کیا ثواب ملے گا یعنی اعمال اور فضائل کا حال دریافت کیا کرتے تھے لیکن میں یہ سوال کرتا کہ فلاں فلاں عمل کو کون سی چیز فاسد کرے گی۔ جب آپ نے دیکھا کہ میں اعمال کی آفتوں ہی کے بارے سوال کرتا ہوں تو آپ نے مجھے اس علم سے مخصوص فرما دیا۔ اور حضرت حذیفہ رض منافقوں کو پہچاننے کا بھی خصوصی علم رکھتے تھے اور وہ نفاق اس کے اسباب اور فتنہ کی باریکیوں کے جاننے میں ماہر تھے۔ حضرت عمر رض، حضرت عثمان رض اور اکابر صحابہ رض آپ سے عام و خاص فتنوں کے بارے دریافت کیا کرتے تھے۔ منافقین کے بارے جب ان سے پوچھا جاتا تو وہ نام لینے کی بجائے ان کی باقی تعداد بتا دیا کرتے تھے۔ اور حضرت عمر رض ان سے پوچھا کرتے کہ مجھ میں کوئی نفاق کی بو تو نہیں تو آپ نے ان کو منافقت سے بری قرار دیا۔ اور جب حضرت عمر رض کو کسی کی نماز جنازہ کے لئے جاتا تو آپ اگر حذیفہ رض کو جنازے کے ساتھ شریک موجود پاتے تو نماز جنازہ پڑھا دیتے ورنہ ترک کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت حذیفہ رض "صاحب السر" مشہور تھے۔[1]

مختصر یہ کہ دل کے احوال و مقامات پر نظر رکھنی علمائے حق کا قاعدہ ہے۔ کیونکہ دل ہی تو قرب الٰہی کی کوشش کرنے والا ہے۔ اب یہ فن اجنبی اور پرانا ہو گیا ہے اور اگر کوئی اہل علم اس فن میں سے کوئی چیز جاننا چاہتا ہے تو لوگوں کو عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ واعظوں کا ڈھکوسلا ہے۔ تحقیق سے اس فن کو دور کا بھی تعلق نہیں۔ اصل میں وہ تحقیق صرف مناظرانہ باتوں ہی کو سمجھتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگ عام طور پر اس چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو آسان اور ان کی طبیعتوں کے موافق ہو۔ کیونکہ حق تلخ ہے اور اس پر قائم ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ ساتھ ہی اس کا ادراک بھی سخت ہے اور راہ باریک ہے۔ خاص طور پر دل کی صفات معلوم کرنا اور اسے اخلاق ذمیمہ سے پاک کرنا تو ہمیشہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس لئے حق کی طرف متوجہ ہونے والے کی مثال اس دوائی پینے والے مریض سے دی جاتی ہے جو شفا کی امید میں کڑوی دوائی پی جاتا ہے۔ یا حق پرست کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ساری عمر روزے رکھ کر سختیاں برداشت کرتا ہے کہ موت کے وقت اس کی عید ہو۔ بس حق کے سے مشکل راستے کی طرف کس

---

[1] آپنے دیکھا کہ احیاء العلوم میں کس کس قسم کی روایات ہیں! (طلوع اسلام)

زیادہ رغبت ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ بصرے شہر میں ایک سو بیس واعظ تھے مگر علم یقین، دلوں کے حالات اور باطن کی صفات پر تین واعظوں کے سوا کوئی گفتگو نہ کرتا تھا۔ وہ حضرات سہل تستری ؒ، الصبیحیؒ، اور عبدالرحیمؒ تھے۔ جہاں ان عام واعظین کی مجلس میں حاضرین کی تعداد بے شمار ہوتی تھی وہاں ان تین حضرات کی مجلس میں بہت کم لوگ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ شاذ و نادر ہی ان کی گنتی دس سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ نفیس اور عمدہ چیز کے اہل خاص خاص لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو چیز عامۃ الناس کے لئے ہوتی ہے، وہ آسان ہوتی ہے اس لئے اس کے چاہنے والے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

علمی اعتماد

علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنے علوم پر اعتماد اپنی بصیرت اور دل کی صفائی کے ادراک کے ذریعے کرے نہ کہ صحیفوں اور کتابوں کے ذریعے۔ اور یہ اعتماد اس تقلید کے ذریعے بھی نہ ہو جو وہ دوسروں سے سنے کیونکہ تقلید کے حقدار تو صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کہ جو کچھ آپ نے حکم دیا ہو یا فرمایا ہو۔ اور صحابہ کرام رضؓ کی تقلید بھی صرف اس وجہ سے کی جائے گی کہ آپ نے وہ عمل حضورؐ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا۔ اور پھر جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی کرے تو چاہیئے کہ ان کے اسرار کو بھی سمجھے۔ اس لئے کہ وہ ان افعال کی پیروی اس لئے کر رہا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں سرانجام دیا ہے اور ضروری ہے کہ ان اعمال کے ضرور کوئی اسرار ہونگے جن کی وجہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان پر عمل فرمایا تھا۔ اس لئے وہ اعمال اور اقوال کے اسرار کی بابت خوب تحقیق کرے۔ کیونکہ اگر وہ ان کے اسرار معلوم کئے بغیر یاد کرے گا تو وہ ان کا عالم تصور نہ ہوگا بلکہ یوں سمجھے کہ اس کا علم ایسا ہوگا جیسا کہ کچھ چیزیں کسی برتن میں جمع کر دی گئی ہیں۔ جس کے دل سے پردہ اٹھ گیا اور وہ نور ہدایت سے منور ہو گیا تو وہ بذاتِ خود امام اور پیشوا بن جاتا ہے۔ اس لئے اسے کسی دوسرے کی تقلید نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں جس کی ہر بات تسلیم کی جائے۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے فقہ حضرت زیدؓ بن ثابت سے سیکھی تھی اور قرأت حضرت ابی بن کعبؓ کو سنائی تھی اور پھر ان دونوں علوم میں اپنے ان دونوں اساتذہ سے اختلاف کیا۔

دینی کتابیں سن ہجری کے ایک سو بیس برس بعد تالیف ہونی شروع ہوئیں

بعض سلف صالحین نے فرمایا کہ جو کچھ ہمیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے اسے تو ہم بسر و چشم مانتے ہیں اور جو صحابہ کرامؓ سے پہنچا ہے اس میں سے بعض کو اختیار کرتے ہیں اور بعض پر عمل نہیں کرتے اور تابعین کے اقوال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں اور اس بارے میں صحابہ کرام رضؓ کو فضیلت اسلئے ہے کہ انہوں نے حضورؐ

صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات کے قرآن کو دیکھا اور اس طرح جو باتیں معلوم ہوتیں انہیں دلی اطمینان حاصل
اور ان پر نور نبوت کا فیضان اتنا تھا جس نے انہیں خطا سے محفوظ رکھا اور جب غیر سے سنی ہوئی بات پر
کرنا ناپسندیدہ تقلید ہے تو کتابوں اور تصانیف پر اعتماد کرنا اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہے کیونکہ
نئی چیزیں ہیں جو صحابہؓ اور تابعین رحمہ کے ابتدائی زمانے میں ناپید تھیں۔ یہ تو ہجرت کے ایک سو بیس برس
تالیف ہوئی شروع ہوئیں جبکہ تمام صحابہ کرامؓ، تابعین رحمہ اور حضرت سعید بن مسیبؓ اور حسن بصریؒ
بزرگ وفات پا چکے تھے۔

صدرِ اول میں حدیث کی کتابوں کی تالیف ناپسندیدہ تھی

صدر اول کے لوگ ۔ کی کتابوں کا مدون[1]

کسی اور کتاب کو تصنیف کرنا سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کتابوں کی وجہ سے لوگ قرآن
کو پڑھنے اور اس پر غور و فکر سے غافل ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ کہا کرتے کہ قرآن مجید کو اس طرح یاد کرو
طرح ہم یاد کیا کرتے تھے۔ شاید اسی لئے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور کچھ دوسرے صحابہؓ نے قرآن مجید کو
مصحف کی صورت میں جمع کرنا مناسب نہ سمجھا اور فرمایا کہ ہم کس طرح ایسی بات کریں جسے حضور صلے اللہ
نے نہیں کیا۔ اور انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ لوگ کہیں قرآن مجید کو لکھا ہوا دیکھ کر کافی سمجھیں اور تلاوت
چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قرآن مجید کو ایسا ہی رہنے دو تاکہ لوگ ایک دوسرے سے سیکھ کر پڑھ
اور یہ ان کا شغل و مقصود بنا رہے۔ لیکن حضرت عمر رضؓ اور چند دوسرے صحابہؓ نے اسے کتابی صورت کے
اصرار کیا اور دلیل دی کہ اگر لوگوں پر سستی چھا گئی یا کسی نقطہ کی قرأت کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا
تو اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے کوئی مستند اصل موجود نہ ہوگی تو کیا کیا جائے گا۔ پس حضرت ا
دل بھی اس معاملے میں کھل گیا اور قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کرنے کا پاک فریضہ سر انجام د
احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ کے موطا تصنیف کرنے کو ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ
صحابہؓ سے کوئی تصنیف ثابت نہ ہو، بدعت ہے۔

اسلام میں سب سے پہلی تصنیف

اور کہا گیا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی کتاب جو
ہوئی وہ ابن جریج کی کتاب ہے جو آثار اور حضرت
کے دو شاگردوں مجاہدؒ اور عطاءؒ کے تفسیری اقوال پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مکہ شریف میں تصنیف

---

[1] یہ صحیح نہیں۔ قرآن مجید خود رسول اللہ کے زمانہ میں مدون شکل میں موجود تھا۔ (طلوع اسلام)

یمن میں معمر بن راشد الصنعانیؒ نے ایک کتاب میں سنن ماثورہ جمع کیں۔ تیسرے نمبر پر مدینہ شریف میں موطا امام مالکؒ ہے اور پھر امام سفیان ثوریؒ نے اپنی الجامع تصنیف فرمائی۔ پھر چوتھی صدی میں فلسفیانہ کتابیں وجود میں آئیں اور لوگ مناظروں اور جھوٹے علوم میں منہمک ہو گئے۔ پھر عامۃ الناس میں قصہ گوئی اور وعظ گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ تو اس وقت سے علم یقین کم ہونے لگا۔ اور پھر اس کے بعد تو معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ علم قلبی، یا نفس کی صفات معلوم کرنا اور شیطان کی مکاریوں پر آگاہی حاصل کرنا ایک عجیب بات ہو گئی۔ اور سوائے معدودے چند افراد کے سب لوگوں نے ان علوم سے منہ پھیر لیا۔ اور اب صرف اسی شخص کو عالم دین کہا جاتا ہے جو خوب مناظرے کرے اور چکنے چپڑے الفاظ اور مقفیٰ عبارتوں میں قصے بیان کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان وعظوں کے سننے والے عامۃ الناس ہوتے ہیں جنہیں علم حقیقی کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی ان کے سامنے صحابہؓ کی سیرت یا علوم ہوتے ہیں جن سے وہ یہ اندازہ کر سکیں کہ موجودہ عالم دین کس طرح ان کے بالکل الٹ واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس بے خبری کی وجہ سے ان کے لئے "عالم دین" کا لفظ مستقل ہو گیا۔ اور پھر یہ نام نسلاً بعد نسلاً چلتا رہا۔ اور اس صورت حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم آخرت لپیٹ لیا گیا یہاں تک کہ عامۃ الناس کو تو علم اور کلام (فلسفہ) کے فرق کا بھی امتیاز نہ رہا۔ صرف چند ہی لوگ رہ گئے تھے، جو اس فرق کو محسوس کرتے تھے۔ جب اُس زمانے میں دین میں یہ کمزوری آگئی تھی تو اس زمانے کا کیا پوچھتے ہو، اب اگر کوئی علم کلام وغیرہ کا انکار کرے تو دیوانہ کہلاتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی فکر میں لگا رہے اور خاموش رہے۔

بدعتوں سے اجتناب

اور علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ بدعات سے سخت اجتناب کرے چاہے اس پر جمہور نے اتفاق ہی کیوں نہ کر لیا ہو اور جو بدعت صحابہؓ کے بعد وجود میں آئی، اس پر جمہور کا اتفاق اسے دھوکے میں نہ ڈالے۔ بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ صحابہؓ کی سیرت، حالات و اعمال کی تحقیق و جستجو کرے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ آیا وہ لوگ درس دینے، کتابیں لکھنے، مناظرہ کرنے، قاضی اور حاکم بننے، اوقاف کے متولی، یتیموں اور وصیت کے مال کے امین ہونے اور سلاطین سے میل جول بڑھانے میں مشغول رہا کرتے تھے یا وہ خوف و حزن، فکر و مجاہدہ اور ظاہر باطن کی دیکھ بھال، چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنے، نفس کی خفیہ خواہشات اور شیطان کی مکاریوں کو معلوم کرنے میں مشغول ہوتے تھے۔

یہ ایک قطعی حقیقت ہے کہ ہر زمانے کے لوگوں میں سے سب سے زیادہ عالم دین اور حق کے قریب وہ شخص ہے جو صحابہ کرامؓ کے مشابہ ہو اور سلف صالحین کے طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس لئے کہ دین انہی ہستیوں سے لیا گیا ہے۔ اور اسی لئے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو دین اسلام کا

مفہوم القرآن

میں نے احباب سے مشورہ طلب کیا تھا کہ مفہوم القرآن کا جدید ایڈیشن طبع کیا جائے تو وہ اس میں کس ق
ضروری سمجھتے ہیں۔ میری اس درخواست کے جواب میں قارئین کے وسیع حلقہ کی طرف سے جس قدر خطوط موصول
ان سے پتہ چلتا ہے کہ احباب کو اس میں کس قدر دلچسپی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک!

(۲) احباب کی طرف سے جو تجاویز موصول ہوئی ہیں ان میں اکثریت کا مشورہ یہ ہے کہ مفہوم القرآن
ایسی جامع کتاب بنایا جائے جس میں لغات بھی ہو اور ترجمہ بھی۔ مفہوم بھی ہو اور تفسیر بھی اور آخر میں ایک
ہو جو قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کو مختلف عنوانات کے تحت اس طرح پیش کرے کہ ہم جس موضوع کے متعا
وہ بیک نظر بہ تمام و کمال ہمارے سامنے آجائے۔ یہ تجاویز، قرآنی تعلیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں احباب کے شو
کی آئینہ دار تو ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا ہو گی جس کی تالیف بحالا
میرے لئے ممکن نہیں۔ لغات القرآن اور مفہوم القرآن الگ الگ موجود ہیں۔ جہاں تک انڈکس کا تعلق
کئی برسوں سے تبویب القرآن کی ترتیب و تالیف میں مصروف ہوں۔ اس کا کافی حصہ مرتب ہو چکا ہے
بہت سا باقی ہے۔ باقی رہی تفسیر، سو احباب چاہتے ہیں کہ میں جس انداز سے ہفتہ واری درس دیتا ہوں، اس
تفسیر مرتب ہو جائے۔ میرے لئے تو ایسا کرنا مشکل ہے۔ البتہ قرآنِ کریم کے ایک والہانہ شیدائی (عزیز
ظہور احمد۔ راولپنڈی) کئی برسوں سے میرے درس کے (TAPES) کو صفحاتِ قرطاس پر منتقل کرنے میں منہ
یہ مہم خارہ شگافی سے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ دعا ہے کہ خدا انہیں اس کوہکنی کو تکمیل تک پہنچانے کی
فرمائے۔ اگر یہ سلسلہ دراز مکمل ہو کر شائع ہو گیا تو یہ ہو گی وہ تفسیر جس کا تقاضا احباب کی طرف سے موصول ہو
میں اس کا وعدہ نہیں کر سکتا کیونکہ بات میرے بس کی نہیں۔

(۳) تصریحات بالا کی روشنی میں فیصلہ یہی کیا گیا ہے کہ مفہوم القرآن کو سر دست موجودہ انداز ہی
جائے۔ البتہ جب جدید ایڈیشن شائع کیا جائے تو اس میں موجودہ ایڈیشن کی غلطیوں کی تصحیح کر دی

(۴) میں احباب کے مخلصانہ مشوروں کا بدل شکر گزار ہوں۔ (پرویز)

(٥)

خوشخبری

مفہوم القرآن کی طباعت اور اشاعت کا انتظام میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے سپرد تھا۔ انہوں نے اپریل ۱۹۶۷ء میں ستائیسواں پارہ چھاپا اور اس کے بعد اس کا سلسلہ رُک گیا۔ پرویز صاحب کی قرآنی فکر کے شیدائیان کے لئے یہ انقطاع جس قدر باعثِ سوہانِ روح تھا اس کا اندازہ ان کی طرف سے موصول ہونیوالی شکایات سے بخوبی ہوتا تھا۔ لیکن ہم اس باب میں مجبور تھے۔

الحمد للہ کہ اب مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت کا انتظام ادارہ طلوع اسلام کے سپرد ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم نے سب سے پہلے اٹھائیسویں پارہ کی کتابت شروع کرا دی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تین چار ماہ میں یہ آخری تینوں پارے (۲۸۔۲۹۔۳۰) شائع ہو جائیں گے۔ جو حضرات ان پاروں کے انتظار میں تھے وہ اپنے آرڈرز فوراً بک کرائیں تاکہ جس وقت یہ پارے چھپیں انہیں بھیجے جائیں۔ اگرچہ اب سامانِ طباعت کی گرانی کی وجہ سے لاگت بہت بڑھ جائے گی لیکن ہم سردست قیمت میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ ان تینوں پاروں کی قیمت چھ روپے ہی لی جائے گی۔ محصولڈاک پچھتر پیسے ہوگا اور اگر آپ بذریعہ رجسٹری منگانا چاہیں تو سوا روپیہ ہوگا۔

۲۔ اس وقت ہمارے پاس پہلے ۲۷ پارے سٹاک میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں پہلے بیس پارے دو جلدوں میں (یعنی دس دس پارہ کی جلد) بہت تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ پارے یا جلدیں فرمائش موصول ہونے پر فوراً بھیجی جا سکتی ہیں۔ ان کی قیمت اور محصولڈاک حسب ذیل ہوگی۔

(۱) پہلا پارہ۔ سستا ایڈیشن۔ ایک روپیہ، اعلیٰ ایڈیشن۔ تین روپے

(۲) پارہ ۲ تا ۲۷۔ دو روپے فی پارہ۔ محصولڈاک ۲۵ پیسے فی پارہ۔ خرچہ رجسٹری ۵۰ پیسے (واضح ہے کہ خرچہ رجسٹری ایک پارہ پر بھی وہی آئے گا اور ایک سے زاید پاروں پر بھی وہی۔ یعنی ۵۰ پیسے)

(۳) موجودہ دس دس پاروں کی جلدوں کی قیمت۔ جلد اوّل۔ اکیس روپے، جلد دوم۔ بیس روپے، محصولڈاک۔ فی جلد۔ دو روپے۔

(۴) یہ اعلان اس وقت تک کے لئے ہے جب تک آخری تین پارے (۲۸۔۲۹۔۳۰) شائع نہیں ہو جاتے۔ اسکے بعد پاروں کی قیمت اور سپلائی کے متعلق نیا اعلان کیا جائے گا۔

(ناظم۔ ادارہ طلوع اسلام)

بقیہ "علمائے کرام"۔ از صفحہ ۷۸ مسلسل

بقیہ "علمائے کرام"۔ از صفحہ ۷۸ مسلسل

سب سے زیادہ متبع ہو۔ آپ نے یہ اس وقت فرمایا تھا جب کسی نے آپ کے کسی کام پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ فلاں شخص کے عمل کے خلاف ہے تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم حضور صلعم کے زمانے کے موافق عمل کرتے ہو تو پھر اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ اس طرز عمل سے اپنے زمانے کے بعض لوگوں کی مخالفت لازم آتی ہے کیونکہ لوگوں نے تو قیاس کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے اور انکا نفس اس بات کا اقرار کرنا گوارا نہیں کرتا کہ ان کا یہی قیاس انہیں جنت سے محروم کرنے کا سبب بنے گا۔ بلکہ انہوں نے الٹا اس امر کا دعویٰ کیا کہ جنت کا حصول قیاس کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔

(باقی آئندہ)

بصیرت افروز - انقلاب آفریں لٹریچر

(۱) لغات القرآن - (چار جلدیں) یہ محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری نہیں۔ اس میں

(۱) تمام قرآنی الفاظ کے معانی عربی زبان کی مستند کتب لغت اور قرآن کریم کی روشنی میں متعین کئے گئے۔ اتنے حصے کو آپ لغات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی ان آیات کا مفہوم وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ اس اعتبار یہ حصہ تفسیر القرآن کا ہے۔

(۳) دین کے تمام بنیادی تصورات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے اس لحاظ سے یہ حصہ دین کی بنیادی تعلیم

(۴) شروع میں عربی زبان کے بنیادی قواعد و اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصہ عربی زبان کا معلم ہے

(۵) تمام قرآنی الفاظ کی ایک جامع فہرست میں ہر لفظ کے سامنے اسکا مادہ دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا انڈکس ہے

آپ ایک مرتبہ اس لغات کو شروع سے اخیر تک پڑھ جائیں تو قرآن کریم کے سمجھنے اور دین کے بنیادی اصولوں کے لئے آپ کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کتاب چار جلدوں میں بڑے پاکیزہ ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔ جلدیں۔ پندرہ روپے فی جلد، چوتھی جلد۔ بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی قیمت۔ پچاس روپے۔

(۲) معراج انسانیت - (دوسرا ایڈیشن) سیرت صاحب قرآن خود قرآن کے آئینے میں۔ حضور خاتم النبیین کی سیرت طیبہ تمام نوع انسانی کے لئے جگمگاتا مینارہ ہے جس رہ گم کردہ زندگی کے ساحل مقصود کا صحیح صحیح پتہ پا سکتا ہے۔ حضورؐ کی سچی اور قابل اعتماد سیرت (جسے نوع انسانی کیلئے نمونہ بننا ہے) قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے۔ اس ذات اقدس و اعظمؐ کی حیات مقدسہ کا وہی نقشہ قابل اعتماد ہو قرآن کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہو۔ یہ کتاب اسی انداز ترتیب کی کامیاب پیشکش ہے جس میں کسی مقام پر بھی تاریخی روایات وصنعی ملکوں کو قرآنی حقائق پر اثر انداز نہیں ہونے دیا گیا۔ سیرت مقدسہ پر یہ حسین ترین تصنیف ختم نبوت کا عظیم فلسفہ۔ اس کا پہلا ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا اب مصنف کی نظر ثانی نے اسے جو یہ بیکر عطا کیا ہے ضخامت قریب چھ سو صفحے قیمت۔ بیس روپے۔

(۴) انسان نے کیا سوچا؟ (پرویز)

سقراط اور افلاطون سے لے کر برٹرنڈ رسل اور ٹوئن بی تک مختلف مفکرین۔ مدبرین۔ مؤرخین اور سائنسدانوں نے کائنات اور انسانی دنیا کے متعلق جو خیالات پیش کئے ہیں انہیں اس انداز میں سامنے لایا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ انسان وحی کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کسی زبان میں اس انداز کی کتاب نہیں مل سکیگی۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت بارہ روپے۔

(۴) اسلام کیا ہے؟ (پرویز)

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟۔ قیمت:۔ قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے، سستا ایڈیشن۔ چار روپے۔

(۵) جہانِ فردا۔ (پرویز)

ہر شخص اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا جواب ملے گا اس کتاب سے جس میں قرآن کریم کی رو سے موت۔ قبر۔ برزخ۔ حشر۔ نشر۔ قیامت۔ اعمال نامہ۔ جہنم۔ جنت وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں۔ قیمت:۔ اعلیٰ ایڈیشن۔ دس روپے۔ سستا ایڈیشن۔ چھ روپے۔

(۶) شعلۂ مستور۔ (پرویز)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوائفِ حیات۔ کیا آپ بن باپ پیدا ہوئے؟ کیا یہود نے واقعی آپ کو فروخت کر دیا تھا؟ کہ آپ آسمانوں پر زندہ ہیں؟ کیا آپ پھر نازل ہوں گے؟ آپ کی صحیح تعلیم کیا تھی؟ ایک نئے زاویے سے عجیب غریب حقائق کی نقاب کشائی اور رسم خانقاہیت کی عبرت آموز داستان۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے قیمت، مجلد۔ چھ روپے۔

(۷) خدا اور سرمایہ دار

موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصرِ معاشی کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کریم کے معاشی نظام سے کیا جاتا۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت۔ مجلد نو روپے۔

(۸) نظامِ ربوبیت۔ (پرویز)

نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے! اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس

تفصیل اس کتاب میں ملے گی اور جس کی رو سے دنیا میں کوئی شخص نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ نہ کوئی امیر رہیگا نہ غریب، قارون ہوگا نہ بھکاری۔ یہ ہمارے دور کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

(۹) فردوسِ گم گشتہ۔ (پرویز) محترم پرویز صاحب کے ان مضامین اور تقاریر کا مجموعہ جنہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ہے۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دیں گی۔ قیمت، آٹھ روپے

(۱۰) سلسبیل۔ (پرویز) قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقا کا دوسرا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت: آ

(۱۱) بہارِ نو۔ (پرویز) یہ جناب پرویز کے مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے جس سے ذہنوں میں ب ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت

(۱۲) سلیم کے نام خطوط۔ (پرویز) سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملاّ کے پیش کرد نے دین سے بیزار کر دیا ہے۔ اس کے دل میں سینکڑوں ا پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک مشفق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوط کی شکل میں دلائل اور علم و بصیرت کی رو سے خالص قرآنی فکر کی روشنی میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت: حصہ اول۔ آٹھ ر قیمت حصہ دوم و سوم۔ چھ چھ روپے۔

(۱۳) طاہرہ کے نام خطوط۔ (پرویز) عائلی زندگی کے بنیادی اور الجھے ہوئے مسائل۔ا کے بارے میں جناب پرویز نے اپنی ملت کی طاہ کو مخصوص مشفقانہ انداز سے مخاطب کیا ہے۔ اور انہیں بتایا ہے کہ خدا کا دین انہیں کس قدر بلند مقام عط ہے اور ان سے کن ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ آنسوؤں اور آہوں کے جہنم میں کیونکر جنتی کی صبح بہار نمودار ہوسکے گی۔ یہ کتاب خواتینِ ملت کے قلب و نگاہ میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کرتی ہے کتاب کے آخری باب میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رض کی عمر چھ سال قیمت:۔ چھ روپے۔

(۱۴) قرآنی قوانین۔ (پرویز) ایک مختصر لیکن جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ جج صاحبان اور وکلاء حضرات کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ا ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مستقل

کو بھی مدون کردیا گیا ہے جن کی روشنی میں امت عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی۔
قیمت: تین روپے۔

(۱۵) جہاد۔ (پرویز) جہاد کیا ہے؟ جنگ اور جہاد میں کیا فرق ہے؟ مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق مخالفین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔ ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔ بصیرت افروز۔ حیات آموز۔ قیمت: دو روپے۔

(۱۶) مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں۔ (پرویز) مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گزریں اور آج ان کی کیا حالت ہے۔ اس کتاب میں اس سوال کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔ نیز اس میں یہودیت، عیسائیت، زرتشتی مذہب، ہندو مت، بدھ مت، جین مت، چین اور جاپان کے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ محفوظ چلا آرہا ہے۔ قیمت: تین روپے۔

(۱۷) اسبابِ زوالِ امت۔ (پرویز) ملا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت: ۱ روپیہ پچاس پیسے۔

(۱۸) اسلامی معاشرت۔ (پرویز) اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کے دلوں میں صحیح اسلام کی تعلیم نقش کرنے کے لئے، نیز کم تعلیم یافتہ حضرات اور عورتوں کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ انداز بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے

(۱۹) اقبالؒ اور قرآن۔ (پرویز) جس جہانِ نو کا تصور ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اس کے خد و خال سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس مجموعہ کو دیکھیں جس میں اقبالؒ اور قرآن بیک وقت آپ کے سامنے آجائیں۔ قرآن کے حقائق اقبالؒ کا بیان حسن و حقائق کا اس سے دلکش مرقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ قیمت: دو روپے۔

(۲۰) قرآنی فیصلے زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا حکم ہے اور ہم کیا کرتے ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ صدقات

قربانی ۔ ترکہ ۔ وصیت ۔ نکاح ۔ طلاق ۔ اوقاف ۔ شراب ۔ جوا ۔ حرام وحلال یا مثلاً شب برات ۔ عیدمیلاد
قرآن کی حفاظت ۔ ناسخ ومنسوخ ۔ تصویر کشی ۔ موسیقی ۔ سینما ۔ مشاعرے ۔ عذاب قبر ۔ حیات بعد الممات ۔
ملکیت ۔ نبی اکرمؐ وعلم غیب ۔ حضورؐ کا معراج ۔ ولی اور الہام ۔ تاریخ اور قرآن ۔ مرکز ملت ۔ غلام
لونڈیاں وغیرہ بیسیوں باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق آپ کو علم نہیں کہ قرآن کا فیصلہ کیا ہے ۔ یہ سب کچھ ایک
کتاب میں مل جائے گا ۔ قیمت جلد اول، دوم ۳/۲۵ روپے فی جلد ۔ جلد سوم ۔ تین روپے فی جلد ۔

(۲۱) مقام حدیث یہ وہ کتاب ہے جس نے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے ۔ حدیث کا صحیح مفہوم کیا ہے ؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا ؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں ؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان کی حیثیت کیا ہے ؟ رسول اللہؐ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے ؟ اقرار و انکار حدیث سے کیا مراد ہے ؟ حدیث کے متعلق یہ جامع کتاب اس قدر پُر از معلومات ہے کہ آپ بیسیوں کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں گے ۔
قیمت :۔ چار روپے ۔

(۲۲) منزل بہ منزل تحریک طلوع اسلام دراصل قرآنی فکر کے عام کرنے کی ایک تحریک کوشش ہے ۔ یہ تحریک کن کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچی وہ کون سے عناصر ہیں جو اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہے اور کھڑے ہیں ۔ قرآنی فکر کی یہ تحریک ان موانعات کو کس طرح دور کرتی اور امت کو کیسے قرآن مجید کے قریب لاتی ہے ۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام کے سالانہ اجتماعات نے کیا نمایاں خدمات سرانجام دیں ۔ ان اجتماعات میں اس تحریک کے بانی جناب پرویز صاحب نے قوم کو کیا پیغام دیا ۔ یہ اس قافلۂ قرآنی کی جادہ پیمائی کی نہایت حسین و سادہ اور بے حد جاذب و پرکشش داستان ہے جسے نہایت حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ قیمت :۔ چھ روپے ۔

(۲۳) قرآنی دستور پاکستان قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کردہ قرارداد مقاصد و اصول وحقوق اور دستور کے مسودات ۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ ۔ جماعت اسلامی کی دستوری سفارشات اور ان کی فکر و نظر کے تضادات پر تبصرہ اس مجموعہ میں وہ سب کچھ آگیا ہے جسے تدوین دستور پاکستان کے سلسلہ میں آپ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی ۔ لیکن اصولی طور پر اس کی افادیت اب تک باقی ہے ۔ قیمت

(۲۴) مزاج شناس رسولؐ سب سے خطرناک رہزنی وہ ہے جو خدا اور رسولؐ کے نام کے نقاب میں کی جائے ۔ اس میں انسانیت لٹتی اور عاقبت

ہوتی ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ لوگ کس طرح مذہب کے نام پر اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جماعتِ اسلامی کے عزائم کیا ہیں اور وہ کس طرح قوت حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور اس کے امیر کی ڈکٹیٹر شپ پر اتنا مواد اور اس انداز سے مربوط شکل میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔

قیمت چار ۴/- روپے۔

(۲۵) قتلِ مرتد۔ غلام اور لونڈیاں

کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؟ کیا اسلام جنگ کے قیدیوں کو غلام اور قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے، بلا تعداد گھروں میں ڈال لینے اور بازاروں میں فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ قرآن کی رو سے ان اہم سوالات کا جواب کیا ہے؟ مدلل اور مسکت بحث۔ اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ مصر ہے کہ جب پاکستان میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا تو اس میں یہی قوانین رائج ہوں گے۔ قیمت ۱/۵۰ روپے۔

(۲۶) عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا۔ (پرویز)

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کئی ایک ایسی باتیں رائج ہیں جنہیں وہ حقیقت سمجھتے ہیں لیکن دراصل وہ افسانے ہیں۔ جناب پرویز نے ان افسانوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ہٹا کر حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ بڑی دلچسپ اور بصیرت افروز کتاب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

(۲۷) انسانیت کا آخری سہارا۔ (پرویز)

یہ وہ بصیرت افروز خطاب ہے جس سے جناب پرویز نے دسویں طلوعِ اسلام کی کنونشن کے الوداعی اجلاس کو نوازا جس کے جذب و انہماک اور تاثر کیف کا یہ عالم تھا کہ کوئی قلب نہ تھا جو وجد میں نہ آ گیا ہو اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ قیمت: ایک روپیہ۔

(۲۸) عربی خود سیکھئے۔ (رفیع اللہ)

قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اس لئے ایک ایسی مختصر اور سلیس کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جاتے جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آ جاتے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ دوسرا ایڈیشن —

قیمت: ۴/۵۰ روپے

(۲۹) دھتکارے ہوئے انسان۔ (عنایت اللہ)

جیل کی سلاخوں کے پیچھے کی د
پراسرار حالات۔ قاتلوں۔ ڈا
گرہ کٹوں اور سنگین مجرموں کے جرائم کا پس منظر۔ جیل میں بسنے والی دنیا کے مہیب، وحشتناک، ج
لیکن عبرت آموز حالات جو طلسم ہوش ربا سے زیادہ دلچسپ اور گلستانِ سعدی سے زیادہ سبق آموز
قیمت:۔ -/۵ روپے۔

(۳۰) الفتنۃ الکبریٰ۔ (طٰہٰ حسین مصری)

حضور رسالتمآب صلے اللہ علیہ
رحلت کے پچیس سال بعد ہی ا
حضرت عثمان رض کس طرح دن دہاڑے شہید کر دیئے گئے۔ اور امتِ مسلمہ کو کن مصائب کا شکار ہو
ان حوادث کے محرکات کیا تھے اور ان کا پس منظر کیا۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔
قیمت:۔ -/۶ روپے

(۳۱) فجر الاسلام۔ (احمد امین مصری)

مصر کے نامور مؤرخ علامہ احمد امین
آثار تصنیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ ق
اسلام کے پراز معلومات حالات۔ اسلام کے قرنِ اول کی روشن داستان۔ ہر بات مستند۔ ہر دعوٰ
تاریخ اسلام پر ایسی کتاب اس سے پہلے شائع نہیں ہوئی۔

قیمت:۔ جلد اول۔ دوم، چار چار روپے۔

(۳۲) اسلام پر کیا گزری؟۔ (احمد امین مصری)

علامہ احمد امین مصری کے س
اسلام کی دوسری کڑی۔ بنی ا
عباسیہ کے زمانے میں اسلام کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ کیسے ہوا۔ اس میں کون کون سی باتیں باہر سے آکر م
یہ ساری کہانی بڑی بصیرت افروز اور عبرت آموز ہے۔ قیمت:۔ پانچ روپے۔

(۳۳) پاکستان کا معمارِ اول۔ (صفدر سلیمی)

سرسید کی صحیح عظمت اور ہمار
زندگی میں اس کا مقام بلند ا
پہلے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ سرسید کا
نہایت دلکش انداز میں اس مختصر لیکن جامع تصنیف میں دیکھئے۔ قیمت:۔ صرف -/۳ روپے۔

(۳۴) تاریخ الامت۔ (اسلم جیراجپوری)

امت کی تمام سرگذشت۔ مفصّ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
۸۰۸۰۰	پاکستان — ایک روپیہ	سالانہ پاکستان — دس روپے
خط و کتابت	ہندوستان	سالانہ ہندوستان — پندرہ روپے
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی، گلبرگ، لاہور	ڈیڑھ روپیہ	سالانہ غیر ممالک — ایک پونڈ

جلد (۲۳) | ستمبر ۱۹۷۰ء | نمبر (۹)

فہرست

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر۔ سراج الحق۔ مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبک روڈ

یاد میں

(۱) پاکستان کی سرحدوں پر بسنے والے ان بے گناہ، مظلوم انسانوں کی، جنہیں بھارتی درندوں نے صبح بغیر کسی قسم کی آگہی یا اعلانِ جنگ کے، اُس وقت اپنی ہوسِ خون آشامی کا شکار بنایا جب وہ اپنے گھروں میں سو رہے تھے اور ستاروں کی آنکھوں کے سوا، اس خونی منظر کا دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

(۲) اُن معصوم بچوں کی، جنہیں مرہٹہ "بلوانوں" اور سکھ "سورماؤں" نے اچھال اچھال کر اپنی سنگینوں سے چھلنی کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم کیوں لیا تھا۔

(۳) اُن عزت مآب دخترانِ ملت کی جنہیں یہ انسان نما بھیڑیئے، ان کے صحنِ خانہ سے ان نامعلوم طرف کشاں کشاں لے گئے جہاں سے پھر ان کی آہ و فغان تک بھی کسی کو سنائی نہ دی۔

(۴) اور ــــ یاد میں

اُن غیور و جسور جوانانِ ملت کی جو ان بے پناہ مظالم کا بدلہ لینے کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آنکلے اور اپنی عدیم النظیر جرأت و بسالت سے دنیا کو دکھا دیا کہ حق کی خاطر جان دینے والے کیا کچھ کر دکھایا کرتے ہیں۔

اور ــــ چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ، چونڈہ واہگہ، برکی، ہڈیارہ، سلیمانکی، راجستھان کے ان ذرات کی، جو اپنی علمتاب چمک دمک سے اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ خونِ شہیداں کی رنگینی کس طرح حنا بندِ عروسِ ملت ہوتی ہے۔

لاکھوں صلوٰۃ و سلام ہوں اُن شہدائے امت اور مجاہدینِ ملت پر جنہوں نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے اس خطۂ زمین کو دشمن کی دستبرد سے محفوظ رکھا جسے اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ ؎

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
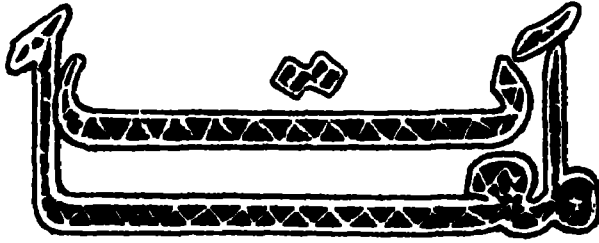
الم انگیز ہونے پر بھی کیا دلچسپ ہوتا
چراغِ انجمن کا ذکر، پروانے کا فـ

سرسیدؒ نے آج سے قریب سو سال پہلے، اپنے انگریز کلکٹر سے کہا تھا کہ آپ لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہ
ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے. یہاں دو الگ الگ قومیں بستی ہیں۔ اگر آج کوئی اس حقیقت سے ا
برتتا ہے تو آنے والا زمانہ اس سے اس حقیقت کو خود منوا لیگا. سرسیدؒ نے یہ اعلان، ہندوستان کی ج
آزادی (۱۸۵۷ء) سے چند ہی سال بعد کیا تھا، جب حالت یہ تھی کہ انگریز اور ہندو کی متحدہ سازش، ہند
سے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹانے کے لئے برسرِ کار تھی. سرسیدؒ کے اس انقلابی اعلان سے انؔ
کھڑے ہوتے اور انہوں نے متحدہ قومیت کا جال بننے کے لئے گہری تدبیریں سوچنی شروع کر دیں. ۱۸
کانگریس کا قیام اسی سازش کی ایک کڑی تھا. سرسیدؒ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ ہندو اور انگریز کے
اس دامِ ہمرنگِ زمیں میں نہ پھنسیں اور اُس کانگریس میں قطعاً شامل نہ ہوں جو ہندوستان کے تمام با
کو ایک قوم کے افراد قرار دے کر، اپنے آپ کو نیشنل کہتی ہے. اس کے بعد جب ہندوستانیوں کو شریک
کرنے کی اصلاحات کا پہلا قدم اٹھایا گیا تو سرسیدؒ نے انگریز سے برملا کہہ دیا کہ جب تک مسلمانوں کو
نیابت نہیں دی جائے گی، ہم اس میں شرکت نہیں کرینگے. سرسیدؒ کے بعد اقبالؒ بھی اسی پیغام کو د
کہ — بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے — اور ہندو، اس کے خلاف متحدہ قومیت
الاپتا رہا، تا آنکہ ۱۹۳۰ء میں اقبالؒ نے اس نظری تصور کو عملی پیکر میں تبدیل کرنے کے لئے مسلمانوں
قوم کے لئے ایک جداگانہ خطۂ زمین کے مطالبہ کی بنیاد رکھی. قائد اعظمؒ اس بنیاد پر تشکیلِ پاکستان کی

استوار کرتے چلے گئے، اور جب ان سے دریافت کیا گیا کہ پاکستان کب وجود میں آئے گا، تو انہوں نے
تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جس دن یہاں سب سے پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کر کے، اپنی جداگانہ
اعلان کیا تھا۔ بات آگے بڑھتی گئی تا آنکہ ہندو اور انگریز دونوں کو، مسلمانوں کے اس متحدہ مطالبہ کے
جھکنا پڑا، اور ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے لئے خطۂ زمین الگ کر دیا گیا اور اس طرح ہندوستان کی تقسیم
آگئی۔ یوں تو یہ تقسیم انگریز، ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ معاہدہ کی رُو سے عمل میں آئی تھی، لیکن ہند
دونوں کے دل پر اس سے کیا گزری تھی، اس کا اندازہ ان کے اعلانات سے لگائیے جس سے انہوں
معاہدہ کی رسمِ افتتاحیہ ادا کی تھی۔ یہ معاہدہ، مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین ہوا تھا۔ ۳ رجون ۱۹۴۷ء
معاہدہ پر دستخط ہوئے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۴ رجون کو حسبِ ذیل ریزولیوشن پاس کیا

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی
> آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا
> اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار
> پا جائے گا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو ایک طرف اس معاہدہ پر دستخط کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی
> طور پر اور دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنے
> کے بل جھک کر ہم سے درخواست کرے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر
> لیجئے۔

یہ نیشنلسٹوں کے نیتا تھے۔ ہندو مہا سبھا کے سرپنچ، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، اپنی جاتی کو بتا
رہے تھے کہ

> ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے،
> اس حقیقت سے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ
> معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔

یہ ہندوؤں کی متشدد جماعت کا نمائندہ تھا۔ دوسری طرف دیوان چمن لال جیسا (بظاہر) اعتدال پسند
کہہ رہا تھا کہ

> میں نا امید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیمِ ہند کا

عارضی حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم انہیں امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔

یہ ہندو تھا۔ دوسری طرف انگریز کی کیفیت یہ تھی کہ جب تقسیم ہند کا بل، پارلیمان میں منظوری کے لئے پیش ہوا تو وہاں کے وزیراعظم، لارڈ ایٹلی نے (جو اس وقت میجر ایٹلی تھے) اپنی تقریر میں کہا کہ

ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکیگی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

اس طرح، ہندو اور انگریز کی طرف سے اس اسکیم کا ہورت (افتتاح) یا سواگت (استقبال) ہوا۔ ہندو اور انگریز کے ان مشئوم عزائم کا مظاہرہ خود تقسیم کے وقت ہوا جب انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اور لاکھوں کی تعداد میں بے سروسامان قافلوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد۔ لیا تھا نہ قیامت میں ہنوز ۔۔۔ کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے خود انہی کی بعض مصلحتوں کی بنا پر یہ منصوبہ عمل میں نہ آسکا۔ نرادیسی۔ چوہدری، کے بیان کے مطابق ہندو نے دو سال کے عرصہ میں تین بار پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاری کی تھی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ راجہ مہندر پرتاپ نے ۱۹۵۰ء میں کہا تھا کہ

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدیک ہوگئی ہے۔ بنا بریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

ہندو حملہ تو نہ کر سکا لیکن حملے کی تیاری سے ایک ثانیہ کے لئے بھی غافل نہ رہا۔

———— (۰) ————

اُدھر یہ ہو رہا تھا اور اِدھر (پاکستان میں) قومِ ہندو کے "مالِ غنیمت" کی لوٹ میں مصروف تھی جس گروہ یا قوم کو لوٹ کا چسکا پڑ جائے وہ محنت کر کے کمانے کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ لوٹ کا مال ختم

بجائے اس کے کہ قوم محنت شروع کرتی، اس نے لوٹ ہی کی نئی نئی راہیں تراشنا شروع کر دیں — اور اس کے لئے اس نے ایسے سہل گزار راستے وضع کئے کہ —— نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا ہو — چنانچہ قوم پھر لوٹ میں منہمک ہو گئی، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے، ہندو کے ترکہ کو لوٹا جا رہا تھا۔ اب قوم خود اپنوں کو لوٹ رہی تھی۔ ترقی (DEVELOPMENT) کے لئے یہاں صنعت کا دور شروع ہوا تو سرمایہ داروں کے وارے نیارے ہو گئے۔ جس نے چکی سے بات شروع کی، دنوں میں ملوں کا مالک بن گیا۔ مزید ترقی ہوئی تو تجارت کو فروغ حاصل ہو گیا۔ جس کی باپ دادا کے وقت سے آٹے دال کی دکان چلی آ رہی تھی، وہ چیمبر آف کامرس کی باتیں کرنے لگ گیا صنعت اور تجارت کے لئے سرکاری امداد کی ضرورت تھی۔ اس امداد کی آڑ میں نظم و نسق کی ساری مشینری (CORRUPT) ہو گئی۔ رفتہ رفتہ قوم دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی —— ایک طبقہ لوٹنے والوں کا، دوسرا لٹنے والوں کا —— ملک کی ترقی کا پیمانہ، لوٹنے والوں کے چہروں کی سرخی قرار پا گیا۔ اور کسی نے نہ سوچا کہ اس ایک کے چہرے کی سرخی سے کتنے ہزار چہروں کی سرخی زردی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ بہرحال، جب ترقی کا پیمانہ لوٹنے والوں کا معیارِ زیست قرار پا گیا تو ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ملک کی دولت بڑھ رہی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کتا، کسی خشک ہڈی کو چبانے لگتا ہے تو ہڈی کی نوک سے اس کا جبڑا زخمی ہو جاتا ہے اور اس میں سے لہو رسنے لگتا ہے۔ وہ کتا اس لہو کو مزے لے لے کر چوستا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اسے نہایت تر و تازہ غذا مل رہی ہے —— وہ اتنا نہیں سوچتا کہ وہ اس کا اپنا ہی لہو ہے جسے وہ اس مزے سے چاٹ رہا ہے۔ یہی حالت ہماری ہو رہی تھی۔ ہمارا لوٹنے والا طبقہ دن بدن فربہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور کوئی نہیں سوچتا تھا کہ قوم کس تیزی سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس ساری نفسا نفسی اور افراتفری میں، ایک گروہ ایسا تھا جس کے متعلق عام طور پر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کاروبار میں مصروف ہے۔ وہ گروہ تھا ہماری فوج کا۔ چونکہ ایک تو فوجی یوں بھی شہری آبادیوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور دوسرے ان کے مشاغل بھی صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں، اس لئے ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس دوران میں، قوم نے اس گروہ کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا۔ البتہ جب کبھی بجٹ میں یہ دکھائی دیتا کہ ملک کی آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ، مدافعت (DEFENCE) کی "نذر" ہو جاتا ہے تو "درد مندانِ ملت" کے قلبِ مضطر میں ٹیس پیدا ہوتی اور ادھر اُدھر سے اس قسم کی آوازیں آنے لگتیں کہ یہ فوجی بیکار بیٹھے، مفت کی کھاتے رہتے ہیں، ان سے کوئی کام لینا چاہیئے۔ کوئی کہتا کہ ان سے نہریں کھدوانی چاہئیں۔ کوئی کہتا ان سے سڑکیں کٹوانی چاہئیں۔ کوئی کہتا ان سے ہل چلوانے چاہئیں۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک دفعہ جب فوج کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تھا تو اس طرح دہائی مچا دی گئی جیسے گاؤں

میں ڈاکو تھ گئے ہوں ۔۔۔ بہرحال، فوج کے متعلق اہل ملک کو اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ بیکاروں کا ٹولہ مفت کی کھا رہا
ہے، ان سے کچھ کام لینا چاہیئے ۔۔۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب پوزیشن صدر اول کی سی ہو جس میں ہر مسلمان سپاہی
ہوتا تھا تو یہ طریق کار ممکن العمل ہوتا ہے کہ جنگ کے وقت وہ میدان کارزار میں ہوں اور دیگر اوقات میں دوسرے
کاموں میں مصروف (اور وہ کام بھی درحقیقت کسی نہ کسی نہج سے استحکام مملکت ہی سے متعلق ہوتے تھے) لیکن
جب انسانیت کی بدبختی سے، اقوام عالم نے مستقل فوج (STANDING ARMY) کی طرح ڈال دی
اور فن حرب انتہائی ٹیکنیکل اور (SPECIALISED) ہو گیا ہے تو فوج کے کسی وقت کو فارغ سمجھا
جا سکتا۔ لیکن ملک کو بہرحال کچھ علم نہ تھا کہ فوج کچھ کر بھی رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر کر رہی ہے تو کیا۔۔۔ عام تاثر
یہی تھا کہ فوج بیکار بیٹھی کھا رہی ہے۔

(۰)

نظریۂ ارتقاء کے ماہرین بتاتے ہیں کہ زندگی جب اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتی ہے تو وہ اس
سست خرام اور سبک پا ہوتی ہے کہ نہ کوئی آنکھ اس کی رفتار کو دیکھ سکتی ہے نہ کوئی ایک انسان، ان
پھر، ان فاصلوں کو پہچان سکتا ہے جنہیں وہ اس طرح طے کرتی ہے۔ آپ کسی پودے کے کنارے صبح
شام تک بیٹھے رہیئے، آپ محسوس تک نہیں کر سکیں گے کہ وہ بڑھ رہا ہے حالانکہ اس میں مسلسل نشو و نما
رہی ہوگی۔ یہ کیفیت اس پودے کی ہے جو دو چار ماہ میں اپنے نقطۂ آغاز سے مقام تکمیل تک پہنچ جاتا۔
اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ زندگی جو کروڑ در کروڑ برسوں سے نشو و نما کی منازل طے کر رہی ہے، اس
کس قدر غیر محسوس ہوگی۔ قرآن کے الفاظ میں، اس کی رفتار کے پیمانے "خدا کے وہ" دن "ہیں جن میں سے ا
دن کی مدت، ہزار ہزار، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے ارتقائے حیات کی عام رفتار۔ لیکن
ماہرین، ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی اپنے ارتقائی سفر کی کئی ایک منزلوں
پھاند جاتی ہے اور جو نتائج کہیں لاکھوں سالوں میں جا کر نمودار ہونے تھے، ان کا ظہور صدیوں میں ہو جاتا
ہے، ان کی اصطلاح میں، نجائی ارتقاء، یا (EMERGENT EVOLUTION) کہتے ہیں قرآن
نے، اس سامانِ نشو و نما کو جس سے زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہے، رحمت کی اصطلاح سے تعبیر کیا
ہے اور خدا کی جس صفت سے رحمت کا ظہور ہوتا ہے، اس کے لئے رحیم اور رحمٰن کے الفاظ آئے ہیں۔ ۱۱
کا مادہ تو وہی (ر۔ح۔م) ہے لیکن عربی زبان میں ابواب یا اوزان کی جو خصوصیت ہے، ان کی رُو سے
دونوں (رحیم اور رحمٰن) میں بڑا اہم فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ رحیم، فعیل کے وزن پر ہے جس کے معنی
اس میں خدا کی صفت رحمت کا ظہور مسلسل، متواتر، ایک ہی نہج سے ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور رحمٰن، فعلان

... پر ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہنگامی ضروریات کے وقت، رحمت کا ظہور یک لخت اور بڑی شدت سے ہو۔ نظریۂ ارتقاء کی رو سے یوں سمجھئے کہ رحیمیت، عام ارتقاء کے لئے اور رحمانیت، نجاتی ارتقاء کے لئے جس میں انقلاب یک لخت نمودار ہوتا ہے۔

ہماری فوج اس دوران میں، ارتقائی منازل رحیمیت کے انداز سے طے کر رہی تھی ——— نہایت خاموش، غیر مرئی اور غیر محسوس طریقہ سے مسلسل اور متواتر اپنے کام میں مصروف۔ پیہم اور لگاتار، انتہائی ثبات واستقامت سے، اپنی قوت میں اضافہ کرنے میں مشغول — کہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، ہندو نے اس آگ کو یک لخت اگل دیا جسے اس کا حسد و انتقام سے بھنچا ہوا سینہ، اٹھارہ برس سے اپنے اندر دبائے چلا آرہا تھا — اچانک اور بلا اعلانِ جنگ کئے حملہ — اور اس کے جواب میں، ہماری افواج قاہرہ، بادل گرج اور بجلی کی چمک کے ساتھ یوں لپک کر ابھریں، جیسے شیر کچھار سے نکلے اور ایک ہی جست میں گیدڑ کو جا دبو[چے]۔ ہماری افواج کے اس محیر العقول، برق پا جوشش کردار کو دیکھ کر دنیا بھر کے ماہرینِ فنِ حرب، آج تک انگشت بدنداں ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ کیسے کر دکھایا۔ لیکن ہمیں اس "کیسے" کے جواب کی تلاش میں کہیں دور جانے [کی] ضرورت نہیں۔ ہماری افواج اس تمام دوران، بیکار بیٹھیں مفت کی نہیں کھا رہی تھیں، وہ خدا کی صفت رحیمیت کو سامنے رکھتے ہوئے نہایت خاموشی سے "جہاد کی تیاری میں مصروف"[1] تھیں۔ وہ اپنی مضمرہ [قوتوں] کو اپنے اندر متحرک کرتی چلی آرہی تھیں۔ وہ قوتیں، تاریخ کے اس نازک ترین لمحہ میں، خدا کی صفت رحمانیہ [کے] تتبع میں، یوں یک لخت نمودار ہو گئیں جس طرح بربط کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے، ایک جنـ[بش] مضراب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ [میں بیان] کیا ہے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس زمانے میں یہ خیال (نا واقف لوگوں کی زبان پر) عام تھا کہ ہماری افواج، ہندوستان [کے ارادوں] سے بے خبر تھیں اور اسی لئے ان کی طرف سے جو حملہ اچانک ہوا تو اس کی مدافعت کی تدابیر [پہلے سے] نہیں کی جا سکی تھیں۔ یہ خیال غلط تھا۔ ہمیں اسی زمانے میں ایک واقفِ حال نے بتایا تھا کہ

---

[1] نبی اکرمؐ سے کسی نے پوچھا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب جہاد (قتال) ہو رہا [ہو تو اس میں شریک ہو، اور جب نہ ہو رہا ہو] تو [اس کی تیاری] میں مصروف ہو۔

کی عقاب نگہی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان نے پانچ مختلف گوشوں سے حملہ کیا تھا اور ان میں سے چار مقامات ہمارے حفاظتی انتظامات پہلے سے موجود تھے۔ صرف ایک مقام خالی تھا۔ لیکن چونکہ ہماری افواج باقی ہر چہار محاذوں کی طرف سے مطمئن تھیں اس لئے اس پانچویں محاذ کی مدافعت میں زیادہ مشکل نہیں اٹھانی پڑی۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگائیے کہ جس زمانے میں یہ کہا جا رہا تھا کہ ہماری افواج بیکار بیٹھی مفت کی کھا رہی ہیں' وہ اس زمانے میں کیا کچھ کر رہی تھیں۔ بہرحال' جنگ کے سترہ دنوں میں ان جیوش و عساکر نے جو کچھ دکھایا' تاریخ میں اس کی مثال بہت کم ملے گی ـــ تعداد اور اسلحہ وغیرہ ہر لحاظ سے اپنے سے اتنے گنا زیادہ طاقت ور دشمن کا جرأت و بیباکی سے مقابلہ' اور اس مقابلہ میں اسے ایسی استخواں شکن شکست کہ وہ تو وہ' اس کی آنے والی نسلیں بھی صدیوں تک ان چوٹوں کو سہلاتی رہیں گی ـــ یہ اللہ کے انہی شیروں کا کام تھا۔

ہمارے ان جانبازوں کی اس فقید المثال بہادری کا لوہا دشمن نے مانا۔ اس کا اعتراف ساری دنیا کے ارباب بصیرت اور اعیانِ سیاست نے کیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ خود ہمارے ہاں کیا ہو رہا تھا؟ یہاں عجیب چال چلی جا رہی تھی۔

آپ اپنی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ (صدرِ اول کے بعد) تاریخ میں علماء و مشائخ کی داستانیں بڑی شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہیں۔ علماء نے حصولِ علم میں جو جو مشقتیں اٹھائیں اور حضرات مشائخ نے "روحانیت" کے جو جو کارنامے کر کے دکھائے' ان کے تذکار جمیلہ سے کتابوں کی کتابیں بھری ملیں گی۔ لیکن ان کتابوں میں ارباب تیغ و سناں کا کہیں ذکر تک نہیں ملیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان حضرات (علماء و مشائخ) کے تصور و خیال تک سے لوگوں کی گردنیں بصد عزت و احترام جھک جاتی ہیں۔ جنگ ستمبر میں پہلی بار یہ انقلاب رونما ہوا کہ لوگوں کی طرف سے تعظیم و تکریم کے نذرانے' حضرات منبر و محراب اور ارباب تسبیح و مصلےٰ کی طرف سے ہٹ کر' مردانِ کارزار کی بارگاہ میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات' جو اپنے سوا سے باہر کسی کی تعریف و توصیف کو برداشت نہیں کر سکتے' اس تبدیلی کو کیسے گوارا کر لیتے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک عجیب تدبیر سوچی۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ہمیں جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں' وہ ہمارے سپاہیوں کے کارنامے نہیں بلکہ وہ ان بزرگانِ کرام کا صدقہ ہیں جو "سبز عماموں" اور "سفید گھوڑیوں" کے ساتھ' غائب سے نمودار ہوتے تھے اور دشمنوں پر گولے برسا برسا کر ان کا کچومر نکال رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ میں اس قدر محیر العقول کارناموں کا (CREDIT) ان جانبازوں اور سرفروشوں کے بجائے "روحانیت" کے ان علمبرداروں کے حصے میں آ گیا اور تسبیح و مصلےٰ' تیغ و سناں پر غالب رہ گئے۔ حالانکہ خدا نے حیاتِ جاوداں' مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے بتائی ہے۔ زاہدانِ شب زندہ دار'

ارباب منبر و محراب کے لئے نہیں ـــ طلوع اسلام نے انہی دنوں اس سازش کے خلاف بھرپور مقالات سپرد قلم کئے تھے جن کا عنوان تھا ـــ ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے ـــ للہ الحمد کہ ارباب عقل و شعور پر ان مقالات کا نہایت عمدہ اثر ہوا۔

بہرحال ہماری نگاہ احترام جھکتی ہے ـــ اور تاریخ میں جس جس تک بھی یہ کارنامے پہنچیں گے، ان کی نگاہ احترام بھی اسی طرح جھکے گی ـــ ان جسور و غیور مجاہدین کی بارگاہ میں جو شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں نکل آئے اور جنہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے یہ ثابت کر دیا کہ ـــ بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں ـــ ہماری مملکت، ہمارے جان و مال، ہماری عزت و ناموس کے پاسبانو! تم پر خدا کا لاکھ لاکھ سلام ہو۔ تم اس پاسبانی کا مقدس فریضہ ادا نہ کرتے تو آج نہ پاکستان باقی ہوتا، نہ ہم ہوتے۔ ـــ تمہارے اس احسان کے بار عظیم سے ملت پاکستانیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔

ـــ (۰) ـــ

اقبالؔ نے کہا تھا۔

مقامِ ہوش سے آساں گزر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ جو بازی ہم نے میدانِ کارزار میں اس سرفرازی و سربلندی کے ساتھ جیتی تھی، اسے اب ہم بساطِ سیاست پر اس ندامت و خجالت سے ہار رہے ہیں ـــ اور قیامت بالائے قیامت کہ ہار رہے ہیں خود اپنوں کے ہاتھوں ـــ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں (STATE) کا لفظ نہیں بلکہ (STATES) ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ایک مملکت نہیں، بلکہ دو الگ الگ آزاد مملکتیں بننی چاہئیں ـــ ایک مغربی پاکستان میں، دوسری مشرقی پاکستان میں ـــ یعنی ان حضرات کو چالیس سال کے بعد اس ریزولیوشن میں (S) نظر آیا ہے ـــ ادھر ون یونٹ توڑنے کے بعد، مختلف صوبوں کو یہ پٹی پڑھائی جا رہی ہے کہ تم میں سے ہر صوبہ کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہونی چاہیئے، تاکہ مرکز محض "ثواب" کی خاطر باقی رہ جائے۔ یہ سب کچھ یہاں "لیڈرانِ کرام" کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اور ہندو، انگریز سے، کنکھیوں سے کہہ رہا ہے کہ تم نے دیکھا کہ ہم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست کا کیسا انتقام لیا؟

برہمنے بغزنوی گفت کرامتم بہ بیں ÷ تو کہ صنم شکستۂ بندہ شدی ایاز را

آسمان کی آنکھ نے اس قسم کا حادثہ کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ قوم رہزنوں سے بچ کر، رہبروں
لٹ رہی ہو۔ ہم ان "رہبروں" سے تو کچھ کہنا بے سود سمجھتے ہیں، البتہ قوم سے اتنا ضرور پوچھنا چا
کہ کیا تم جنگِ ستمبر کے شہداء کے خون کی قیمت یوں ادا کرنا چاہتے ہو؟

یہ آئینہ ہے

اسکے سامنے سنبھل کر آئیے، کہ
ہم خود فریبی کے خوگر ہو چکے ہیں اور
آئینہ کسی کو خود فریبی میں مبتلا نہیں رہنے دیا کرتا!

آئیے۔ آج کی نشست میں ہم جذبات سے یکسو ہو کر، خالص واقعاتی انداز نگاہ سے، ایک ایسے مسئلہ پر غور و فکر کریں جس کا تعلق، ہماری حیاتِ اجتماعیہ کی شاخوں اور پتوں سے نہیں، بلکہ اس کی جڑ اور بنیاد سے ہے۔

قرآنِ کریم میں، حضرات انبیاء کرام کی بعثت کی غرض و غایت، دو آیات میں یوں بیان کی گئی ہے، کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۹/۱۰)۔ تمام نوع انسان، ایک برادری (امتِ واحدہ) تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا تو فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا جو انہیں اتحاد و ائتلاف کی زندگی کے خوشگوار نتائج کی بشارت دیتے تھے۔ اور اختلاف و تفریق کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے تھے۔ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ انبیاء کے ساتھ خدا، اپنی کتاب — ضابطۂ ہدایت — نازل کرتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ جن معاملات میں لوگ اختلاف کریں، ان کا تصفیہ اس ضابطہ کی رو سے کر دیا جائے۔ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ لیکن انبیاء کے جانے کے بعد، وہی لوگ جنہیں وہ کتاب دی جاتی، باہمی ضد اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کے جذبہ کی بنا پر اس میں اختلاف پیدا کر دیتے۔ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ۔ جو لوگ اپنے ایمان پر پختہ ہوتے انہیں ان اختلافات

کی تاریکیوں میں بھی اتحاد و ائتلاف کی راہ دکھائی دے دیتا۔ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى
مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (۲/۲۱۳)۔ اور یہ چیز کسی خاص گروہ، خاص قوم، خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص و محدو
خدا کی کتاب موجود ہو، تو جو بھی چاہے اس سے زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ کی طرف راہ نمائی
کرسکتا ہے۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد

ان دو آیات میں' سارا پروگرام نکھر اور ابھر کر ہمارے سامنے' یعنی :-

(۱) زندگی کے ابتدائی دور میں' انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) کی شکل میں رہتے تھے۔ ا
کوئی گروہ بندی نہ تھی۔ تفرقہ نہیں تھا، اختلاف نہیں تھا۔

(۲) بعد میں' انفرادی مفاد پرستیوں اور گروہ بندانہ تغلب اندیشیوں نے' اس برادری میں
پیدا کر دیئے اور انسانیت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

(۳) ان میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کیلئے' خدا نے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ ایک
اپنے ساتھ ضابطہ ہدایت لاتا۔ اس ضابطہ کی رُو سے' تمام اختلافی امور کے فیصلے ہوتے اور ا
ایک ایسی امت کی تشکیل ہو جاتی جس میں کوئی تفرقہ، کوئی اختلاف نہ ہوتا۔

(۴) نبی کے چلے جانے کے بعد، خود اس کتاب کے نام لیواؤں میں گروہ بندانہ مفاد و تغلب کے
اُبھرتے اور ان میں اختلافات پیدا ہو جاتے۔ اس کے بعد پھر ایک نبی آتا اور ان کے اختلافات رفع کر
واحدہ کی تشکیل کر دیتا۔

(۵) اس امت کی اساس' اس ضابطہ خداوندی کی صداقت و محکمیت پر ایمان، اور عملاً اس اق
پر تھی کہ ہم اپنے تمام اختلافی معاملات کا حل اس ضابطہ کی رُو سے دریافت کیا کریں گے۔ خود اس ضا
اس امر کی صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ تمام اختلافی امور کا نہایت اطمینان بخش حل دے دے۔

(۶) تشکیلِ امت کے اس طریق کا نام، آج کی اصطلاح میں، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر
کی تعبیر ہے۔ یعنی رنگ، نسل، زبان، وطن وغیرہ کے تمام اختلافات سے بلند ہو کر، خالص آئیڈ
اشتراک سے ایک امت (یا قوم) کی تشکیل۔

تشکیلِ امت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا لیکن چونکہ ازمنۂ قدیمہ میں وسائلِ رسل و رسائ
کم اور ذرائع مواصلات محدود تھے، اس لئے اس قسم کی امتیں محدود علاقوں میں متشکل ہو جاتی
کے بعد، جب دنیا ایک نئے دور میں داخل ہونے کے قریب آئی تو رشد و ہدایت کے اس سلسلہ

قری کرلی، حضور نبی آخرالزمانؐ کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ آپؐ کے متعلق اعلان کر دیا گیا کہ آپؐ کی رسالت
سی خاص قوم، خاص ملک سے محدود، اور کسی خاص زمانہ تک محدود نہیں۔ آپؐ رسولؐ کافتہ للناس ہیں یعنی
تمام نوعِ انسان کی طرف رسول۔ اور جو ضابطہ ہدایت (قرآنِ کریم) آپؐ کی وساطت سے بھیجا جارہا ہے وہ

امتِ محمدیہ کی تشکیل

ذکر للعالمین ہے ــــ یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے دستورِ حیات ــــ اس
ضابطہ کی بنیادوں پر، یعنی آئیڈیالوجی کے اشتراک سے حضورؐ نے ایک
امت کی تشکیل فرمائی جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ کوئی افتراق نہیں تھا۔ اس میں کوئی مذہبی فرقہ
نہیں تھا، کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی۔ نہ ان میں عقاید کا کوئی اختلاف تھا نہ نظریات کا تفاوت۔ نہ ان کی
منزلیں الگ الگ تھیں نہ راستے جدا جدا۔ ایک منزل، ایک راستہ، ایک کارواں، اس کا ایک قائد۔ جو
اختلافی معاملہ ان کے سامنے آتا اس کا حل قرآن سے دریافت کرلیا جاتا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

(۱) اس امت سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ۔ (۴۲/۱۰)۔
جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو، اس کے فیصلے کے لئے خدا کی طرف رجوع کیا کرو۔

(۲) لیکن خدا تو ایک بسیط حقیقت ہے۔ اس کی طرف رجوع کیسے کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے خود ہی کہہ
دیا کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا عملی طریق یہ ہے کہ خدا کی کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ اس نے کفر اور ایمان
کا خطِ امتیاز ہی یہ بتایا کہ

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

خود اس کتاب کے متعلق کہہ دیا کہ، اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲)
اس میں کوئی ابہام نہیں۔ کوئی پیچیدگی نہیں۔ اس میں ہر بات صاف صاف اور واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے۔
یہ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ ہے (۱۶/۸۹) "ہر بات کو کھول کھول کر بیان کر دینے والی۔" مکمل بھی ہے اور
غیر متبدل بھی۔ (۶/۱۱۶)

(۳) لیکن کتاب تو حروف و نقوش کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس سے فیصلہ کیسے لیا جائے؟ اور اگر اس سے
اختلافی معاملہ کی وضاحت بھی ہو جائے تو اس فیصلہ کو پوری امت پر نافذ کس طرح کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس
کے لئے کسی محسوس و ناطق اتھارٹی کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ رسولؐ کی موجودگی میں اس قسم کی
اتھارٹی اس کے سوا اور کون ہو سکتی تھی؟ اس لئے بھی کہ اس اتھارٹی کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ أَتْقَاكُمْ
ہو۔ (۴۹/۱۳) تم میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ــــ یعنی قوانینِ خداوندی کا پابند ــــ اور امت میں رسولؐ سے

بڑھ کر تقویٰ شعار اور کون ہو سکتا تھا، اس لئے رسولؐ اللہ سے کہہ دیا گیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ۔ (۵/۴۸) تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔

اسلامی نظام

(۴) ان فیصلوں کے سلسلہ میں رسولؐ اللہ سے یہ کہہ دیا گیا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۸) فیصلہ طلب امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کر لیا کرو۔
سے ایک نظام وجود میں آ گیا، جسے دور حاضرہ کی اصطلاح میں نظام مملکت کہا جاتا ہے۔ اس نظام کے خطوط یوں تھے کہ

(i) ایک امت (قوم) تھی جس میں نہ الگ الگ فرقے تھے نہ پارٹیاں۔

(ii) اس امت کی ایک مملکت تھی جس کا ایک ہی سنٹر تھا۔ دور حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ مملکت کی حکومت وحدانی (UNITARY FORM) کی تھی جس میں مرکز ایک ہوتا ہے۔

(iii) اس مرکز کا ایک سربراہ تھا اور اس کی مجلس مشاورت۔

(iv) امور مملکت کے فیصلوں کے لئے قرآن دستور العمل تھا۔ اسی کو اقتدار اعلیٰ حاصل تھا یعنی (SOVEREIGN AUTHORITY) قرآن تھا — نہ عوام، نہ پارلیمان، نہ سربراہ مملکت۔ قرآن کے اسی اقتدار اعلیٰ کا نام "حکومت خداوندی" تھا۔

(v) جو فیصلہ قرآن کریم کی روشنی میں، باہمی مشاورت کے بعد، سربراہ مملکت کیطرف سے نافذ کیا جاتا، اس کا اطلاق تمام افراد امت پر یکساں ہوتا۔ اس میں نہ عبادات اور معاملات میں کوئی فرق تھا، نہ پرسنل اور پبلک لاز کی کوئی تفریق — نہ الگ الگ مسجدیں[1] تھیں، نہ الگ الگ جماعتیں، نہ الگ الگ رسمیں، نہ الگ الگ فقہیں۔ نہ الگ الگ احکام تھے نہ الگ الگ حکومتیں — ایک خدا، ایک قرآن، ایک رسول، ایک امت، ایک مملکت، ایک حکومت، ایک قانون — اس کا نام تھا اسلام۔

اس نظام کی تشکیل کے بعد امت سے کہہ دیا کہ تم نے دیکھ لیا ہے کہ رنگ، نسل، زبان، اور اختلافات سے بلند ہو کر، کس طرح آئیڈیالوجی کے اشتراک سے، تم میں عملاً وحدت پیدا کر دی گئی۔

تفرقہ شرک ہے!

اس کا نام توحید ہے۔ اگر تم میں تفرقہ پیدا ہو گیا تو تم مؤحد نہیں رہو گے مشرک ہو جاؤ گے۔ لہٰذا اس کی سخت احتیاط برتو کہ۔

---

[1] رسولؐ اللہ کے زمانے میں، منافقین نے "خدمت دین" کی آڑ میں ایک الگ مسجد تعمیر کر دی تھی۔ خدا نے فوراً حکم بھیج دیا کہ جس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو وہ مسجد نہیں، خدا اور رسول کیخلاف جنگ کرنیوالوں کی کمین گاہ ہے اسلئے حضورؐ نے اس مسجد کو

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

تم (ایک امت بننے کے بعد پھر سے) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ اور ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ گروہ سازی میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے گروہ بندانہ نظریات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ دین میں تفرقہ نہ پیدا کر لینا' تو اس سے مذہبی فرقے ہی مراد نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی، ہر قسم کی تفریق مراد ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے، مذہب اور سیاست یا دین اور امور دنیا میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا، امتِ واحدہ میں ہر قسم کا تفرقہ، (قرآن کی نصِ صریح کی رو سے) شرک ہے۔

اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۔ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کریں اور ایک گروہ بن بیٹھیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور اس امر کا اعلان کر دیا کہ اگر تم میں تفرقہ اور اختلاف پیدا ہو گیا تو تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (۳/۱۰۴)

اس طرح رسول اللہ نے وحدتِ امت کا ایک عملی نظام قائم کر دیا۔ یہ نظام درحقیقت' وحدتِ انسانیت کے عالمگیر پروگرام کی پہلی کڑی تھا۔ اسی لئے اس وحدت کی مظہر امت کو امتِ وسطیٰ (۲/۱۴۳) "ایک مرکزی جماعت" اور شہداء علی الناس (۲/۱۴۳) تمام نوعِ انسان کے اعمال کی نگران کہہ کر پکارا گیا۔

رسول اللہ کے بعد

اسلام کے اس نظام کی وسعتیں تو زمان اور مکان کی حدود سے ماورا تھیں، لیکن اس میں ایک کڑی ایسی تھی جس کی حیاتِ ارضی بہرحال محدود تھی۔ یہ کڑی تھی خود نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی۔ آپؐ کے متعلق یہ کہہ کر وضاحت کر دی کہ

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۔ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ۔ وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۔ (۳/۱۴۳)

محمد بجز این نیست کہ خدا کا ایک پیغام رساں ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغام رسانِ خداوندی آئے۔ اور اپنی حیاتِ ارضی پوری کر کے دنیا سے چلے گئے

اگر کل کو یہ رسول بھی اپنی طبعی موت مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم، یہ سمجھ کر کہ یہ نظام تو اسی کی ذات سے وابستہ تھا، پھر سے قبل از اسلام نظامِ زندگی کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو تم میں سے ایسا کریگا وہ اپنا ہی نقصان کریگا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اور جو اس کے مطابق زندگی بسر کرکے، شکر گزارِ نعمتِ خداوندی ہوگا، اسے اس کے حسنِ عمل کا صلہ ملیگا۔

اس سے قرآن نے واضح کر دیا کہ اسلام کا نظام، حضورؐ کی زندگی تک ہی محدود نہیں تھا۔ اسے آگے بھی چلنا تھا۔ نظام کی مختلف کڑیوں میں سے جب یہ کڑی نہ رہے تو اپنے میں سے "اتقیٰ" (سب سے زیادہ تقویٰ شعار) سے اس خلاء کو پورا کر لو۔

(۰)

رسول اللہ کی وفات کے بعد یہ نظام اسی طرح قائم رہا۔ ایسا تسلیم کرنے کی ہمارے پاس دلیل یہ ہے، رفقائے رسول اللہ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ (مہاجرین ہوں یا انصار) مومن حقا تھے۔ (یہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے پیرو۔ اس لئے مومنین کی جو صفات و خصوصیات قرآن نے بیان کی ہیں وہ ا حامل تھے۔ اور مومنین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی؛ اور باہمی محبت کے ہوئے ہیں۔ وہ اسلامی نظام کے قیام و استحکام کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے ہیں۔ صحابہ کبارؓ کے زما میں چونکہ اسلامی نظام، مملکت علیٰ منہاجِ رسالت قائم تھا اسلئے امت کی وحدت بھی قائم تھی۔ ان میں کسی کا تفرقہ نہیں تھا ـــ اسلئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) قرآن کریم نے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ جن حضرات کو قرآن 'مومن حقا' کہہ کر پکارے وہ (معاذ اللہ) مبتلائے شرک ہو جا

تاریخ کی حیثیت

صحابہ کبارؓ کے متعلق جو کچھ ہماری تاریخ میں آیا ہے اسے آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کر لینا چاہیئے۔ یہ تاریخ، اُس دور سے اڑھائی تین سو سال زبانی روایات کی بنا پر مرتب ہوئی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب امت کی گاڑی مدت سے، اسلامی نظام کی پٹڑی سے اتر کر، ملوکیت کے راستے پر پڑ چکی تھی۔ عہد رسالتمآبؐ اور دورِ صحابہؓ سے متعلق تاریخ کے قبول کا معیار قرآن کریم کو قرار دینا چاہیئے۔ اس (تاریخ) میں ان حضرات کے متعلق جو کچھ آیا ہے، اگر اس سیرت و کردار کا مظہر ہے جسے قرآن نے مومن کا شعار قرار دیا ہے تو اسے صحیح تسلیم کیا جا سکتا اگر وہ اس کے خلاف ہے تو اس تاریخی بیان کو دیوار پر دے مارنا چاہیئے۔ اسلئے کہ اسے صحیح تسلیم سے قرآن کی وہ شہادت غلط قرار پاتی ہے جو ان کے متعلق اس میں بصراحت مذکور ہے۔ ہم

پرایمان لانے کے مکلف ہیں۔ زید، بکر، عمر کے نوشتوں پر نہیں۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ عہد صحابہ تک امت کی وحدت قائم رہی۔ اس کے بعد نہ اسلام باقی رہا نہ وحدتِ امت۔ یہ کب ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا، یہ امور ہمارے موضوع زیر نظر سے خارج ہیں۔

ہماری حالت

اس بحث میں الجھے بغیر، اپنے زمانہ کی طرف آجائیے۔ اور دیکھئے کہ ہمارا کیا ہے۔

(۱) دنیا میں قریب ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ لیکن کیا یہ امتِ واحدہ ہیں؟ نام کے اعتبار سے تو (یا مغربی اصطلاح میں محمڈن) ضرور ہیں۔ لیکن اس اشتراکِ رسمی کے علاوہ ان میں کوئی اور قدرِ مشترک ؟

(۲) ان مسلمانوں کی متعدد اپنی آزاد مملکتیں ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اسلامی نظام میں امت میں ایک سے زیادہ مملکتوں ..... کا تصور ہی باطل ہے۔ اس نظام میں، تمام امت کی اور اس کا ایک مرکز ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ زمانہ کے بدلے ہوئے حالات پیشِ نظر ان الگ الگ مملکتوں کا وجود ناگزیر تھا۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ کیا ان میں کوئی ایک بھی ایسی ہے جس میں وہ اسلامی نظام قائم ہے جس کی قرآنی تفصیلات اوپر دی جا چکی ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) "یہ حقیقت ہے کہ تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔" کیا ان مختلف مملکتوں کا باہمی رشتہ اخوت کا ہے؟ ـــــ قرآن نے کہا تھا۔ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ . . . . . . عَذَابًا عَظِيْمًا۔ (۴/۹۳) جس شخص نے کسی مومن کو بھی عمداً قتل کر دیا، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب ہے۔ اور بہت بڑا عذاب۔ یہ ہے خدا کا ارشاد۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کیا یہ مملکتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نہیں رہتیں۔ اور ایک "بھائی" دوسرے "بھائی" کا گلا نہیں کاٹتا؟ کیا ان میں سے "ایمان" کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف تو ایک طرف رہا، محض اتحاد کرنے کے لئے قرآن نے کہا تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۴/۱۴۱) ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا کافروں کو مومنوں پر غلبہ دیدے؟ کیا ان مملکتوں میں سے کوئی مملکت ایسی ہے جس پر کسی نہ کسی رنگ میں، بالواسطہ یا بلا واسطہ، کفار کا سیاسی، تمدنی، یا معاشی غلبہ نہ ہو۔ ہے جو غیر مسلم مملکتوں کی دست نگر نہ ہو۔؟

(۳) کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم مسلمانوں میں قومیت کا معیار نسل ہے یا وطن۔ اور امت

[illegible]

(۴) مختلف مملکتوں سے نیچے اتر کر، اب کسی ایک مملکت کی طرف آئیے۔ کیا اس مملکت کے تمام باشندے "امتِ واحدہ" ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک ہی مملکت کے اندر مسلمان ذاتوں، برادریوں (یعنی نسلی امتیازات) کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں! وطنی اعتبار سے ایک صوبے میں بسنے والے مسلمان دوسرے صوبے میں بسنے والے مسلمانوں کے رقیب ہیں اور باہمی تعصب کی بنا پر ایک دوسرے کے مفاد کے دشمن۔ سیاسی پارٹیوں کی طرف آئیے، تو ان کی باہمی سر پھٹول کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

(۵) اور آخر میں مذہب کی طرف آئیے۔ کیا کوئی خطۂ زمین بھی ایسا ہے جس میں صرف "مسلمان" بستے ہوں۔ اور وہ شیعہ، سنی، اہلِ حدیث، حنفی، حنبلی، مالکی، شافعی، کی گروہ بندیوں میں بٹے ہوئے نہ ہوں اور ان فرقوں میں کوئی فرقہ بھی ایسا ہے جو قرآن اور صرف قرآن کو دین میں سند و حجت مانتا، اختلافی معاملات میں اسے حکم تسلیم کرتا اور اس اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کی اطاعت قبول کرتا ہو۔

اس کے بعد آپ اس آخری بات کو سامنے لائیے جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ اس پر جذبات سے ہٹ کر، واقعاتی انداز نگاہ سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ آخری بات یہ کہ دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ

اسلام کہاں ہے؟

مسلمان تو بستے ہیں لیکن کیا یہاں کسی جگہ اسلام بھی موجود ہے؟ زید۔ بکر۔ عمر کا اسلام نہیں۔ وہ اسلام جس کا تصور قرآن نے پیش کیا تھا اور جسے ہم شروع میں سامنے لا چکے ہیں۔ یہ ہے وہ اہم سوال جسے نمایاں طور پر سامنے رکھ کر آگے بڑھئے۔ بات بالکل واضح ہے۔

جب امت، امت واحدہ نہیں تو ان میں اسلام بھی کہیں نہیں۔ قرآن نے تفرقہ کو شرک قرار دیا تھا۔ جس امت میں تفرقہ ہے۔ وہ بہ نصِ صریحِ قرآنیہ شرک میں مبتلا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شرک اور اسلام ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

ہم جانتے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت اس پر سخت چیں بہ جبیں ہو گی۔ لیکن آپ ان حضرات کے سامنے قرآن کی وہ آیات رکھئے جنہیں پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اور پھر ان سے پوچھئے کہ ان کے معانی کیا ہیں۔ بات واضح ہو جائے گی۔ ان میں سے ہر ایک یہ کہیگا کہ قرآن کی یہ آیات برحق ہیں لیکن ان کا اطلاق ہم پر نہیں ہوتا۔ ہم تو اصلی اسلام کے پیرو مسلمان ہیں۔ تفرقہ دوسروں نے پیدا کر رکھا ہے اور اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ (ان میں سے ہر ایک یہی الفاظ کہے گا۔ اور یہ اس لئے کہ قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ فرقہ بندی میں ہوتا یہ ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر اور باقی سب کو باطل پر قرار دیتا ہے)۔

آپ ایسا کہنے والوں سے یہ پوچھئے کہ بہت اچھا صاحب! آپ اصلی اور حقیقی اسلام کے پیرو ہیں۔ فرقے دوسروں نے پیدا کئے ہیں۔ لیکن آپ یہ فرمایئے کہ جس فرقے سے آپ متعلق ہیں، کیا قرآن میں مسلمانوں کو اس نام سے

گیا ہے؟ کیا رسول اللہ نے اپنے آپ کو اس نام سے متعارف کرایا تھا؟ قرآن نے تو کہا تھا کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (۲۲/۷۸) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اور رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (میں سب سے پہلا مسلم ہوں)۔

اور اس کے بعد ان سے کہیئے کہ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں کہ کل سے آپ اپنے آپ کو (مثلاً) شیعہ نہ کہیں صرف مسلمان کہیں۔ سنی نہ کہیں مسلمان کہیں۔ اہل حدیث، حنفی، مالکی، شافعی وغیرہ نہ کہیں صرف مسلمان کہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ "اصلی اور حقیقی اسلام" کے پیرو ہونے کے مدعی' اتنی سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں ہونگے۔

اور یہ تو صرف نام کی بات ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی شخص اپنے معتقدات و نظریات، مسلک اور مشرب میں ذرا سی تبدیلی کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوگا۔

یہ ہے اس وقت مسلمانوں کی حالت!

(۵)

امت کی اس عبرت انگیز اور المناک حالت سے متاثر ہو کر مصلحینِ ملت وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے کہ

مصلحینِ امت کی ناکامی

ملت کے اس تشتت و انتشار اور افتراق و اختلاف میں اتحاد کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ماضی قریب میں' ان میں سرفہرست' سید جمال الدین افغانی" کا نام نامی دکھائی دیتا ہے۔ سید صاحب کی ساری عمر اس مقصد کے حصول کے لئے صحرانوردیوں اور دشت پیمائیوں میں بسر ہوگئی۔ انہوں نے قریب قریب تمام مسلم مملکتوں کا دورہ کیا۔ ان کے اربابِ حل وعقد سے رابطہ اور ضابطہ قائم کیا۔ ان کے باہمی اتحاد و اتفاق کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

افغانی (علیہ الرحمۃ) کے بعد، یہی صدائے دلخراش اقبال" کے قلب درد آگیں سے ابھری اور وہ ساری عمر اسی کی تلقین کرتے رہے۔ کبھی انہوں نے کہا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائیگا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑگیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

اور کبھی یہ کہ

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وہ ساری عمر اس صدائے دردناک کو عام کرتے رہے لیکن اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد انہو ایک عملی پروگرام سوچا اور اپنی آواز کو ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود کر دیا تاکہ اس عالمگیر انقلاب کا آغاز اس خطۂ زمین سے کیا جائے۔ یہاں انہوں نے۔ قرآنِ کریم کے اس بنیادی اصول کو اجاگر کیا کہ اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ ایمان ہے، نہ کہ اشتراکِ وطن۔ اور اس اصول کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان غیر مسلموں سے الگ، ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں (اس سے پہلے سرسیدؒ نے بھی یہ اصول پیش کیا تھا)۔ اس کے بعد اقبالؒ نے اسلامی نظام کا دوسرا بنیادی اصول پیش کیا کہ مسلمان۔ اسلام کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں اسلام کے اصول و احکام نظام کی شکل میں کارفرما ہوں۔ یہ دو اصول، مطالبۂ پاکستان کی بنیاد قرار پائے۔ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ میں کہا تھا کہ اس آزاد مملکت کے حصول کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام پر جو ٹھپہ عربی ملوکیت نے لگا دیا تھا وہ دور ہو جائے گا۔ اور قبل از دورِ ملوکیت کا حقیقی اسلامی نظام دوبارہ وجود میں آ سکے گا۔ یہ تھی حصولِ پاکستان کی غایت۔

پاکستان کی غرض و غایت

اقبالؒ کے بعد پاکستان کی اسی غرض و غایت کو قائدِ اعظمؒ دہراتے رہے حتیٰ کہ پاکستان وجود میں آگیا۔

پھر سن لیجئے کہ حصولِ پاکستان کی غرض و غایت کیا تھی؟ یہ کہ

(۱) پاکستان ایک ایسا خطۂ زمین ہوگا جو تجربہ گاہ بنے گا اس اسلامی نظام کے احیاء کا جو عہدِ محمدؐ رسول اللہ والّذین معہٗ میں وجہ شادابیٔ عالم ہوا تھا۔

(۲) اس مملکت میں بسنے والے تمام مسلمان، اشتراکِ ایمان کی بنا پر، ایک قوم (امتِ واحدہ) بن جائیں گے۔ اس امت میں رنگ۔ نسل۔ زبان۔ جغرافیائی تفریق، صوبائی تقسیم، ذات، گوت، برادری وغیرہ کے غیر فطری امتیازات ختم ہو جائیں گے اور دنیا ایک بار پھر اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ کا جنت نظیر منظر دیکھ لے گی۔ غیر مسلم (یعنی جو اس نظریہ پر ایمان نہ رکھتے ہوں) اس امت کا جزو نہیں قرار پا سکیں گے۔

(۳) اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں

دیا ہے؟ کیا رسول اللہ نے اپنے آپ کو اس نام سے متعارف کرایا تھا؟ قرآن نے تو کہا تھا کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (۲۲/۷۸) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اور رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶/۱۶۴) میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔

اور اس کے بعد ان سے کہیئے کہ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں کہ کل سے آپ اپنے آپ کو (مثلاً) شیعہ نہ کہیں صرف مسلمان کہیں، سنی نہ کہیں مسلمان کہیں۔ اہل حدیث، حنفی، مالکی، شافعی وغیرہ نہ کہیں صرف مسلمان کہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ "اصلی اور حقیقی اسلام" کے پیرو ہونے کے مدعی، اتنی سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں ہونگے۔

اور یہ تو صرف نام کی بات ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی شخص اپنے معتقدات ونظریات، مسلک اور مشرب میں ذرا سی تبدیلی کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوگا۔

یہ ہے اس وقت مسلمانوں کی حالت!

(۰)

امت کی اس عبرت انگیز اور المناک حالت سے متأثر ہو کر مصلحینِ ملت وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے کہ

مصلحینِ امت کی ناکامی

ملت کے اس تشتت وانتشار اور افتراق واختلاف میں اتحاد کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ماضی قریب میں، ان میں سرفہرست سید جمال الدین افغانی رہ کا نام نامی دکھائی دیتا ہے۔ سید صاحب کی ساری عمر اس مقصد کے حصول کے لئے صحرانوردیوں اور دشت پیمائیوں میں بسر ہوگئی۔ انہوں نے قریب قریب تمام مسلم مملکتوں کا دورہ کیا۔ ان کے ارباب حل وعقد سے رابطہ اور ضابطہ قائم کیا۔ ان کے باہمی اتحاد واتفاق کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

افغانی (علیہ الرحمۃ) کے بعد، یہی صدائے دلخراش اقبال رح کے قلب دردآگیں سے ابھری اور وہ ساری عمر اسی کی تلقین کرتے رہے۔ کبھی انہوں نے کہا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ وخون مٹ جائیگا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

اور کبھی یہ کہ

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وہ ساری عمر اس صدائے دردناک کو عام کرتے رہے لیکن اُس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک عملی پروگرام سوچا اور اپنی آواز کو ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود کر دیا تاکہ اس عالمگیر اخوت کا آغاز اس خطۂ زمین سے کیا جائے۔ یہاں انہوں نے۔ قرآنِ کریم کے اس بنیادی اصول کو اجاگر کیا کہ اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ ایمان ہے، نہ کہ اشتراکِ وطن۔ اور اس اصول کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے الگ، ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں (اس سے پہلے سرسیدؒ نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا)۔ اس کے بعد اقبالؒ نے اسلامی نظام کا دوسرا بنیادی اصول پیش کیا کہ مسلمان۔ اسلام کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں اسلام کے اصول و احکام عملی نظام کی شکل میں کارفرما ہوں۔ یہ دو اصول مطالبۂ پاکستان کی بنیاد قرار پائے۔ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں کہا تھا کہ اس آزاد مملکت کے حصول کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام پر جو ٹھپہ عربی ملوکیت نے لگا دیا تھا، وہ دور ہو جائے گا۔ اور قبل از دورِ ملوکیت کا حقیقی اسلامی نظام دوبارہ وجود میں آسکے گا۔ یہ تھی حصولِ پاکستان کی غایت۔ اقبالؒ کے بعد پاکستان کی اسی غرض و غایت کو قائدِ اعظمؒ دہراتے رہے حتیٰ کہ پاکستان وجود میں آگیا۔

پاکستان کی غرض و غایت

پھر سن لیجئے کہ حصولِ پاکستان کی غرض و غایت کیا تھی؟ یہ کہ

(۱) پاکستان ایک ایسا خطۂ زمین ہوگا جو تجربہ گاہ بنے گا اس اسلامی نظام کے احیاء کا جو عہدِ محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ میں وجہِ شادابیٔ عالم ہوا تھا۔

(۲) اس مملکت میں بسنے والے تمام مسلمان، اشتراکِ ایمان کی بنا پر، ایک قوم (امتِ واحدہ) قرار پائیں گے۔ اس امت میں رنگ۔ نسل۔ زبان۔ جغرافیائی تفریق، صوبائی تقسیم، ذات، گوت، برادری، وغیرہ کے غیر فطری امتیازات ختم ہو جائیں گے اور دنیا ایک بار پھر انما المؤمنون اخوۃ۔ کا جنت نگاہ نظارہ دیکھ لے گی۔ غیر مسلم (یعنی جو اس نظریہ پر ایمان نہ رکھتے ہوں) اس امت کا جزو نہیں قرار پا سکیں گے۔

(۳) اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں

رفتہ رفتہ فرقہ بندانہ تعصبات ختم ہو جائینگے۔ اور یوں ایک دن' تفرقہ کا شرک ائتلافِ قلبی کی وحدت سے بدل جائے گا۔

(۴) اس کامیاب تجربہ کو دیکھ کر' دنیا کے دیگر مسلم ممالک بھی' اسی نظام کو اپنے ہاں رائج کرتے چلے جائینگے اور اس طرح تسبیح کے یہ بکھرے ہوئے دانے' ایک بار پھر' رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جائینگے ——
اور ظاہر ہے کہ جب ساٹھ ستر کروڑ نفوس' قلبی رشتہ سے بنیان مرصوص (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بن جائیں' تو دنیا کی کونسی طاقت ان پر غالب آسکتی ہے ؟

یہ تھیں وہ حسین آرزوئیں اور شاداب تمنائیں جو مملکتِ پاکستان کے حصول و قیام کا محرک ہوئی تھیں۔

———— (۰) ————

اس خواب کی تعبیر

یہ ہمارا خواب تھا —— اور اس خواب کی تعبیر کیا ہے' اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ —— صورت ببیں' حالم مپرس! صورت اس وقت یہ ہے کہ ایمان کے اشتراک سے امت کی تشکیل تو ایک طرف، ہم' دنیا کی عام اقوام کی طرح ، وطن یا مملکت کے اشتراک سے بھی ایک قوم نہیں بن سکے —— یہاں' بنگالی بستے ہیں، بلوچی بستے ہیں، سندھی بستے ہیں، پنجابی بستے ہیں، پختون بستے ہیں۔ لیکن پاکستانی کہیں نظر نہیں آتے۔ اور پھر ان بنگالیوں، بلوچوں، سندھیوں، پنجابیوں، پختونوں میں باہمی تعصب کا عالم یہ ہے، کہ (عام تاثر یہ ہے کہ) ایک بنگالی مسلمان کے نزدیک غیر بنگالی مسلمان کے مقابلہ میں، بنگالی ہندو زیادہ عزیز ہے۔ (ہم نے بنگالی اور غیر بنگالی کا نام محض بطور مثال لیا ہے۔ یہی کیفیت' دوسری جگہ بھی پائی جاتی ہے) سیاسی افتراق کا یہ عالم ہے کہ تقسیم سے پہلے، اصولی طور پر مسلمانوں کی دو ہی سیاسی پارٹیاں تھیں —— ایک مسلم لیگ جو مطالبۂ پاکستان کی محرک و موئید تھی۔ اور دوسری متحدہ قومیت کے حامیوں کی۔ لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ جو اینٹ اٹھایئے اس کے نیچے سے ایک نئی سیاسی پارٹی ابھر کر سامنے آجاتی ہے گی۔ اور ان پارٹیوں میں جو کچھ باہمی ہو رہا ہے' اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ ملک، انسانوں کی بستی نہیں۔ درندوں کا بھٹ ہے جس میں ہر گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا' اور ہر جماعت دوسری جماعت کی جان کی لاگو ہے —— اور تعصب کا یہ عالم کہ' سابقہ الیکشن کے زمانے میں' جماعت اسلامی کے امیر' مودودی صاحب نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں ایک ہندو کو ترجیح دوں گا۔ مذہبی تفرقہ کی یہ کیفیت کہ ۱۹۶۲ء کے آئین میں مختلف فرقوں کا ذکر نہیں تھا —— یہ ایک خوش آئند علامت تھی —— لیکن مذہب پرست طبقہ نے (جسے اب "اسلام پسند" کی جدید اور نہایت شرمناک اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے —— "شرمناک" اس لئے کہ اس

سے دنیا کو یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مسلمان تو کہلاتے ہیں لیکن اسلام کو پسند نہیں کرتے۔ کیا کسی قوم کی طرف سے اس قسم کا اعلان، باعث شرم و ندامت نہیں !!)۔ ہاں! تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں فرقوں کا ذکر نہیں تھا۔ لیکن مذہب پرست طبقہ (بالخصوص جماعتِ اسلامی) نے اس کے خلاف ہنگامے برپا کر دیئے اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک آئین میں اس "دفعہ" کا اضافہ نہ کرا لیا کہ شخصی معاملات میں، ہر فرقہ، کتاب و سنت کی تعبیر اپنی اپنی فقہ کے مطابق کرے گا۔ اس سے فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا ہوگئی۔ اب وہ بدقسمت مسلمان، جو فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہے اور اس لئے اپنے آپ کو کسی فرقہ سے منسوب نہیں کرتا، محوِ حیرت ہے کہ اگر ملک میں ان حضرات کے اسلام کا نظام رائج ہو گیا تو اس کے معاملات کا فیصلہ کون سی فقہ کی رُو سے ہوا کرے گا۔

جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے، مملکتِ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے لئے ایک مضبوط مرکز، اور مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کا ایک وحدت (وَن یونٹ) میں اوغام، وحدتِ ملّت کے لئے عمدہ ذرائع بن سکتے تھے۔ لیکن مغربی پاکستان کی وحدت تو ٹوٹ چکی ہے اور مشرقی پاکستان سے ابھرنے والے "چھ نکات" کا عملاً مفہوم یہ ہے کہ اُس خطہ کو ایک جداگانہ آزاد مملکت بنا دیا جائے — اور جب اُسے یہ حیثیت حاصل ہو جائے تو پھر مغربی پاکستان کے صوبوں کی طرف سے بھی اس قسم کا مطالبہ پیش کر دیا جائے۔ یوں اس جسدِ مملکتِ پاکستان کے تمام اعضاء ایک ایک کر کے الگ کر دیئے جائیں اور کہا یہ جائے کہ اس سے جسدِ مملکت زیادہ مستحکم اور توانا ہو جائے گا۔ کوئی ان فیلسوفوں سے پوچھے، کہ جس جسد کے اعضاء الگ الگ کر دیئے جائیں، اس (جسد) کا وجود کہاں رہتا ہے؟ نام نہاد مرکز اور خودمختار صوبوں کے معنی ہیں پاکستان کا خاتمہ۔

وہ ہمارا خواب تھا — اور یہ اس خواب کی تعبیر ہے!

(۰)

کیا یہ اسلام کی شکست ہے؟

یہاں سے ایک نہایت اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے — اہم بھی اور نازک تر بھی — نازک تر اس لئے کہ جو قوم جذبات میں ڈوب جانے کی عادی ہو جائے، جب اسے، حقائق کے آئینے میں اس کی شکل دکھائی جائے تو وہ جھنجھلا کر آئینہ ہی کو توڑ دیا کرتی ہے۔ لیکن کبھی تو حقائق کا سامنا کرنا ہی ہو گا — کبھی تو اس خود فریبی سے نکلنا ہی ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بنیادوں پر ایک امت کی تشکیل اسلام کے صدر اول میں ہوئی۔ بڑے عرصہ تک وہ وحدت قائم رہی۔ اس کے بعد اس امت میں تفرقہ پیدا ہونا شروع ہو گیا اور وہ تفرقہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اسے دور کرنے کی جس قدر کوششیں کی گئیں وہ ناکام رہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے تو کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اسلام نے جو یہ اصول پیش کیا تھا کہ اشتراک دین کی بنیاد پر وحدت پیدا کی جائے، وہ اصول ہی سرے سے غلط اور ناممکن العمل تھا۔ انہوں نے مطالبۂ پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

> یہ سب سے بڑا فریب (FRAUD) ہے جس میں لوگوں کو مبتلا کیا جا رہا ہے کہ دین کا سررشتہ، اُن خطوں کو متحد کر دیگا جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہا تھا جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے ماوراء ہو۔ لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ چند ہی سالوں کے بعد — یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد، اسلام اس قابل نہ رہا کہ مسلمانوں کے مختلف ممالک کو محض اسلام کی بنیاد پر، ایک مملکت بنا سکے۔ (لہٰذا، اب اس ناکام تجربہ کو دہرانا حماقت یا فریب نہیں تو اور کیا ہے؟)

(INDIA WINS FREEDOM _ P. 227)

آج ابوالکلام آزاد زندہ ہوتے تو بغلیں بجاتے ہوئے کہتے کہ تم نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہوا! لیکن اگر (مولانا) آزاد آج زندہ نہیں تو کیا؟ ان کے بیشمار متبعین اور ہم خیال یہاں موجود ہیں۔ پاکستان کے اس انتشار پر وہ یقیناً کہیں گے کہ — کیوں ہم نہ کہتے تھے! لیکن سوال کسی کے ایسا کہنے یا نہ کہنے کا نہیں۔ جب یہ تاریخی حقیقت ہے — اور پاکستان کے تجربہ نے اس کی تازہ شہادت بہم پہنچا دی ہے، تو ہم پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ ہم، جذبات سے الگ ہٹ کر، غور کریں کہ اس کا اصلی سبب کیا ہے؟

اس کا سبب کیا ہے؟

اس سبب کے سمجھنے کے لئے، ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

آپ نے اس قسم کے نام اکثر سنے ہونگے — قاضی احمد اللہ۔ مفتی سعید الرحمن، حکیم احمد حسن — نام یہ نام ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان میں سے نہ کوئی قاضی ہوتا ہے، نہ مفتی، نہ حکیم۔ ان کے بزرگوں میں سے

کوئی ایسا تھا، اور اس خصوصیت کی بنا پر ان کی شہرت تھی۔ وہ دنیا سے چلے گئے اور ان کے اہل خاندان نے یہ خصوصیت اپنے نام کا جزو بنالی۔ جیسے کہ بعض شہروں میں 'محلہ قاضیاں، مفتیاں محلہ، بازار حکیماں بھی ہوتے ہیں' لیکن نہ ان محلوں میں کوئی قاضی یا مفتی ہوتا ہے' نہ ان بازاروں میں کوئی حکیم۔ کسی زمانے میں وہاں ان خصوصیات کے حامل رہتے ہوں گے۔ وہ ختم ہو گئے لیکن ان محلوں اور بستیوں کے نام اسی طرح متوارث چلے آتے ہیں۔

اب فرض کیجئے کہ تپ دق کا کوئی مریض "حکیم احمد حسن" سبزی فروش کے پاس چلا جائے اور وہ بھی اسے کچھ ٹوٹکے بتادے۔ مریض کی وفات ہو جائے۔ اور اس پر اس کے لواحقین کہنا شروع کر دیں کہ حکمت (طب یونانی) میں تپ دق کا کوئی علاج نہیں، ہم نے آزما کر دیکھ لیا ہے۔ تو فرمایئے ان کا یہ فیصلہ کہاں تک مبنی بر حقیقت ہوگا۔ حکیم تو وہ ہوگا جس نے باقاعدہ حکمت (طب) پڑھی ہو اور اس کے مطابق طبابت کرتا ہو۔ اگر یہ اطباء طبابت کے اصولوں کے مطابق علاج کریں اور تپ دق پر قابو نہ پا سکیں تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ طب یونانی، تپ دق کے علاج سے قاصر ہے۔ اُس سبزی فروش کے علاج کی ناکامی سے' جس کا محض خاندانی نام "حکیم" ہے، طب یونانی کو موردِ الزام ٹھہرانا کس طرح صحیح قرار پا سکتا ہے؟

جو غلطی تپ دق کے اس مریض اور اس کے متعلقین نے کی تھی' اسلام کے متعلق بعینہٖ وہی غلطی ہم کرتے ہیں۔ ہم نے اسلام اور مسلمانوں کو مرادف سمجھ لیا ہے۔ اور مسلمانوں کی ناکامی کو اسلام کی ناکامی قرار دے دیتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ (مولانا) آزاد جیسا باریک بین' اسلام اور مسلمانوں کے فرق کو نہ سمجھ سکا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے محض اپنے مسلک (متحدہ قومیت) کو حق بجانب قرار دینے کے لئے، مسلمانوں کی تاریخ کو بطور سند پیش کر دیا۔ اگر وہ اپنے آپ کو یہیں تک محدود رکھتے تو خیر تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اس سے نتیجہ یہ مرتب کیا کہ اسلام نے ایمان کے اشتراک سے قومیت کی تشکیل کا ایک تجربہ کیا تھا، جو ناکام ثابت ہوا۔ آپ سوچئے کہ جو شخص یہ مانتا ہو کہ اسلام' کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں جس کے مطابق تجربات کامیاب بھی ہو سکتے ہیں اور ناکام بھی، بلکہ اسلام' اس خدا کا عطا کردہ ضابطۂ ہدایت ہے جس کا ہر ارشاد الحق ہے' اور جس سے ہمیشہ وہ نتائج مرتب ہوں گے جن کا وہ مدعی ہے، وہ ایسی بات کبھی کہہ سکتا ہے؟ کیا عبرت انگیز ہے یہ تصور کہ (مولانا) آزاد جیسا شخص اپنی زندگی کے آخری سانس میں اسلام کے متعلق ایسی بات کہہ جائے۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے اسلام اور مسلمانوں کو مرادف سمجھ رکھا ہے۔ قرآن کچھ ابدی قوانین دیتا ہے جن کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جب اور جہاں بھی ان قوانین

کیا جائے گا، فلاں قسم کے نتائج مرتب ہو جائیں گے۔ صدرِ اول میں ایک جماعت نے ان قوانین پر عمل
اور اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے آ گئے۔ اس جماعت کا نام جماعت مومنین (یا عرفِ عام میں مسلمان)
اس کے بعد، اس جماعت کی نسل آگے چلی۔ انہوں نے ان قوانین پر تو عمل کرنا چھوڑ دیا لیکن نام اپنا
اپنے اسلاف کی تقلید میں "مسلمان" ہی رکھا۔ بعینہٖ جس طرح احمد حسن سبزی فروش نے اپنا نام حکیم احمد حسن
چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان "مسلمانوں" کا معاشرہ ان انسانیت ساز نتائج سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا تھا،
ان قوانین پر عمل پیرا ہونے سے مرتب ہوتے تھے۔

ہم پوچھتے ہیں دانشورانِ عالم سے کہ اس ناکامی کو اسلام کی ناکامی کہا جائے گا یا مسلمان نام رکھانے
والی قوم کی ناکامی؟

اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ امت کے اصلاحِ حال کی جس قدر کوششیں کی جاتی ہیں،
وہ ناکام کیوں رہتی ہیں؟ اسلئے کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ مسلمان جیسے ہیں ویسے کے ویسے ہی رہیں، لیکن ہمارے
وعظ سے ان کے معاشرہ میں اسلامی نظامِ زندگی کے نتائج ظہور میں آنے شروع ہو جائیں۔ ایسا سمجھنا بھی غلط
ہے اور اس مفروضہ پر کوئی کوشش کرنا بھی لاحاصل۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ حکیم احمد حسن سبزی فروش کے ہاتھوں
مریض شفایاب ہو جائے تو کرنے کا کام یہ ہوگا کہ اس سے سبزی فروشی کا کاروبار چھڑا کر اسے طب کی باقاعدہ
تعلیم دیں۔ اور جب وہ طب کی سند حاصل کرلے، تو پھر اسے حکیم کہیں، اور
مریضوں کا اس سے علاج کرائیں۔ اسلام کے صدرِ اول میں طریق کار یہی تھا،

مسلمان کیسے بنتا ہے

وہاں غیر مسلموں کو پہلے اسلامی قوانین و نظامِ حیات کی صداقتوں سے آگاہ کیا جاتا تھا اور ان سے کہا
جاتا تھا کہ وہ ان پر اچھی طرح غور و فکر کرلیں۔ جب وہ غور و فکر کے بعد ان کی صداقت پر مطمئن ہو جاتے
تھے تو ان کی اس کیفیت کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد انہیں اس نظام کی تعلیم دی جاتی،
اور ان کی صلاحیتوں کی نشو ونما کی جاتی تھی۔ (وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ)۔
اس طرح جب وہ "کامل الطب والجراحت" کی سند حاصل کر لیتے تھے، تو پھر وہ معالجہ کی طرف
آتے تھے۔

سوچئے کہ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی اس طرح ایمان لاکر "مسلمان" ہوا ہوا ہے؟ اسکے برعکس،
کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص "حکیم احمد حسن" ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ہم سے توقع کرنا کہ ہم
اسلامی نظام کے خوشگوار نتائج کے مظہر ہونگے، خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی غلطی ہم نے پاکستان
قائم کرنے کے بعد کی۔ ہم نے ایمان کے اشتراک سے ایک امت کی تشکیل کا دعویٰ تو کیا، لیکن ایمان کسی میں

پیدا نہ کیا۔ ہم نے بنگالی کو بنگالی ۔ بلوچی کو بلوچی ۔ سندھی کو سندھی ، پنجابی کو پنجابی ، پٹھان کو پٹھان رہنے دیا، اور فرض یہ کر لیا کہ یہ اُمّتِ واحدہ ہیں کیونکہ یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ۔ کتنی بڑی تھی یہ خود فریبی جس میں ہم نے اپنے آپ کو مبتلا رکھا ــــــ اور جس کا خمیازہ، ہم آج اس بُری طرح بھگت رہے ہیں ! اس دوران میں ہم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ بنگالی کیوں غیر بنگالی کو اپنا نہیں سمجھتا ، اور پٹھان کیوں ون یونٹ سے تنگ آیا ہوا ہے ۔ ہم نے جب بھی علیحدگی کی کوئی آواز سنی ، یا بیگانگی کے آثار دیکھے تو اس قسم کے وعظوں کو کافی سمجھا کہ

> پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے ، اس لئے ہماری زندگی کا نقشہ اسلام کے مطابق ہونا چاہیئے ۔ اسلام میں رنگ ، نسل ، خون ، زبان کے تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں اور تمام مسلم خدا کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں ــــ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ ــــ اسلام میں اسود و احمر کی کوئی تمیز نہیں ۔ اس میں بلال حبشی رضؓ ، صہیبؓ رومی ، سلمان پارسی رضؓ اور صدیقؓ عربی ، سب ایک خاندان کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے بن جاتے ہیں ۔ ہماری زندگی کا یہی شعار ہونا چاہیئے ، ہمارے معاشرہ کا یہی انداز ہونا چاہیئے ۔ ہمارا خدا ایک ، کتاب ایک ، رسول ایک ، کلمہ ایک ، قبلہ ایک ، پھر ہم بھی سب ایک امت کیوں نہ ہوں ۔ یاد رکھیئے ۔ اتحاد میں برکت ہے ، انتشار کا نتیجہ ہلاکت ہے ۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مِٹ جائے گا !

یہ وعظ کیا اور پھر لمبی تان کر سو گئے کہ سب خیر ہے ۔ ہم اس طرح اپنے آپ کو فریب دیتے رہے اور ہم میں ہم آہنگی و یک رنگی پیدا ہونے کے بجائے باہمی نفرت اور کدورت کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ۔

طلوعِ اسلام نے حصولِ پاکستان کے ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ ہم جس قسم کے مسلمان ہیں سو ہیں ۔ ہم نے اس خطۂ ارض کو حاصل کر لیا ۔ یہ بجائے خویش بہت بڑی بات ہے ۔ لیکن جس مقصد کے لئے اسے حاصل کیا گیا ہے (یعنی اسے اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنانا) یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہوگا ۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) موجودہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ تم اس خطۂ زمین کی حفاظت اس طرح سے کرو کہ دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے ۔　　اور

(۱۱) اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ وہ اس انداز کے مسلمان بن کر ابھریں جس انداز کے مسلمان، ہمارے صدرِ اول کے اسلاف تھے۔ اسی تعلیم سے یہ نوجوان قرآن کے اصول و اقدار پر ایمان لا سکیں گے۔ اور اس طرح لائے ہوئے ایمان کے اشتراک سے وحدتِ امت کے امکان روشن ہوتے چلے جائیں گے، اور رفتہ رفتہ ایسی کیفیت پیدا ہو سکیگی کہ ہم نہ بنگالی رہیں نہ بلوچی، نہ پنجابی رہیں نہ افغان، بلکہ صرف پاکستانی رہیں۔ اور اس سے آگے چل کر یہ توقع بھی ہو سکے گی کہ ہم نہ شیعہ رہیں نہ سُنّی۔ نہ وہابی رہیں نہ حنفی۔ بلکہ صرف مسلمان بن جائیں۔ ان مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نتائج مرتب ہو سکینگے جن کا وعدہ اسلام کرتا ہے، اور جو وعدہ یقینی اور اٹل ہے۔ اسلامی نظام نے جو کچھ ایک دفعہ کر کے دکھایا تھا، اس میں وہی کچھ کر دکھانے کی ابدی صلاحیت ہے۔ جس طرح فطرت کا کوئی قانون کبھی فیل نہیں ہوتا، اسی طرح قرآن کا کوئی اصول بھی کبھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتا، کہ یہ دونوں اس خدا کے تخلیق کردہ ہیں جس کا علم ازلی اور ابدی ہے، تجارب کا محتاج نہیں۔

جماعتِ اسلامی کا اعتراض

اس مقام پر ضمناً ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات آج کل بڑے فخر سے کہتے پھر رہے ہیں کہ دیکھا مودودی صاحب نے جو کچھ ۱۹۴۳ء میں کہا تھا وہ کیسے حرف بحرف صحیح ثابت ہوا؛ انہوں نے کہا تھا کہ ان پیدائشی مسلمانوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ اسلامی نظام قائم کر سکیں گے، قطعاً غلط ہے۔ مودودی صاحب کی بات کسی نے نہ سنی، لیکن واقعات نے اسے سچا ثابت کر دکھایا۔

مودودی صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس میں اتنی بات تو صحیح تھی کہ موجودہ مسلمان، اسلامی نظام قائم نہیں کر سکینگے۔ لیکن اس کے بعد، وہ قوم کو جس راستے پر ڈالنا چاہتے تھے وہ تباہیوں کی طرف لے جانے والا تھا۔ اُس وقت ہندوستان کا سیاسی نقشہ یہ تھا کہ انگریز وہاں سے جا رہا تھا۔ ہندو کی کوشش تھی کہ وہ جاتے وقت، زمامِ اقتدار (جمہوریت کے نقاب میں) ان کے حوالے کر جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا، تو مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندو کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے رہتے۔ قائدِاعظم کی کوشش یہ تھی کہ وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوستان سے الگ کر دیئے جائیں تاکہ ان میں مسلمان اپنی آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ اور پھر اس حکومت کو رفتہ رفتہ اسلامی بنا لیا جائے۔ یہ تھی وہ کشمکش جس میں مسلمان کا سیاسی مستقبل گرفتار تھا۔ ایسے نازک وقت میں، مودودی صاحب یہ پٹی پڑھا رہے تھے، کہ موجودہ مسلمان اس قابل ہی نہیں کہ وہ اسلامی حکومت قائم کر سکیں۔ اس لئے ان کے لئے الگ آزاد خطۂ زمین کا مطالبہ غیر اسلامی ہے۔ ہمیں اس مطالبہ کو چھوڑ کر مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی فکر کرنی چاہیئے

جب یہ مسلمان ہو جائینگے تو ـــــ یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم بھی ان کے قبضے میں آ جائینگے۔

اب سوچئیے کہ اگر اُس وقت ان کی بات مان کر پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیا جاتا، تو انگریز کے جانے کے بعد، پورا ہندوستان، ہندوؤں کے زیرِ اقتدار آ جاتا۔ اور پھر وہاں ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو وہاں رہ جانے والے مسلمانوں کا حشر ہو رہا ہے ـــــ وہاں ہم چار کروڑ ہوتے یا سات کروڑ، اس سے کچھ فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ مسلمان مودودی صاحب کے اس مقدس فریب میں نہ آسکے۔ ورنہ یہ ہندوؤں کے ہاتھوں بے دریغ ذبح ہوتے اور باہر کی دنیا تک ان کی چیخ و پکار پہنچانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔

اگر مودودی صاحب نیک نیتی سے سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ـــــ ہندوؤں کے سیاسی اقتدار کے علی الرغم ـــــ مسلمان بنایا جا سکتا ہے جس سے وہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندوؤں پر غالب آ جائیں، تو سوال یہ ہے کہ وہ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان سے بھاگ کیوں آسے ـــــ ہندوستان میں اُس وقت چار پانچ کروڑ مسلمان باقی تھے۔ انہوں نے وہاں انہیں مسلمان بنانے کی مہم کیوں نہ شروع کی۔

اور اگر (محض بطور عذرِ لنگ) یہ کہا جائے کہ تقسیم نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ وہاں کے مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی مہم شروع نہیں کی جا سکتی تھی، تو دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انہوں نے، پاکستان آ کر، یہاں کے مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی مہم کیوں نہ شروع کی! اس میں کون سا امر مانع تھا؟ یہ تھا وہ سوال جو خود جماعتِ اسلامی کے اکابرین کی ایک کھیپ نے اٹھایا۔ اور جب، اس کے جواب میں، مودودی صاحب نے 'اصول پرستی کی جگہ "حکمتِ عملی" کو اسلامی تقاضا بتایا، تو وہ (۱۹۵۵ء میں) جماعت کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ اور جماعت نے انہیں کوسنا شروع کر دیا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مودودی صاحب جو کچھ ۱۹۳۸-۳۹ء میں فرماتے تھے، اس سے مقصود مسلمانوں کو مسلمان بنانا نہیں تھا۔ درِ اسلامی کی آڑ میں مطالبۂ پاکستان کی اسکیم کو ناکام بنانا تھا۔ اس کے برعکس، تحریکِ پاکستان کے دوران، طلوعِ اسلام کا مسلک یہ تھا کہ اس وقت سیاسی کشمکش نے جس مقام پر ہمیں کھڑا کر دیا ہے اس میں کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں کو ہندوستان سے علیحدہ کر کے، مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنانے کی مہم شروع کر دی جائے۔ تاکہ رفتہ رفتہ یہ آزاد مملکت، اسلامی مملکت بن جائے۔ اس کے نزدیک اس کا طریقہ نئی نسلوں کے لئے صحیح تعلیم کا نظام تھا۔ ہم اپنے اس پیغام کو تیس سال سے مسلسل عام

کرنے چلے آ رہے ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ کرنا ہماری بساط میں نہیں تھا۔ طلوعِ اسلام نہ تو (مولانا) آزاد کی طرح، اسلام ہی کی طرف سے مایوس ہے، اور نہ ہی مودودی صاحب کی طرح، اصولوں کو چھوڑ کر حکمتِ عملی کا قائل۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کا ایمان ہے کہ اسلام نے جو کچھ ایک دفعہ کر دکھایا تھا اس میں، ہر زمانے میں وہی کچھ کر دکھانے کی صلاحیت موجود ہے ــــ اور اس کی یہ صلاحیت ابدی اور غیر متبدل ہے۔ ہمیں مایوسی اُس وقت ہوتی ہے جب ہم اسلام اور مسلمانوں کو مترادف سمجھ لیتے ہیں، اور مسلمانوں کی ناکامیوں اور حرماں نصیبیوں کو اسلام کی شکست قرار دے دیتے ہیں۔ جو حضرات (پاکستان ہی کی نہیں بلکہ عالمگیر) "ملّتِ اسلامیہ" کے اصلاحِ حال کا درد اپنے سینے میں رکھتے ہیں، ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اسلام اور موجودہ مسلمانوں کے اس فرق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کوئی قدم اٹھائیں۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ، صدرِ اول کے بعد کی تاریخ کو اسلام کی تاریخ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ سمجھیں۔ اگر قوم کی قسمت نے کبھی پلٹا کھایا تو اس کے لئے یہ بھی کرنے کا کام ہوگا کہ اسلام کی تاریخ کو مسلمانوں کی تاریخ سے الگ کر کے، از سرِ نو مرتب کریں۔ اس سے وہ تمام الجھنیں دور ہو جائیں گی جو اس وقت قدم قدم پر ہمارے لئے وجہ اضطراب بنتی رہتی ہیں۔ اور پھر ہمیں مایوسی کی تاریکیوں میں دھکیل دیتی ہیں۔

———— (٠) ————

موجودہ سیاسی حالت کا جائزہ

ان تصریحات کی روشنی میں ہمیں پاکستان کی موجودہ سیاست کا جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں، مختلف خطوں، صوبوں، گروہوں، پارٹیوں اور طبقوں میں باہمی تعصب کے جذبات بڑی شدت اختیار کر چکے ہیں، حتےٰ کہ اکثر ذہنوں میں علیحدگی تک کے خیالات پرورش پانے لگ گئے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ان اسباب و علل کا حقیقت پسندانہ نگاہ سے سراغ لگائیں جن کی وجہ سے حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے، ہم یہ کہہ کر شترمرغ کی طرح اپنا سر ریت میں چھپا لیتے ہیں کہ مشرق ہو یا مغرب، سندھ ہو یا بلوچستان، ہم سب اسلام کے فرزند ہیں اور اسلام محبت اور اخوت، اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ نفرت وعداوت اور تشتت و انتشار کی۔ لہٰذا فرزندانِ توحید کے دل میں باہمی تعصب و نفرت یا بیگانگی اور علیحدگی کے خیالات پیدا ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ ہم ان ہزاروں بار کے دہرائے ہوئے الفاظ کو بارِ دگر دہرا دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ تمام اختلافی مسائل حل ہو گئے۔ یہ اندازِ نگاہ غلط ہے جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے۔ جب ہم نے یہاں اسلامی ذہنیت ہی پیدا نہیں کی تو ان معاملات کے سلجھانے کے لئے اسلام کے نام کی اپیل کس طرح نتیجہ خیز ہو سکتی ہے؟ ہمیں ایسا کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ یہ فریبِ نفس ہے۔

جس سیاسی بگولے میں اس وقت ہمارا ملک پھنس چکا ہے، ہمارے نزدیک یہ اس سے اسی صورت میں صحت و سلامتی سے نکل سکتا ہے کہ اس کا نظام حسب ذیل خطوط پر متشکل ہو۔

(۱) اس مملکت کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ غیر مسلم اور مسلمان مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ غیر مسلم، اس ملک میں ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے جسے مملکت کے قانون سازی وغیرہ کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ البتہ ان کے انسانی حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ لہذا، پاکستانی غیر مسلموں کو ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کا حصہ قرار نہ دیا جائے۔

(۲) پوری مملکت کی حکومت وحدانی ہو جس کے نظم و نسق کے لئے اسے مختلف کمشنریوں میں تقسیم کر دیا جائے اور صوبوں کی امتیازی حدود ختم کر دی جائیں۔ ان کمشنریوں کو ایسے اختیارات حاصل ہوں کہ عوام کے معاملات وہیں کے وہیں طے ہو جایا کریں۔ سابقہ ون یونٹ کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں کو ذرا ذرا سی بات کے لئے لاہور آنا اور دفتروں کے چکر کاٹنا پڑتے تھے۔

(۳) مملکت کا نظام صدارتی ہو اور پارلیمان اور صدر کے حدود و اختیارات متعین کر دیئے جائیں۔

اس سے ملک کم از کم اس آتش فشاں پہاڑ میں گرنے سے بچ جائے گا جس کے دہانے پر اسے اس وقت لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ یہ سارا کھیل چند دنوں میں ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد (خاکم بدہن)

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

لیکن اگر، مندرجہ بالا سیاسی تبدیلیوں سے ملک محفوظ بھی کر لیا گیا تو بھی یہ اسلامی مملکت نہیں بن سکیگا۔ اس کے اسلامی مملکت بننے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے نظامِ تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کی جائے جس سے یہ نوجوان صرف مسلمان بن کر ابھریں ——— صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے انداز کے مسلمان۔

لیکن اس قسم کا جرأت مندانہ اقدام کوئی ایسا مردِ قلندر ہی کر سکتا ہے جو اپنی امانت و دیانت اور خلوص و بلندئ کردار کی بنا پر قوم کے دل میں ایسا اعتماد پیدا کر چکا ہو کہ اس کے فیصلوں کے سامنے قوم بطیبِ خاطر سر جھکا دے۔

اگر ہمارے نظامِ تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی نہ ہوئی تو، مملکت کا اسلامی بننا تو درکنار، آپ دیکھیں گے کہ یہاں "کتاب و سنت" کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین بھی مرتب نہیں ہو سکیگا جس کا اطلاق یہاں کے تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے ——— اگر اس کا تجربہ کرنا ہو تو آپ مختلف فرقوں کے علماء سے

کہیئے کہ وہ باہمی مل بیٹھ کر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر کے دکھائیں! آپ دیکھیں گے کہ ایسا ضابطہ مرتب کرنا تو ایک طرف، وہ چار دن ایک کمرے میں اکٹھے بیٹھ بھی نہیں سکیں گے۔ آپ جماعت اسلامی سے کہئے کہ وہ ایسا کر کے دکھائے۔ ان کے دعوائے اسلامی نظام کی قلعی کھل جائیگی۔

(۰)

یہ ہے وہ آئینہ جسے ہم قوم کے سامنے رکھنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر اسے پتھر پڑے مارنے کے بجائے اپنے خط و خال کی درستگی کی طرف توجہ دے، اور اس طرح اس مظلوم ملک کی حالت پر رحم کھائے!

(۰)

بقیہ "یومِ آزادی کی رُوح پرور تقریب" صلہ سے مسلسل

حضور نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اسی طرح سے یہ دوبارہ قائم ہو سکتا ہے۔

قریب دو گھنٹے کے اس نہایت مدلل اور حقیقت کشا قرآنی خطاب کے بعد سامعین سے سوالات کیلئے کہا گیا اور پرویز صاحب نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں ان کے مسکت جوابات دیئے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب یہ روح پرور تقریب بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

(۰)

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونیشن

اپنے روایتی حسن و سادگی، اور صحت مندانہ آب و تاب کے ساتھ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں منعقد ہو رہی ہے۔ تواریخ اور پروگرام کے متعلق آئندہ ماہ کے طلوع اسلام میں اعلان کیا جائیگا۔ ہنگامہ خیزیوں سے شرابور فضا میں اس قسم کے خالص فکری اور سنجیدہ اجتماع کی جو اہمیت ہو سکتی ہے اسکا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کنونیشن بگولوں کے نرغے میں گھری ہوئی قوم کی صحیح راستہ کیطرف راہنمائی کی کوشش کریگی۔

ناظم

ہم کس کا ساتھ دیں؟

انتخابات کی گہما گہمی کے سلسلہ میں، ہمارے ہاں اس قسم کے سوالات کا تانتا بندھ رہا ہے کہ ہم کس کا ساتھ دیں؟ جو حضرات انتخابات میں بطور امیدوار کھڑا ہونا چاہتے ہیں، وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں؟ ووٹ دینے والے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کس پارٹی کے امیدوار کے حق میں ووٹ دیں۔

یہ واضح ہے کہ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے ــــ وہ امت کے پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانے کو از روئے قرآن جائز ہی نہیں سمجھتا ــــ نہ ہی ہم عملی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں۔ لہٰذا، اس قسم کے سوالات کے سلسلہ میں ہم جو کچھ عرض کریں گے وہ ہماری قرآنی بصیرت کی روشنی میں مشورۃً ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جو احباب دل میں پاکستان کا درد اور ملت کی بہی خواہی کا احساس رکھتے ہیں، وہ اگر آزاد امیدوار کی حیثیت سے اسمبلی میں جائیں تو کچھ مفید کام کر سکیں گے۔ پارٹی ٹکٹ پر منتخب ہونے سے، یہ رکن اپنی آزادی پارٹی کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ اسے پارٹی کے ہر فیصلہ کا پابند ہونا پڑتا ہے خواہ وہ فیصلہ اس کے خیال میں غلط ہی کیوں نہ ہو۔ آزاد امیدوار کم از کم اپنی آزادی برقرار رکھتا ہے اور پیش آمدہ معاملات میں، تائید اس کی کرتا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے، اور جسے غلط سمجھتا ہے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر ایوانات میں اس قسم کے آزاد امیدوار وزنی حیثیت حاصل کرلیں تو وہ فیصلوں کا رُخ بدلنے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

جہاں تک رائے دہندگان کا تعلق ہے، ان سے بھی ہمارا مشورہ یہی ہے کہ وہ پارٹیوں سے قطع نظر، ایسے آزاد امیدوار کے حق میں ووٹ دیں جس کی دیانت وامانت اور فراست وبصیرت ان کے نزدیک قابلِ اعتماد ہو۔ ووٹ دینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس شخص کو جس کے حق میں آپ ووٹ دیتے ہیں، اپنا نمائندہ مقرر کرتے ہیں۔ نمائندہ مقرر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایوان میں جو معاملہ زیر نظر ہو، اس میں وہ شخص جو کچھ کرے یا کہے، وہ اسکا ایسا

بلکہ خود آپ کا قول اور فعل سمجھا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر آپ کے نمائندہ کا قول و فعل خود آپ کا قول و فعل قرار پائے گا۔ بس اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ آپ کے ووٹ دینے کا عملی مفہوم کیا ہے۔

۲۔ بعض حضرات کہتے ہیں (اور یہ گروہ زیادہ تر گرم جوش نوجوانوں پر مشتمل ہے) کہ جس معاشی نظام کی طرف طلوعِ اسلام برسوں سے دعوت دیتا چلا آتا ہے، پیپلز پارٹی اسی نظام کے قیام کے لئے مصروفِ جدوجہد ہے۔ اس لئے طلوعِ اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس پارٹی کا ساتھ دے۔ جیسا کہ (متعدد بار) کہا جا چکا ہے طلوعِ اسلام پارٹیوں کی کشمکش میں نہیں الجھتا لیکن چونکہ ان استفسارات میں ایک پارٹی کا خاص طور پر نام لے کر سوال کیا جاتا ہے اسلئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس باب میں اپنی پوزیشن واضح کر دی جائے۔

جس وقت سے پیپلز پارٹی وجود میں آئی ہے، آپ اس وقت سے آج تک کے طلوعِ اسلام کے پرچے سامنے رکھیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم ان حضرات سے مسلسل کہتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ سوشلزم سے ان کی مراد کیا ہے، اور جب وہ "اسلامی سوشلزم" کہتے ہیں تو اس میں اور "سوشلزم" میں فرق کیا ہے؟ ــــ یا اسلامی سوشلزم اور غیر اسلامی سوشلزم میں کیا فرق ہے؟ ان حضرات کی طرف سے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ انہوں نے کیا ہے تو صرف اتنا کہ "اسلامی سوشلزم" کے ساتھ "مساواتِ محمدی" یا "خلافتِ راشدہ کا معاشی نظام" جیسی مزید اصطلاحات کا اضافہ کر دیا ہے ــــ یاد رکھئے۔ ہمارے ہاں کے موجودہ خلفشار کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں لیکن ان کی وضاحت کبھی نہیں کی جاتی۔ عصرِ حاضر کی میکیاولی سیاست کا گُر یہ ہے کہ نہایت خوشنما، دلفریب لیکن مبہم اصطلاحات پیش کر کے عوام کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کرتے جاؤ لیکن ان اصطلاحات کی وضاحت کر کے، اپنے آپ کو (COMMIT) مت کرو۔ اس سے پہلے مذہبی جماعتوں کی طرف سے اقامتِ دین، حکومتِ الٰہیہ، اسلامی نظام، احکامِ شریعت جیسی مبہم اصطلاحات سے عوام کو اپنے پیچھے لگایا جاتا رہا ــــ اور لگایا جا رہا ہے ــــ اس کے بعد اس فہرست میں "جمہوریت" جیسی اصطلاح کا اضافہ ہوا۔ پھر مسٹر بھٹو نے اپنے اقنوم ثلاثہ پیش کئے کہ ــــ اسلام ہمارا مذہب، جمہوریت ہماری سیاست، اور سوشلزم ہماری معیشت ــــ پھر سوشلزم کے ساتھ اسلامی کا اضافہ کیا گیا۔ پھر اسلامی سوشلزم عرف مساواتِ محمدی، عرف اسلام کا معاشی نظام وغیرہ ــــ نعرے فضا میں بلند ہوئے۔ نہ مذہب کے اجارہ داروں نے قوم کو واضح الفاظ میں بتایا کہ اقامتِ دین سے ان کی مراد کیا ہے اور نہ ہی ان کے مخالفین کی طرف سے قوم کو یہ بتایا گیا کہ سوشلزم، اسلامی سوشلزم یا مساواتِ محمدیہ کا متعین مفہوم کیا ہے۔

طلوعِ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کی کہ روس اور چین کی طرف سے پیش کردہ سوشلزم، مرکب ہے دو لاینفک اجزاء سے ــــ یعنی ایک وہ فلسفۂ زندگی جو ان کے نزدیک، ان کے نظامِ معیشت کی بنیاد ہے اور

دوسرا وہ معاشی نظام جسے انہوں نے اپنے ہاں رائج کیا ہے یا رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فلسفۂ زندگی خدا، رسول، و آخرت کے انکار کا دوسرا نام ہے اور ظاہر ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کا ماننے والا کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ البتہ جو معاشی نظام انہوں نے پیش کیا ہے وہ قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ ہم نے "اسلامی سوشلزم" کے مدعیان کی خدمت میں گزارش کیا کہ وہ کم از کم اتنا ہی اعلان کر دیں کہ ہم سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کو ملعون مردود قرار دیتے ہیں اور جس معاشی نظام کے لئے ہم جدوجہد کرتے ہیں اس سے مراد قرآن کا وہ معاشی نظام ہے جس کی بنیاد قرآن کے متعین کردہ فلسفۂ زندگی پر ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے آج تک ا بھی نہیں کیا۔ انہوں نے سوشلزم کی "ازم" یعنی اس کے فلسفۂ زندگی کو کہیں ملعون و مردود نہیں ٹھہرایا۔ اسکے باوجود ہم نے ان حضرات کو کافر و ملحد قرار نہیں دیا، بلکہ یہ کہہ کر کہ انہوں نے سوشلزم کی اصطلاح اختیار کر کے ایک اجتہادی غلطی کی اور اب محض اپنی بات کی پچ پر اڑے ہوئے ہیں' ان کے متعلق بہر نوع حسن ظن سے کام لیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس حسن ظن کی بنا پر ان کے مؤقف کی تائید کرنے لگ جائیں۔ جب تک یہ حضرات متعین طور پر نہیں بتائیں گے کہ اسلامی سوشلزم سے ان کی مراد کیا ہے اور وہ "سوشلزم" سے کس طرح مختلف ہے۔ "اسلامی سوشلزم" کسے کہتے ہیں اور غیر اسلامی سوشلزم کسے ۔۔۔ اس وقت تک ہم ان کے مؤقف کی صحت و سقم کے متعلق نہ حتمی رائے قائم کر سکتے ہیں نہ ان کی تائید میں کچھ کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ طلوع اسلام کی طرف سے کی تائید و تردید سے مراد کیا ہے اور اسکے نتائج کس قدر دور رس ہوتے ہیں؟ (اللہ کا شکر ہے کہ آج) ملک میں بکثرت ایسے حضرات موجود ہیں جو مسائل زندگی میں طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ فکر کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فکر قرآنی تعلیم کی روشنی میں پیش کی گئی ہے' اور اس کے بعد وہ اسکے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے آپ سوچئے کہ کسی مسلک کی تائید یا مخالفت سے طلوع اسلام کس قدر عظیم ذمہ داری اپنے سر پر لیتا ہے۔ ہمارا سر بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے کہ بڑے سے بڑے لالچ اور ہیبت سے ہیبت خوف نے بھی آج تک کبھی اس ذ کے احساس سے ہمیں غافل نہیں ہونے دیا۔ کسی بات کے سمجھنے میں غلطی کر جانا اور بات ہے لیکن خدا کا احسان کہ جس بات کو ہم نے قرآن کریم کی روشنی میں حق سمجھا ہے' اس کا ہم نے بلا خوف لائمۃ لائم' پوری زور و شور سے اعلان کیا ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کی بھی اسی شدت سے مخالفت کی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک!

۳۔ کہا یہ جاتا ہے کہ "اسلامی سوشلزم" سے مراد وہی ہے جسے علامہ اقبالؒ نے (بالشوزم + خدا = اسلام) مساوات (EQUATION) سے تعبیر کیا تھا۔ ایسے کہنے والے حضرات کو غالباً اس کا علم نہیں کہ علامہ اقبالؒ اپنے اس فارمولا (یا مساوات) کو علیٰ حالہٖ غیر مبہم نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے بڑی شرح و بسط سے اس وضاحت بھی کی تھی کہ (+ خدا) سے ان کا مطلب کیا ہے۔ آپ جاوید نامہ میں وہ باب دیکھئے جس میں انہ

ملّتِ روسیہ سے خطاب کیا ہے۔ آپ کو نظر آجائیگا کہ انہوں نے سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کی کس شدت سے مخالفت کی ہے اور اسکے بعد کس حتم و یقین کے ساتھ کہا ہے کہ جب تک اس اقتصادی نظام کو خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی بنیادوں پر استوار نہیں کیا جاتا' نہ صرف یہ کہ یہ نظام' نوعِ انسانیہ کے لئے منفعت بخش نہیں ہوسکتا بلکہ یہ ممکن العمل بھی نہیں ہوگا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کے واضعین نے اس کی بھی کہیں اسی طرح وضاحت کی ہے؟ وضاحت کے یہ معنی نہیں کہ ان کے فلاں لیڈر نے اپنی فلاں تقریر میں یہ کہا ہے اور فلاں نے یہ۔ پارٹیوں کے مؤقف کی وضاحت ان کے منشور میں کی جاتی ہے۔ اور (جہاں تک ہمارے علم میں ہے) پیپلز پارٹی نے ابھی تک اپنا منشور ہی شائع نہیں کیا، چہ جائیکہ اس میں اس اصطلاح کی وضاحت کی گئی ہو۔ تقاریر اور بیانات میں یہ کہتے جانا کہ ہم زمینداروں سے زمینیں چھین لینگے۔ کارخانہ داروں سے کارخانے لے لئے جائینگے، دولت کو جمع نہیں ہونے دیا جائیگا، وغیرہ وغیرہ۔ نعرہ بازی کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن بات تو یہ بتانے کی ہے کہ ان زمینوں، کارخانوں، جائیدادوں کو چھین کر دیا کن کے ہاتھوں میں جائیگا؟ ان کے انتظام کی شکل کیا ہوگی۔ وہ کون سا پروگرام ہوگا جس کی رُو سے، مزدور، کاشتکار، عوام اس دولت کے مالک بنا دیئے جائینگے۔ اس کی ضمانت کیا ہے کہ ملک میں واقعی کوئی بھوکا نہیں رہے گا۔ کوئی ننگا نہیں رہے گا۔ ہر ایک کو مکان مل جائیگا۔ ہر ایک کے علاج معالجہ، تعلیم کا انتظام ہوگا۔ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ کس طرح ہوگی؟ محنت کا معاوضہ کس معیار کے مطابق متعین کیا جائیگا۔ کون یہ معیار مقرر کریگا۔ وہ جذبہ محرکہ کیا ہوگا جس کی رُو سے زیادہ کمانے والے اپنی کمائی کا زاید از ضروریات حصہ دوسروں کیلئے دیدیں وغیرہ وغیرہ۔ جب تک ان اور ان جیسے دیگر متعلقہ سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں دیا جاتا' خود سوشلزم کی اصطلاح مبہم رہ جاتی ہے چہ جائیکہ اسلامی سوشلزم کی حقیقت سامنے آسکے! لاکے ساتھ الاّ نہایت ضروری ہے۔ یہ حضرات اس قسم کے وعدے کرتے ہیں اور ہمیں یہ خطرہ ستا رہا ہے کہ اگر یہ برسرِ اقتدار آگئے اور ان وعدوں کو پورا نہ کرسکے (جو ظاہر ہے کہ راتوں رات کبھی پورے نہیں ہوسکینگے) تو عوام ہر طرف سے مایوس ہو جائینگے' اور پھر ملک میں وہ خلفشار مچیگا جو کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ ابلیس مایوسی کا نمائندہ ہے اور شیطان سرکشی کا پیکر۔ ناکامی کا پہلا ردّعمل مایوسی ہوتا ہے' اور اسکے بعد سرکشی ــــ مایوس کی سرکشی جس قسم کی تخریبی ہوتی ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا، بجائے اسکے کہ عوام کو نگا، فریب نعروں میں الجھا کر پاپولیریٹی حاصل کیجائے' تقاضائے تدبر یہ ہے کہ ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور کر کے ان کا اطمینان بخش حل تلاش کیا جائے اور پھر عوام کو سنہرے خوابوں کے بجائے' ٹھوس حقائق کا سامنا کرنا سکھایا جائے۔ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ صحیح نظامِ معیشت اسی طرح لایا جاسکتا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ ہم سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے فالج سے چھٹکارا حاصل کرتے کرتے' جذبات پرستی کے سرسام

ہی مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس کے لئے بڑے حسنِ تدبر کی ضرورت ہے۔ یہ مقصد مبہم اصطلاحات سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

بہرحال، طلوع اسلام، مبہم اصطلاحات کی تائید سے ہزارہا بندگانِ خدا کی آراء کو متاثر کرنے کی ذمہ داری کے احساس سے لرزاں ہے۔ اس نے اس کا جواب اپنے خدا کے حضور دینا ہے۔ محض پاپولر بننا اس کے پیش نظر نہیں۔

۴۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت کا سامنے رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ طلوع اسلام کی دعوت معاشی نظام تک محدود نہیں۔ اس کی دعوت یہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری کی پوری زندگی قرآنی حدود و قیود کے تابع بسر ہو۔ اسی کا نام اسلامی نظام ہے جس کا ایک گوشہ معاشی نظام ہے۔ طلوع اسلام بارہا بار اس حقیقت کو واضح کر چکا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، دین کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ دین، نظامِ حیات کا، یوں سمجھئے کہ، ایک فارمولا ہے اور فارمولا اپنے نتائج اسی صورت میں مرتب کر سکتا ہے جب اسے بتمامہ عمل میں لایا جائے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) "جو لوگ کتابِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے"؛ تو اس میں زندگی کے کسی ایک شعبہ کو قرآن کے تابع لانے کو ایمان یا اسلام نہیں قرار دیا گیا۔ پوری کی پوری زندگی پر اس کی حکمرانی کو ایمان کہا گیا ہے۔

اب قرآن کے اس اصول کی روشنی میں مسئلہ زیرِ نظر کا جائزہ لیجئے۔ ظاہر ہے کہ انتخابات کے بعد جو پارٹی بھی صاحبِ اقتدار ہوگی وہ اپنی حکومت قائم کرے گی ـــ حتیٰ کہ اگر پیپلز پارٹی بھی برسرِ اقتدار آگئی تو یہ نہیں ہوگا کہ وہ اپنے اقتدار کو صرف معاشی پروگرام تک محدود رکھے۔ اسے حکومت کے ہر شعبہ کا نظم و نسق کرنا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس پارٹی نے کہیں اس کا اعلان کیا ہے کہ وہ برسرِ اقتدار آگئی تو قرآن کی حکمرانی قائم کرے گی؟ پیپلز پارٹی تو ایک طرف، ایسا اعلان ملک کی کسی پارٹی نے بھی نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی طلوع اسلام کی تائید کلی حاصل نہیں۔ طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ جو بات قرآن کے مطابق ہو، وہ کسی فرد، کسی فرقہ، کسی پارٹی، کسی گروہ حتیٰ کہ کسی حکومت کی طرف سے اٹھے، طلوع اسلام اس بات کی تائید کرے گا۔ اور جو بات قرآن کے خلاف ہو، وہ کسی کی طرف سے بھی باہر کیوں نہ آئے، وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ (ضمناً بعض گوشوں کی طرف سے جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ دیکھئے طلوع اسلام نے فلاں حکومت کی حمایت کی تھی۔ تو ایسا کہنے والے یا تو حقیقت سے باخبر نہیں ہوتے یا دانستہ عوام کو دھوکا دیتے اور اشتعال دلاتے ہیں۔ طلوع اسلام نے آج تک نہ کسی حکومت کی بہ حیثیتِ مجموعی حمایت کی ہے، نہ مخالفت۔ اس کا مسلک یہ رہا ہے کہ اگر کسی بدترین حکومت کی طرف سے بھی ایسا اقدام ہوا ہے جو اس کے نزدیک قرآن کے مطابق تھا، اس نے اس کی تائید و تحسین میں کبھی بخل نہیں برتا۔ اور اگر کسی اچھی سے اچھی حکومت کی طرف سے بھی ایسی بات سرزد ہوئی ہے جو اس کے نزدیک قرآن کے خلاف تھی تو اس نے اس کی مخالفت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھائی۔)

طلوع اسلام کا یہی مسلک پارٹیوں اور گروہوں کے سلسلہ میں بھی ہے۔ قرآن کے مطابق آواز کسی طرف سے

بھی اُٹھے وہ اس بات کی تائید کریگا اور جو بات قرآن کے خلاف ہوگی وہ اس کی مخالفت کریگا۔ البتہ اسکی کلی تائید صرف اس کے ساتھ ہوگی جو اس کا اعلان کرے (جیسا کہ قائدِ اعظمؒ نے اعلان کیا تھا) کہ

> اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو ہم ملک میں ایسا نظام قائم کرینگے جس میں اطاعت صرف خدا کی ہوگی جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ خدا کی اس کتاب عظیم کے قوانین و اصول ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرینگے۔ اس نظام میں حکمرانی صرف قرآنی اصول و احکام کی ہوگی۔ مملکت ان اصول و احکام کے نافذ کرنے کی ایجنسی ہوگی اور بس۔

جو سعادت بخت' اسکا اعلان کرے' وہی حق بر ہوگا اور اسی کو طلوعِ اسلام کی کلی حمایت حاصل ہوگی۔

۴۔ اور آخری بات یہ کہ یہ اقتدار بھی پُرامن آئینی طریق سے حاصل کیا جائیگا۔ فساد انگیزیوں اور ہنگامہ خیزیوں' تشدد سے نہیں۔ کسی قوم کو قانون شکنی پر ابھارنے یا فساد انگیزیوں پر اسکی پیٹھ ٹھونکنے کے جو نتائج ہوتے ہیں' اس' اندازہ اس مختصر سی حکایت سے لگ سکتا ہے جسے ہم بچپن میں سنا کرتے تھے کہ ایک لاڈلے بچے نے' بازار میں کسی کو گا دی تو اس نے اُسے شاباش بھی دی اور دو پیسے کی مٹھائی بھی لے دی۔ کسی دیکھنے والے نے اس سے کہا کہ تم نے یہ کیا کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اسکا نتیجہ تھوڑے ہی دنوں میں' خود اس لاڈلے کے اور ان میاں صاحب کے سامنے آجا' جنہوں نے اپنے چہیتے کو گالیاں دینا سکھایا ہے۔ دوسرے یا تیسرے دن اس بچے نے کسی اور کو گالی دیدی تو اس نے لیرٹ دیا کہ اسے تین دفعہ غش آیا اور بڑے میاں کو ہفتہ بھر اس کا علاج کرانا پڑا ـــ جب ۶۹-۱۹۶۸ء میں' ہمارے لیڈرانِ کرام' قوم کو ہنگامہ خیزیوں پر اُکسا رہے تھے تو ہم نے انکی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ عوام (بالخصوص نوجوا' کو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خوگر نہ بنائیے اس سے ملک کی بھی تباہی ہوگی اور خود آپ کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا لیکن اس تنبیہ پر کسی نے کان نہ دھرا ـــ نہ صرف یہ کہ اسے اَن سُنی کر دیا بلکہ بعض گوشوں سے یہ بھی کہا گیا کہ طلوعِ اسلام غلط حکومت کی حمایت کرتا ہے حالانکہ طلوعِ اسلام غلط حکومت کی حمایت نہیں کرتا تھا بلکہ غلط حکومت کو بدلنے کے غلط طریق کار کی مخالفت کرتا تھا ـــ بہرحال' اس تنبیہ پر کسی نے کان نہ دھرا۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ایک پارٹی کا جلسہ ہوتا ہے جلوس نکلتا ہے تو دوسری پارٹی کے "مجاہدین صف شکن" ڈنڈے لیکر پہنچ جاتے ہیں اور خون خرابہ شروع ہو جاتا ہے۔ ڈنڈے والوں کی پارٹی بغلیں بجاتی ہے لیکن دوسرے ہی دن جب فریق مقابل کے ڈنڈے باز ان پر حملہ کرتے ہیں تو یہ دہائی دیتے ہے اور حکومت تک سے اپیلیں کرتی ہے کہ خدا کیلئے امن قائم کیجئے۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیے۔ اب انہیں کون بتائے کہ

این بادِ صبا ہمہ آوردۂ تست!

اور ان ہنگامہ آرائیوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں جرائم عام ہو رہے ہیں۔ کسی کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت' محفوظ نہیں رہی۔ امن پسند شہری لرزاں و ترساں زندگی کے دن گزار رہے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ' ملک کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جا رہا ہے ـــ لہٰذا' طلوعِ اسلام ایسے طریق کار کی حمایت کس طرح کر سکتا ہے جسکے نتا' ہوں۔! ـــ یہ ہے طلوعِ اسلام کا مؤقف اور یہ ہے مستفسرین سے اسکا مشورہ۔ فھل من مدّکر!

———— (※) ————

یومِ آزادی کی تقریب پر دو تقریب

۱۴ اگست کی شب بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی نے یومِ آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں ایک جلسہ عام کا اہتمام لیا۔ اُس دن شہر میں مختلف تقاریب تھیں لیکن گارڈن کالج کا وسیع و عریض ہال (جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا) اہالیانِ راولپنڈی کے حسنِ ذوق اور قرآنی فکر سے وابستگی کا آئینہ دار تھا۔ جلسہ کا آغاز اعلان کے مطابق ٹھیک آٹھ بجے تلاوتِ قرآنِ کریم سے ہوا۔ طلوعِ اسلام کے معمول کے مطابق، کرسیِ صدارت پر بزمِ راولپنڈی کے نمائندہ، نجابت خان صاحب رونق افروز تھے اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض بزم کے رکن، ظہور الحق صاحب سرانجام دے رہے تھے۔ عزیز احمد قریشی صاحب نے تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف کرایا جس کے بعد پرویز صاحب نے اپنے خطاب کا آغاز کیا جس کا عنوان تھا ——— "رزق کی محمدی تقسیم" ——— انہوں نے تمہیداً قوموں کی زندگی میں آزادی کی اہمیت اور حصولِ پاکستان کے معرکہ آرا کارنامہ کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا کہ ہندو کے نزدیک آزادی سے مفہوم فقط اتنا تھا کہ ہندوستان سے انگریز چلا جائے اور زمامِ اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں آ جائے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک انگریز کے چلے جانے کا نام آزادی نہیں تھا۔ اس کا ہندوستان کو چھوڑ دینا، ہماری آزادی کے لئے راستہ ہموار کرنے کے مرادف تھا۔ انہوں نے کہا کہ آزادی سے ہمارا مفہوم کیا تھا، اس کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن علامہ اقبالؒ نے اسے دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے جب کہا کہ

کس دریں جا سائل و محکوم نیست ——— عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یعنی جس خطۂ زمین میں قرآنی تصور کے مطابق آزادی کا جھنڈا لہرائے گا اس میں کیفیت یہ ہو گی کہ نہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا محکوم ہو گا۔ نہ کسی کا محتاج۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے۔ اس میں حکمرانی قوانینِ خداوندی کی ہو گی جو قرآنِ کریم کی دفتیں میں محفوظ ہیں۔ اب رہا اس مملکت کی بنیادی خصوصیت کا دوسرا حصہ ——— کہ اس میں کوئی شخص کسی کا محتاج نہیں ہو گا۔ تو یہی پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا جس پر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں تریب

منٹ تک ایسی مدلل، بصیرت افروز اور سحر انگیز تقریر فرمائی کہ پورا ہال جذب کیف کے عالم میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان
طاب کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے مائدۂ ارض پر رزق بکھیر دیا ہے لیکن وہ اِن
ں میں تقاسیم رزق نہیں کہ ہر بھوکے کو خود آ کر کھلائے اور ہر ننگے کو خود آ کر پہنائے۔ رزق کی اس قسم کی تقسیم جس میں
فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے، اس نظام کی رُو سے ہوگی جو سب سے پہلے حضورؐ نبی اکرم کے
ں ہاتھوں سے قائم ہوا۔ "رزق کی محمدی تقسیم" سے مراد اُسی نظام کا معاشی پروگرام ہے جس میں رزق کے
شمے افراد کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ ہی کسی کے پاس دولت کے انبار جمع ہوتے ہیں۔ اس میں ہر فرد
صلاحیت اور استعداد کے مطابق پوری محنت اور دیانت سے کام کرتا ہے' اور نظامِ مملکت اس کی اور
کی اولاد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ پرویز صاحب نے واضح الفاظ میں بتایا کہ اس قسم
ظام الٰہی افراد کے ہاتھوں متشکل ہو سکتا ہے جن کے قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو چکی ہو جسے قرآنِ کریم مومن
صوصیات سے تعبیر کرتا ہے۔ اس تبدیلی کی بنیاد سنہ خدا، وحی، رسالت، قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ
دی کے محکم یقین پر استوار ہوتی ہے۔ یہ چیز نہ مغرب کے مادہ پرستانہ تصورِ زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے' نہ
پر متفرع کمیونزم یا سوشلزم سے' نہ ہی اس کے لئے کسی قسم کا تشدد برتا جاتا ہے نہ جبر و اکراہ۔ یہ پُر امن
ی طریق سے عمل میں لایا جاتا ہے اور صحیح تعلیم و تربیت سے اس کی بنیادیں مضبوط کی جاتی ہیں۔ یہی طریق

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

شاہد عادل

عورتوں کے اسلامی حقوق اور تعدد ازواج

"قرآن کریم نے تعدد ازواج کی مشروط اجازت دی ہے (اور اس کی عائد کردہ شرائط کو ان صفحات میں کئی بار دہرایا جا چکا ہے) لیکن ہماری تاریخ کے مختلف ادوار میں اس مشروط اجازت سے جس طرح ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے وہ ایک دردناک کہانی ہے اور اس نے ہماری معاشرتی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں ہم صدیوں سے اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو خاندان بھی اس کی لپیٹ میں آیا وہ دوزخ کا نمونہ بن گیا یہاں تک کہ ہمارے قدامت پسند علماء تک نے ان مظالم کو محسوس کیا اور اسے ختم کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ قانون کو ایسی حالت میں مرد کو صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے"

(حقوق الزوجین۔ از ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۴۱-۴۲)

تعدد ازواج اور عائلی قوانین

خوش قسمتی سے حکومت پاکستان نے ان مظالم کو ختم کرنے کے لئے اس مسئلہ میں دلچسپی لی اور ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کے ذریعے تعدد ازواج کی مشروط اجازت کو قانون کا پابند کر دیا۔ معلوم نہیں کیا سیاسی وجوہات تھیں کہ جونہی حکومت نے یہ قدم اٹھایا تو وہی لوگ جو تعدد ازدواج پر قانونی پابندیاں لگانے کی تجاویز پیش کر رہے تھے، اس کی مخالفت پر اُتر آئے اور اس وقت سے لے کر اب تک برابر مخالفت کئے جا رہے ہیں۔ اب جبکہ الیکشن قریب آ رہے ہیں تو یہ مخالفت اور بھی تیز ہو گئی ہے ۔ پسماندہ علاقوں کے جہلاء اور عیش پسند امراء سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے یہ "چارنٹ" بھی اچھی خاصی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مختلف لیڈروں کی طرف سے ان طبقات کو وعدہ دیا جا رہا ہے کہ اقتدار سنبھالنے کے بعد ہم پہلا کارنامہ عائلی قوانین کی منسوخی کا سرانجام دینگے اور اس کے بعد ہر شخص کو چار چار عورتوں سے شادی کرنے کی کھلی چھٹی ہوگی۔ اور

جب ان میں سے کسی سے جی بھر جائے اور اس کی جگہ ایک نئی نویلی لانے کا خیال انگڑائیاں لینے لگے تو اس کے لئے صرف منہ سے تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہہ دینا کافی ہوگا ـــــ یہ مراد ہے عائلی قوانین کی منسوخی سے۔ اس کے ساتھ ہی بڑی چالاکی سے عورتوں کو یہ سبز باغ دکھلائے جا رہے ہیں کہ اسلام انہیں کہیں زیادہ حقوق عطا کرتا ہے۔ اسلئے عائلی قوانین کی منسوخی سے انہیں کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اسلام عورتوں کو کون سے حقوق عطا کرتا ہے، اس کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی جاتی ـــــ دھوکا، ہر ایک کو دھوکا ـــــ !

تعدد ازواج سے متاثر ہونے والی خواتین کی حالت

لیڈروں کو اس قسم کے سیاسی وعدے کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن جہاں تک حقائق کا تعلق ہے اور تعدد ازواج کے نتیجے میں کسی عورت یا اس کے والدین کو جن دردناک مصائب کا شکار ہونا پڑتا ہے، اسے صرف انہی کے دل جانتے ہیں۔ جن پر یہ حالت نہ گزرے وہ ان جانکاہ مصائب کا اندازہ تک نہیں کر سکتے۔ اس معاملے کی سنگینی کا اندازہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ردّ عمل سے کیا جا سکتا ہے، جب ایسا ہی معاملہ آپ کی بیٹی سے ہونے لگا۔ جب آپؐ سے حضرت فاطمہؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کے نکاح ثانی کے لئے اجازت طلب کی گئی تو آپؐ نے منبرِ نبوی پر رونق افروز ہو کر یہ اعلان فرمایا:

عن المسور بن مخرمة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول وهو على المنبر ان بنی هشام بن المغيرة استاذنوا فی ان ينكحوا ابنتهم على ابن ابی طالب فلا اذن ثم لا اذن ثم لا اذن الا ان يريد ابن ابی طالب ان يطلق ابنتی وينكح ابنتهم فانما هی بضعة منی يريبنی ما ارابها و يؤذينی ما اذاها۔

حضرت مسوّر بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بنی ہشام بن المغیرہ نے مجھ سے اس بارے میں اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح علیؓ بن ابی طالب سے کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں ہرگز ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں اگر علیؓ چاہتے ہیں تو میری بیٹی کو طلاق دے دیں اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ میری بیٹی میرا جگر گوشہ ہے۔ جو چیز اسے تکلیف پہنچاتی ہے وہ مجھے بھی پہنچاتی ہے اور جو چیز اس کے لئے باعثِ ایذا ہے وہ میری ایذا کا بھی سبب ہے۔

(بحوالہ صحیح بخاری، باب ذبّ الرجل عن ابنته فی الغیرة والانصاف)

یہ حدیث بخاری شریف میں ایک سے زیادہ مرتبہ آئی ہے۔ اور جب عائلی قوانین کی مخالفت کرنیوالوں کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے مختلف حیثیتوں سے اسے گول مول کرنے کی کوشش کی۔ خیال رہے کہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ بخاری کے مشہور شارح علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب فتح الباری شرح صحیح بخاری کی جلد ۹ صفحہ ۱۸۷ پر اس حدیث پر مفصل بحث فرمائی ہے۔

تعدد ازواج کی شرعی حیثیت

ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل اسلامی تعلیمات کے مطابق تھا اور یہی ہمارے ائمہ فقہ کا مسلک ہونا چاہیئے۔ لیکن عملاً ہمارے مولوی حضرات کی جانب سے عامۃ المسلمین کو عام طور پر یہی باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام میں چار عورتوں تک کی کھلی اجازت ہے۔ آیئے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ ان کے اس دعوے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

اس سلسلے میں یہ حضرات قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا (تَعْدِلُوْا) ۔ (النساء - ۳)

اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے تو عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ دو دو، تین تین، چار چار، لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کرسکو گے تو پھر ایک بیوی رکھو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں بے انصافی سے بچنے کے لئے یہ زیادہ قرین قواب ہے۔

ہمارے مفسرین نے اس آیت پر لمبی چوڑی بحثیں کیں۔ اور ان سب میں ایک مشترکہ بات ہے جس کی طرف امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۰۰ میں اشارہ کیا ہے کہ ائمہ مجتہدین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ تعدد ازواج فرض، واجب یا سنت نہیں ہے بلکہ یہ صرف مباح ہے یعنی کوئی حاجتمند اگر اس کی ضرورت محسوس کرے تو اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی تمام شرائط پوری کرتا ہو۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم سے اس آیت کی جو تفسیریں منقول ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اجازت یتیموں کے مسئلہ سے مشروط ہے۔ علامہ الوسی صاحب روح المعانی نے بخاری، مسلم، نسائی اور بیہقی کی بہت سی احادیث نقل کی ہیں جن میں حضرت عائشہؓ نے اس آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر رضؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کی تفسیر کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اے بھانجے، وہ یتیم لڑکی ہے جو ولی کی نگرانی میں ہوتی تھی اور وہ اس کے مال میں شریک ہوتا تھا۔" (روح المعانی، جلد ۴ صفحہ ۱۶۸)

بعض ائمہ نے بھی اسی تفسیر کی تائید کی ہے۔ علامہ الوسی اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں۔

وقد قیل فی تفسیر الآیۃ الکریمۃ ان المراد من النساء الیتمٰی (ایضاً)

اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ النساء سے مراد یتیم عورتیں ہیں۔ (ایضاً۔ ص۱۷۳)

واضح رہے کہ یتیم عورتوں سے مراد ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو شادی کے قابل تو ہوں لیکن ان کی شادی نہ ہوسکی ہو۔ مثلاً ناکتخدا بالغ لڑکیاں۔ بیوائیں وغیرہ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بعض ائمہ نے اسی آیت سے تعدد کی بجائے تحدید یعنی ایک بیوی تک محدود رہنا ثابت کیا ہے۔ اسے بھی علامہ الوسی ہی کی زبانی سنیئے۔

وجوز بعضھم کون الاشارۃ الی ثلاثۃ امور۔ التقلیل من الازواج واختیار الواحدۃ والتسری۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۷۵)

بعض ائمہ نے اس آیت کی روشنی میں تین امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی تحدید ازواج، اور صرف ایک بیوی تک محدود رہنا۔ یا لونڈی سے نکاح کرنا۔

امام شافعی کی تفسیر

یعنی وہ تفسیر جو اکثر ائمہ ومفسرین سے منقول ہے۔ شافعی مذہب کے بانی امام شافعی رحؒ نے اس آیت کی تفسیر اور ہی رنگ میں کی ہے۔ ان کے نزدیک شادی کے سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ تعدد ازواج تو کجا ایک عورت سے شادی کے مقابلہ میں بھی نفلی عبادت میں مشغول رہنے کو زیادہ افضل قرار دیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ۳ ص۱۳۰)

پھر اس آیت کے آخری ٹکڑے الا تعولوا کا مفہوم یہ بیان فرماتے ہیں" تاکہ تمہارے اہل وعیال زیادہ نہ ہو جائیں۔" (روح المعانی۔ جلد ۴۔ ص۱۷۶)

علامہ الوسی امام شافعی رحؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ثم المراد بالعیال علےٰ ھذا التفسیر یحتمل ان یکون الازواج کما اشرنا الیہ وعدم کثرۃ الازواج فی اختیار الواحدۃ۔ (ایضاً)

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس آیت میں عیال سے مراد ازواج ہیں۔ اور زیادہ کی بجائے صرف ایک بیوی تک محدود رہنا۔

تعولو

امام شافعیؒ کی تفسیر پر اعتراضات

امام شافعیؒ کی اس تفسیر پر اعتراض بھی کئے گئے ہیں اور عائلی قوانین کی مخالفت کرنے والوں کی دیانتداری ملاحظہ ہو کہ وہ ان اعتراضات کو تو بڑی آب و تاب سے نقل کرتے ہیں۔ لیکن مفسرین نے ان اعتراضات کے جو مفصل جواب دیئے ہیں، ان پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ بڑے بڑے مفسرین نے جن میں امام فخرالدین رازی اور علامہ الوسی صاحب روح المعانی شامل ہیں، ان اعتراضات کا جواب دے کر امام شافعیؒ کی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔ ان مفسرین نے ان اعتراضات کے جو جواب دیئے ہیں ان کا خلاصہ یوں ہے۔

(۱) امام الکسائی نے فصیح عربوں سے "عال" کے یہی معنی نقل کئے ہیں کہ جب میاں زیادہ ہو جائیں۔ الاصمعی اور الازہری جیسے ائمہ ادب و لغت نے بھی اس لفظ کے یہی معنی کئے ہیں جو اس کے مستند ہونے کے لئے کافی ہے۔　(تفسیر روح المعانی۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۲۶)

(۲) بعض سلف صالحین سے بھی اس لفظ کی ایسی ہی تفسیر منقول ہے۔ ابن ابی حاتم نے جو ایک مشہور عالم تابعی ہیں، یہی معنی روایت کئے ہیں۔ اور حضرت طاؤس کی قرأت ان لا تعیلوا اس کی تائید مزید کرتی ہے۔　(ایضاً)

(۳) امام القراء علامہ الدوری نے اسے "قبیلہ حمیر" کی لغت قرار دیا ہے اور اس کی تائید میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

وان الموت تاخذ کل حیّ　　بلاشک وان امشی وعالا

ای وان کثرت ماشیتہ۔　(ایضاً)

بے شک موت ہر زندہ کو جا لیتی ہے۔ چاہے اس کے مویشی اور عیال کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں امام شافعیؒ کی تفسیر کو ترجیح دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اگر "تعولوا" کے معنی ظلم کے لئے جائیں تو پھر اس آیت میں تکرار لازم آتا ہے کیونکہ ظلم کا مفہوم تو انصاف نہ کرنے کے خدشے سے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ امام شافعیؒ کی تفسیر اختیار کرنے سے ایسا کوئی تکرار لازم نہیں آتا۔ اس لئے یہی اس آیت کی عمدہ تفسیر ہے۔

چار نہیں بلکہ نو بیویاں

بعض دوسرے ائمہ مجتہدین جن میں ظاہری مذہب، امام ابن الصباغ، امام عمرانی اور بعض شیعہ ائمہ شامل ہیں، اس آیت کی اور ہی

الوکی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ یہ بحث ذرا بہت لمبی ہے اسلئے صرف اس کے ترجمے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

"اس آیت میں مثنیٰ وثلاثہ ورُبٰع میں جو "واوٗ" ہے وہ جمع کے لئے ہے (یہ ظاہر یہ کا استدلال ہے، ان کے نزدیک نو بیویوں کی اجازت ہے)۔ لغت میں لفظ مثنیٰ کے معنی " دو دو" کے ہیں، نہ کہ صرف " دو "۔ اور اگر کہا جائے کہ دو دو آدمی آئے تو یہ الفاظ ایک ہزار کی تعداد میں آنے والے اشخاص کے لئے بھی بولے جاسکتے ہیں کہ اتنی تعداد دو دو کر کے آئی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ " جاء القوم مثنیٰ۔ (لوگ دو دو کرکے آئے۔ اسی طرح ثلٰثہ اور رباع کے معنی ہوں گے۔ یہ تو عربی لغت کا مسئلہ ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

پس آیت مذکورہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ "دو دو" یا "تین تین" یا "چار چار" عورتوں سے شادی کرے۔ اس میں یہ کوئی پابندی نہیں کہ اس کے بعد " دو دو " یا " تین تین" یا " چار چار " کی دوسری جماعت نہ ہو۔ کیونکہ لغت کے قواعد اور عرف کے لحاظ سے یہ شرط ٹھیک نہیں۔ مثلاً اگر کسی آدمی کے پاس ایک ہزار آدمی جمع ہوں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ دو دو یا تین تین کرکے آئے۔ اس تفسیر کی رو سے لاتعداد شادیاں جائز ہیں۔ اب واوٗ چاہے جمع کے لئے یا اختیار کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(نیل الاوطار شرح منتقیٰ الاخبار۔ جلد ششم۔ صفحہ ۱۵۱)

متضاد تفسیریں اور ائمہ کا فیصلہ

یہ ہیں تعدد ازواج کی حمایت میں پیش کی جانے والی آیت کی مختلف تفسیریں۔ ان مختلف اور متضاد تفاسیر کو دیکھ کر خود مفسرین عجیب شش و پنج میں پڑ گئے کہ کس تفسیر کو ترجیح دیں اور کسے رد کریں۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اس آیت سے چار بیویوں والا مسئلہ حتمی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا جواز احادیث سے ملتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب اپنی مشہور تفسیر فتح البیان کی جلد ۲ صفحہ ۱۶۸ پر فرماتے ہیں۔

فاولی ان یستدل علی تحریم الزیادۃ علی الاربع بالسنۃ لا بالقرآن۔ پس زیادہ صحیح یہ ہے کہ چار سے زیادہ بیویوں کی حرمت کا استدلال حدیث سے کیا جائے نہ کہ قرآن مجید سے۔

تعدد ازواج اور احادیث

جب خود مفسرین کی تصریح کے مطابق قرآن مجید سے چار بیویوں والا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا تو ہم ان احادیث کو سامنے لاتے

جنہیں مفسرین اور محدثین نے پیش کیا ہے۔ یہ ایک ہی حدیث ہے جو مختلف طریقوں سے مروی ہے۔ سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں جن الفاظ کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے اس کا ترجمہ یوں ہے۔

"قیس بن حارث کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ لیکن اسلام لانے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے صرف چار بیویاں اختیار کر لینے کا حق دیا تھا۔"

(نیل الاوطار۔ جلد ۶۔ صفحہ ۱۵۰)

یہ ہے وہ حدیث جس سے چار عدد بیویوں کا جواز ثابت کیا جاتا ہے۔ اتنی اہم حدیث کو ائمہ حدیث نے جو مختلف زاویوں سے پرکھا تو اس کی صحت مشکوک نکلی اور یہ ضعیف ثابت ہوئی۔ علامہ شوکانی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حدیث قیس بن الحارث و فی روایۃ الحارث بن قیس فی اسنادہ محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلی و قد ضعفہ غیر واحد من الائمۃ۔

(نیل الاوطار۔ جلد ۶۔ صفحہ ۱۵۰)

قیس بن حارث دوسری روایت کے مطابق حارث بن قیس کی حدیث کے ایک راوی محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہیں جسے اکثر ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

علامہ شوکانی مزید فرماتے ہیں کہ حارث بن قیس نام کے شخص کی کوئی دوسری روایت نہیں۔ صرف مذکورہ بالا حدیث میں اس کا ذکر ہے۔

علامہ شوکانی کی ان تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث سے بھی چار ازواج کا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ ہمارے مفسرین اور محدثین نے قرآن وسنت سے چار بیویوں کی حیثیت ثابت کرنے میں اس طرح اپنے عجز کا ثبوت دیا ہے لیکن اس کے باوجود چار بیویوں کا مسئلہ اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا یہ قرآن مجید کا حکم ہے کہ جس کے بدلنے سے کفر لازم آئیگا۔

قرآن، حدیث اور فقہ

یہ تھی قرآن وحدیث کی رُو سے مسئلہ تعدد ازواج کی شرعی حیثیت۔ لیکن یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں قرآن وحدیث تو صرف زیب داستان کے لئے رہ گئے ہیں۔ عمل صرف اسی مسئلہ پر ہوگا جس کی سند فقہ سے مل جائے۔ طلاق بدعت یعنی بیک مجلس تین طلاقیں دینے کو تمام حضرات قرآن وسنت، کے خلاف بتاتے ہیں لیکن اس کے باوجود جب اس پر پابندی عائد کی گئی تو خود انہی حضرات نے جو اسے قرآن وسنت کے خلاف بتاتے تھے یہ کہہ کر اس اقدام کی مخالفت کرنے لگے کہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہے۔ تو ان کے اس طرز عمل

سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مسائل میں اصل دار و مدار فقہ اور خاص کر فقہ حنفی ہے تو آئیے ہم آپ کو ائمہ فقہ کے پاس لے جاتے ہیں۔ امام شافعی رح کا مسلک تو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، اب ہم امام ابو حنیفہ رح کا فیصلہ سامنے لاتے ہیں۔

تعدد ازواج اور امام ابو حنیفہ رح

فقہ میں امام ابو حنیفہ رح کا مسلک بڑا انقلابی تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ملوکیت نے ان کی ایک نہیں چلنے دی اور انکی کوئی کتاب ہم تک نہ پہنچنے دی۔ حنفی فقہ کی جتنی کتابیں متداول ہیں وہ سب بعد میں لکھی گئی ہیں۔ اور امام صاحبؒ کے اقوال ان میں کہیں کہیں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ تعدد ازواج کے مسئلہ پر جو ملوکیت کا خاصہ ہے، امام صاحبؒ نے بڑی سیر حاصل بحث فرمائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ ہم تک پوری کی پوری نہیں پہنچ سکی۔ لیکن جو کچھ پہنچی ہے' ہمارے مدعا کے لئے کافی ہے۔ علامہ مناظر حسن گیلانی (مرحوم) نے اسے مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ہم انہیں کی زبانی اسے نقل کرتے ہیں۔

" تعدد ازواج کے بارے میں امام صاحبؒ کا جو نقطۂ نظر تھا دوسری جگہ لوگوں نے اسے بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم غالباً (النخعی) کے متعلق امام صاحبؒ سے کسی نے اس واقعہ کا ذکر کیا کہ کسی نے ہدیۃً کوئی کپڑا ان کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کیا۔ اس نے کہا "خرید لیجئے۔" بولے کہ میاں چار سو درہم میرے پاس اگر ہوتے تو دوسری بیوی نہ کرتا۔

اس نے کہا کہ ایک بیوی کیا آپ کے لئے کافی نہیں۔ بولے۔ اِنْ حَاضَتْ حِضْتُ۔ (جب اس کے ایام کا زمانہ آتا ہے تو میں بھی گویا ایام میں بیٹھ جاتا ہوں) امام صاحبؒ نے اس قصے کو سن کر کہا کہ بھائی مجھے تو رسول اللہ کے صحابی حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک بیوی والا سرور میں رہتا ہے اور دو بیویوں والا شرور کا شکار رہتا ہے۔ یعنی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ روایت سنا کر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے ساتھ جسے اتفاق نہ ہو وہ تجربہ کر کے دیکھ لے یا شاید جابر ہی کا قول نقل کیا۔ اور کہا کہ ابراہیم کو شاید تجربے کا موقعہ نہ ملا۔

اور اس کے بعد کہنے لگے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ عدل و انصاف کا اپنی بیویوں کے ساتھ تھا جو اس برتاؤ کو نہ کر سکے تو وہ ظالموں میں لکھا جائے گا۔ پھر وہ حدیث سنائی جس میں آیا ہے کہ دو بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنیوالا قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ ایک شق اس کے بدن کا ساقط ہوگا۔

امام صاحبؒ نے اس پر اور اضافہ کیا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت اپنے لئے تو میں نے اس مسلک

کو اختیار کیا ہے اور فرمایا۔ بجائی بے طلری اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں۔ پھر عورتوں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے ان الفاظ کو دہرایا کہ یہ عورتیں تمہارے ہاتھوں میں بندھی ہوئی ہیں بس ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہنا۔ راوی کا بیان ہے کہ دیر تک امام صاحب اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے لیکن مجھے بس اس قدر یاد رہ گیا۔ کاش امام صاحب کی پوری تقریر راوی کو یاد رہ جاتی، تو تعدد ازواج کے مسئلہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے امام کا نقطہ نظر دنیا کے سامنے آجاتا اور پہلی صدی تک مسلمانوں کے خیالات کی یہ ایک تاریخی شہادت ہوتی۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں یورپ کی نکتہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے بنانی شروع کی ہیں، ان کا بہترین جواب امام صاحب کا یہ بیان ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو جو کچھ راوی کو یاد رہ گیا ہے وہ بھی اس مدعا کے لئے کافی ہے۔"

(حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی مطبوعہ کراچی۔ صفحہ ۳۱۷۔ پہلا ایڈیشن)

امام احمد بن حنبل کا مسلک

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے بعد تیسرے امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ملاحظہ ہو۔ حنبلی فقہ کی کتابوں میں آپ کا مسلک ان الفاظ میں دیا جاتا ہے۔

قالوا یندبُ نکاح امراۃٍ واحدۃٍ فلا یعدد الازواج فان فی التعدد خطرۃ عدم العدل فیقعُ فِی المحرم۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ ۱۰)

صرف ایک عورت سے شادی کرنا مستحب ہے۔ پس بیویاں زیادہ نہ ہوں کیونکہ ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں عدل سے ہٹ جانے کا خطرہ ہے جس سے حرام فعل کا ارتکاب ہوتا ہے۔

حنابلہ نے یہاں ندب (مستحب) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حنفیوں کے ہاں مستحب اور سنت دو الگ چیزیں ہیں۔ لیکن حنابلہ کے نزدیک یہ دونوں اصطلاحات مترادف ہیں۔ دوسرے الفاظ میں امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک سنت کی رُو سے بھی شادی کا طریقہ ایک بیوی تک محدود رہنا ہے۔

نگاہِ بازگشت

ان تفصیلات کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے۔

(۱) شریعتِ اسلامی میں تعدد ازواج کی مشروط اجازت ہے۔

(۲) تعدد ازواج کی اس مشروط اجازت سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔
(۳) دوسری بیوی کے آنے سے پہلی بیوی اور اس کے خاندان والوں کا مصائب کا شکار ہونا ایک قدرتی امر ہے۔
(۴) حضرت علیؓ نے دوسری شادی کے لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت چاہی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری شادی کے لئے بیوی یا اس کے خاندان والوں کی اجازت ضروری ہے۔
(۵) بیوی یا اس کے خاندان والے اس کی اجازت دینے سے انکار بھی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا۔
(۶) جس آیت سے تعدد ازواج کی اجازت ثابت کی جاتی ہے، مفسرین نے اس کی اتنی متضاد تفسیروں کے بعد فیصلہ یہ دیا ہے کہ اس کا ثبوت قرآن سے نہیں بلکہ حدیث سے ملتا ہے۔
(۷) جو حدیث اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے محدثین کے نزدیک وہ ضعیف ہے۔
(۸) امام شافعی قرآن مجید سے تحدید ازواج ثابت کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ احادیث کی روشنی میں ایک بیوی پر قناعت کا مسلک پیش کرتے ہیں۔ جبکہ امام احمد بن حنبل رہ کے نزدیک ایک بیوی پر قناعت کرنا سنت ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں قارئین خود فیصلہ کریں کہ عائلی قوانین میں تعدد ازواج کی مشروط آزادی کو جو قانونی شکل دی گئی ہے وہ کیسے خلافِ اسلام ہو سکتی ہے؟

(۰)

طلوعِ اسلام۔ جیسا کہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے متعدد بار لکھا جا چکا ہے قرآن مجید میں ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی اجازت ایک ہی آیت (۴/۳) میں دی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے، کہ ازدواجی سلسلہ میں قانون تو وحدتِ زوج (ایک میاں ایک بیوی) کا ہے لیکن اگر معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ یتیم بچوں، بالغ ناکتخدا لڑکیوں یا بیواؤں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے، اور ان کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل نہ مل سکتا ہو تو اسلامی حکومت اس کی اجازت دے سکتی ہے کہ ان عورتوں کو (بیویوں کی حیثیت سے) گھروں میں بسا لیا جائے۔ بشرطیکہ ایسا کرنے سے کسی پر ظلم کا اندیشہ نہ ہو — بس یہ ہے قرآن مجید کی ایک آیت جس میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی — یا یوں کہیئے کہ

جس میں، ہنگامی حالت میں، قانونِ وحدتِ زوج میں استثنار کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک جو روایت یا فقہ کا فیصلہ اس آیت کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ دین میں آخری حجت قرآنِ کریم ہے۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ بات سامنے آگئی۔ مودودی صاحب نے (اس سے پہلے بھی بتایا تھا، اور اب اسے پھر دہرایا ہے کہ) جب وہ لندن ہسپتال میں زیرِ علاج تھے تو ایک نرس ان کے پاس بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتی تھی۔ ایک دن اُس نے اسلام میں تعددِ ازدواج پر اعتراض کیا، تو مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے معاشرہ میں وحدتِ زوج کے بعد، لوگ اس کثرت سے حرامکاری کرتے ہیں، تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ ان عورتوں سے زنا کرنے کے بجائے انہیں بیویاں بنا لیا جائے۔ تعددِ ازدواج کی اس فلسفیانہ حکمت سے وہ نرس مطمئن ہو گئی۔

بالفاظِ دیگر، مودودی صاحب نے اس نرس سے کہا کہ مرد ایک عورت پر اکتفا ہی نہیں کر سکتا۔ اگر اسے ایک سے زیادہ بیویاں نہ دی جائیں تو وہ زنا کریگا ——— لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب نے مصلحتاً بات ادھوری چھوڑ دی۔ نرس نے یہ ضرور پوچھا ہو گا کہ حضرت! آپ کی کتنی بیویاں ہیں۔ اور جب انہوں نے کہا ہو گا کہ ایک ——— تو اس نے پوچھا ہو گا کہ اس کے بعد آپ کیا کرتے ہیں؟ معلوم نہیں اس کا مودودی صاحب نے کیا جواب دیا ہو گا!

اور شاید اس نے یہ بھی پوچھا ہو کہ حضرت! اگر ایک بیوی ایک خاوند پر اکتفا نہ کر سکتی ہو تو وہ کیا کرے؟

آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرات کس طرح دنیا میں اسلام کو اضحوکہ بناتے رہتے ہیں اور پھر اپنی ان حماقتوں کا کس فخر سے اعلان کرتے ہیں ——— اور ان کے مریدوں کا حلقہ، ان کی فکرِ بلند کے کس طرح قصیدے پڑھتا رہتا ہے!

قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس قسم کی جنسی بدنہادی (SEX - PERVERSION) کی جڑ کاٹ کر رکھ دی، جب کہا کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳) جن لوگوں کے لئے شادی کا انتظام نہ ہو سکے، وہ ضبطِ نفس سے کام لیں! قرآن جنسی جذبات پر ضبطِ نفس سے کنٹرول کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کی بے محابا تسکین کے لئے عورتوں کی کھیپ حرم میں داخل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

جنسی پابندیوں کا اثر قوموں کی زندگی پر

SEX AND CULTURE

پرویز

[۱۹ جولائی (اتوار) کی صبح، پرویز صاحب کے ہفتہ واری درس قرآن مجید میں، سورۃ النساء کی آیت ۴/۱۵ زیر تدریس تھی جس میں، فحاشی اور بے حیائی کو روکنے کی تاکید کی گئی ہے ۔ ضمناً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس آیت کا تعلق جرم زنا سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ جرم زنا کے اثبات کے لئے چار عینی شاہدوں کی شرط عائد کرنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نہ یہ جرم ثابت ہو، نہ کسی کو سزا دی جاسکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا قانون وضع اور نافذ کرنا ۔۔۔ می نہ سزد خدائے را ۔۔۔ نیز اس آیت میں، سزا صرف یہ تجویز کی گئی ہے کہ متعلقہ عورت کو پابند مسکن کر دیا جائے حالانکہ سورۃ النور (۲۴/۲) میں جرم زنا کی سزا، بالفاظِ صریح سو کوڑے متعین کی گئی ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۴/۱۵ کا تعلق ان بے حیائی کی باتوں سے ہے جن کی اگر روک تھام نہ کی جائے تو وہ رفتہ رفتہ زنا تک لے جانے کا موجب بن سکتی ہیں۔ انہیں آپ مبادیاتِ زنا کہہ سکتے ہیں ۔۔۔!

پرویز صاحب نے اپنے درس میں بتایا کہ قرآن مجید نے حفاظت عصمت کو دین کی مستقل (غیر متبدل) اقدار میں شمار کیا ہے اور اس کی بڑی سخت تاکید کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عصمت کے مستقل اور غیر متبدل قدر قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کو (یورپ کی طرح) سوسائٹی کی صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا کہ وہ جنسی اختلاط کی جس شکل کو مناسب سمجھیں جائز اور قانوناً صحیح قرار دے دیں۔ اور جب جی چاہے اس میں تبدیلیاں کرتے جائیں۔ جنسی اختلاط پر جو پابندیاں قرآن نے عاید کی ہیں وہ مستقل اور ابدی ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی

نہیں کی جا سکتی۔ ان پابندیوں کی نگہداشت (یعنی ان کی خلاف ورزی نہ) کرنے کا نام عصمت ہے۔ پرویز صاحب نے کہا کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے عصمت کا تقاضا (بالعموم) لڑکیوں (عورتوں) سے کیا جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ یہ لفظ بھی طبقۂ نسواں سے مختص ہو کر رہ گیا ہے ۔ لڑکوں (مردوں) کے باعصمت ہونے پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم مرد اور عورت دونوں سے حفاظتِ عصمت کا یکساں تقاضا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس جرم زنا کی سزا عورت اور مرد دونوں کے لئے ایک ہی متعین کی ہے۔ جب وہ حفاظتِ عصمت کو مومنین کی بنیادی خصوصیات بتاتا ہے تو اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قرآنِ کریم نے تحفظِ عصمت کے سلسلہ میں دو برگزیدہ ہستیوں کا ذکر کیا ہے ۔ ایک حضرت مریم علیہا السلامؑ اور دوسرے حضرت یوسف علیہ السلام ۔ ان کے تذکارِ جلیلہ سے جہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں، اگر انسان کا قوانینِ خداوندی پر ایمان محکم اور عزم راسخ ہو تو وہ اپنی عصمت کی حفاظت کر سکتا ہے[۱]۔ وہاں یہ صراحت بھی مطلوب ہے کہ جس طرح عورت بھی وہی باوقار اور واجب الاحترام ہو سکتی ہے جو اپنی عصمت کی حفاظت کرے، اسی طرح مرد بھی وہی سرفرازیوں اور سربلندیوں کے مقامِ رفیع پر فائز ہو سکتا ہے جو اپنے پاؤں میں لغزش نہ آنے دے۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے نہایت وضاحت سے بتایا کہ تحفظِ عصمت سے مقصود صرف اتنا ہی نہیں کہ اس سے سوسائٹی کا نظم و ضبط قائم رہتا ہے اور اولاد کی ولدیت کا صحیح تعین ہو جاتا ہے۔ اس کا بڑا گہرا تعلق قوموں کے عروج و زوال سے ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے "سلیم کے نام ایک خط" میں سے کچھ اقتباسات پیش کئے جن میں ایک بلند پایہ مغربی محقق کی تحقیقات کے نتائج سامنے لائے گئے تھے۔ یہ اقتباسات اس قدر برجستہ، دلنشیں اور اثر انگیز تھے کہ درس کے بعد، اکثر سامعین نے تقاضا کیا کہ "سلیم کے نام (اس) خط" کو بہ تمام و کمال طلوع اسلام میں شائع کیا جائے کیونکہ آجکل، مغرب کی نقالی میں، خود ہمارے معاشرہ میں بے حیائی کا جو سیلاب اس بے باکی سے اُٹھ رہا ہے، اس کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ اس قسم کے لٹریچر کی اشاعت عام کی جائے۔ سلیم کے نام یہ خط، اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا اور اب "سلیم کے خطوط" کے مجموعہ (جلد سوم) میں شامل ہے۔ اسے ہم احباب کے تقاضا اور وقت کی ضرورت کے احساس سے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔　　(طلوع اسلام)

---

[۱] "زنا بالجبر" کا سوال ہی الگ ہے۔ اس میں اسی قسم کا طبعی جبر کارفرما ہوتا ہے جس قسم کا جبر قتل کی صورت میں عمل میں لایا جاتا ہے۔

میاں! تم نے بالآخر اس موضوع پر بھی بات چھیڑ دی جس سے تم اس وقت تک اتنی جھجک محسوس کر
بہت اچھا ہوا کہ (تمہارے الفاظ میں) میرے احترام کے جذبہ پر اس موضوع کی اہمیت غالب آ گئی۔
خوشی ہوئی کہ تم نے بات کرتے وقت اس روایتی حجاب کو آڑے نہیں آنے دیا جو اس باب میں اکثر
گلوگیر ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ایسے اہم عنوان پر صحیح راہ نمائی سے
تے ہیں۔ اور یہی حجاب ان کی تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جنسی تعلقات
اس قدر شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے کہ "شریفوں کی مجلس" میں اس کا نام تک لینا بھی بے حیائی
تا ہے۔ یہ غیر شعوری طور پر نتیجہ ہے اس خانقاہی ضابطۂ اخلاق (MYSTICAL ETHICS)
بت کی رہبانیت سے، تصوف کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے ہاں آ پہنچا اور جس نے ہمارے تمام تصورات
یا۔ چونکہ رہبانیت میں جنسی تعلقات کو سخت معیوب اور وجۂ ذلتِ انسانیت سمجھا جاتا ہے، اس
ہاں بھی جنسیات کو نہایت شرمناک تصور کیا جاتا ہے اور کسی کے سامنے اس کا ذکر آ جانے سے
ے جاتے ہیں۔ جب ہمارے معاشرے میں جنسیات کے ذکر تک کو اس قدر شرمناک سمجھا جاتا ہو تو ظاہر
موضوع پر ہمارے ہاں لٹریچر کس طرح مل سکتا ہے! چنانچہ جہاں تک میری معلومات یاوری کرتی
ہاں اس موضوع پر ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے سنجیدگی سے کسی نوجوان کے ہاتھ میں دیا جا سکے۔
یہ ہے کہ ہمارے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) چوری چھپے اس سطحی (CHEAP) جنسی لٹریچر
تے رہتے ہیں جو آوارگانِ مغرب کی بد لگام ذہنیت کا پیدا کردہ ہوتا ہے، اور جس سے طرح طرح کے
ماغی اور جسمانی مفسدات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (حالانکہ یورپ میں اس موضوع پر سائنٹیفک
بلند پایہ لٹریچر کی بھی کمی نہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے نوجوان اس موضوع پر بات کرنے سے شرماتے ہیں،
کی صحیح راہ نمائی ہو نہیں سکتی اور ان کی رسائی صرف سطحی لٹریچر تک ہوتی ہے)۔ بہرحال تم نے اچھا
موضوع کے متعلق بے تکلفی سے بات چھیڑ دی۔ میں کوشش کرونگا کہ یہ نہایت نازک، لیکن بڑا
اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ لو سنو۔

زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، حیوانی سطح سے انسانی پیکر میں پہنچی تو وہ حیوانی زندگی
سائص و لزومات بھی اپنے ساتھ لائی۔ کھانا۔ پینا۔ سونا وغیرہ (جسم کا طبیعی نظام) حیوان اور انسان
ہیں۔ بالفاظِ دیگر، یہ انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاہر ہیں۔ انہی میں افزائشِ نسل (PROCRE-
-) اور اس کے لئے جنسی جذبہ (SEXUAL INSTINCT) بھی شامل ہے۔
نے پینے کے معاملہ میں حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے از خود عاید ہوتی ہیں۔ مثلاً

بکری گھاس کھاتی ہے، گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے، گھاس نہیں کھاتا۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف گھیر کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ حیوانات پر یہ پابندیاں از خود عاید ہوتی ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس انسانی بچے کو دیکھئے۔ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح شاخ نبات (مصری کی ڈلی) کو۔ وہ کبھی دھکتا ہوا کوئلہ بھی پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس پر فطرت کی طرف سے از خود ایسی پابندیاں عاید نہیں ہوتیں جیسی حیوانات پر عاید ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اسلئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرے کی طرف سے عاید کی جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ (مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے اسلئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہے ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ نہ ہوں بلکہ خدا کی طرف سے عاید کردہ ہوں)

معاشرتی پابندیاں

معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور وحی کی رُو سے متعین کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بنا پر بدلی بھی جا سکتی ہیں۔ لیکن وحی کی رُو سے عاید کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہیئے۔ اس فیصلہ کی رُو سے (KEEP TO THE LEFT) سڑک کا قانون قرار پا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر "دائیں طرف چلو" کا قانون بھی نافذ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحی خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً) لحم خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس قانون میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ وحی خداوندی کے ماننے والوں کو لحم خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے نہیں کرتی۔ لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار و ارادہ سے کرنا ہوگا۔

جنسی جذبہ پر پابندیاں

کھانے پینے کے علاوہ، جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عاید ہوتا ہے۔ ایک بیل ہر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا، تاوقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرارِ حمل کا طبیعی تقاضا اس کی دعوت نہ دے۔ لیکن انسان پر اس قسم کا کوئی کنٹرول نہیں عاید کیا گیا۔ وہ جب جی چاہے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کر سکتا ہے۔

حیوانات پر اس طبیعی کنٹرول کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عاید نہیں کیا گیا۔ (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عاید کی گئی ہیں۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عاید کی جاتی ہیں اور وحی کی رُو سے بھی۔ معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام اور ممالک میں مختلف نوعیتوں کی ہیں۔ نیز کسی ایک ہی قوم میں مختلف زمانوں میں ان پابندیوں میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط کی صورت پیدا کرلیں تو معاشرہ کی نگاہوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ نہ ہی ایسا کرنا قانوناً جرم ہے۔ اسی طرح اگر ایک شادی شدہ مرد یا عورت کسی اور سے جنسی تعلق پیدا کرلے تو یہ کوئی معاشرتی جرم نہیں۔ یہ اسی صورت میں جرم قرار پائیگا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ ان پابندیوں میں ردّ و بدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اس وقت تک وہاں یہ صورت ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلّت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں وہاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے' ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرہ کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ (اس وقت ان فیصلوں پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اگر معاشرہ چاہے تو اپنی عاید کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے[1]

وحی کی پابندیاں

اس کے برعکس' اس باب میں وحی (یعنی قرآنِ کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عاید کی ہیں۔ ان پابندیوں کا ماحصل یہ ہے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد یا عورت) کو جنسی اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں اور شادی کے بعد' نہ بیوی کسی غیر مرد سے اختلاط پیدا کر سکتی ہے' نہ میاں کسی اور عورت سے۔ اس قسم کا اختلاط فرد کا نہیں بلکہ معاشرہ کا جرم ہے۔ اور اس جرم (زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کی جنسی بے باکیوں سے متأثر ہو کر' ہمارے ہاں کے نوجوان طبقہ میں بھی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبیعی تقاضے کی تسکین یا افزائشِ نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل

---

[1] انگلستان میں اب لواطت کو بھی قانوناً جائز تسلیم کر لیا گیا ہے اور امریکہ میں لڑکوں کی ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں ہو رہی ہیں اور پادری ان شادیوں کی توثیق کرتا اور برکات کی دعائیں دیتا ہے۔ (۱۹۷۰ء)

(BIOLOGICAL ACTION) ہے اور بس۔ اس معاملہ کو لڑکی اور لڑکے کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاہیئے اور نکاح وغیرہ کی پابندی، محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہونی چاہیئے، نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی (مغرب کی طرح) جنسی فوضویت (SEXUAL ANARCHY) کی فضا عام ہوتی جا رہی ہے اور وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں [یعنی عفت وعصمت (CHASTITY) کے مطالبہ] کو غیر فطری جکڑ بندیاں قرار دیا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے

ان پابندیوں کی مصلحت

ہیں، یا ان کا تعلق عالمِ انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ہے۔ اگر ان کا مقصد محض معاشرتی نظم وضبط ہے، تو بے شک معاشرہ کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ (اپنے مصالح کے پیشِ نظر) ان میں ردّ وبدل کرے۔ لیکن اگر ان کا تعلق انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروپ کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ان پابندیوں میں تبدیلی کر کے انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔ قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب اس نے کہا کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ..... هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۔ (۲۳/۱-۵) تو اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ عفت وعصمت کا، قوموں کی فلاح وبہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں فائز المرام (PROSPEROUS) نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں۔ لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں۔ سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعویٰ کو بطور ایمان (FAITH) ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسکے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں[1]۔ ان لوگوں

قرآنی دعویٰ کی دلیل

(بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد وبے دین کہہ کر تیوریاں چڑھا لیں۔ قرآن اپنے ہر دعویٰ کی بنیاد علم وبصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل وبرہان کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جوں جوں

---

[1] انہیں اس کا علم نہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے ایمان اندھے (FAITH) کا نام نہیں بلکہ اس (CONVICTION) کا نام ہے جو علم وبصیرت کی رُو سے حاصل اور دلائل وبراہین کی رُو سے محکم ہو۔

انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ...... (۴۱/۵۳) ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تا آنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہو چکی ہیں وہ قرآن کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ۔ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی سنجیدہ توجہ اور گہری فکر سے غور و خوض کیا جائے۔

جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوتی اسلئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا

غور و فکر

نہیں ہوتا۔ اور ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے، زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوتی ہو! حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو اور تقلید کہن زندگی کی محور رسن قرار پا چکی ہو، ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ یورپ میں (دیگر شعبوں کی طرح) جنسیات نے

علمائے مغرب کی تحقیقات

بھی ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں پر تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات (SOCIOLOGISTS) تہذیب کے مؤرخ، علمائے جنسیات اور ماہرین علم تجزیۂ نفس (PSYCHO - ANALYSTS) وغیرہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں (PRIMITIVE TRIBES) کے احوال و کوائف، بود و ماند، رسوم و معاشرت اور اجتماعی اعمال و معتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ (DATA) سے نتائج مستنبط کرتے ہیں۔* اس مقصد کے لئے انہیں جن صبر آزما منازل اور مشقت طلب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی

---

* واضح رہے کہ ان کا انداز اس طریق سے مختلف ہے جو آجکل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جس کی رو سے ایک خاص فرقہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوالنامہ دے دیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد و شمار (STATISTICS) اکٹھے کر کے نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں اور ان نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر اور فطرتِ انسانی کے ترجمان ہیں۔ آجکل امریکہ کا (KINSLEY) بیہ ہستم کے "محقق" اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریق کار کبھی عالمگیر (UNIVERSAL) نتائج تک ہمیں نہیں پہنچا سکتا۔

ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گزار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو وہ پہنتے تھے۔ انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہیں میں شادیاں بھی کیں۔ اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے متعلق براہ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ہیں، ان میں جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدن (CULTURE) کا اس سوال سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔ انہی محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J.D. UNWIN) کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر انون نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے اسی غیر مہذب (قدیم) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب (SEX AND CULTURE) میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

> دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

اصل کتاب سے بھی پہلے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو۔ اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود وغیرہ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھا ہوں۔ (XIV)

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

> کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر

ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (صفحہ ۳۲)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے! وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دار و مدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہوگئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (صفحہ ۳۰۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (۳۳۰)

اس لئے اگر کسی قوم میں متمدنی تبدیلی واقع ہو یعنی اُسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہونگی اسی قسم کے نتائج مرتب ہونگے۔

جبری تجرّد

سب سے پہلے تجرد کی زندگی (CELIBACY) کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلک خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

> جبری تشدد (COMPULSORY CELIBACY) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (صلاش)

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلک خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی شرفِ انسانیت کی زندگی ہے تو دوسری طرف آجکل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عاید کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں

پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عاید کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ ص ۱۱)

(۷)

تین گروہ

اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (ZOISTIC) رکھتا ہے۔ اس سے اوپر (MANISTIC) کا درجہ ہے اور سب سے اوپر (DEISTIC) کا درجہ۔ اس کے بعد وہ انہی قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جس گروہ نے کنوارپن (PRE - NUPTIAL) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

(۲) جن قبائل میں زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عاید تھیں، وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے۔ اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت (CHASTITY) کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ (ص ۳۲۵-۳۰۰)

اس کے بعد ڈاکٹر انون، شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ

> شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے کی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (ص ۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONOGAMY) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو، بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو۔ ایسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج (MODIFIED MONOGAMY) کی اصطلاح

سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعددِ ازواج (ABSOLUTE POLYGAMY) ہے۔ اور

(۴) اگر مرد، دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرلے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعددِ ازواج (MODIFIED POLYGAMY) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ

آج تک کوئی قوم شق ۳ کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔ (ص ۳)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے۔ اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِ عمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (SEXUAL ANARCHY) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (ص ۳)

اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے، ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی۔

بہترین تمدن کی حامل قوم

اور شادی کے بعد شق ۲ کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابلِ تنسیخ نہ ہو۔ بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہو سکتا ہو۔ یہ بعینہٖ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عاید کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے مختلف ماہرینِ علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

جنسی تعلقات کی حدبندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (TENSION) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (COMPRESSION) پیدا ہو جاتا ہے (ص ۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے لئے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو، ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اون کہتا ہے کہ

نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود و پابندیاں عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (صـ۳۱)

فرائڈ کی تحقیق بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوتی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے کیونکہ ہر فرد، اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے (جب ان کی بیباکانہ تسکین ہی مقصدِ زندگی نہ بن جائے تو) یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں (جسے SUBLIMATION کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

آپنے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق، اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں[1]۔

فرائڈ نے اس طریق عمل کا نام (SUBLIMATION) رکھا ہے۔ یہ علم تجزیۂ نفس (PSYCHO - ANALYSIS) کی ایک اہم اصطلاح ہے اور دورِ حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق۔ لیکن آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ انسانی ذہن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے، قرآن نے چھٹی صدی عیسوی میں [جبکہ علم طور پر

---

[1] اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر میں جس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہو رہے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم اس وقت فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہے ہیں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک نہ بہنے دیا جائے تو یہ اپنا رُخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے فرائڈ ایک بڑی حد تک بعض غلط فہمیوں کا شکار بھی ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق میں نے اپنی کتاب (ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION) میں

(DARK - AGES) کہا جاتا ہے) کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سورۃ آلِ عمران میں مومنین کی ایک صفت الکاظمین الغیظ بتائی گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب ایک گرم اور خشک ملک ہے۔

قرآنی کظامت

جہاں پانی کی اکثر قلت رہتی ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھودتے۔ ان میں کسی میں کم پانی نکلتا کسی میں زیادہ۔ پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں (SUBTERRANEAN CHANNELS) کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے۔ اس طرح جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا، اس کا فالتو پانی دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی۔ اس طریق عمل کو ان کے ہاں کظامت کہا جاتا تھا۔ لہٰذا کاظمین الغیظ کے معنی ہوئے وہ لوگ جو اپنی اس حرارت اور توانائی کو جو غصے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے، کسی دوسری طرف منتقل کر کے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصرِ حاضر کے ماہرین تجزیہ نفس نے (SUBLIMATION) سے تعبیر کیا ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر انون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس،

> جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کریں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلاقیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔ (صفحہ ۳۹۸)

اضمحلال

قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَا يَزْنُوْنَ۔ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔ اس لئے کہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذَالِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔ (۲۵) جو قوم ایسا کرتی ہے، اسے اِثْم سے دوچار ہونا پڑتا ہے عربی زبان میں اٰثِمَۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے؛ اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس تک دورِ حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزادانہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انون نے یہ بھی کہا ہے کہ

مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائیاں پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت، شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ ہے۔ (ص ۲۲۳)

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے۔ وہ حٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ (وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں) کے ساتھ وَالْحٰفِظٰتِ (۳۳/۳۵) بھی کہتا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے دامنِ عفت کو داغدار نہ ہونے دیں۔ اور جرمِ زنا کی سزا بھی مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے۔ (۲۴/۲)

قرآنی حدبندی

قرآن کی رو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے، یا مرد کا کسی دوسری عورت سے جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضی مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی" نہیں ہوتی بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود و حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عاید کی ہیں، باہمی رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی اسلئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے لہٰذا اسکا انداز سائنٹیفک ہونا چاہیئے تھا) اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع (SEXUAL OPPORTUNITIES) کی اصطلاح استعمال کی ہے اس کا کہنا ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہونگے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے، وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ زنا ہے۔ نکاح کا معاہدہ اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت (LIFE-LONG COMPANIONSHIP) کا معاہدہ ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو۔ پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے، بچوں کا کھیل نہیں کہا، کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔ علاوہ بریں اس نے وحدتِ زوج

وحدتِ ازدواج

(MONOGAMY) کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے اور تعدد ازدواج کو محض ایک ہنگامی تمدنی مشکل کے حل کے لئے بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (اسکی بھی محض اجازت ہے حکم نہیں) آپ دیکھئے کہ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONOGAMY) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے "قریب قریب" اسلئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج" میں شادی

صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے۔ لیکن قرآن نے نباہ نہ ہو سکنے کی بھی فسخ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا اور نکاح کے بعد عام حالات میں صرف ایک جوڑے کو باہمدگر وابستہ رکھتا ہے۔ تنوعِ ذوق (change) کی خاطر تبدیلی (change) کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی محصنین کیساتھ غیر مسافحین (۲۴/۵) کا اضافہ کیا ہے جصن کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور سفح کے معنی ہیں یونہی بہا دینا۔ لہٰذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی مقصود ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لیجائے اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف (RECOGNISED) طریق سے مہیا کئے جائیں اور ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

> انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدتِ زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخِ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اسکے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو، جب عقدِ نکاح مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا، تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اسلئے کہ اس وقت تک زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی)؛ اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا، وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (ص۳۸)

آپ نے دیکھا کہ زمانے کی علمی شہادتیں کس طرح قرآنی حقائق کی تائید کرتی چلی جا رہی ہیں اور دنیا کس طرح (غیر شعوری طور پر خود بخود) قرآن کے قریب آتی جا رہی ہے۔

(۰)

عربوں کی تاریخ

ڈاکٹر انون نے اپنی تحقیق کے دوران ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور دیتا

کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکلکر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے۔ اس کے بعد جب انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کر دی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رک گئیں۔ (ص ۳۶۷) اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک اور تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہلِ کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے بلکہ یہ کہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کرسکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جاکر رُک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادی کی۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ اسپین میں (ص ۳۶۷)۔ کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے محصن (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت، نکاح میں وحدتِ زوج (MONOGAMY) بطور اساسی اصول؛ اور نکاح کے بعد میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت اور مرد کیساتھ اختلاط ناجائز) لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں (جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس ہنگامی اعزدت کے بغیر جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں، طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ تبدیلی ازواج اور قرآن کے کھلے کھلے حکم کے خلاف لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط، یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں) تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں اور نہ ہی اپنے تمدن کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کی صلاحیتیں باقی۔ اس قسم کی

جنسیات میں الجھی ہوئی قوم کی حالت

قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی۔[۲] وہ واقعات

---

[۱] رابرٹ برفا (BRIFFAULT) نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی وقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE MOTHER) اس میں وہ ایک گروہ کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر ایک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ (غالباً) پچاس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا۔ یہ جنسی اختلاط کے متنوع مواقع کی ایک مثال ہے! اس سے اور مثالوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔ [۲] دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لهم قلوب لا یفقهون بها۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

کے اسباب علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔
زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں انکی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت انکی سمجھ میں نہ آئے جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے حتیٰ کہ اسکی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اسکے بعد ڈاکٹر داؤن نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز۔ گنڈہ تعویذ۔ اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں اپنی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اسکے بعد وہ لکھتا ہے) اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے۔ بالکل حیوان ہوتے ہیں[۱]۔ (صفحات ۴۲۶-۴۲۷)

آپنے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آرہی اور کیا آج بھی ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سوحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جو کچھ قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ ان میں پھر نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔ ان کے ممالک میں لونڈیاں آج تک سربازار بکتی ہیں۔

ہمارا نوجوان طبقہ

یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اسکے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنہوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عاید کرنا، انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اسلئے ازمنۂ مظلمہ کے ان اغلال و سلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ اس میں،

ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے

---

[۱] یہی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام (۴۷/۱۲) وہ سامان زیست سے اسطرح فائدہ حاصل کرتے اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

جنسی اختلاط قائم کرے، اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی ہوتی ہے نہ لڑکے پر۔ لڑکپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انہیں لذت ملتی ہو۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش بیدار ہوئی اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (ص۳۴۲)

اس کا نتیجہ

یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اسے خود ڈاکٹر انون کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم کی زندگی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو ریفارمر ان میں مفاہمت (COMPROMISE) کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی معاشرہ ہو، اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی (ص۳۸۲)

بنابریں۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جاتے ہیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (ص۴۱۱)

(۰)

پس چہ باید کرد؟

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جایا جائے اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی جائے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہو گئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت مدید تک کم از کم حد تک محدود رکھ سکی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں

وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔　(صفحہ ۱۳۱)

مرد اور عورت کی مساوی حیثیت

آپ نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا ہو۔ آج اس معاشرہ میں جس میں ہم صدیوں سے چلے آرہے ہیں، یہ کہنا کہ اسلام نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کیا تھا، شاید اپنی ہنسی اڑانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے کہ قرآن نے یہ اعلان آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۲۸)۔ قاعدے اور قانون کی رُو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ یعنی قانون کی نگاہ میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے تو کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اپنے معاشرے کو قرآنی خطوط پر متشکل کر لیں۔

―――――― (۰) ――――――

آخر میں ڈاکٹر ان ون لکھتا ہے کہ

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن سے معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔　(صفحہ ۴۳۲)

قرآن ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے ہیں۔ وہ عائلی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ جہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے امور کے متعلق بالعموم اصولی قوانین دیتا ہے وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے[۱]۔

لیکن اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا

---

[۱] ان امور کی تفصیل میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" میں دیکھئے!

جاتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے۔ اور جس طرح بھوک، پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں عام قوانین کو ڈھیلا (RELAX) کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جنسی قوانین کی بندشوں کو بھی ڈھیلا کر دینا چاہیئے۔ یہ

ایک بنیادی حقیقت

تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (NATURAL INSTINCT) ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھو۔ تم کسی کام میں منہمک بیٹھے ہو۔ تمہیں پیاس لگتی ہے۔ شروع میں تمہیں اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو تمہیں اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر تم پانی پی لیتے ہو تو فبہا، ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے او اگر تمہیں کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھوک سے اس سے تم نے دیکھ لیا کہ

(۱) بھوک، پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تا وقتیکہ ہم اس کا خیال نہ کریں۔

خیال کا دخل

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمو دیکسر ہمارے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی اضطراری حالت کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے۔ (۳۳/۲۴)

ضبطِ نفس

اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو، اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ وہ نہ خیالات کو طیورِ آوارہ بنائے، نہ توجہ اس طرف جائے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر

اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن چور ہی کو نہیں بلکہ چور کی ماں کو بھی مارتا ہے۔ وہ صرف ارتکاب جرم کے بعد مجرم کو نہیں پکڑتا،

بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے لئے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۔ (۶/۱۵۲) تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو۔ ان اسباب ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آ جاتے ہیں۔ اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں۔ یعنی دل میں گزرنے والے خیالات جو آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَ مَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)، وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری تک سے واقف ہے۔ اس قسم کی روش کو تطہیر قلب و نگاہ کہتے ہیں۔ یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے۔ (انہیں پردے کے احکام کہا جاتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ سردست اتنا وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ قرآن کس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں عورتوں کی آزادی کو سلب نہیں کیا جاتا لیکن اس میں جنسی محرکات کبھی بے باک نہیں ہونے پاتے اور انسانی خیالات میں بے راہ روی نہیں پیدا ہوتی۔

(۰)

بہرحال، تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاط محض ایک طبعی فعل (BIOLOGICAL - ACTION) نہیں جس کا تعلق صرف انسان کے جسم تک ہو۔ اس کا تعلق قوموں کی تہذیب و تمدن اور کلچر اور ثقافت کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے یونہی نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم تمدن اور ثقافت میں ممتاز حیثیت حاصل کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنسی تعلقات کو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھیں۔ یعنی ان آزادیوں کو بھی محدود کریں جو مغرب کی اندھی تقلید سے ہمارے جدت پسند طبقہ میں دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اور ان "شرعی اجازتوں" کو بھی حدود اللہ کا پابند بنائیں جو غلط (یعنی غیر قرآنی) مذہب کی بنا پر ہمارے قدامت پسند معاشرہ میں صدیوں سے مروج چلی آ رہی ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے ابھرنے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ سنت اللہ کسی کے لئے بدلا نہیں کرتی۔

حنائے چہرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اچھا! خدا حافظ!	پرویز

——— (۞) ———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۹ء

تعلیم کا نصابِ نو

محترم عبدالحکیم خان مرحوم

(پروانۂ شمعِ قرآنی عبدالحکیم خان نے، جن کی وفات کی اندوہ ناک خبر فروری کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے، طلوعِ اسلام کی سابقہ کنونشن میں ایک مقالہ پڑھا تھا جسے مرحوم کی آخری یادگار کے طور پر تزئین دہِ اوراق طلوعِ اسلام کیا جاتا ہے۔ اس مقالہ سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ موت کے ہاتھوں ہم کس قدر گراں بہا متاع سے محروم ہو گئے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

پشاور میں میرے ایک چچازاد بھائی ہیں۔ وہ ایڈوکیٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ میں کبھی کبھی اُن سے ملنے پشاور جایا کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں جب گیا اور وقت گزارنے کے لئے اُن کی لائبریری سے کوئی کتاب اٹھانے لگا تو معًا میری نظر ایک کتاب پر پڑی جس کا نام جلی حروف میں سرورق پر "بحرالانوار" لکھا گیا تھا۔ نام کے اوپر قرآن کریم کی مشہور آیت " اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ " درج تھی اور نیچے کے حصے میں مؤلف کا نام " عبدالرؤف نوشہروی " تحریر تھا۔ یہ تینوں علامات میرے لئے وجہ کشش بنیں۔

پہلے نمبر پہ کتاب کا نام "بحرالانوار" بڑا ہی جاذبِ نظر تھا۔ دوسرے نمبر پر قرآن کریم سے شوق و شغف کی وجہ سے قرآنی آیت کے مفہوم کا تجسس اور تیسرے نمبر پہ "نوشہرہ" کی کشش۔ (میرا گاؤں نوشہرہ تحصیل میں ہے اور اس سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ گاؤں کی قربت کا تقاضا تھا کہ ان کے خیالات کو بھی قریب سے معلوم کروں)۔ ان تینوں عوامل نے بے اختیار میرا ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر میں "بحرالانوار" کو ہاتھ میں موجود پایا۔

کتاب پشتو میں تھی۔ جب کھولی تو معلوم ہوا کہ اس میں اولیاء کرام کے سوانح حیات، اُن کی تعلیمات کرامات درج ہیں۔ ان میں سب بڑے بڑے اولیاء مثلاً عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ اجمیریؒ، حضرت داتا بخشؒ، اور پیر صاحب گولڑہؒ وغیرہم کے اسماء گرامی موجود پائے۔ سب سے پہلا ذکر عبدالقادر جیلانیؒ کا میں ابھی پہلا صفحہ ہی پڑھ رہا تھا کہ بھائی صاحب سے معلوم ہوا کہ کتاب کے مؤلف کیمسٹری میں ایم۔ ایس۔ سی ہیں۔ چند سال امریکہ میں مزید ریسرچ کی غرض سے بھی گزار چکے ہیں اور اب پشاور یونیورسٹی

میں شعبۂ کیمسٹری کے سربراہ ہیں، مؤلف ؒ کے تعلیمی تفوق کے پیشِ نظر کتاب بڑے شوق سے پڑھنے لگا اس خیال سے کہ اتنے بڑے عالم فاضل کی وساطت سے ان بزرگوں کی حالاتِ زندگی کے مطالعہ کا موقع صرف ایک دوسرے زاویے سے ملیگا، کیونکہ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالاتِ زندگی اس سے قبل یا تو ان کے کسی مرید کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتا تھا جس میں اُن کی زندگی کے حالات کم اور "کرامات" کا سلسلہ لامتناہی اور طویل ہوتا تھا۔ اور یا ان کے کسی مجاور کے رشحاتِ قلم ہوتے تھے جو اپنی روزی کمانے کے لئے اِن کے نام سے دکان سجاتا اور محیّرالعقول خودساختہ "کرامات" ان کی طرف منسوب کرکے عوام پر رعب ڈالتا اور اس طرح ایک ایسے کاروبار کی بنیاد رکھ لیتا جس میں نہ سرمایہ لگانا پڑتا، نہ کاروبار کے مندا پڑجانے کا خوف اور نہ مال کے ضائع ہوجانے کا ڈر ہوتا۔ یہ تو شراب کی طرح ایسا مال ہے جس پر جتنی زیادہ مدت گزرتی جائے اُتنی ہی قیمت بڑھتی جائے۔ شیطان حضرتِ انسان کو ہمیشگی کے ایک درخت اور ایک لازوال بادشاہت کا گر بتانے لگا تھا تو قرآن کریم کے الفاظ میں یہ کہا کہ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ۔ لیکن ان اولیاء حضرات کے نبض شناس اور چالاک مجاوروں نے جس جس طرح کے گُر اور کرتب ایجاد کئے ہیں اُن تک شیطان کا دماغ بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ شیطان کے سبق میں تو مُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ تھا۔ یعنی ایسی بادشاہی جس پر زوال نہیں آئے گا۔ لیکن یہاں تو ایسی بادشاہی ہے کہ زوال کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں، یہاں تو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہی ترقی ہے اور ہر آئندہ کل گزشتہ کل سے تابندہ اور درخشندہ ہوتی ہے۔ اگر حضرات اولیاءِ کرام اپنے ان مجاوروں کی اس سوداگری کو دیکھتے تو یقیناً چیخ اٹھتے۔

ہمارے سوات و بنیر کے علاقے میں پیر بابا علیہ الرحمت کا مزار ہے۔ ان کے ایک مجاور سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ اُس ملاقات میں ذرا کھل کر باتیں ہوئیں اس نے کہا کہ پیر باباؒ کے مجاور اب تعداد میں بہت زیادہ ہوگئے ہیں اور شکرانے کے پیسے بہت کم۔ اُس نے بتایا کہ سال میں میری باری صرف پانچ دن ہوتی ہے۔ پچھلے سال میری بار کا مارچ کے مہینے میں آئی تھی۔ اور پانچ دن کے قلیل عرصہ میں مجھے سات ہزار روپے ملے۔ (ویسے مارچ اور اپریل سیزن کے مہینے ہوتے ہیں۔ زائرین سینکڑوں کی تعداد روزانہ آتے ہیں)

تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ پروفیسر صاحب کی تالیف شدہ کتاب کو اس لئے شوق سے پڑھنے لگا کہ طور پر یہ کتاب ایسی کرامات و واقعات کا مجموعہ ہوگی جسے قرآن کی سند بھی حاصل ہوگی، اسو کی نشاندہی بھی، اور عقلِ سلیم کے میزان میں تولے جانے کے قابل بھی ہوگی۔ لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

اس میں "نوادر" تو بہت سارے ہیں لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے فی الحال صرف دو نمونے پیش کرنے کا "ثواب" حاصل کرتا ہوں:۔

(i) "عبدالقادر جیلانی ابھی رحمِ مادر میں تھے کہ ان کی والدہ صاحبہ ایک باغ میں گئی۔ وہاں سیب کے درخت سے سیب توڑنے لگی، ذرا اونچا تھا۔ کوشش کرنے لگی۔ ہاتھ پہنچنے والا ہی تھا کہ اُس نے پیٹ میں ایسا محسوس کیا جیسے پیٹ میں کسی نے چٹکی کاٹی ہو۔ اور درد کی وجہ سے بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی کیا دیکھتی ہے کہ وہ سیب نیچے گر گیا۔ اور اس سے ایک بہت زہریلا کیڑا باہر نکل آیا۔ وہ حیران ہو گئی یہ حیرانی بدستور ان کی رہی یہاں تک کہ غوث الاعظمؒ پیدا ہو گئے۔ اور آپ چار ماہ کے ہو گئے۔ چار ماہ کے تھے۔ جھولے میں پڑے ہوئے تھے کہ والدہ صاحبہ نے پیار سے اُس کے رخسار پر آہستہ سے چپت مارا۔ عبدالقادر جیلانیؒ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اماں جان آپ نے شاید مجھ سے وہ بدلہ لے لیا جبکہ میں نے آپ کو سیب کے زہریلے کیڑے سے بچانے کے لئے چٹکی کاٹی تھی۔" ص۱۲

(ii) "ایک دن غوث الاعظمؒ جا رہے تھے کہ انہیں تین خچر شراب کے مشکوں سے لدے ہوئے راستے میں ملے۔ یہ شراب سلطان کے استعمال کے لئے تھی شراب کی بدبو بہت تیز تھی۔ طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ کوتوال کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ وہ ڈر کے مارے بھاگنے لگا اور خچروں کو بھی دوڑانے لگا۔ حضرتؒ نے خچروں پر آواز کسی۔ وہ جہاں تھے وہیں دم بخود کھڑے ہو گئے۔ کوتوال وغیرہ پیٹ کے ایسے شدید درد میں مبتلا ہو گئے کہ وہیں گر پڑے۔ جب سب تڑپنے لگے اور لگے توبہ استغفار کرنے، تو حضرتؒ نے ان کے حال پر رحم کھایا۔ وہ سب اپنی اصلی حالت پر آ گئے لیکن شراب سرکہ میں بدل گئی۔" ص۲۹

یہ دو نمونے تو ہوئے اُن کرامات کے جو غوث الاعظمؒ سے پہلے کسی فرد کو ان سے نہیں نوازا گیا ہے خواہ وہ رسول ہی کیوں نہ ہو۔ اور اُن کے بعد تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ان کرامات کی فہرست میں ایک کرامت یا ولایت ایسی بھی خوش قسمتی سے شامل کی گئی ہے جو عوام سے بھی خدا کے فضل سے اکثریت کو حاصل ہوئی ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اسے کرامت کہا جائے یا کچھ اور۔ بہرحال، نوشہروی صاحب کا یہ دعوے ہے کہ غوث الاعظمؒ کے والد کی عمر ساٹھ سال تھی۔ تجربہ اور حکمت کی

تُو سے اس عمر میں پیدائش کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن انبیاء اور اولیاء اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ غوث الاعظمؒ کی پیدائش بھی ایک کرامت تھی "۔ ص ۱۵

اس کرامت میں نوشہروی صاحب نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے اور اس کرامت کے حلقے میں نادانستہ طور پر عوام بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ورنہ کہاں عوام اور کہاں کرامات۔

اتنی ڈگریاں اور سندیں حاصل کرنے اور امریکہ میں کئی سال رہنے کے بعد جناب نوشہروی کو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ مرد کے جرثومہ حیات ہرگز ختم نہیں ہوتے ہیں خواہ اس کی عمر ایک سو پچاس سال تک کیوں نہ پہنچ جائے۔ میں نے ان کو لکھا ہے کہ ایسی کرامتیں تو روزانہ ظہور میں آتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں آتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کرامت کا اعزاز نہ صرف مسلمانوں کو حاصل ہے بلکہ انگریز، روسی، ہندو، سکھ، سب اس سے مساوی نوازے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ غوث الاعظمؒ کی کرامت کا پَرتَو ہے یا اور کوئی چیز ہے۔

جب اس قسم کی مضحکہ خیز اور عقل سوز کرامات اس "بحر الانوار" میں میری نظر سے گذریں تو بھائی صاحب پر بڑا خفا ہؤا کہ باایں عقل و دانش انہوں نے اس کتاب کو اپنی لائبریری میں کیونکر جگہ دی ہے۔ کہنے لگے کہ لڑکی پشتو بائی پرافیشنسی میں امتحان دے رہی ہے۔ یہ کتاب اس کے کورس میں شامل ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ پروفیسر صاحب کے حق میں سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا ۔ کار طفلاں خراب خواہد شد

میں نے اس کتاب پر تفصیلی مراسلہ لکھا ہے اور پروفیسر صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے۔ دیکھئے ہیں جواب میں کیا لکھتے ہیں۔ میں یہ مراسلہ مرتب کر رہا تھا کہ ادارہ کی طرف سے خط آیا کہ میں متوقع "طلوع اسلام کالج" کے بارے میں ایک مختصر مقالہ کنونشن کے موقع پر پیش کردوں۔ اس خط میں اشارۃً کہا گیا ہے کہ مقالے کا محور مندرجہ ذیل دو سوالات ہوں۔

(۱) کالج کی اہمیت۔
(۲) کالج کے قیام کے لئے عملی تجاویز۔

(۱) کالج کی اہمیت کا اندازہ تو آپ نے میرے ان تمہیدی سطور سے لگا لیا ہوگا — آپ نے دیکھا، کہ ہمارے بچوں کے تعلیمی نصاب کس طرح فرسودہ و بے بنیاد کہانیوں اور عقل سوز افسانوں پر مشتمل ہیں اور پھر اس دور میں جب انسان چاند پر محو خرام نظر آرہا ہے۔ ایک طرف تو اسی امریکہ کے انسان نے ایک صحیح نصاب کی راہنمائی میں اپنے ذہن کو جلا بخشی اور چاند کے سینے میں اپنا قومی جھنڈا گاڑ کر لِمَنِ الْمُلْکُ کا اعلان

کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ دوسری طرف اِسی امریکہ کے ایک فارغ التحصیل یعنی ہمارے زیرِ بحث دانشور صاحب نے غلط نصاب کی وجہ سے اپنے ذہن کو جلا ڈالا ہے اور زمین میں دھنسا جا رہا ہے۔ خود تو یہ دھنسا جا رہا اور ڈوبا جا رہا ہے، لیکن ڈوبتے ڈوبتے ہماری آئندہ نسل کو بھی ڈوبنے کا اعزاز بخش رہا ہے اور بزبانِ حال وقال کہہ رہا ہے۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

زیادہ افسوس تو اس بات پر ہے کہ اتنا زیادہ قومی نقصان پہنچانے اور نئی نسل کو تباہ و برباد کرنے کے بعد اپنے اس کارنامے پر نہ نادم ہے اور نہ اسے احساسِ زیاں ہے بلکہ فخریہ انداز میں "عرضِ حال" کے عنوان سے اس کتاب میں یوں رقمطراز ہے۔

> ۱۹۵۰ء کا زمانہ تھا۔ میں لاہور میں طالب علم تھا۔ سردار عبدالرب نشتر اس وقت وہاں گورنر تھے۔ ایک دن لاہور قلعہ کی درکشائی کی رسم منائی گئی، نشتر صاحب نے افتتاح کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا کہ قیامت کے دن جب میں اللہ کے دربار میں پیش ہونگا اور اللہ تبارک و تعالیٰ میرے اعمال کے بارے میں پوچھیگا تو میں جواب میں کہوں گا کہ اور تو کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے البتہ اتنا یاد ہے کہ ایک دن ایک نیک کام کیا تھا اور وہ یہ کہ بزرگوں کے ہاتھوں کا لاہور شاہی قلعے کا دروازہ جو مدت بعید سے بند پڑا تھا درکشائی کی تھی، تاکہ مخلوقِ خدا آزادی کے ساتھ اس میں آ اور جا سکے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ مجھے اس کی وجہ سے بخشدے۔ یہی حال میرا بھی ہے، مجھے تو قوی امید ہے کہ یہ کتاب میری بخشش کا سبب بنے گی۔"

——— کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا ——— اسی کو کہتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ صاحب قوم کے بچوں کو تباہی اور دوزخ کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے اور دوسری طرف اللہ میاں سے بخشش کی قوی آس بھی لگائے بیٹھا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ اُس نے اپنے لئے نمونہ نشتر مرحوم کو بنایا ہے۔ اگر نشتر مرحوم گورنری کی حیثیت سے حکم دے کر اور مزدوروں سے دروازہ کھلوا کر جنت کا مستحق ٹھہر سکتے ہیں جس میں نہ "ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آئے" تو ہمارے نوشہروی صاحب پوری ایک کتاب نقل کرنے کے بعد کیونکر جنت کا دعویدار نہیں بن سکتا ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوگی کہ نوشہروی صاحب نے کتاب کے آخر میں کتابوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے جن سے انہوں نے اپنی کتاب مرتب کی ہے۔ اور جب میں اِن کتابوں کو گننے لگا تو یہ گنتی انتیس تک پہنچ گئی۔ یہ کتاب ——— انتیس (۲۹) کتابوں

کا نچوڑ ــــ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔

لیکن جنت تو وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ قرآن میں کرتا ہے اور اس کا استحقاق کا مرحلہ بڑے صبر آزما قربانیوں کے بعد آتا ہے۔ جیسے قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط

تم جنت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے ہو جب تک تم پر بھی وہ مصائب اور تکالیف نہ آئیں جو تم سے قبل تمہارے آباؤ اجداد پر اللہ کی راہ میں آئی تھیں۔ وہ آلام و مصائب سے لرزنے لگے حتیٰ کہ رسول اور مومنین پکار اٹھے کہ یا الہ العالمین تیری مدد کب آئے گی ؟؛

اور پھر ایک جنت نشتر مرحوم اور نوشہروی صاحب کے اذہان کی تعمیر شدہ ہے اور دونوں نوعیت کے جنتوں پر علامہ اقبالؒ نے جس خوبی سے روشنی ڈالی ہے وہ بھی سماعت فرمائیے۔

بہشتے بہر پاکان حرم است　　بہشتے بہر ارباب ہمم است
بہشتے فی سبیل اللہ ہم است　　بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش

یہ تو ہوئے ان کے وہ خوش آیند توقعات اور خوش فہمیاں جن کی بنیادوں پر انہوں نے بہشت فی سبیل اللہ کھڑی کی ہے۔ لیکن اس موقع پر ایک دوسرے دانشور جن کو اس کتاب کا "تعارف" لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے، مختصر طور پر ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ان صاحب کا اسم گرامی (مولانا) عبدالقادر[1] ہے۔ ایم۔اے ہیں۔ بڑے عالم، فاضل مشہور ہیں۔ بڑے اہم علمی محکموں سے متعلق رہے ہیں۔ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے کافی مدت تک ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ ہزاروں روپے تنخواہ لیتے رہے ہیں۔ ابھی پچھلے سال ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ان کے ملفوظات بھی سنیئے۔ اس نادر اور بے مثل کتاب پر کس دریا دلی سے جناب مؤلف کو داد دے رہے ہیں۔

جن اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کے حالات فاضل مؤلف جناب عبدالرؤف نے اس کتاب میں بیان کئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ یہ ہر قاری کے لئے آج بھی رشد و ہدایت کی باعث ہونگے۔ فاضل مصنف علم کیمیا کے پروفیسر ہیں اور پشاور یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ کہاں سائنس، پھر سائنس میں علم کیمیا اور پھر کہاں

[1] افسوس کہ مولانا بھی اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

تصوف، لیکن یہ اللہ کا فضل ہے جس پر ہو جائے۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔"

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جس کسی نے ناجائز کمائی سے کوئی بلڈنگ وغیرہ تعمیر کرلی ہو تو اس کے ماتھے پر هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ یا ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ لکھا ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آیت کے اس ٹکڑے سے یہ صاحب بتانا یہ چاہتا ہے کہ اگر مجھے اپنی محنت، اہلیت اور قابلیت کے لحاظ سے بدلہ ملتا تو یہ مکان ہرگز تعمیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو خدا بھلا کرے رشوت، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ کا، کہ ایک رات میں میری دنیا بدل گئی۔ اسی طرح مولانا عبدالقادر صاحب کا جناب عبدالرؤف نوشہروی کے حق میں ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ لکھنا غالباً یہی ظاہر کرتا ہے کہ نوشہروی صاحب نے جو امتحانات پاس کئے ہیں یا جو ڈگریاں حاصل کی ہیں، بطور استحقاق نہیں ہیں بلکہ "من فضل ربی" ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ ورنہ بات ظاہر ہے۔ کتاب کے اقتباسات آپ کے سامنے آئے ہیں۔ اس میں جو کچھ نمونۃً پیش کیا گیا ہے اسے مولانا عبدالقادر فضل اللہ یعنی اللہ کا فضل کہتے ہیں۔ اگر اسے اللہ کا فضل کہا جائے تو معلوم نہیں اللہ کا قہر اور غضب کسے کہنا پڑے گا۔

اس مقالے میں اگر کتاب کے "عرضِ حال" اور "تعارف" کے عنوانات کو زیرِ بحث لانے کے بعد ایک تیسرے عنوان "انتساب" کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے تو یہ نہ صرف اس مقالے کے ساتھ بے انصافی ہوگی بلکہ زیرِ بحث تصنیف بھی گلہ کرے گی۔ جناب نوشہروی صاحب اس کتاب باصواب کو اپنے بچوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے مادیت کے اس دور میں اُن کے لئے روحانیت کا حصار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بابت وہ "انتساب" کے زیرِ عنوان یوں لکھتے ہیں۔

> "میں اپنے بچوں — جاوید، طاہرہ، ظفر، ناصرہ اور عطیہ کے نام منسوب کرتا ہوں تاکہ آج کے مادی دور میں جبکہ لوگ روحانیت سے دور بھاگ رہے ہیں، ان کی زندگی روحانیت کی چار دیواری میں گزرے۔
>
> میں ڈرتا ہوں کہ یہ سیلاب کہیں میرا یہ سرمایہ اپنے ساتھ بہا نہ لے جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کی راہ نمائی اِن کو اس سیلاب سے بچائے رکھے۔"

پشاور یونیورسٹی کے دو بلند پایہ عالموں کے خیالات سے آپ روشناس ہوگئے۔ اگر اتنے بڑے بڑے عالم، اتنی بڑی بڑی ڈگریوں کے حصول کے بعد بھی صحیح تربیت اور صحیح نصابِ تعلیم کے فقدان سے نہ تو مردِ مومن کی نگاہ پیدا کر سکتے ہوں اور نہ دانائے راز کا دل، تو لامحالہ وقت آگیا ہے کہ ہم "قرآنی کالج"

کی بنیاد رکھیں اور مخصوص نصاب کے تحت قرآن کی روشنی میں اپنی نئی پود کو ایک بار پھر پکاریں کہ سے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

لیکن بدقسمتی سے اگر ہم نے اب بھی قرآن کی تعلیمات کے مطابق اپنے اس قرآنی کالج کے قیام کو نظر انداز کیا اور اس کے لئے جدوجہد میں کوتاہی سے کام لیا تو ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کے لئے قبر کھود رہے ہیں اور کل جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہمارے سامنے ہماری اولاد کھڑی کی جائے گی، تو ہمارے پاس کیا جواب ہوگا جب اللہ میاں پوچھیگا۔ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ؟ --- میدانِ حشر کی اس ندامت اور خجالت سے اگر ہمیں کوئی چیز بچا سکتی ہے تو یہ صرف قرآنی کالج ہو سکتا ہے۔

III۔ (ا) اب رہیں عملی تجاویز۔ اس کے بارے میں گزارش ہے کہ ہر بزم ایک خاص رقم اپنی استطاعت کے مطابق پورے خلوص اور دیانت سے کنونشن میں سالانہ ادا کرنے کا اعلان کرے اور اسے اگلی کنونشن سے قبل ادا کرنے کا عہد کرے۔ یہ عہد ایسا ہو کہ زمین پھٹ جائے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے مگر اس میں کسی قسم کی کمزوری نہ آنے پائے۔

(ب) ایک ایک روپے کے ٹکٹ جو اس مقصد کے لئے چھپوائے گئے ہیں جاری رکھے جائیں۔ اس کے نتائج مفید نکل رہے ہیں۔

(ج) ہاں ایک بات جو میرے خیال میں بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جس جس طرح ہماری بزموں کے پاس رقم پہنچتی رہے، ساتھ کے ساتھ ادارے کو بھیجی جاتی رہے تاکہ تعمیری کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہونے پائے۔ اس طرح رقمیں ادارے کو پہنچتی جائیں گی اور کمرے بنتے جائیں گے۔ انشاء اللہ چند سالوں میں کمرے ہی کمرے نظر آئیں گے۔

ہم جو بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور اُن کے دیو ہیکل عمارتیں آج دیکھ رہے ہیں یہ ایک دن یا ایک سال میں نہیں بنی ہیں بلکہ سالہا سال کی سعی و کاوش اور ایثار و قربانی کا نتیجہ ہیں۔ علی گڑھ اور پشاور یونیورسٹیاں ایک لمبی مدت میں اس مقام تک پہنچی ہیں۔ اگر ہماری کوششیں ایسی جاری رہیں اور ہماری ہمتیں ہمتِ مرداں کے کارنامے دکھاتی رہیں تو قرآنی کالج انشاء اللہ اسی شان و شوکت سے ہمارے عزیز نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بنے گا جو کسی زمانہ میں غرناطہ اور قرطبہ سنبھالا کرتے تھے، قرآنی تعلیمات کے چشمے جاری ہو جائینگے اور ہم مسلمان قرآن کی حقانیت پر ایمان رکھنے والے ایک دفعہ پھر کہہ سکینگے کہ

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ط

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ — پاکستان — دس روپے
سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے
سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان — ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

جلد (۲۳) — اکتوبر ۱۹۷۰ء — نمبر (۱۰)

فہرست

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۶ ستمبر کی صبح' طلوع آفتاب سے بھی پہلے ، زندہ دلانِ لاہور اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ان سڑکوں پر ہولئے جو باٹا پور ، برکی ، ہڈیارہ کے محاذوں کی طرف جاتی ہیں ـــــ بچے ، بوڑھے ، جوان ، حتیٰ کہ عورتیں بھی ـــــ کشاں کشاں ، رواں دواں ، جوق در جوق ـــــ اکثر و بیشتر پیدل ، کچھ سائیکلوں پر ، بعض موٹر سائیکلوں پر ، ایک خاص وضع قطع کے افراد رہڑھوں پر ۔ دن زیادہ چڑھا تو ٹرکوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ۔ ہر ایک کا چہرہ شگفتہ و شاداب ۔ سینہ میں جذبات کا بے پناہ تلاطم جو اپنے اظہار کے لئے بے ساختہ مختلف شکلیں اختیار کر رہا ہے ۔ کوئی سیٹیاں بجاتا ہے ، کوئی تالیاں پیٹتا ہے ، کوئی ترانے گاتا ہے ۔ اکثر منچلے بھنگڑا ڈالتے راستوں کو پیچھے چھوڑتے چلے جا رہے ہیں ۔ ایسا جوش و خروش ، ایسا ولولہ و طنطنہ ، نہ کبھی عید کی تقریب پر نظر آیا ، نہ کسی عرس یا میلے پر ۔ وہ جو غالب نے کہا تھا کہ ـــــ

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

تو اس کاروانِ جذب و شوق کا ہر فرد اسی کا مظہر دکھائی دیتا ہے ۔

یہ کاروانِ کیف و مستی کہاں جا رہا ہے ؟ اور کیوں جا رہا ہے ! اس سمت تو نہ کوئی قابلِ ذکر بستی ہے نہ آج کوئی خاص تقریب ہے ۔ پھر اس قافلہ کی منزلِ مقصود کون سی ہے ! اور وہاں کونسا مقناطیس ہے جس کی کشش انہیں بے اختیار اپنی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے ۔

یہ کاروانِ عشق و مستی ، پاکستان کی ان نئی زیارت گاہوں کی طرف رُخ کئے ہوئے ہے جن کی خاک کے ذرّے ان شہدا کے مقدّس خون کے آئینہ دار ہیں جنہوں نے آج سے پانچ سال قبل " اپنا آج ہمارے کل کے لئے قربان کر دیا تھا " یوں تو سارے ملک کو وہ محیر العقول داستانیں ابھی تک یاد ہیں لیکن اہل لاہور کے

توں کی دھڑکنیں ہنوز خاموش نہیں ہوئیں جو ستمبر ۱۹۶۵ء کے سترہ دنوں میں ان کے لئے موت اور زندگی کی کشمکش کی علامات بن رہی تھیں۔ یہ افرادِ کارواں اپنی نذرِ عقیدت پیش کرنے جا رہے ہیں اُن مجاہدوں، غازیوں اور شہیدوں کی بارگاہ میں جن کی جانبازانہ ہمت اور سرفروشانہ معرکوں کے صدقہ میں یہ آج زندہ بھی ہیں اور آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بھی ـــ اہلِ لاہور کا یہ جذبہ اور وفورِ شوق، دلیل ہے اس حقیقت کی، کہ یہ لوگ احسان فراموش نہیں۔

یہ انبوہِ عظیم، کارواں در کارواں ان میدانوں میں پہنچ گیا جہاں آج سے پانچ سال پہلے، وہ معرکہ سرزد ہوا تھا جس نے دانشورانِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا، اور جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا ـــ لیکن وہاں ان کے لئے نہ کوئی انتظام تھا نہ اہتمام۔ لاہور میں یہ موسم ویسے ہی خاصا گرم ہوتا ہے اور امسال اس کی حدت اور شدت خاص طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ ان میدانوں میں کوئی سایہ دار درخت بھی ایسے نہیں جو ان قافلوں کے لئے مسافر نواز بن سکیں۔ یہ "دیوانے" سارا دن، اسی شدت کی دھوپ میں ـــ اور شاید بھوکے پیاسے، ان گرد و غبار سے اَٹے ہوئے میدانوں میں رقصاں و جنباں، گھومتے پھرتے اور اپنے جذباتِ شوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے۔ اور اس کے بعد انہی جذبات کے زور پر شام کو واپس آ گئے ـــ واپسی پر بھی ان کے جوش اور ولولہ کا وہی عالم تھا۔

قوموں کے اس قسم کے جذبات بڑے قیمتی ہوتے ہیں اور انہی کی بنیادوں پر، زندہ قومیں اپنے مستقبل کی عمارتیں استوار کرتی ہیں۔ لیکن کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ ہمارے ہاں یہ جذبات، مضطرب موجوں کی طرح خود ہی اُبھرتے ہیں اور اس کے بعد خود ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ کوئی، اس سیلِ بے پناہ کو نظم و ضبط کے ساحلوں میں محصور کر کے، جوئے نغمہ خواں میں تبدیل کرنے کی فکر نہیں کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ انتظام حکومت کی طرف سے ہونا چاہیئے ـــ ایک منظم پروگرام کے ماتحت، اس روز، لاہور سے محاذات تک ٹرانسپورٹ کا انتظام ہو۔ ان میدانوں میں ان افراد کے بیٹھنے اور ستانے کے لئے سایہ اور فرش کا انتظام ہو۔ ابھی تک ہماری افواج میں، وہ افسر اور نوجوان موجود ہیں جو اس جنگ میں اِن محاذوں پر لڑے تھے۔ وہ اُ فسران پیکرانِ خلوص و محبت کو ساتھ لے کر، مختلف مقامات پر جائیں اور انہیں بتائیں کہ یہاں کیا ہوا تھا اور وہاں کیا۔ دشمن کی نفری کتنی تھی، ان کا سامانِ حرب و ضرب کس قدر حد و د فراموش تھا۔ ان کے عزائم کیا تھے۔ انہوں نے ان محاذوں پر کس طرح حملہ کیا اور ہمارے جیوش و عساکر نے، تعداد کی اس قدر قلت اور سامانِ جنگ کی اس قدر کمی کے باوجود، انہیں کس طرح استخواں شکن شکستیں دیں۔ ظاہر ہے کہ جنگ کی داستانیں جو اُن مجاہدین کی زبانی بیان ہونگی جو خود ان معرکوں میں شریک تھے، جو اثر پیدا اور جو ولولے بیدار کر سکتی ہیں، ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ہی قوم کو یہ بھی بتایا جائے کہ اب دشمن کے عزائم کیا ہیں اور ان کے پیشِ نظر ہماری ذمہ داریاں کیا۔ بیشک اس "میلہ" میں شگفتہ کھیل تماشے بھی ہوں اور سنجیدہ تفریح کے سامان بھی۔ آلات جنگ کے معائنے بھی ہوں اور فوجی نقل و حرکت کے مظاہرے بھی۔ اس طرح اس دن کو ایک زندہ اور پُرکشش تقریب کی شکل دے کر، قوم کے ان حرارت آمیز جذبات کو صحیح مصرف میں لایا جائے اور یوں ہماری اس معرکہ آرائی، فیصلہ کن جنگ کی داستانِ زریں، آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتی چلی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی قوت کا راز جذبۂ جہاد میں مضمر تھا لیکن، ایک خاص سازش کے ماتحت، قوم کے دل سے جہاد کی اہمیت کو اس قدر کم اور رفتہ رفتہ محو کر دیا گیا کہ اب "خالد" اور "طارق" نام رکھنے کے علاوہ، قوم کو کچھ یاد ہی نہیں کہ جہاد نے کیا کچھ کیا تھا اور ہماری زندگی میں اس کا مقام کیا ہے۔ آپ کی ساری تاریخ قلم اور زبان کے معرکوں سے لبریز ہے لیکن تیغ و سناں کی چمک (صدرِ اول کے بعد) کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ حجرہ نشیں زاہدوں، اور بادیہ پیما قلندروں کے محیر العقول افسانے آپ کو ہر منبر و محراب سے سنائی دینگے لیکن سربکف مجاہدوں اور کفن بدوش غازیوں کی معرکہ آرائیوں کے تذکرے آپ کے لئے کہیں بھی فردوسِ گوش نہیں بنیں گے۔ خود حکومت کے محکمہ اوقاف کو دیکھئے۔ ان کی طرف سے کسی سائیں بوہڑ شاہ کے عرس اور کسی حضرت سیت شاہ کے ختم کے لئے ہزاروں روپے وقف ہو نگے لیکن حرام ہے جو سال بھر میں کسی مجاہد کی یاد میں یا کسی شہید کی تقریب شہادت کے سلسلہ میں ایک پائی بھی خرچ کی جائے۔ ان کی طرف سے کتابیں بھی شائع ہوں گی تو انہی کے کشف و کرامات سے مملو ۔۔۔ تاکہ قوم، مزاجِ خانقاہی میں پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر محکمۂ اوقاف جنگ ستمبر کے شہداء کی یاد میں، مذکورہ بالا تقریب کو اسکے شایانِ شان طریق سے منانے کے لئے ضروری رقم مخصوص کر دے تو ہو سکتا ہے کہ وہ، اس محکمہ کی "بخشش" کا ذریعہ بن جائے۔

معلوم نہیں "میلہ مویشیاں" (ہارس اینڈ کیٹل شو) کا ڈھول فوج کے گلے میں کیسے پڑ گیا ۔۔۔ بھلا فوج کا میلہ مویشیاں سے کیا تعلق ۔۔۔ لیکن بایں ہمہ، جس حسنِ تدبیر سے اور نظم و نسق سے وہ اس میلہ کا انعقاد کرتی ہے، وہ فوجی روایات کے مصداق ہیں۔ ہم ملک کے محکمۂ دفاع سے مشورۃً گزارش کرینگے، کہ وہ "میلہ مویشیاں" کے بجائے، جنگ ستمبر کی تقریب منانے کا فریضہ اپنے ذمے لیں اور اسے ایک ہفتہ تک پھیلا دیں۔ اسی میں لاہور سٹیڈیم یا فوجی فورٹرس میں منعقد ہونے والی تقاریب بھی شامل ہوں، اور جنگ کے محاذات پر منعقد کی جانے والی محافل بھی۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے ہماری ملی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا ۔۔۔ ایک درخشندہ اور حیات بخش باب کا اضافہ۔

لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر رفتہ رفتہ عوام کے یہ جذبات افسردہ ہو جائیں گے اور اس کے بعد ہماری اس روح پرور معرکہ کی یاد بھی دلوں سے محو ہو جائے گی۔ اور اگر محاذوں پر جانے کا یہ سلسلہ کسی طرح جاری بھی رہا تو پھر یہ بھی اسی قسم کی رسم بن کر رہ جائے گی جس قسم کی رسمی تقاریب ہماری عیدیں بن چکی ہیں ـــــ ہم عیدالفطر کی تقریب مناتے تو اس ذوق و شوق اور طرب و مسرت سے ہیں لیکن کسی کو اس کا علم و احساس بھی ہوتا ہے کہ یہ تقریب کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے ـــــ لوگوں کو نہ حق و باطل کا عظیم انقلابی معرکہ جنگ بدر یاد ہے (جو سترہ رمضان کو واقع ہوا تھا) نہ نزولِ قرآنِ کریم کی انسانیت ساز تقریب کا کچھ علم ـــــ عیدالفطر انہی دو تقاریب کا حسین مجموعہ ہے جسے اب محض رسم کے طور پر منا لیا جاتا ہے ـــــ اگر جنگِ ستمبر کے سلسلہ میں محاذوں پر جانے کی روش باقی بھی رہی تو یہ محض ایک رسم بن کر رہ جائے گی۔ ضرورت ہے کہ اسے بے جان رسم بن کر رہ جانے سے بچایا جائے اور اس کی روح کو زندہ اور تابندہ رکھا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ حکومتِ پاکستان کا اولین فریضہ ہے جس کی ادائیگی نہایت ضروری ہے۔ قومیں اپنی تاریخ کے اسی قسم کے اوراق کے صدقے زندہ رہا کرتی ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ (ان رازہائے سربستہ کو چھوڑ کر جن کا افشا قرینِ مصلحت نہیں) جنگِ ستمبر کی ایک مصدقہ تاریخ مرتب اور شائع کی جائے ـــــ لیکن جو قوم اور جو حکومت' تحریکِ پاکستان کی مستند تاریخ اور بانیٔ پاکستان کے باوثوق سوانح حیات مرتب نہیں کر پائی، اس سے یہ توقع کرنا کہ جنگِ ستمبر کی مستند تاریخ مرتب اور شائع کر دے گی' اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنا ہے ـــــ لیکن اس فریب خوردگی کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے! پاکستان کی محبت میں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

کسے معلوم تھا عشق اس طرح لاچار کرتا ہے
دل اس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے

ـــــ (پٰیٰڑ) ـــــ

طلوع اسلام کی تیرہویں سالانہ کنونشن

امسال، طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن، اپنے روایتی وقار و سنجیدگی اور سادگی و شادابی کیساتھ،

ادارہ طلوع اسلام، واقعہ بی/۲۵۔ گلبرگ (۲)۔ لاہور میں

مؤرخہ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵ر اکتوبر، بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار منعقد ہوگی

کنونشن کے کچھ اجلاس خصوصی ہونگے جن میں صرف بزمہائے طلوع کے ارکان و مدعوئین خصوصی شرکت کر سکینگے۔ باقی اجلاس کھلے ہونگے جن میں وہ دیگر حضرات بھی شامل ہو سکینگے جو پیش کردہ مقالات، خطابات، تقاریر کو سکون اور سنجیدگی سے سننا چاہیں۔

کھلے اجلاسوں کا مشروط پروگرام حسب ذیل ہوگا!

(۱) پہلا اجلاس ——— ۲۳ر اکتوبر۔ بروز جمعہ ——— بوقت۔ ۲½ بجے دوپہر
خطاب پرویز صاحب ——— قدیم اور جدید کی کشمکش
(کیا قوانین شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟)

(۲) دوسرا اجلاس ——— ۲۴ر اکتوبر۔ بروز ہفتہ ——— بوقت۔ ۲½ بجے دوپہر
مجلس مذاکرہ ——— جس میں بالعموم طلباء و طالبات حصہ لینگے۔
عنوان ——— اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

(۳) تیسرا اجلاس ——— ۲۴ر اکتوبر۔ بروز ہفتہ ——— بوقت۔ ۸ بجے شب
مجلس استفسارات ——— پرویز صاحب، آپکے (موصول شدہ) سوالات کے جوابات، قرآن کریم کی روشنی میں دینگے۔ یہ مجلس بڑی بصیرت افروز اور حقیقت کشا ہوتی ہے

(۴) چوتھا اجلاس ——— ۲۵ر اکتوبر ——— بروز اتوار۔ ——— صبح۔ دس بجے
خطاب پرویز صاحب ——— قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگاموں سے نہیں!
(ملک میں آندھیوں کے جو طوفان اُٹھ رہے ہیں، ان کا نہایت ٹھنڈے دل سے تجزیہ، اور علم و بصیرت کی رُو سے اس بحران کا علاج)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، طلوع اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں جیسی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی فکری محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آدابِ مجلس کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مستورات کے لئے الگ پردہ کا انتظام ہوتا ہے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

قرآن مجید سمجھ میں نہیں آتا

اب آپ ایسا نہیں کہہ سکتے ـــــ کیوں؟ اس کا جواب غور سے سنیئے!

پرویز صاحب ہمارے دور کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر قرآن مجید پر غور و فکر میں صرف کی ہے اور گزشتہ تیس سال سے اپنی فکر کے نتائج کو مسلسل قوم کے سامنے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی دو درجن سے زاید نہایت بلند پایہ تصانیف اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں۔ آخر میں انہوں نے اپنی تمام فکری کاوشوں کو دو اہم تصانیف میں سمٹا دیا ہے جن سے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت کا صحیح مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ان میں سے پہلی تصنیف ہے

لغات القرآن

جس میں قرآنی الفاظ کے صرف لغوی معانی نہیں دیئے گئے بلکہ ان کا واضح مفہوم نہایت دلکش انداز میں سامنے لایا گیا ہے ـــ یہ گراں بہا علمی تصنیف چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ جن کی مجموعی قیمت پچاس روپے ہے۔

اسکے ساتھ ہی انہوں نے پورے قرآن مجید کا مفہوم (الحمد سے والناس تک مسلسل) اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ آپ اسے ایک کتاب کی طرح پڑھتے جائیے۔ قرآنی مطالب نکھر کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔ اس کا نام ـــ

مفہوم القرآن

ہے۔ اس سے پہلے اس کے ستائیس پارے شائع ہوئے تھے۔ اب ہمیں امید ہے کہ کنونشن کے موقعہ پر ہم اس کا مکمل سیٹ (تین نہایت خوبصورت پائیدار جلدوں میں) پیش کر سکیں گے۔ اس کے بعد کسی کو یہ شکایت نہیں رہے گی کہ قرآن مجید سمجھ میں نہیں آتا۔　　　واللہ المستعان

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

نقد و نظر

ماہنامہ حکایت (لاہور)

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے ایک دفعہ یہ دعا مانگی تھی کہ ـــــ خدا بھائیوں کی اس جوڑی کو سلامت رکھے۔ یہ بھائی تھے، خورشید عالم اور عنایت اللہ ـــــ اول الذکر ۱۹۴۷ء کا پاکستانی کہ اسلام کا درد اور پاکستان کی محبت جس کے خون کے ذرات میں حلول کر چکی ہے۔ اور ثانی الذکر وہ کہ جنگِ ستمبر کے شہداء سے عشق گویا اس کا جزوِ ایمان ہے۔ یہ دونوں سیارہ ڈائجسٹ میں رہتے اور اسے اپنے خونِ جگر کی آبیاری سے "شجرِ طیب" بنائے چلے جا رہے تھے۔ لیکن سرمایہ داری کے تقاضے کچھ اور تھے، اس لئے ڈائجسٹ کے مالکوں کو ان کی یہ روش پسند نہ آئی اور انہیں بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اپنے رفقائے کار کے ساتھ ان کے تعلقات کس نوعیت کے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کے نکلنے کے ساتھ ہی عملہ کا بیشتر حصہ حتےٰ کہ خوش نویسوں تک' ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔ اور اب انہوں نے اپنا ماہنامہ ـــ حکایت ـــ جاری کیا ہے جس کا پہلا شمارہ' جو جنگِ ستمبر نمبر ہے' ہمارے سامنے ہے۔ وہی آن بان۔ وہی حسن و زیبائی۔ مضامین کا وہی معیار' اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ پا بہ زنجیر تھے اس لئے ان کے قلم کی جولانگاہ' زنجیر کی لمبائی تک محدود تھی۔ اب یہ آزاد ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ نے جس انداز سے جنگِ ستمبر کے مجاہدوں اور شہیدوں کی یاد قائم کر رکھی تھی' اب وہی فریضہ پہلے سے بھی زیادہ جگر سوزی اور بیباکی کے ساتھ حکایت سرانجام دے گا۔ چنانچہ پہلے ہی شمارہ میں' چونڈہ کی ٹینکوں کی ہولناک جنگ، کھیم کرن کی اذان۔ بلوچ رجمنٹ۔ پاک فضائیہ کے شاہین، سیالکوٹ کے صحن میں ـــ جیسے حرارت افروز مضامین اس کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ ماہنامہ ملک کے سنجیدہ طبقہ کی طرف سے ہر قسم کی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

قیمت۔ فی پرچہ ۲ روپے　،　سالانہ خریداری۔ پندرہ ۱۵/- روپے

پتہ:۔ ۵۳ ۔ شارع فاطمہ جناح۔ لاہور

ـــــــ (۰۰۰) ـــــــ

یہی شہادتِ جاں اور یہی تسلیمِ جاں ہے زندگی

> ۱۰ ستمبر کی شام، بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال میں شہدائے پاکستان کی یاد میں ایک روح پرور اجتماع منعقد ہوا جس میں پرویز صاحب نے برجستہ خطاب فرمایا۔ اسے از سرِ نو مرتب کر کے، زینتِ اوراقِ طلوعِ اسلام کیا جاتا ہے!

صدرِ گرامی قدر، و عزیزانِ محترم۔ سلام و رحمت۔

آج صبح نماز کے وقت، ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو آواز آئی — پرویز صاحب! یومِ استقلالِ پاکستان مبارک — آواز اس قدر جذب و کیف میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے سننے کے ساتھ ہی — اِک لرزشِ خفی میرے سارے بدن میں تھی — یہ آواز تھی جنگِ ستمبر کے اس مردِ مجاہد کی جس نے کھیم کرن، اور چھنڈہ، دونوں محاذوں پر سرفروشانہ معرکے سر کئے تھے، اور جنگ کے بعد جن کی دعوت پر مجھے پاکستان کی نئی زیارت گاہوں کی خاک بوسی کی سعادت نصیب ہوئی تھی[1] — میں نے ان کا دلی شکریہ ادا کیا لیکن اس احساس سے بے حد ندامت ہوئی کہ اس ہدیۂ تبریک کی پہل میری طرف سے ہونی چاہیئے تھی کیونکہ اس کے حقیقی مستحق تو یہ مجاہد اور غازی تھے جن کی جاں فروشیوں کے تصدق، ہم آج زندگی سے ہمکنار ہیں — لیکن شہید اور غازی پر کون سبقت لے جا سکتا ہے۔ اس لئے اس باب میں بھی سبقت انہی کا حق تھا۔ حقیقت یہ ہے، برادرانِ عزیز! کہ اگر ہمارا ملی احساس بیدار اور ہماری غیرت جوان ہوتی تو ہمیں آج کا دن، جشنِ عید کی طرح منانا چاہیئے تھا — جیسے

---

[1] جنگ کے مختلف محاذوں کے پرویز صاحب کے چشم دید حالات، "پاکستان کی نئی زیارت گاہیں" کے عنوان سے طلوعِ اسلام میں بالاقساط شائع ہوتے تھے۔

جسے آپ عید (الفطر) کہتے ہیں' آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس واقعہ کی یاد کا جشن ہے۔ روزے' سب سے پہلے' ۲ھ میں فرض ہوئے اور سترہ رمضان کو بدر کے میدان میں' حق و باطل کی ابدی کشمکش کا وہ معرکہ پیش آیا جو انسانیت کی موت و حیات کے لئے فیصلہ کن لمحہ تھا ـــ اور رمضان ہی میں' نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ عید الفطر' نزولِ قرآن کریم اور فتحِ بدر کا جشنِ عید تھا۔ یہی فیصلہ کن حیثیت ہماری ملّی زندگی میں ستمبر ۱۹۶۵ء کے معرکہ کو حاصل ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد' سال میں دو دن ایسے آتے تھے جنہیں ہم حاصلِ مراد قرار دیتے تھے۔ ایک یومِ پاکستان' جب قوم نے اپنے لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت کے حصول کے عزمِ راسخ کا اعلان کیا۔ اور دوسرا یومِ آزادی جب ہمارا مقصود حاصل ہو گیا۔ لیکن اب ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں یہ تیسرا دن ایسا ہے جو ان دونوں دنوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس لئے زیادہ اہم ہے کہ ایک پیدائشی اندھے کی بینائی سے محرومی بھی کچھ کم وجہِ سوہانِ روح نہیں ہوتی لیکن جو شخص بینائی حاصل کرنے کے بعد' کسی حادثہ سے' پھر سے نابینا ہو جائے' اس کی باقی زندگی کس قیامت خیز کربِ اضطراب سے گزرتی ہے' اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حصولِ آزادی سے پہلے' ہم آزادی کی لذت سے ناآشنا تھے۔ اس لئے اس سے محرومی ہمارے لئے باعثِ دردِ سر تو ضرور تھی' وجہِ سوزِ جگر نہیں تھی۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد اگر ۶۵ء کی جنگ کے نتیجہ میں' خدانکردہ' ہزار بار خدانکردہ' ہم اپنی آزادی سے محروم ہو جاتے تو اس سے ہماری جو حالت ہو جاتی' اس کے تصوّر سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جو میرے نزدیک' وہ دن' جب ہماری آزادی چھنتے چھنتے بچی' اور ہماری متاعِ حیات لٹتے لٹتے محفوظ رہی' ہماری تاریخ کا عظیم ترین دن ہے۔ اور وہ جنہوں نے اُس وقت اپنی جانیں دے کر ہماری زندگی کا سامان مہیا کر دیا' اس قابل کہ ـــ جب تک پاکستان زندہ و پائندہ ہے' خدا اسے ابدالآباد تک زندہ و پائندہ رکھے ـــ ملّتِ پاکستانیہ کا ہر فرد' بصد خلوص و محبت' اور بہ ہزار تسلیم و نیاز' ان کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرے۔

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما سازگار آمد!

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۲/۱۵۷)

ـــــــــ (٥) ـــــــــ

ہم میں کیریکٹر نہیں

عزیزانِ من! آج جو درد مند حضرات قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں' وہ سب کچھ کہہ سُن لینے کے بعد' ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر' باصد حسرت و یاس' یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ صاحب! قوم کی جو جو خرابیاں گنائی گئی ہیں' وہ سب اس میں موجود ہیں۔ وہ جس تباہی کے گڑھے کی طرف کشاں کشاں اور رواں دواں چلی جا رہی ہیں' اس کا بھی ہمیں احساس ہے۔ اس زوال اور انحطاط کا

جو انجام ہوا کرتا ہے وہ بھی ہماری چشم تصور کے سامنے ہے لیکن ہم ان خرابیوں کے اسباب و علل پر جوں جوں غور کرتے ہیں، ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم میں کیریکٹر نہیں رہا۔

جس نتیجہ پر یہ حضرات پہنچتے ہیں وہ باون تولے چار رتی درست ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔ قومیں ڈوبتی اُس وقت ہیں جب ان میں کیریکٹر نہیں رہتا۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟ وہ کیا چیز ہے جس کا قوم میں فقدان ہے۔ کیریکٹر کا لفظ تو ایک اصطلاح ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی اصطلاح کا مفہوم واضح نہ ہو بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ آج ہمارے ہاں جس قدر ذہنی خلفشار اور عملی تشتت و انتشار پیدا ہو رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوم کو یکے بعد دیگرے، نہایت خوشنما، نگاہ فریب سحر انگیز اصطلاحات دی جارہی ہیں جن کا متعین مفہوم کبھی سامنے نہیں لایا جاتا۔ یہ مبہم اصطلاحات رفتہ رفتہ سلوگن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر بلند آہنگ نعرے بن کر فضا میں ارتعاش پیدا کئے چلی جاتی ہیں۔ عوام ان اصطلاحات سے مسحور ہو کر آنکھیں بند کئے، ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور نہ یہ کسی سے پوچھتے ہیں، نہ انہیں کوئی بتاتا ہے کہ ان الفاظ کے معانی کیا ہیں اور ان اصطلاحات کا مفہوم کیا۔ جن کی خاطر انہیں اس قدر قربانیاں دینے کے لئے آمادہ اور مشتعل کیا جاتا ہے — "ہم اس لئے تباہ ہو گئے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے"؛ ہم جب تک اسلام کے پابند نہیں ہوتے، ہماری بگڑی بن نہیں سکتی"؛ "ہمیں کہیں سے کوئی نظریہ، کوئی مسلک، کوئی لائحہ عمل مستعار لینے کی ضرورت نہیں۔ اسلام، ہماری، بلکہ پوری نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے"؛ یہ اور اسی قسم کے دیگر سلوگن، ہم برسوں سے سنتے چلے آرہے ہیں اور ان نعروں سے مسحور ہو کر معلوم عوام کس قدر قربانیاں دے چکے اور دے رہے ہیں۔ لیکن آج تک اتنا کسی نے نہیں بتایا کہ وہ اسلام ہے کیا جسے چھوڑنے سے ہمارا یہ حشر ہو گیا ہے، اور جسے اختیار کرنے سے ہمارا ہر کام سنور جائے گا — "اسلام" کی اصطلاح سے آگے بڑھے تو پھر "اسلامی نظام"، "اسلامی آئین"، "اقامتِ دین"، "نظامِ شریعت" جیسی اصطلاحات سامنے لائی گئیں اور عوام سے کہا گیا کہ ان کی تمام مشکلات کا حل اس نظام اور آئین کے اندر موجود ہے۔ عوام بیچارے ان دعاوی کو بھی اعلاناتِ مسیحا سمجھ کر ان کے پیچھے لگ گئے لیکن انہیں کسی نے اتنا بتانے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ان اصطلاحات کا عملی مفہوم کیا ہے۔ پھر "بھائی جمہوریت" کی اصطلاح کا غوغا بلند ہوا اور اس زور شور سے کہ اس نے صورِ اسرافیل کو بھی مات کر دیا۔ اصطلاح یہ بھی مبہم ہی رکھی گئی۔ آجکل فضا میں "اسلام کا معاشی نظام"، "اسلامی سوشلزم"، "مساواتِ محمدی" جیسی اصطلاحات گونج رہی ہیں۔ اس میں بھی ہر مدعی کا دعویٰ یہ ہے کہ اصلی اور سکہ بند مال صرف اسی کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ دوسروں کے ہاں جعل سازی ہے، نقالی ہے۔ فریب ہے، دغا بازی ہے۔ لیکن کیفیت پھر وہی ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم کوئی بھی واضح نہیں کرتا۔

محض سلوگن

اب ظاہر ہے کہ جس قوم کا معمولِ زندگی یہ ہو چکا ہو کہ اس میں اصطلاحات عام کی جائیں لیکن ان کا مفہوم کبھی واضح نہ کیا جائے، وہاں اگر یہ کہا جائے کہ ہماری تمام خرابیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا، لیکن اس کی وضاحت نہ کی جائے تو اس کا گلہ کس سے کیا جائے اور تقاضا کس سے؟ تقاضا کرنے پر بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ یہاں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے، دوسرے کو دھوکا دیتا ہے، رشوت کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر شخص جائز اور ناجائز ہر طریق سے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا ـــ یہ ٹھیک ہے کہ ان خرابیوں کا سبب یہی ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا لیکن سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں جس کے نہ ہونے سے یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ـــ آئیے، ہم آج کی نشست میں یہ دیکھیں کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں، کہ جب تک اس اصطلاح کا مفہوم واضح نہیں ہوگا، جن مردانِ حق آگاہ کی یاد منانے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کی عظمتِ شان و رفعتِ مقام کے صحیح نقوش ابھر نہیں ہو سکیں گے۔

ـــــــ (۰) ـــــــ

کیریکٹر کسے کہتے ہیں

کیریکٹر کی وضاحت میں عام طور پر ایک مثال سے کیا کرتا ہوں جسے دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ نقاہت سے آپ کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپ اپنے ایک دوست کے ہاں جاتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ پلاؤ کا گرم گرم قاب آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ آپ لپک کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ لقمہ اٹھاتے ہیں کہ اتنے میں باورچی اندر سے آکر کہتا ہے کہ صاحب! یوں تو اس پلاؤ میں ہر چیز نہایت اعلیٰ معیار کی ہے لیکن غلطی سے نمک کی جگہ اس میں سنکھیا پڑ گیا ہے ـــ سوچئے کہ کیا اس کے بعد آپ وہ لقمہ منہ میں ڈال لیں گے؟ آپ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ اتنی شدید بھوک کے باوجود آپ اسے باہر پھینک دیں گے ـــ ڈر اور لالچ وہی محرکات ہوتے ہیں جن سے آپ کسی سے اس کی خلافِ منشاء کام کرا سکتے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ آپ اس پلاؤ کو کھا لیجئے ورنہ آپ کو قید کرا دیا جائے گا تو آپ پھر بھی اسے نہیں کھائیں گے۔ اور اگر کوئی شخص آپ کو پچاس ہزار روپیہ رشوت کے طور پر دے تو آپ اسے بھی ٹھکرا دیں گے۔ زہر آلود پلاؤ کبھی نہیں کھائیں گے۔ اس سوال کے جواب کے لئے کہ آپ ایسا کیوں نہیں کریں گے، اس قدر شدت کی بھوک، قید و بند کے خوف اور اتنی بڑی رشوت کے لالچ کے باوجود اسے کیوں ٹھکرا دیں گے، کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے کہ اسکے کھانے سے چونکہ آپ کو جان کا خطرہ لاحق ہے اس لئے آپ بھوک برداشت کر لیں گے لیکن اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالیں گے۔ بالفاظِ دیگر، جان کے خطرے کے مقابلہ میں آپ بھوک کی تکلیف کو ترجیح دیں گے۔

اب اسی مثال کو آپ ذرا آگے بڑھائیے۔ جب آپ نے اس پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تھا، اگر اس وقت آپ کا وہ دوست آپ سے یہ کہتا کہ بھائی! اس پلاؤ میں ہر شے بالکل خالص اور اعلیٰ درجہ کی ہے، لیکن یہ ہے چوری کے مال کا۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس وقت بھی اس لقمہ کو باہر پھینک دینگے یا کھا جائینگے۔ بس اس سوال کے جواب سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ اگر آپ اسے کھا جائینگے تو کہا جائے گا کہ آپ میں کوئی کیریکٹر نہیں۔ اور اگر آپ بھوک کی تکلیف برداشت کر لینگے لیکن اس ناجائز مال سے حاصل کردہ کھانے سے پرہیز کرینگے تو سمجھا جائے گا کہ آپ کا کیریکٹر بلند ہے۔ اور اگر آپ مہیب سے مہیب خوف اور بڑے سے بڑے لالچ کے باوجود اس کے کھانے سے اجتناب کرینگے تو کہا جائے گا کہ آپ کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔

لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ، اتنی سخت بھوک کے باوجود، ایسے اچھے کھانے کو مسترد کیوں کرتے ہیں؟ آپ اسے کھا کیوں نہیں لیتے؟ اس میں سنکھیا تو پڑا نہیں جو آپ کو نقصان کا احتمال اور جان کا خوف ہو۔ وہ تو نہایت عمدہ کھانا ہے۔ چوری کا ہے تو ہوا کرے، اس سے کھانے کی نوعیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے اور اسی کے سمجھنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں اور جو لوگ ایسے مقام پر کیریکٹر کا ثبوت دیتے ہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں!

حیوانی جبلت کے تقاضے

ماہرین علم الحیات ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی اپنے مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی حیوانات کے پیکر میں نمودار ہوئی تو اس کی اگلی کڑی انسانی ہیئت تھی جسے قرآن نے احسن تقویم سے تعبیر کیا ہے اور جسے ہم سمجھنے کی خاطر، انسانی سطح زندگی کہہ کر پکارتے ہیں۔ انسان میں اگر ۹/۱۰ حصہ حیوانی زندگی ہے تو ۱/۱۰ حصہ انسانی زندگی کا بھی ہے، جو حیوانی زندگی سے یکسر متمیز اور ممتاز ہے۔ حیوانات ایک اندرونی تہیج (URGE) کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں جسے جبلت (یا INSTINCTS) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے بنیادی جذبہ تحفظ خویش (SELF - PRESERVATION) کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہے کہ ہر ذی حیات، ہر قیمت پر اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے لئے اسے جس قدر ذرائع و اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے حاصل کرتا اور محفوظ رکھتا ہے۔ چیونٹی کی ننھی سی جان ہوتی ہے۔ اسکے راستے میں ایک ذرا سا تنکا رکھ دیجئے اور دیکھئے کہ وہ اس سے محفوظ رہنے کے لئے کس قدر تڑپتی اور تلملاتی ہے۔ اور، وہ جو کہتے ہیں کہ بلی کے پاؤں جلنے لگے تھے تو اس نے اپنے بچے کو پاؤں تلے لے لیا تھا، تو وہ بھی اسی جذبۂ تحفظ خویش کی نمود تھی۔ زندگی نے تحفظ خویش کا یہی جذبہ انسان کو بھی ودیعت کیا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا اور زیادہ سے زیادہ سمیٹتا ہے، اس کا محرک یہی جذبہ ہے — یہی اسکے

نزدیک نفع اور نقصان ماپنے کا پیمانہ ہے۔ ہر وہ عمل جس سے اسے تحفظ حاصل ہو اس کے نزدیک نفع بخش ہوتا ہے اور جس سے اس کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہو، نقصان رساں۔ وہ جو آپ نے زہر آلود پلاؤ نہیں کھایا تھا، تو اس کا محرک بھی یہی جذبۂ تحفظِ خویش تھا۔ اس میں نہ آپ کی کوئی کاریگری تھی، نہ خصوصیت۔ ایسے مقام پر حیوان بھی یہی کرتا ہے۔ جس چیز سے اسے خطرہ لاحق ہوتا ہے وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ چیل کے ملنے سے مرغی کے چوزے کس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں تلے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور بلی کی میاؤں سے چوہیاں کس طرح بلوں میں گھس جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی جان بچانے کے لئے بھوک کی تکلیف برداشت کر لیتا ہے تو اسے اس کا کیریکٹر نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کیریکٹر کا یہی معیار ہو تو پھر جانوروں سے بڑھ کر بلند کیریکٹر کا حامل کون ہو سکتا ہے؟ اگر آپ اپنے نفع کی سوچتے ہیں اور نقصان سے بچتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ آپ سمجھ سے کام لیتے ہیں ۔۔ کیونکہ پاگل اُسے کہتے ہیں جو اپنے نفع نقصان کا خیال نہ رکھے ۔۔ دنیا اس پر ہنستی ہے۔

لیکن اس سے آگے ایک اور مقام آتا ہے جو حیوان اور انسان کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ ایک بیل کو بھوک لگے اور اسکے دائیں جانب اپنے مالک کا کھیت ہو اور بائیں جانب کسی اور کا، تو وہ دائیں اور بائیں میں امتیاز کئے بغیر جس کھیت سے جی چاہے چارہ چر لے گا ۔۔ اور یہ چیز اس کے خلاف نہ قانونی جرم قرار پائے گی نہ اخلاقی عیب۔ لیکن ایک انسان اگر ایسے مقام پر، اپنے کھیت کے بجائے غیر کی کھیتی سے غلہ لے جائے تو کہا جائے گا کہ اس نے ایک ناجائز کام کیا ۔۔ جائز اور ناجائز کی تمیز، انسانی سطحِ زندگی سے شروع ہوتی ہے

جائز اور ناجائز کی تمیز

حیوانی سطح پر اس کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ اس جائز و ناجائز کا تعین ایک تو انسانی معاشرہ کرتا ہے ۔۔ بعض باتوں کو وہ قانوناً ناجائز قرار دیتا ہے اور بعض کو سوسائٹی کے نقطۂ نگاہ سے معیوب۔ لیکن معاشرہ کا یہ معیار، حالات اور مصالح کے مطابق بدلتا رہتا ہے ۔۔ آج جو بات قانوناً ناجائز ہے، کل ہی جب اس قانون میں ترمیم کر دی جائے گی تو وہ جائز قرار پا جائے گی۔ آج جس روش کو سوسائٹی معیوب قرار دیتی ہے کل ہی وہ روش سوسائٹی کا معمول (فیشن) بن سکتی ہے ۔۔ علاوہ ازیں، ہر ملک کا قانون الگ الگ، اور ہر قوم کا معاشرہ جدا جدا ہوتا ہے۔ جو بات ایک کے ہاں معیوب و مذموم ہوتی ہے وہ دوسرے کے ہاں مستحسن و ممدوح سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا، انسانی معاشرہ کا معیار، عالمگیر انسانیت کے لئے جائز اور ناجائز، محبوب اور مذموم کا معیار نہیں بن سکتا۔ یہ معیار خدا کی

اس کا معیار

طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوتا ہے جو عالمگیر بھی ہے اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، غیر متبدل اور ابدیت درکنار بھی۔ اس معیار کی رُو سے جو امور جائز اور مستحسن قرار

پاتے ہیں، انہیں اسلام کی زبان میں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے طبیعی تقاضوں کا تعلق، اس کی حیوانی سطحِ زندگی سے ہے اور مستقل اقدار کا تعلق اس کی انسانی سطحِ زندگی سے۔ جو نظریۂ حیات، جو تصورِ زندگی، جو مسلک و مشرب، انسان کی طبیعی زندگی ہی کو زندگی کی آخری کڑی اور اس کے طبیعی تقاضوں ہی کو منتہائے مقصود اور حاصلِ مراد سمجھتا ہے، قرآن اسے کفر تعبیر کرتا ہے، وہ

صرف حیوانی زندگی کفر ہے

کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ۔ (۴۷/۱۲) جو لوگ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور جسم کے طبیعی تقاضوں ہی کو منتہائے مقصود قرار دے لیتے ہیں، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس، جو لوگ زندگی کے طبیعی تقاضوں کے ساتھ ساتھ، مستقل اقدار کی صداقت پر بھی یقین رکھتے ہیں، انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ جسم کے طبیعی تقاضے، یا بالفاظِ دیگر، حیوانی جبلت (INSTINCTS) تو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ اسی لئے ان کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی طبیعی تقاضا اور مستقل قدر میں تصادم ہو جائے یعنی ان میں (TIE) پڑ جائے، تو اس وقت جو شخص طبیعی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے مستقل قدر کو قربان کر دے، اس کے متعلق کہیں گے کہ اس میں کیریکٹر نہیں اور جو شخص مستقل قدر کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے وہ بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ "مال صدقۂ جان، اور جان صدقۂ آبرو" سمجھ بوجھ اور کیریکٹر کے مفہوم کی وضاحت کے لئے نہایت جامع محاورہ ہے۔

اب ہمارے سامنے، برادرانِ عزیز! کیریکٹر کی صحیح (DEFINITION) اور اس کا واضح مفہوم آگیا۔

کیریکٹر کا مفہوم

یعنی جب جسم کے کسی تقاضا، یعنی حیوانی جبلت اور مستقل قدر میں تصادم ہو، تو جبلی تقاضا کو قربان کر کے، مستقل قدر کو محفوظ رکھنے کا نام کیریکٹر ہے۔ جب آپ سے کہا گیا تھا کہ وہ پلاؤ ویسے تو خالص اور عمدہ ہے لیکن ہے چوری کا، تو اس وقت، جسم کے ایک طبیعی تقاضے اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ بھوک کا تقاضا تھا کہ پلاؤ کھا لیا جائے لیکن مستقل قدر کا فرمان تھا کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ اگر آپ نے بھوک کے تقاضے کو ترجیح دے کر، اسے کھا لیا، تو آپ نے کیریکٹر کا ثبوت نہ دیا۔ اگر آپ نے بھوک کی تکلیف کو برداشت کر لیا لیکن مستقل قدر کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تو آپ نے عمدہ کردار کا مظاہرہ کیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک معاملہ میں، ذرا سا جھوٹ بولنے سے، دس ہزار روپیہ بلا تکلف آپ کی جیب میں آجاتا، با ایں نمط کہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر تک نہیں ہو سکتی۔ اگر اس وقت آپ اتنے بڑے لالچ کو ٹھکرا دیتے ہیں اور سچ پر قائم رہنے کی مستقل قدر کی حفاظت کرتے ہیں تو اسے کہیں گے آپ کا کیریکٹر ــــ بس یہ ہے کیریکٹر اور

علم کیریکٹر میں فرق اور یہ ہے کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز۔ جس قدر شدید وہ تقاضا ہوگا جس پر آپ مستقل اقدار کو ترجیح دیتے ہیں، اتنا ہی بلند آپکا کیریکٹر ہوگا اور اتنا ہی درخشندہ آپ کا حسنِ عمل۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، جبلّی تقاضوں (INSTINCTS) میں، تحفظِ خویش یعنی جان کی حفاظت کا جذبہ شدید ترین ہے۔ خود قرآن کی رُو سے بھی انسانی جان کس قدر گراں بہا ہے، اس کا اندازہ سورۃ المائدہ کی اس آیت سے لگائیے جس میں اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ (۵/۳۲) جس نے کسی ایک انسانی جان کو بھی ناحق تلف کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کی زندگی ضائع کر دی۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا یوں سمجھو گویا اس نے ساری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی۔ اسی لئے اس نے تاکیداً کہا ہے کہ ـــــ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۔ (۲/۱۹۵) اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالا کرو۔

لیکن مصافِ زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں ایک طرف جان جیسی متاعِ گراں بہا ہوتی ہے اور دوسری طرف حق کی حفاظت، جو بلند ترین مستقل قدر ہے۔ یہ مقام بڑی شدید کشمکش کا مقام اور

موت اور حیات کی کشمکش

یہ آزمائش بڑی صبر آزما اور ہمت طلب آزمائش ہوتی ہے۔ حیوانی جبلّت کا شدید ترین تقاضا ـــــ تحفظِ خویش ـــــ پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ تم نے ایک قدم آگے بڑھایا اور موت کے بھیانک غار میں جا گرے۔ دوسری طرف انسانی زندگی کی نشید جاں فزا یہ مژدۂ دلنواز و روح پرور سنا رہی ہوتی ہے کہ ایک قدم آگے بڑھاؤ اور حیاتِ فانی کے مادی قالب سے نکل کر حیاتِ جاوداں کی عروسِ جمال افروز سے ہمکنار ہو جاؤ۔ یہی وہ شدید ترین کشمکش ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲) موت اور حیات کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ تم دیکھ سکو کہ تمہاری ذات میں اس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے کہ تم اس جہانِ رنگ و بو کی رعنائیوں اور دلکشیوں سے صرفِ نظر کر کے، حیوانی زندگی کے اس قدر شدید تقاضے کو جھٹک کر، حیاتِ جاوید کے مستحق قرار پا جاؤ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، تم اس حقیقت کا مشاہدہ کر لو کہ ؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اِک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۔ (۸/۲۴) اے مومنین! تم خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو

تمہیں ایسی چیز کی طرف بلاتی ہے جس سے تمہیں حقیقی زندگی عطا ہو جائے گی۔ یعنی ایک تمہاری موجودہ زندگی ہے جو طبیعی قوانین کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے اور جس نے ایک دن بالآخر ختم ہو جانا ہے۔ خدا اور رسول کی یہ دعوت تمہیں اس عارضی زندگی کے بجائے، وہ حقیقی زندگی عطا کرے گی جو کبھی فنا نہیں ہوگی۔ تم اس سودے کے نفع نقصان پر غور کرو اور سوچو کہ یہ دعوت تمہیں کس قدر قلیل قیمت کے عوض کیسی متاعِ بے بہا دے رہی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ جب تک زندگی اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ نہیں ہوا تھا، یہ زندگی اس قابل تھی کہ اس کا پورا پورا تحفظ کیا جاتا۔ لیکن جب ان دونوں میں تصادم ہو جائے تو پھر طبیعی زندگی کے معیارِ نفع و نقصان سے بلند ہو کر حقیقی زندگی کی منفعت بخشیوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ یہی مومن کا شعار ہے۔ یہی بلندیٔ کردار کا ثبوت ہے۔ یہی مفہوم ہے اس بلند حقیقت کا جسے اقبالؔ نے ان حسین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

جو مردانِ حقیقت شناس، عام حالات میں اپنی جان کی حفاظت کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں، لیکن جب مستقل اقدار کے تحفظ کا سوال سامنے آجائے تو اسی جان کو بطیبِ خاطر، بنفسی خوشی، جانِ آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں، ان کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری سطح بین نگاہیں یہی فیصلہ دیں گی کہ وہ مر گئے کیونکہ ان کی سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اصل

حیاتِ جاوداں کے مستحق

یہ ہے کہ وہ درحقیقت مرتے نہیں۔ وہ زندگی کی نچلی سطح کی قیمت ادا کر کے اس سے بلند تر سطح کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۔ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (۲/۱۵۴)؛ جو لوگ اللہ کی راہ میں، یعنی مستقل اقدارِ خداوندی کی حفاظت کے لئے، قتل ہو جائے انہیں مردہ مت کہو۔ وہ مردہ نہیں، زندہ ہیں لیکن تمہارا شعور، جو زندگی کو محض نفس شماری سمجھتا ہے، اس بلند سطح کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتا۔

میزانِ خداوندی میں اس سے زیادہ وزنی کوئی حسنِ عمل نہیں۔ ایسا وزنی کہ اگر کسی کو اس سے پہلے، کوئی نیک کام کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو، تو یہ ایک گراں بہا عمل، اس کے لئے جنت کا ضامن بن جائے۔ کیا آپ نے اس خوش بخت و فیروز مند عمرو بن ثابتؓ کا واقعہ نہیں سنا جو اسلام نہیں لایا تھا۔ غزوۂ احد کے دن، جب حق و باطل کی جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں، اس کے دل میں صداقت نے جوش مارا۔ مسلمان ہوئے تلوار ہاتھ میں لی۔ جانفروشانہ لڑے اور شہید ہو گئے۔ حضورؐ نے لاش کو دیکھ کر فرمایا کس قدر خوش نصیب ہے یہ کہ جس نے کبھی ایک وقت کی نماز تک نہ پڑھی لیکن سیدھا جنت میں جا پہنچا۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیئے قصے تمام
اس زمین و آسماں کو بےکراں سمجھا تھا میں

اس کے برعکس، ایسے تصادم کے وقت، جو لوگ اپنی جان کی حفاظت کے خیال سے میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھیں، انکے متعلق تقدیر کے قاضی کا فیصلہ کیا ہے؟ اسے سننے سے پہلے، ذرا چشمِ تصور میں لائیے اس منظر کو کہ بدر کے میدان میں حق و باطل کا سب سے پہلا معرکہ درپیش ہے۔ حق کی مدافعت کے لئے، خود حضور نبی اکرمؐ کی قیادت میں ان صحابہ کبارؓ

میدانِ جنگ سے بھاگ جانے والے

کا لشکر صف آرا ہے جن کی شمعِ ایمانی ظلمت کدۂ عالم میں ہمارے لئے دلیلِ راہ اور مشعلِ ہدایت بنتی ہے۔ عین اس وقت جب لشکر مسلمانوں کے چلے جڑھائے جا چکے تھے، یہ تنبیہہ خداوندی نازل ہوتی ہے کہ یاد رکھو! وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۔ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ (۸/۱۶)۔ آج کے دن جو شخص بھی دشمن سے منہ موڑ کر بھاگے گا — بجز اسکے کہ ایسا کرنا کسی جنگی ضرورت کے لئے یا اپنی دوسری پارٹی سے ملنے کے لئے ہو — تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ خدا کے غضب میں ماخوذ ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ اس کی عمر بھر کی نیکیاں سب غارت ہو جائیں گی۔ قرآن نے کہا کہ اس طرح میدانِ کارزار سے بھاگ کر تم مزید چند دنوں کے لئے سانس تو زور سے لے سکو گے لیکن اس ذلت کی زندگی میں جو جہنمی موت پوشیدہ ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۔ (۱۴/۱۷) اس میں ہر طرف سے موت اپنے خونی پنجے نکالے یلغار کرتی ہوئی آتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ مرتے بھی نہیں کہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ اس ذلت کی "مرگ آفریں" زندگی اور اس عزت کی حیات آور موت میں جو فرق ہے اسے اقبالؒ نے ان حقیقت کشا الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

کھول کے کیا بیاں کروں، سرِ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بےشرف

مرگِ باشرف اور حیاتِ بےشرف کا یہی وہ نازک ترین دوراہا تھا جس پر ہم نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، اپنے آپ کو اچانک کھڑے پایا تھا — اُف! کیسا تھا وہ نازک مرحلہ اور کس قدر فیصلہ کن

۶ ستمبر کا دوراہا

تھا ہمارے سفرِ حیات میں وہ دوراہا — بال سے باریک، اور تلوار سے تیز "پل صراط" جس پر سے اگر ذرا سا بھی پاؤں پھسلے تو ساری کی ساری قوم تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا گرے۔ ہندو جیسا منتقم مزاج، روباہ صفت، تنگ نظر، اور انتہائی کمینہ دشمن اٹھارہ برس کی مسلسل تیاری کے

بعد پاکستان سے پانچ گنا زیادہ تعداد کے لشکر اور بے محابا سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ، اعلانِ جنگ کئے بغیر بے پناہ سیلاب بلا اور بلا وانگ آتش خاموش کی طرح، ایسے وقت میں ہماری سرحدوں پر آن کھڑا ہوا جب ہم سب اطمینان اور سکون کی نیند سو رہے تھے ۔ لیکن میں نے یہ غلط کہا ہے کہ ہم سب اطمینان کی نیند سو رہے تھے۔ ہم تو بے شک سو رہے تھے لیکن جنہیں جاگنے کی ضرورت تھی وہ جاگ رہے تھے۔ قرآن کریم نے جماعت مومنین طائفین کی جماعت کہا ہے۔ طائف کہتے ہیں اس چوکیدار کو جو گشت کر کے پہرہ دے تاکہ سونے والوں کی جان مال عزت، آبرو، ہر خطرہ سے محفوظ رہے۔ ہم سو رہے تھے اور ہمارے طائفین کا گروہ، جو مشتمل تھا افواجِ پاکستان کے جواں ہمت، جفاکش اور وفاکیش، فرائض شناس اور جاں سپار

شب زندہ دارانِ ملت

جیالوں پر، جو جاگ کر پہرہ دے رہا تھا۔ یہ ۵ اور ۶ ستمبر کی درمیانی رات ہی کو نہیں جاگتا رہا تھا، یہ مسلسل اٹھارہ برس سے شب بیدار تھا، یہ الگ بات تھی کہ ہم سونے والوں نے اسے کبھی جاگتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ اس کی مسلسل اٹھارہ برس کی شب بیداری کی ریاضت کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد سترہ دن تک ایک لمحہ کے لئے بھی اس نے آنکھ نہیں جھپکی، اور یہ اُنہی بندگانِ مولا صفات کی لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ - (۲/۲۵۵)۔ (نہ اُسے اونگھ آتی ہے نہ نیند) کا صدقہ تھا کہ ہم پھر اطمینان کی نیند سو سکے۔ ان خود آگاہ و خدامست شب زندہ داران کی بیداریوں کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ ہمارے ٹینک رجمنٹ کے اس وفعدار کی قلبی کیفیت سے لگایئے جسے اس کے رفقاء "حافظ جی" کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ وہ حافظِ قرآن تھا ـــــ حافظِ قرآن ہی نہیں بلکہ وہ میدانِ کارزار میں شمشیر بکف اپنے آپ کو محافظِ قرآن سمجھتا تھا اور بالکل بجا اور درست ایسا سمجھتا تھا۔ اس نے جنگ کے بعد وقائع نگار کو بتایا کہ سب سے پہلے یہ ٹینک دشمن کے مقابلہ کو پہنچے وہ میرے ٹروپ کے تھے۔ میں اپنے ٹروپ کے ساتھ مسلسل پانچ روز تک اپنے ٹینک سے فائر کرتا رہا۔ ایک روز جب شاید تین دن اور تین راتیں کھڑے کھڑے فائر کرتے گزر چکی تھیں، میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود

میں سو کیوں گیا

میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے تھام لیا اور گھبرا کر پوچھنے لگے کہ حافظ جی! کیا ہوا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا کہ میں کتنی دیر سویا تھا؟ انہوں نے کہا کہ آپ سوئے کہاں تھے۔ یونہی ذرا سی اُونگھ آئی ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے سر کو جھٹکا سا دیا اور آپ ہوشیار ہو گئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ ایک آدھ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگی تھی تو مجھے اطمینان ہوا اور میرا رعشہ تھمنے لگا۔ حافظ جی نے رعشہ کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بہت دیر تک سویا رہا ہوں۔ اس احساس سے مجھ پر عجیب سا

خوف طاری ہو گیا۔ خیال آیا کہ کس قدر مقدّس فریضہ کی ادائیگی میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگر اس حالت میں میرا ٹینک ہٹ ہو جاتا تو میں حرام کی موت مر جاتا اور اگلے جہاں جب خدا مجھ سے پوچھتا کہ بدبخت بندے! جب کفار میرے قرآن در مساجد کی سرزمین میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو اُس وقت تجھے نیند کیسے آ گئی تو میں کیا جواب دیتا؟ الحمد للہ کہ میں اس بازپرسی سے بچ گیا بس صاحب! اس کے بعد نہ بھوک محسوس ہوئی نہ نیند آئی۔ نہ یہ ہوش رہا کہ دشمن کی فوج کتنی زیادہ ہے۔ میں تھا اور خدا کی طرف سے اس پرسش کا خیال۔ اس کے بعد بھلا نیند کیسے آ سکتی تھی!

موت و حیات کی ایسی شدید کشمکش میں مستقل اقدار کے تحفظ کا احساس تھا جسے اس سادہ ذہن، پاکیزہ فطرت، وفادار نے خدا کی پرسش سے تعبیر کیا۔ یہی بلند کردار اور حسنِ سیرت کی بنیاد ہے۔ اُن سترہ دنوں میں ساری دنیا محوِ حیرت تھی کہ اتنی تھوڑی سی فوج نے، اس قدر کم اسلحہ اور سامان کے ساتھ، آتش فشاں پہاڑ کے اُس آگ کے دریا کا مقابلہ کس طرح سے کیا — اور صرف مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ اس قدر استخواں شکن شکست دی کہ ہندو کی آنے والی نسلوں کی ہڈیوں میں وہ چوٹیں وراثتاً منتقل ہوتی چلی جائیں گی۔ اور اس کے بعد بھی اس پانچ سال میں ماہرینِ فنِ حرب، حسابی قاعدے جوڑ جوڑ کر تھک گئے ہیں لیکن انہیں اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا، کہ ان مولوں نے اس قدر مہیب کرگسوں (گِدھوں) کے پر کیسے نوچ ڈالے! اس سوال کا جواب حسابی قاعدوں سے نہیں مل سکتا۔ اس کا جواب، مستقل اقدار کی صداقت پر اس ایمانِ محکم سے ملے گا جس کی رُو سے کہا گیا تھا کہ تمہارے دس مجاہد دشمن کے سو پر اور بیس مجاہد اس کے دو سو پر بھاری ہوں گے۔ یہی جواب تھا جو امریکی میگزین ٹائم کے نامہ نگار لوئیس کرار کو ہماری فوج کے ایک افیسر کمانڈنگ نے دیا تھا۔ لوئیس نے (۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء) کو لکھا

لوئیس کرار کو جواب

تھا کہ میں نے اس افسر سے پوچھا کہ اس کا بالآخر راز کیا ہے کہ آپ اسقدر قلیل التعداد ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کو یوں مغلوب کئے جا رہے ہیں۔ اس افسر نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا، مسکرایا اور کہا کہ

> اگر حوصلہ، جرأت و شجاعت ایسی اجناس ہوتیں جو بازار سے خریدی جا سکتیں تو ہندوستانی انہیں امریکی امداد کے ساتھ حاصل کر لیتے۔ (یہ متاعِ گراں بہا بازار میں نہیں مل سکتی۔ یہ سپاہی کے جذبۂ ایمان میں پوشیدہ ہوتی ہے)

سچ ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

یہی وہ شاہین جگر اور جری القلب شیران غاب ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ ۔ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۔ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۔ (۳/۱۷۲) یہ وہ ہیں کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ دشمن نے تمہارے خلاف ایک عظیم لشکر جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں ان سے ڈرنا چاہیئے تو اس سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ ۔ خدا داریم چہ غم داریم ۔ وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس اعتماد کی کیفیت اور قلّت و کثرت کے فریب تخیل کی حقیقت پوچھیئے میجر شفقت بلوچ (ستارۂ جرأت)

میجر شفقت بلوچ

سے جو اس فیصلہ کن شب کو ہڈیارے کے سیکٹر پر اپنی کمپنی کے صرف ایک سو جوانوں کے ساتھ متعین تھے۔ رات کے تین بجے انہوں نے ایک پورے بریگیڈ کو جو ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح تھا، پاکستان کی طرف بڑھتے ہوئے پایا۔ میجر شفقت نے فوراً محسوس کیا کہ ایک عظیم آزمائش کا تاریخی مرحلہ سامنے آگیا ہے۔ آسمان کی آنکھ نے جرأت و بسالت کا ایسا محیر العقول کارنامہ بہت کم دیکھا ہو گا جب ایک سو مجاہد ایک پورے بریگیڈ (قریب تین ہزار کے لشکر مہیب) پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے۔ اور انہوں نے ان کے ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور بھارتی سورماؤں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ دشمن بار بار از سر نو منظم ہو کر پوری قوت سے حملہ آور ہوا لیکن میجر شفقت اور ان کے یہ جانباز آہنی دیوار کی طرح اس کے سامنے ڈٹے رہے۔ انہوں نے مسلسل نو گھنٹے تک آگ اور خون کے اس سیلاب کا مقابلہ کیا تا آنکہ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا۔

جنگِ ستمبر کے طارق اول میجر شفقت اور اس کے جانباز رفیقو! پاکستان کی سالمیت تمہیں جھک کر سلام کہتی ہے۔

کہا جائے گا کہ اپنے ملک کی حفاظت فوج کا فریضہ ہوتا ہے جس کے لئے عند الضرورت جان بھی دینی

محض فرائض کی ادائیگی نہیں

پڑتی ہے۔ اس لئے ہماری افواج نے جو کچھ کیا وہ ان کے فریضہ کی ادائیگی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی حفاظت فوج کا فریضہ ہوتا ہے لیکن جان دینے کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے بھی جس قدر بلند جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے بالمقابل بھی ایک فوج تھی اور اپنے ملک کے عسکری عزائم کا بروئے کار لانا (خواہ وہ ہمارے یا دنیا کے نقطہ نگاہ سے کیسے ہی مذموم کیوں نہ ہوں) اُن کا بھی فریضہ تھا۔ لیکن انہوں نے جس انداز سے اس فریضہ کو ادا کیا اس کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹ گیا تھا۔ حالانکہ ان کے ارباب حل و عقد نے اس پر لاتنے دبیز پردے

ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ بھارت میں ایک ممتاز اینگلو انڈین ہیں ۔۔۔ مسٹر فرینک انتھونی ۔۔۔ بار ایٹ لاء،

فرینک انتھونی کا انکشاف

بھارت پارلیمان کے رکن اور وہاں کی دفاعی کونسل کے ممبر، انہوں نے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ریکارڈ کی بڑی دقتِ نظر سے چھان بین کی۔ ۲۹ اپریل ۱۹۶۹ء کا ذکر ہے کہ بھارت پارلیمان میں کوئی رپورٹ زیرِ نظر تھی جس کے ضمن میں وہاں کی وزارتِ دفاع نے "حسبِ معمول" اپنی افواج کے کارناموں کی فرضی داستانیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنی شروع کیں۔ جب بحث میں کافی گرمی پیدا ہو گئی تو مسٹر انتھونی خاموشی سے اپنی نشست سے اٹھے، اور اپنی تحقیقات کے نتائج کو بھری بزم میں اس انداز سے کھول کر رکھ دیا کہ اربابِ حکومت کا رنگ زرد اور چہرے فق ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ۔

> لاہور کی دہلیز پر بھارتی فوج کے کم از کم دس ہزار سپاہی اور چار سو افسر ہلاک ہوئے۔ ہماری گیارہویں کور کو، ۸ ستمبر کی شام کو لاہور کے جم خانہ میں جامِ شراب نوش کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ اس کور کے گیارہ بریگیڈیئر نااہل ثابت ہوئے اور نو پلٹنیں ناکارہ نکلیں؛ حتٰے کہ چند ایک ڈویژن کمانڈر (میجر جنرل) بھی بزدل اور بھگوڑے ثابت ہوئے اور تماشہ یہ کہ ان جرنیلوں کو جو میدانِ جنگ سے پچیس میل پیچھے دبک کر بیٹھے تھے، مہاویر چکر کا بلند ترین اعزاز عطا کیا گیا۔

یہ تھا وہ انداز جس سے اُس فوج نے اپنے فرائض کی ادائیگی کی تھی۔ اس کے برعکس، اِدھر یہ عالم تھا کہ اگر کسی کی ڈیوٹی ایسی تھی جس میں جان کا خطرہ نہیں تھا اور اس کے سامنے اگر کوئی ایسا مقام آیا جس میں جان دے کر کسی مورچے کو بچایا جا سکتا تھا، اور وہاں کا ڈیوٹی بردار شہید ہو چکا تھا، تو یہ لبیک کر اس آگ میں کود گیا اور ہنسی خوشی جان دے کر دوسروں کو خطرہ سے بچا لیا۔ میں عزیزانِ من! یہ کہہ رہا ہوں اور میری چشمِ تصور کے سامنے محاذ

میجر خادم حسین

کھیم کرن کا شہیدِ اوّل، میجر خادم حسین آ رہا ہے:- ان کی ڈیوٹی اگلے مورچہ کو گولہ بارود کا سامان پہنچانا تھا۔ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ایک طرف کو جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ پاکستان کے ایک اہم مورچہ کا توپچی شہید ہو چکا ہے اور دشمن کے ٹینک تیزی سے ان مورچوں کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ میجر خادم حسین نے محسوس کیا کہ اگر دشمن کے ٹینک ان مورچوں تک پہنچ گئے تو اس سے ہمیں بہت بڑا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ وہ رکا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس مورچے میں کود پڑا اور توپ سنبھال لی۔ بھارتی ٹینک بہت قریب پہنچ گئے تھے کہ مورچے سے پہلا دھماکا ہوا اور پہلے ہی نشانے

سے دشمن کے ٹینک کے پرخچے اڑ گئے۔ دوسرے گولے نے دشمن کا دوسرا ٹینک تباہ کر دیا لیکن اتنے میں تیسرا ٹینک مورچہ پر چڑھ آیا اور میجر خادم حسین کو مع مورچہ کے کچل دیا۔ لیکن اتنے میں لڑائی کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ پاکستان کے شہباز دشمن کے ٹینکوں پر جھپٹ پڑے تھے۔ میدان صاف ہوا تو پلاٹون کمانڈر حیات، یہ معلوم کرنے کے لئے لپک کر آگے بڑھا کہ یہ معجزہ کس "فرشتے" نے سرانجام دیا تھا! لیکن ٹینک کے نیچے کچلی ہوئی لاش کو اس وقت کون شناخت کر سکتا تھا؟ بعد میں پتہ چلا کہ وہ فرشتہ، میجر خادم حسین تھا ـــ خادم حسین اپنا سامان لئے محفوظ چلا جا رہا تھا۔ مورچہ کی توپ چلانا اس کے فرائض میں داخل نہیں تھا۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ مورچہ میں جانا، اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہے۔ سوچئے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے ہمارے اس جانباز کو "بے خطر آتش نمرود میں کود جانے" پر آمادہ کر دیا؟

> خادم حسین! سرزمین پاکستان جسے تو نے جان دے کر سرفرازی کے قابل بنا دیا، اپنی جبین نیاز سے تجھے احترام آمیز سلام کہتی ہے۔

اور اس سلام کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے، فیلڈ ایمبولینس کور کا وہ کمپاؤنڈر آ جاتا ہے جس کے خون کی رنگینی سمت ملت کی افق تابی کا موجب بنی۔ ایمبولینس کور کے جوانوں کا کام لڑنا نہیں ہوتا، زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ جنگ کے دوران ایک دن کا ذکر ہے کہ

ایک کمپاؤنڈر

بی۔ آر۔ بی کے کنارے گھمسان کا معرکہ تھا۔ نہر کے اُس پار ہمارے کچھ سپاہی رائفلیں سنبھالے، دشمن کی یلغار کو روک رہے تھے۔ نہر کے اس کنارے، فیلڈ ایمبولینس کور کے ایک کمپاؤنڈر نے دیکھا کہ ہمارا ایک سپاہی شہید ہو گیا ہے اور اس طرح حملہ روکنے والی دیوار میں شگاف پڑ گیا ہے۔ وہ نوجوان ادھر تھا۔ درمیان میں تند و تیز نہر تھی جسے دشمن کے سپاہی ہزار کوششوں کے باوجود سترہ دن تک عبور نہیں کر سکے تھے۔ ہم دیکھتے کیا ہیں کہ اس کمپاؤنڈر نے چھلانگ لگائی اور نہر کی موجوں سے ٹکراتا ہوا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ اپنے بازو پر لگے ہوئے ریڈ کراس کے نشان کو نوچ کر پھینک دیا اور وہیں ثانیہ میں اُس شہید سپاہی کی رائفل سنبھالے، اس بنیانِ مرصوص کے شگاف کو پُر کرنے کے لئے صف آرا ہو گیا۔ یہ وہ معرکہ تھا جس میں بھارتی فوج کے میجر جنرل نرنجن پرشاد کو اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ معرکہ سر ہونے کے بعد جب پلٹن کے جانی نقصان کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ایک نفری زیادہ تھی۔ یہ اضافہ ایمبولینس کور کے اسی جانباز نے کیا تھا جس نے اقبال کے اس تخیل کو حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا کہ

> بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
> عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس طرح جلتے بجھتے، دیکھتے بھالتے، خطرہ کی آگ میں کود کر جان دے دینا فرائض اور ضابطہ کی پابندی سے ماوراء جذبہ کی بنا پر ہی ممکن ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھئیے ـــــ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ یہ واقعات کچھ پہلی دفعہ آپ کے سامنے نہیں آ رہے۔ انہیں آپ اس سے پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اوروں سے تو ایک طرف، خود میں نے بھی انہیں گزشتہ برسوں کی اسی تقریب میں کئی بار دہرایا ہے اور پھر یہ طلوعِ اسلام میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت ہے[1] تاکہ ہماری وہ نسلیں جنہوں نے اس فیصلہ کن معرکہ کو دیکھا نہیں، جان لیں اور پہچان لیں کہ وہ کون تھے جن کے متعلق، واہگہ سرحد کیطرف جاتے ہوئے راستے میں، شہداء کی یاد میں ایستادہ ایک سادہ سے مینار پر یہ تابندہ و درخشندہ الفاظ منقوش ہیں کہ

"ہم نے تمہارے کل کی حفاظت کے لئے اپنا آج
قربان کر دیا ہے۔"

ٹینک رجمنٹ کا ڈرائیور

انہی میں ہماری ٹینک رجمنٹ کا ایک ڈرائیور بھی تھا جس کا ٹینک ہٹ ہو چکا تھا اور وہ زخموں سے چور، اس شکستہ ٹینک کے سائے میں بیہوش پڑا تھا۔ ادھر سے گزرتی ہوئی ایک پلٹن کے ایک نائک نے اسے دیکھا تو وہ اس کے قریب گیا۔ اس میں ہنوز سانس باقی تھا۔ فیلڈ ایمبولینس کہیں دور تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے جھولے سے پٹی نکالی کہ اس کا خون پونچھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ میں پانی ٹپکایا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے بیٹھے ہو؟ نائک نے واقعہ بتایا تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے کہا کہ گرائیں! مجھے چھوڑ دو اور اپنی پلٹن کے ساتھ ایڈوانس کرو۔ وہ نائک کہتا ہے کہ اس نے اس کی بات اَن سنی کر دی اور اس کے زخموں پر پٹی باندھتا رہا۔ اس نے دوبارہ آنکھ کھولی۔ اور نہ معلوم اس دفعہ اس میں اتنا جوش کہاں سے آگیا کہ گرجتی ہوئی آواز سے کہا کہ معلوم نہیں تم کس بے غیرت پلٹن کے نائک ہو۔ دشمن یلغار کر رہا ہے۔ تمہاری پلٹن آگے بڑھ رہی ہے اور تم عورتوں کی طرح میرے سرہانے بیٹھے مرہم پٹی کر رہے ہو۔ دوست۔ اٹھو۔ لپک کر آگے بڑھو۔ میرے بچانے کی فکر نہ کرو۔ پاکستان کو بچانے کی فکر کرو۔ وہ بچ گیا تو سب کچھ بچ جائے گا۔

نائک آگے بڑھ گیا۔ دشمن پسپا ہو گیا۔ واپسی پر دیکھا تو وہ زخمی شہید ہو چکا تھا۔ اس کی وردی خون میں لت پت تھی اور اس کی پیشانی پر ہنوز وہ شکنیں باقی تھیں جن سے اس نے نائک کو ڈانٹا تھا۔ یہ اسکے

---

[1] قرآنِ کریم نے حق و باطل کے تاریخی معرکوں کو اسی مقصد کے لئے بار بار دہرایا ہے۔

ملتے کی شکن نہیں تھیں۔ گراموفون ریکارڈ کی وہ لکیریں تھیں جن میں ان جانثاروں کی اُن محیر العقول کارناموں کی داستانیں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی تھیں جنہیں دیکھ کر آسمان کے فرشتے عش عش کرتے اور ان پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے تھے۔ تخلیقِ آدم کی تمثیلی داستان میں جب ملائکہ نے خمیرِ آدم میں آگ کی چنگاریوں اور خون کے چھینٹوں کو مضمر دیکھ کر کہا تھا کہ بارالہا! تو

مسجودِ ملائکۂ آدم

اُسے خلیفہ فی الارض بنا رہا ہے۔ مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲۰)؛ جو زمین میں خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں کریگا۔ تو ارشادِ خداوندی نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ جو باتیں میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اولادِ آدم کے یہ وہ محیر انگیز کارنامے ہیں جنہیں دیکھ کر ملائکہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے خدائے علیم و خبیر! ہمیں اپنے عجز کا اعتراف ہے کہ ہماری نگاہ آدم کی ان مضمر صلاحیتوں کو دیکھ نہیں سکتی تھی جن کی بنا پر یہ مسجودِ ملائک قرار پایا تھا۔ اس وقت ہم نے تعمیلِ ارشاد میں سجدہ کیا تھا۔ آج ہم علیٰ وجہ البصیرت آدم کے حضور احتراماً سجدہ ریز ہیں۔

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

میں یہ عظمتِ آدم کی اس آسمانی تفسیر میں کھو کر کہیں اس سرفروش کی ایمان افروز داستان کو بھول نہ جاؤں جس نے اس خطۂ ارض پر اقدار کے تقابل سے اس راز کو افشا کر دیا کہ کس طرح بڑی قدر کی خاطر چھوٹی قدر کو قربان کر دیا جاتا ہے، اور اس طرح نفع و نقصان کے نئے پیمانوں سے عالمِ انسانیت کو آگاہ کر دیا۔ یہ بیان ہماری ٹینک رجمنٹ کے ایک لانس نائک کا ہے۔ اس نے کہا کہ لڑائی کا تیسرا دن تھا اور معرکہ ایسا گھمسان کا کہ جنگ دست بدست تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ میرا ٹینک ہٹ ہو گیا تو میں نے ایک مشین گن سنبھالی۔ لیکن دشمن اتنا قریب تھا کہ اس نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اتنے

اسے میں لے لونگا

میں میں نے دیکھا کہ ہماری فوج کا ایک سپاہی جسے میں قطعاً نہیں پہچانتا تھا میرے قریب آکر لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ وقت بہت نازک ہے۔ دشمن کے ہینڈ گرنیڈ تمہارے قریب آکر پھٹ رہے ہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرتے جاؤ۔ اگر کوئی ہینڈ گرنیڈ تمہارے قریب آکر گرا تو اُسے میں لے لوں گا۔ نائک نے کہا کہ میں سمجھ گیا کہ اس نے جو کہا ہے کہ "گرنیڈ کو میں لے لوں گا" تو اس سے اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پاگل ہو رہے ہو۔ تم اپنی جان بچاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اس نے کہا کہ گرامی! بات میری اور تمہاری حفاظت کی نہیں۔ میرے پاس صرف رائفل ہے اور تمہارے پاس مشین گن ہے۔ اس وقت زیادہ ضرورت مشین گن کی ہے۔ میں مارا گیا تو ایک رائفل خاموش ہو جائیگی

اور ہم مارے گئے تو ایک شین گن بیکار ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے .....

وہ اتنا کہنے پایا تھا کہ ایک گرینیڈ میرے قریب آ گرا۔ وہ سپاہی کوندے کی طرح لپکا اور دھڑام سے گرینیڈ کے اوپر جا گرا۔ اس کے گرتے ہی گرینیڈ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بوٹیاں فضا میں اڑ گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ادھر یہ ہوا اور ادھر ہمارے سپاہیوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا اور اس کے بعد کوئی گرینیڈ ان کی طرف سے نہ آیا۔

وہ نائک یہ واقعہ سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ نہ مجھے اس جانثار کا نام معلوم ہے نہ پلٹن کا اتا پتہ ... پردیسیوں کا نام اور مقام کیسے معلوم ہو سکتا ہے ... اگر مجھے کم از کم اس کے گاؤں ہی کا پتہ مل جائے تو میں اس خوش بخت کی "بھاگاں والی" (صاحب نصیب) ماں کے پاس جاتا۔ اس کے قدموں کی خاک چومتا اور ہزار ہزار مبارکباد کے ساتھ کہتا کہ ——— وہی مائیں ہیں ایسی مائیں جو اس قسم کے سپوت جنتی ہیں ——— یہی ہیں وہ سپوت جنہیں اپنے چشم تصور میں لاتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

———— (۷) ————

اس قسم کے واقعات، عزیزانِ گرامی قدر! اتنی کثرت سے ہیں کہ میں انہیں سناتا جاؤں تو رات ختم ہو جائے لیکن یہ داستان ختم نہ ہو۔ تنگیٔ وقت کے پیشِ نظر مجھے شجاعت و بسالت کے ان حیرت انگیز واقعات سے ہٹ کر اس جوہرِ انسانیت کی بھی دو ایک مثالیں پیش کرنی ہیں جس کے بغیر اس قسم کی بے لوث قربانیاں ——— جن میں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلہ کی امید ——— ظہور میں آ ہی نہیں سکتیں۔ ہم

بڑھیا کا بیٹا

میں پڑھا کرتے تھے کہ ایک دفعہ جب محمود غزنوی کی فوج، فاتح و منصور، وطن واپس آئی ہے تو ایک بڑھیا فوجیوں کے پاس آئی اور ان سے اپنے جوان بیٹے کے متعلق پوچھا جو ان کے ساتھ فوج میں گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا بیٹا میدان جنگ میں کام آ گیا تھا۔ اس پر بڑھیا نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا تو انہوں نے ازرہِ تفنن کہا کہ وہ میدان سے بھاگ رہا تھا۔ پیچھے سے اس کے تیر لگا اور مر گیا۔ اس پر بڑھیا نے پورے جزم و یقین کے ساتھ کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ وہ کبھی میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نہیں سکتا۔ اس کے تیر پیٹھ میں نہیں، سینے میں لگا ہوگا۔ بات افسر تک پہنچی تو اس نے بڑھیا سے کہا کہ تم تو میدانِ جنگ میں ساتھ نہیں تھیں۔ تم اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کس طرح کہہ سکتی ہو؟

پشت پر نہیں سینے پر لگا تھا۔ اس پر اس نے کہا کہ میں نے اسے دودھ کا ایک قطرہ اس کے حلق میں نہیں ٹپکایا جو رزق حلال سے پیدا نہ ہوا ہو۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسا بچہ میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اُٹھے۔ چنانچہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بڑھیا ٹھیک کہتی تھی۔ اس کے بیٹے نے سینے پر زخم کھا کر ہی جان دی تھی۔

آج جب کہ ہمارے ہاں رزق حلال کے صرف الفاظ باقی رہ گئے ہیں' ہماری نئی نسلوں کے نوجوان شاید یہ نہ سمجھ سکیں کہ رزق حلال سے کس قدر پاکیزہ جوہروں کی نمود ہوتی ہے اور رزق حرام

رزقِ حلال و حرام

کس طرح انسانیت ساز صلاحیتوں کو بھسم کر کے رکھ دیتا ہے — جو بچے بناسپتی کے اس قدر خوگر ہو چکے ہوں کہ خالص گھی سے ان کے حلق میں خراش ہونے لگ جائے، انہیں کیسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ خالص گھی کس قسم کی توانائیاں پیدا کیا کرتا ہے — اور جس معاشرہ میں "خالص اور نخالص" تک کی بھی تمیز اُٹھ گئی ہو اس میں حلال اور حرام کا امتیاز کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ ان حالات میں میں رزق حلال و حرام کے نتائج کی بحث میں تو نہیں جا سکتا۔ البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جن گھرانوں میں ہنوز مستقل اقدار کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ ان میں تربیت یافتہ بچوں کے تحت الشعور میں ان اقدار کی اہمیت ضرور جاگزیں ہوتی ہے اور جب شدت کا مد کر درپیش ہو تو وہ ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور اس سے ایسی حسین و جمیل صفات کی نمود ہوتی ہے جو فضا کی تاریکیوں میں سپیدۂ سحر بن کر چمک اٹھتی ہیں۔ ایسی ہی متبسم فروش و عطر بیز بے ساختہ ادائے دل فروز کا مظاہرہ برکی کے محاذ پر میجر عزیز بھٹی سے ہوا۔ جس کا راوی ان کا کوارٹر ماسٹر اکرام ہے۔ اس نے بتایا کہ جب راجہ صاحب تین دن اور تین راتوں تک مسلسل کھڑے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے، تو جب میں نے دیکھا کہ جو روٹی میں ان کے تھیلے میں ڈال آتا ہوں وہ اسی طرح پڑی سوکھتی رہتی ہے' اس میں سے میجر

میجر عزیز بھٹی

صاحب نے ایک لقمہ بھی نہیں توڑا ہوتا، اس پر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میجر صاحب کو میٹھی پوریاں بہت پسند تھیں۔ میں نے نہایت لذیذ پوریاں تیار کرائیں اور انہیں لے کر میجر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پوریاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کھڑے کھڑے ایک پوری اٹھائی۔ اس میں سے ایک لقمہ توڑا، اور ساتھ ہی پوچھا کہ کیا سارے جوانوں کو اسی قسم کی پوریاں دی گئی ہیں۔ میں نے کہا کہ آج تو ان کے لئے اس کا انتظام نہیں ہو سکا، کل ایسا کر دیا جائے گا۔ یہ سنکر میجر بھٹی نے وہ پوری ہاتھ سے رکھ دی اور کہا کہ پھر میں بھی کل ہی پوریاں کھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میجر پوریاں کھائے اور اس کے جوان سوکھی روٹی پر گزارہ کریں۔

یہ سنکر مجھے عزیزانِ گرامی قدر! چودہ سو سال پہلے کی اپنی تاریخ کا وہ واقعہ یاد آگیا کہ جب حضرت ابو عبیدہؓ فاتح کی حیثیت سے عراق پہنچے تو وہاں کے سرداروں نے آپ کی دعوت کی جس میں انواع و اقسام کے کھانے

دستر خوانوں پر چنے گئے۔ آپ نے ان کھانوں کو دیکھا اور پوچھا کہ کیا یہ کھانے بالخصوص ان کے لئے تیار کئے گئے ہیں یا ساری فوج کو وہی کچھ دیا گیا ہے۔ جب جواب نفی میں ملا تو آپ نے یہ کہہ کر کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ ہمارے ہاں سپاہی اور سپہ سالار میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ میں اس وقت تک ان کھانوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا جب تک میری ساری فوج ان میں شریک نہیں ہو گی۔

محاذِ چونڈہ کا معرکہ

اور یہی تھا ہماری اس فقیدِ عظیم القدر محیر العقول کامیابی کا وہ راز جس کا انکشاف مجھ پر، چونڈہ کے محاذ پر ایک کرنل نے کیا۔ وہ ہمیں میدانِ جنگ کے سب سے اگلے مورچے دکھا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان مورچوں میں سپاہی تھے یا افسر بھی۔ انہوں نے کہا کہ جنگ کا عام نقشہ یہی ہوتا ہے کہ سب سے آگے سپاہی ہوتے ہیں اور ان کے بعد، جوں جوں افسروں کا رینک (RANK) بڑھتا جاتا ہے، ان کا مقام پیچھے ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ جرنیل سب سے پیچھے بیٹھ کر ہدایات نافذ کرتا ہے لیکن ہم نے جنگ کی بساط الٹ دی تھی۔ ہمارے جرنیل، بریگیڈیئر، کرنیل وغیرہ سب سپاہیوں کے ساتھ اگلے مورچوں میں تھے۔ اس طرح محمود و ایاز کے عملاً ایک صف میں کھڑے ہو جانے کا جو نتیجہ نکلا اس نے جنگ کے تمام حسابی قاعدوں کو الٹا کر رکھ دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ علاوہ دیگر امور، یہ دیکھئے کہ اگر کوئی افسر میدانِ جنگ میں مارا جائے تو سپاہی اس کی لاش لینے کے لئے اپنی جانیں تک دے دیتے ہیں۔ تو جو سپاہی افسر کی لاش کے لئے جان دے دیں وہ اپنے اس افسر کی زندگی کے لئے، جو اُن کے ساتھ مورچے میں کھڑا ہے کیا کچھ نہیں کر گزر ینگے۔ چنانچہ ہمارے ان جوانوں نے وہ کچھ کر دکھایا جس پر ہم خود حیران تھے۔

میں نے کرنیل صاحب سے کہا کہ آپ نے اس جنگ میں جو بساط اُلٹی ہے تو یہ سنتِ رسول اللہ کے اتباع میں تھا۔ کیونکہ نبی اکرمؐ میدانِ جنگ میں خود مجاہدین کی پوزیشن کا تعین فرماتے تھے۔ اور قلبِ لشکر میں سب کے ساتھ خود شریکِ کارزار ہوتے تھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور کرنیل صاحب اور ان کے ساتھیوں کی آنکھیں نم آلود ہو رہی تھیں۔ یہ آنسو اس مسرت کے تھے کہ انہیں اسوۂ رسول اللہ کے اتباع کی بھی سعادت نصیب ہو گئی۔

پاکیزگی سیرت

اور اس سے بھی بڑھ کر، ہمارے مجاہدین کی پاکیزگی سیرت کی وہ عدیم المثال نمود تھی کہ اعتراف دشمن کو بھری مجلس میں کرنا پڑا۔ یہ مقولہ تو آپ نے اکثر سنا ہو گا، کہ (EVERY THING IS FAIR IN LOVE AND WAR) جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، اور اس جواز کے بعد، فاتح فوج کے سپاہی جو کچھ مفتوحہ علاقہ میں جا کر کرتے ہیں، اس کے تصور سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ جنگِ ستمبر میں ہماری افواج کے سپاہی فاتحانہ حیثیت سے دشمن

کے علاقوں میں داخل ہوئے۔ وہاں کی آبادی میں عورتیں بھی تھیں، لیکن انہوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کا جواب ہم سے نہیں، بھارت کے وزیر دفاع' چوہان کی زبان سے سنیئے۔ اس نے بھارت کی پارلیمان میں' ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ

> اس سترہ روزہ جنگ میں کوئی ایسا واقعہ ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نظروں سے بھی دیکھا ہو۔

اور ہماری افواج کے ان پاک باز و پاک بیں مجاہدین کا یہ طرز عمل کس قوم کی عورتوں کے ساتھ تھا؟ اس قوم کی مستورات کے ساتھ، جس کے سپاہیوں کا اسی جنگ میں ہماری بہو بیٹیوں کے ساتھ جو سلوک تھا، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا جس کے راوی کرنل سیال ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ۔استمبر کی شام میں کیمپ میں بیٹھا تھا کہ ایک بوڑھا سا آدمی اور اس کے ساتھ ایک بڑھیا میرے پاس آئے جیسے کسی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ہوں۔ اس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ہی اس رجمنٹ کے کمانڈر ہیں۔ جب میں نے ہاں کہا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بڑھیا بے ساختہ میرے پاؤں پر گر پڑی۔ میرے بوٹوں کی مٹی اپنے ہاتھوں پر ملی اور اسے اپنے سر آنکھوں سے لگایا۔ مجھ پر تو یوں سمجھو جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ میں نے اُسے جھٹ سے اٹھایا اور کہا کہ تم تو میری ماں ہو۔ تم نے یہ کیا کیا؟ اس کے ساتھی بوڑھے نے کہا کہ یہ آپ کو میں بتاتا ہوں کہ اس نے کیا کیا ہے۔

ہڈیارہ کی بڑھیا

واقعہ یہ ہے کہ جب ۶ستمبر کی صبح' دشمن نے ہمارے گاؤں' ہڈیارہ کو خالی کرایا ہے تو وہ گاؤں کی آبادی کو ہانک کر باہر لے گئے۔ انہوں نے ہم مردوں کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے۔ بوڑھی عورتوں کو ایک طرف کھڑا کر کے کہہ دیا کہ انہیں گولی سے اڑا دیا جائے اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کو الگ کر کے حکم دیا کہ انہیں سرحد کے پار لے جاکر سپاہیوں میں بانٹ دیا جائے۔ ہم میں سے ایک آدمی نے ان سے کہا کہ یہ تمہاری انتہائی کمینگی ہے۔ ہم مردوں کے ہاتھ کھول دو تو ہمیں کم از کم اس کی تو تسکین ہو جائے کہ ہم نے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر جان دے دی۔ اس پر دشمن کے ایک سپاہی نے بندوق کا کندہ مار کر اس کا جبڑا توڑ دیا۔ وہ درندے ہماری معصوم بچیوں اور باعصمت عورتوں کی طرف لپکے۔ اس وقت ہماری بے کسی کا یہ عالم تھا کہ زمین کانپ رہی تھی، آسمان تھرتھرا رہا تھا، وہ بچیاں بے ساختہ سجدوں میں گر گئیں اور درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز سے کچھ اس طرح خدا سے فریاد کی کہ ہمیں محسوس ہوا گویا

خدا کا عرش کانپ اُٹھا ہے کہ اتنے میں اِدھر سے ایک گولہ آیا اور اس نے دشمن کی فوج میں بھگدڑ مچا دی۔ میدان خالی ہو گیا تو عورتوں نے ہمارے ہاتھ کھولے اور ہم انہیں لے کر بحفاظت نہر کے پار پہنچ گئے۔ یہ بڑھیا، جسے یوں سمجھو کہ اُن سب کی نمائندہ ہے، دو دن سے اُس "فرشتے" کو ڈھونڈھ رہی تھی جس نے ایسے وقت میں انہیں بچایا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ بڈیارہ کا یہ واقعہ جنگِ ستمبر کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ اگر ہمارے ان جسور و غیور مجاہدین کے گولے بر وقت آتش بار نہ ہوتے تو پورا پاکستان بڈیارہ بن جاتا۔ اُف! کس قدر ہوشربا ہے اس کا تصور!!

> جنگِ ستمبر کے شہیدو اور غازیو! تم نے اپنے خون سے ملّتِ پاکستانیہ کی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی حفاظت کی۔ ان باعصمت بیٹیوں اور بہنوں کی پاکیزہ ردائیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے عزیزانِ من! کہ جس طرح جان کی حفاظت حیوانی جبلّت کا شدید ترین تقاضا ہے اسی طرح حفاظتِ عصمت انسانی زندگی کی گراں ترین مستقل قدر ہے۔

حفاظتِ عصمت

مومن کے سامنے جب عصمت کی حفاظت کا سوال آتا ہے تو اُس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے نزدیک ہیچ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ "عصمت کی حفاظت" سے مراد اپنی عورتوں کی عصمت ہی نہیں۔ مومن کے نزدیک دنیا کی ہر عورت کی عصمت یکساں واجب الاحترام ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت مومن کا فریضہ ہوتا ہے۔ جنگِ ستمبر میں ہمارے سرفروشوں نے جو اس قدر محیر العقول کارنامے کر دکھائے تو ان کا ایک بڑا محرک جذبۂ عصمت کی حفاظت بھی تھا۔ چنانچہ جب بلوچ رجمنٹ کے لانس نائک غلام مرتضےٰ سے ہسپتال میں پوچھا گیا کہ تم لوگ باٹا پور کی سرحد پر کھڑے لڑ رہے تھے۔ ملٹری (STRATEGY) کا تقاضا تھا کہ تم ذرا پیچھے ہٹ کر لڑتے۔ تم پیچھے کیوں نہ ہٹے۔ تو اس کے جواب میں اُس اَن پڑھ سپاہی نے کہا تھا کہ ہم پیچھے کہاں ہٹتے۔ پیچھے تو لاہور تھا اور لاہور میں ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں ہماری عزتیں اور آبروئیں لے کر بیٹھی تھیں۔ سرحد پر کھڑے ہو کر ان کی حفاظت کرتے یا ملٹری سٹریٹیجی کو دیکھتے۔ وہ وقت آگے بڑھنے یا کھڑے رہ کر جان دینے کا تھا، پیچھے ہٹنے کا نہیں۔

یہی تھا حفاظتِ عصمت کا وہ مقدس جذبہ جسے میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے ایک سپاہی نے جس کے ہاتھوں میں تازہ مہندی رچی ہوئی تھی، اپنی زندگی کے آخری سانسوں میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

میں چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا، میری شادی میں تین دن باقی تھے کہ جنگ کا اعلان ہو گیا۔ اور مجھے فوری طور پر

ہاتھوں کی مہندی

واپس آنا پڑا۔ میں گھر سے چلنے لگا تو میری والدہ اور ہمشیرہ نے اپنی خوشی پوری کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مہندی لگائی۔ میری منگیتر جو ہمارے اپنے ہی گھر کی لڑکی تھی، لجاتی، شرماتی، گھونگھٹ نکالے، آگے بڑھی اور اپنی انگلی کا ایک قطرۂ خون میری مہندی میں ٹپکا کر خاموش واپس چلی گئی۔ میں گھر سے روانہ ہوا تو پیچھے سے آواز آئی کہ میدان میں جانا تو پیچھے کا خیال نہ کرنا، ایسے وقت زندگی میں بہت کم آیا کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ آواز میری ماں کی تھی، بہن کی یا منگیتر کی تھی لیکن اس نے میری رگوں میں بجلیاں دوڑا دیں۔ جنگ کے ہر محاذ پر وہ آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی تا آنکہ اللہ نے مجھے شہادت کا درجہ دے دیا۔ یہ میرے گاؤں کا پتہ ہے۔ اگر ہو سکے تو میری منگیتر تک میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ میں نے تمہارے قطرۂ خون کی لاج رکھ لی ہے۔

اور کھیم کرن کے محاذ کے اس واقعہ کو کون بھلا سکیگا جسے میں کتنی بار بیان کر چکا ہوں اور کتنی بار

بہنوں کے دوپٹے

دہراؤں گا۔ فوج کے سپاہی ایک گاؤں کے قریب سے گزرے تو گاؤں کی عورتیں باہر نکل آئیں۔ جمعدار کا بیان ہے کہ بوڑھی عورتوں نے ہمیں دعائیں دیں، پاس ہی چند ایک جوان لڑکیاں بھی کھڑی تھیں۔ معلوم ان کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے اپنی چنیاں (دوپٹے) اتار کر سپاہیوں کی طرف پھینکیں اور کہا کہ "بھراؤ! بھیناں دیاں اپناں چنیاں دی لاج رکھنا" جمعدار نے کہا کہ میرے سپاہیوں نے ان دوپٹوں کو امانت کے طور پر اپنے پاس رکھا اور ہم جس جگہ بھی جنگ میں گئے اس امانت کی حفاظت ہمارے لئے جزوِ ایمان بن گئی۔ میری پلٹن کے تین سپاہی نہایت بے جگری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان دوپٹوں کو اپنی فولادی ٹوپیوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

اور یہ تھے بہنوں کے وہ جاں نثار بھائی، جن کی یاد میں، اِن بہنوں نے، اُن الفاظ کے ساتھ خاموش

شہید عزیز کی بہن کا خط

آنسو بہائے تھے، جنہیں میجر عزیز بھٹی کی شہادت کے بعد ان کی غمزدہ بہن نے، شہید بھائی کے نام اپنے خط میں یوں لکھا تھا کہ

> میرے راجہ بھائی! میں گھر سے بہت دور تھی کہ تمہاری شہادت کی خبر سنی۔ وطن پر قربان ہونے والوں میں تمہارا نام آیا تو جانتے ہو تمہاری بہن پر کیا گزری؟ تم سوچتے ہوگے کہ میں نے تمہاری یاد میں سسکیاں بھری ہوں گی۔ نہیں بھیا! میں نے ایسا تو ہرگز نہیں کیا۔ میں نے تمہاری تصویر

اٹھائی۔ اسے آنکھوں سے لگایا۔ اور پھر آپ ہی بے ساختہ میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

- تم نے بہن کی لاج رکھ لی۔ بھیا تو کتنا بہادر نکلا۔

اور ہاں بھیا! میں روئی بھی تھی۔ رونا اس لئے نہیں آیا تھا کہ میں اپنے راجہ ویر کو اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔ بلکہ آنکھیں اس لئے بھر آئیں کہ کاش میں تمہارے قریب ہوتی اور شہید بھائی کی پیشانی چوم سکتی۔

لوگ کہتے ہوں گے میں پاگل ہو گئی ہوں جو تم سے باتیں کر رہی ہوں لیکن تم تو زندہ ہو! اور ابد تک زندہ رہو گے۔ شہید کبھی نہیں مرتے۔ اچھا بھیا! خدا حافظ! اپنی بہن کی دعائیں قبول کرو۔

(تمہاری بہن۔ زیب رانی۔ کراچی)

شہیدوں کی یاد میں ان الفاظ سے زیادہ دل گداز اور پُر تاثیر الفاظ، نہ کسی بڑے سے بڑے سحر نگار ادیب کے قلم سے نکل سکتے ہیں نہ کسی شعلہ نوا خطیب کی زبان سے۔ اس لئے میں بھی اس حسین و سادہ و رنگین داستان کو انہی الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

لیکن اس داستان کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک سوال پہلے اپنے آپ سے پھر آپ احباب سے اور آپ کی وساطت سے پوری ملت پاکستانیہ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمارے ان شہداء کے

ایک سوال

گراں بہا خون کی یہی قیمت ہے جسے ہم آج اپنے معاشرہ میں اس طرح ادا کر رہے ہیں! ہمیں پاکستان جیسی عظیم مملکت ایک قطرۂ خون بہائے بغیر مل گئی تھی ـــ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے لاکھوں جانوں کی قربانی دی تھی، تو یہ دعوے حقیقت کے خلاف ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے جو ہمارے مہاجرین کے نہتے قافلوں کے ساتھ کیا تھا، پاکستان اس سے پہلے حاصل کیا جا چکا تھا۔ اور وہ حاصل کیا جا چکا تھا ایک قطرۂ خون بہائے بغیر۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس کی قدر نہ کی۔ بلکہ علامہ اقبالؒ نے اس سے بہت پہلے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

سال اٹھارہ اسی طرح گزر گئے۔ ہمارے الّوں تللّوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۶۵ء میں یہ مملکت خداداد ہاتھوں سے جا رہی تھی کہ ہمارے جانباز مجاہدوں نے، اپنے خون کی بے بہا قیمت ادا کر کے، اُسے از سرِ نو خرید

کر ہمیں دے دیا۔ لیکن اس پانچ برس کی مدت میں، ہم نے "قبائے ملت کے بخئے ادھیڑنے کے لئے" وہ کچھ کیا جو پہلے اٹھارہ برس میں بھی نہیں کیا تھا۔ اُس وقت کم ازکم مملکت کی وحدت قائم تھی اور ایک مضبوط مرکز موجود جس کی وجہ سے دشمن کی یلغار کو روکنے کے لئے ہماری فوج اور اس کے پیچھے "قوم" ایک آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن اب ارباب ملت کے "خیر سے، عزائم یہ ہیں کہ مملکت کے حصے بخرے کر کے" اسے پانچ چھ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور مرکز کا وجود محض تبرکاً باقی رہ جائے۔ سوال یہ ہے کہ دشمن نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر جب پھر سے یلغار کی تو اس وقت کونسی دیوار اس کے راستے میں کھڑی ہو گی؟ یاد رکھئے! اس مملکت کی سالمیت اور حفاظت کا طریق وحدتِ پاکستان کے سوا کوئی نہیں۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو یہ مملکت محفوظ رہ سکے گی ورنہ —— ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں —— لیکن ہماری داستان رہے یا مٹے، ان شہیدوں کی داستان کو زمانے کا کوئی حادثہ نہیں مٹا سکتا جنہوں نے اپنے خون کی قیمت سے حیاتِ جاوداں خریدی ہے۔ ان کی داستان "قرطاسِ زمانہ پر" سورج کی سنہری کرنوں سے منقوش ہے۔

یہ مردِ مسلمان تھے وہ مردِ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے!

اس کی اذانوں سے فاش سِرِّ کلیم و خلیل

جنگِ ستمبر کے زمانے میں اگر اقبالؒ زندہ ہوتا تو وہ دیکھتا کہ اس نے اپنے "شاہین بچوں" کے ساتھ جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، انہوں نے انہیں کس حسن و رعنائی اور شانِ زیبائی سے پورا کر دکھایا اور اس کی حقیقتِ منتظر کو کس طرح لباسِ مجاز پہنا دیا — وہ مردِ دانا و بینا اپنے خوابوں کی اس تعبیر کو دیکھتا اور پھر ہمیں بتاتا کہ ان شہداء نے اپنے خون کی رنگینیوں سے ہمارے لئے کس قدر سامانِ سرخروئی فراہم کر دیا ہے۔ جو حضرات اُس زمانے میں موجود تھے انہیں یاد ہو گا کہ ۱۹۱۱ء میں "جنگِ طرابلس" نے مسلمانانِ عالم کے کاشانوں پر کس طرح بجلیاں گرا دی تھیں۔ ان شہداء کی یاد میں "شاہی مسجد (لاہور) میں" ایک تاریخی اجتماع ہوا تھا، حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی وہ "سنہرہ آفاق نظم" پڑھی تھی جو بانگِ درا میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے یہ منظر پیش کیا تھا کہ وہ عالمِ بالا میں گئے تو فرشتے انہیں بارگاہِ رسالتمآبؐ میں لے گئے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم خاکدانِ ارضی سے آئے ہو تو ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ اس پر اقبالؒ نے عرض کیا کہ ؎

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہماری سوختہ ساماں، متاع بردہ قوم کے پاس کوئی ایسی مایہ ناز شے نہ تھی جسے ہم حضور رسالتمآبؐ میں بطور نذرانہ پیش کر سکتے۔ شہدائے پاکستان کا ہم پر یہ احسان کس قدر گراں بہا ہے کہ انہوں نے اپنے مقدس خون کا وہ آبگینہ ہمیں عطا کر دیا جسے ہم دنیائے انسانیت کے سامنے بصد فخر و مباہات اور اس کے بعد بارگاہِ ختمی مرتبت میں بہ ہزار عجز و نیاز، آبرومندانہ طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

امت کی آبرو کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں دے دینے والے جنگ ستمبر کے شہیدو! ہمارے سرِ مژگاں چمکنے والے ستاروں کا ہدیۂ محقر قبول کرو کہ ہمارے پاس اس سے زیادہ تابندہ کوئی متاع ایسی نہیں، جو تمہارے شایانِ شان ہو۔　　والسلام!

———(پرویز)———

مودودی صاحب کی حالیہ تقریر

زباں کچھ اور، لوٹے پیرہن کچھ اور کہتی ہے!

وہ جو کہتے ہیں کہ انسان کو اپنا ایک جھوٹ چھپانے کے لئے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، اس کی زندہ شہادت وہ کرب و اضطراب ہے جس میں (بیچارے) مودودی صاحب آجکل بُری طرح مبتلا ہیں اور جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں سُجھائی نہیں دیتا۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران، اس تحریک کی سخت مخالفت کی اور بانیانِ تحریک —— قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کے خلاف جی بھر کر کیچڑ اُچھالا۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد جب وہ ہندوستان سے بھاگ کر یہاں آگئے تو ایک عجیب مخمصہ میں گرفتار ہوگئے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ ملک اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور چونکہ ہم ہی بتا سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے، اس لئے ملک کا اقتدار ہمارے حوالے کر دو۔ اس پر ان کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ لوگ کل تک تو یہ کہتے تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی کافرانہ حکومت قائم ہوگی اور آج آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ ملک اسلامی نظام کے قیام کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ اس تضاد بیانی کے کیا معنی؟ اگر مودودی صاحب میں اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ اس کا اعتراف کرتے کہ مجھے ایسا سمجھنے اور کہنے میں غلطی ہوگئی تھی جس کے لئے میں نادم ہوں۔ لیکن اپنی غلطی کا اعتراف تو ان کی فطرت میں نہیں —— جو شخص بھی احساسِ کمتری کا شکار ہو، وہ اپنی غلطی کا اعتراف کبھی نہیں کیا کرتا؛ "عزت الاثم" (FALSE PRESTIGE) کی انانیت اسے اس طرف آنے ہی نہیں دیتی —— انہوں نے ایسا تو نہ کیا اور غلط بیانیوں سے کام لینا شروع کر دیا۔

طلوع اسلام کی طرف سے نقاب دری

طلوع اسلام نے مودودی صاحب کے عزائم کو اسی زمانہ میں بھانپ لیا تھا جب انہوں نے قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت شروع کی تھی۔ چنانچہ اس کی طرف سے اُسی زمانے (۱۹۴۰ء) میں ان کی مخالفت شروع

ہو گئی تھی۔ جب انہوں نے یہاں پہنچکر غلط بیانیوں کی روش اختیار کی تو طلوعِ اسلام نے ان کے کذب و افتراء کی نقاب دری شروع کی۔ چنانچہ اس تئیس سال کے عرصہ میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں اتنا کچھ شائع ہوا ہے کہ اب کسی کو اس مقصد کے لئے کسی مزید تلاش و تحقیق کی بہت کم ضرورت پڑیگی۔ لیکن اس تمام عرصہ میں جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں طلوعِ اسلام قریب قریب تنہا تھا۔ اس کے وسائل نہایت محدود تھے اور دوسری طرف جماعتِ اسلامی کے پاس زر و سیم کا بحرِ بیکراں تھا جس کے زور پر وہ طلوعِ اسلام کی آواز کو برابر دباتے چلی جا رہی تھی ـــــ اور چونکہ ان کے نزدیک زندگی کے اہم تقاضوں کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے، اس لئے وہ طلوعِ اسلام کے خلاف الزام تراشیوں اور کذب بافیوں میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے ـــــ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ تین نمازوں اور تھوڑے روزوں کا قائل ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ اب حکومت کا پٹھو ہے وغیرہ وغیرہ ہفوات کا مسلسل پراپیگنڈہ جاری رکھا گیا۔ لیکن چونکہ طلوعِ اسلام کے نزدیک 'یہ جماعت' نہ صرف پاکستان بلکہ خود اسلام کے لئے شدید ترین خطرہ کا موجب ہے اس لئے اس نے ان کے اس قدر شدید پراپیگنڈہ اور مہیب مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حسبتاً للہ ان کی نقاب کشائی کا فریضہ جاری رکھا ـــــ للہ الحمد کہ حق و صداقت آخر غالب آتے اور رفتہ رفتہ قوم کی سمجھ میں یہ بات آنے لگ گئی کہ یہ جماعت فی الواقعہ ملک اور دین دونوں کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مودودی صاحب کی غلط بیانیوں کی قلعی کھولنی شروع کر دی۔ چنانچہ اب ہو یہ رہا ہے کہ ایک طرف سے ان کی ایک غلط بیانی کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ یہ اسے چھپانے کے لئے مزید غلط بیانی سے کام لیتے ہیں تو دوسری طرف سے ان کی چار غلط بیانیوں کو سامنے لا کر رکھ دیا جاتا ہے اس سے یہ بے حد لوکھلا اٹھتے ہیں۔

۲۶ اگست کی تقریر

اس کی تازہ مثال، مودودی صاحب کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ۲۶ اگست کو جماعت کے یومِ تاسیس کی تقریب پر کی تھی۔ اس میں انہوں نے 'بانیانِ تحریکِ پاکستان پر پھر کیچڑ اچھالا تو ملک میں چاروں طرف سے ان پر لے دے شروع ہو گئی۔ اس پر انہوں نے حسبِ عادت، یہ کہنا شروع کر دیا کہ میری تقریر کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ ہم نے انتظار کیا کہ مودودی صاحب کی تقریر ان کے اپنے آرگن ـــــ ایشیا ـــــ میں شائع ہو جائے تو پھر اس کا جائزہ لیا جائے۔ ہم نے ایشیا کی اشاعت کا بے تابی سے انتظار کیا لیکن اس نے (اپنی ۳۰ اگست کی اشاعت میں) معذرت پیش کر دی کہ "بعض وجوہ کی بنا پر" تقریر بروقت تیار نہیں ہو سکی۔ یہ تقریر آئندہ شمارہ میں پیش کی جائے گی جو نہایت تھوڑے وقفہ کے بعد سامنے آ جائے گا۔ یہ شمارہ (تھوڑے وقفہ کے بجائے 'کافی لیٹ

یعنی) ۲۰ ستمبر کو شائع ہوا جس میں مودودی صاحب کی مکمل تقریر چھپ گئی ہے۔ اس کی تمہید میں مودودی صاحبؒ لکھا ہے کہ تقریر کو ایک ریکارڈ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں صرف اس حد تک تصرف کیا گیا ہے کہ تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں بدل دیا ہے۔ علاوہ ازیں تقریر میں بعض مقامات پر تشریحی حاشیے بھی دیئے گئے ہیں۔ یہی تقریر اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

تقریر بڑی لمبی ہے اور حسبِ معمول الفاظ کے گورکھ دھندے (JUGGLERY OF WORDS) کا بڑا دلچسپ مجموعہ۔ اس کی (THEME) یہ ہے کہ مودودی صاحب ہنوز سولہ سترہ برس کے نوجوان تھے جب انہوں نے ہندوستان کی مختلف تحریکات کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ہر تحریک میں جو نقائص ان کی نگہِ ژرف بین نے دیکھے ان کا اندازہ کسی اور کو نہیں ہوا۔ اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا تھا بالکل صحیح تھا۔ اگر ہم پوری کی پوری تقریر کا جائزہ لیں تو ــــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ــــ اس لئے ہم اپنے آپ کو سر دست اس موضوع تک محدود رکھتے ہیں کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان اور اس کے بانیوں کے متعلق کیا کہا ہے اور اس میں کس قدر غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ (تقریر کے دیگر الفاظ کو کسی دوسری نشست میں سامنے لایا جائے گا۔)

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے۔

۱۹۴۰ء کے کوائف

جس وقت تحریکِ پاکستان اٹھی اور ۱۹۴۰ء کی قرار داد پاس ہوتی .... اس وقت جو اہم ترین سوالات میرے سامنے تھے وہ یہ تھے کہ حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں، ان میں ایک شکل تو یہ پیش آ سکتی ہے کہ پاکستان کے لئے کوشش کر کے مسلم لیگ ناکام ہو جائے اور ہندوستان میں انگریز واحد ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر ایک جمہوری حکومت قائم کر کے اسے ہندوؤں کے حوالے کر کے چلا جائے۔ اس صورت میں کیا کرنا ہو گا[1]؟ دوسری شکل یہ پیش آ سکتی ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اور ملک تقسیم ہو جائے۔ اس صورت میں جو کروڑوں مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا کیا حشر ہو گا؟[2] اور خود پاکستان میں اسلام کا کیا حشر ہو گا۔ جس قسم کے عناصر پاکستان کی تحریک

---

[1] قاضی کو شہر کا اندیشہ! کیا مسلم لیگ کے راہ نما (بالخصوص قائداعظمؒ) اس کے لئے کچھ نہ کرتے؟

[2] یہ صورت تو پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے لئے آپ نے کیا کیا؟ پاکستان کی طرف بھاگ آئے! (طلوعِ اسلام)

میں شامل ہو رہے تھے ان کو دیکھتے ہوئے میں یقینی طور پر سمجھ رہا تھا کہ یہ عناصر جمع ہو کر ایک ملک بنا سکتے ہیں۔ ایک قومی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان عناصر سے کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ ایک اسلامی حکومت بنا لیں گے۔ میں اس کو بالکل صاف دیکھ رہا تھا کہ مسئلہ ایک شخص یا چند اشخاص کا نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ اس تحریک میں جو لوگ شامل ہو رہے تھے۔ جو اس میں پیش پیش تھے۔ جو اس تحریک کو چلا رہے تھے، ان کے کیریکٹر کو دیکھتے ہوئے۔ ان کی زندگیوں کو دیکھتے ہوئے، ان کی تعلیم، ان کے خیالات اور ان کی ہر چیز کو دیکھتے ہوئے ان سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں ..... (میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ) جو ملک مسلمانوں کے حصہ میں آئے گا اس کو مسلمانوں کی کافرانہ حکومت بننے سے کیسے بچایا جائے۔

یہ تھی تشکیلِ پاکستان سے پہلے کی بات۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد

ہم نے محسوس کیا کہ پاکستان بنانے والوں کا ارادہ ہرگز یہاں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا نہیں۔

اس فقرے کے نیچے حسب ذیل فٹ نوٹ دیا گیا ہے۔

میرے اس فقرہ کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بانیانِ پاکستان کا شروع ہی سے پاکستان کو ایک اسلامی حکومت بنانے کا ارادہ نہیں تھا۔ پھر اس میں مزید شرارت سے یہ معنی بھی پیدا کر لئے گئے ہیں کہ در اصل میں نے اس فقرے میں قائداعظمؒ مرحوم پر حملہ کیا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں .... پاکستان بنانے والوں سے میری مراد وہ بہت سے متضاد عناصر ہیں جو تحریکِ پاکستان کو مقبول اور کامیاب ہوتے دیکھ کر نہ صرف اس میں شامل بلکہ پیش پیش ہو گئے تھے اور ان کے متعلق بھی میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ ان کا ارادہ شروع ہی سے پاکستان کو اسلامی حکومت بنانے کا نہ تھا۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے طرزِ عمل سے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اس ملک کو اسلامی ریاست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

ان اقتباسات کی رو سے مودودی صاحب نے دو باتیں کہی ہیں۔

(۱) انہوں نے مسلم لیگ کے دیگر راہ نماؤں کے خلاف تو بے شک بہت کچھ کہا تھا لیکن قائداعظمؒ کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا۔ اور

(۲) انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ تحریکِ پاکستان کے بانیوں کا شروع ہی سے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ان لوگوں کا یہ ارادہ نہیں رہا تھا۔

قائداعظمؒ کے خلاف مودودی صاحب نے کچھ کہا تھا یا نہیں؛ اسے ہم ذرا آگے چل کر دیکھیں گے بسردست دوسرے اعتراض کو لیجئے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان لوگوں کا شروع میں تو ارادہ یہ تھا کہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنایا جائے گا لیکن حصولِ پاکستان کے بعد ان کی نیت بدل گئی اس لئے مجھے (یعنی مودودی صاحب کو) ان کی مخالفت کرنی پڑی۔ یہ وہ لوگ تھے جو تحریکِ پاکستان کو مقبول اور کامیاب ہوتے دیکھکر نہ صرف اسمیں شامل بلکہ پیش پیش ہو گئے تھے۔" اس سے پہلے مودودی صاحب اسی تقریر میں کہہ چکے ہیں کہ

> ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان پاس ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملک یقیناً تقسیم ہو جائے گا اور پاکستان ضرور بن جائے گا حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء کے آغاز تک بھی یہ بات یقینی نہیں تھی کہ پاکستان واقعی بن جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ جب ۱۹۴۷ء کے آغاز تک بھی یہ بات یقینی نہیں تھی کہ پاکستان واقعی بن جائے گا تو وہ کونسا زمانہ تھا جس میں متضاد عناصر پاکستان تحریک کو کامیاب ہوتے دیکھ کر اس میں نہ شامل بلکہ پیش پیش ہو گئے تھے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب آپ نے (مودودی صاحب نے) ۱۹۴۰ء ہی میں دیکھ لیا تھا کہ جو لوگ تحریکِ پاکستان میں پیش پیش تھے، ان کا کیرکٹر۔ ان کی زندگی۔ ان کی تعلیم۔ ان کے خیالات۔ ان کی ہر بات اس کی شاہد ہے کہ وہ ایک اسلامی ریاست بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہی بنا سکتے ہیں۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ ان کا ارادہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا تھا یا نہیں۔ وہ ہزار ارادے کرنے کے باوجود آپ کے خیال کے مطابق پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے اہل ہی نہیں تھے۔

تیسری بات یہ کہ کیا آپ نے حصولِ پاکستان سے پہلے کبھی کسی وقت بھی یہ کہا تھا کہ ان لوگوں کا ارادہ تو یہ ہے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنایا جائے لیکن ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔ کیا آپ (یعنی مودودی صاحب) اپنی کوئی تحریر ایسی دکھا سکتے ہیں جس میں آپ نے ایسا کہا ہو؟

(۸)

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ آپ نے تحریکِ پاکستان کے راہ نماؤں کے خلاف جو گندا اچھالا تھا، کیا وہ ان لوگوں کے خلاف تھا جو تحریکِ پاکستان کی کامیابی کو دیکھ کر اس میں بعد میں شامل ہو گئے تھے، یا وہ اس تحریک کے السابقون الاولون کے خلاف بالعموم اور خود قائداعظمؒ کے خلاف بالخصوص تھا۔

قارئین سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں دو ایک باتیں خاص طور پر ذہن میں رکھیں۔

مودودی صاحب کو کب معلوم ہوا تھا

(۱) مودودی صاحب نے قائداعظمؒ کے تئیسویں یومِ وفات

ی مجلس (لاہور) کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا ہے کہ

قرار داد پاکستان کی منظوری کے بعد قائد اعظمؒ نے لادین اور سوشلسٹ عناصر کی خواہشات کے بالکل برعکس واضح الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں اسلام کا سماجی نظام رائج کیا جائے گا۔

(مساوات۔ مورخہ ۹/۷ ۱۱)

(اسے ذہن میں رکھیئے کہ قرار داد پاکستان مارچ ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی تھی)

مودودی صاحب نے کہا ہے کہ قائد اعظم نے مارچ ۱۹۴۰ء کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں لامی نظام رائج کیا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں کہ

۱۹۳۶ء تک یہی حالت رہی۔ لیکن ذفرو الی اللہ کی پکار کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ان سب سیاسی نصب العینوں سے مایوس ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی نجات اسلام میں ہے .... مسلم لیگ نے اس نصب العین کو اپنا لیا تھا۔ اس کے لیڈروں نے ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری مسلمان قوم اس کے علم تلے جمع ہو گئی۔[۱]

(ایشیا۔ ۴۸/۸ ۲۵)

کے ایک سال بعد مودودی صاحب نے کہا تھا۔

اگر تحریکِ پاکستان کے آغاز میں یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ ملک وجود میں آتا۔ (ایشیا۔ ۶۹/۸ ۲۰)

کے چند ہی روز بعد انہوں نے کہا۔

قائد اعظمؒ کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقاء، اور نشو ونما کا اصل سرچشمہ اسلام ہے۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام قائم

---

[۱] یہ تحریر ایشیا کے اداریہ میں تھی۔ ہم اس وقت یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ مودودی صاحب کے تھے یا ایشیا کے۔ لیکن صورت کوئی بھی ہو، یہ واضح ہے کہ ان حضرات کو اس کا اعتراف ہے کہ ۱۹۳۶ء ہی سے مسلم لیگ نے اپنا یہ نصب العین مقرر کر لیا تھا۔

کیا جائے گا۔　　　　(نوائے وقت۔ 9/49 ۱۱)

اس سے بھی بہت پہلے، انہوں نے کہا تھا۔

یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ نظریۂ پاکستان کے بانی اور تحریکِ پاکستان کے قائد ہر موقع پر مسلمانوں کو یہی کہتے رہے کہ اس ملک کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے جس سے مادی تہذیب سے ستائی ہوئی انسانیت آرام و سکون حاصل کر سکے۔　　　　(ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۶۵ء)

آگے بڑھنے سے پیشتر، ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس جماعت (مسلم لیگ) کے اغراض و مقاصد یہ تھے کیا — تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى — کے ارشادِ خداوندی کی رُو سے، آپ کا یہ فریضہ نہیں تھا کہ آپ اس جماعت کے ساتھ تعاون کرتے اور ان میں اگر کوئی نقائص تھے تو ان کے ایک رفیق کی حیثیت سے ان کی اصلاح کی کوشش کرتے، بالخصوص جب آپ اسے بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ اُس وقت اِن لوگوں کا ارادہ بھی یہی تھا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنایا جائے! ہے آپ کے پاس اس کا کوئی جواب؟

——————(۰)——————

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ مودودی صاحب نے قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے اولین راہ نماؤں کے خلاف کیچڑ اچھالا تھا یا نہیں! یہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے اپنے بیانات کے مطابق، یہ حضرات (بانیانِ تحریکِ پاکستان، بشمول قائداعظمؒ) (۱) تحریکِ پاکستان کے آغاز ہی سے، یا (۲) ۱۹۳۶ء کے بعد، یا (۳) قرار دادِ پاکستان کی منظوری (یعنی مارچ ۱۹۴۰ء) کے بعد سے بار بار اس کا اعلان کرتے رہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔ (اسے اچھی طرح ذہن میں رکھیے)۔

سیاسی کشمکش حصہ سوم کب شائع ہوئی تھی

مودودی صاحب نے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے دیگر قائدین کے خلاف جو کچھ لکھا تھا، وہ ان کی کتاب (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم) میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی تقریر (۲۶ راگست ۱۹۷۰ء) میں کہا ہے۔

اس غرض کے لئے میں نے وہ سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا جو بعد میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے مضامین زیادہ تر

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۰ء تک لکھے گئے تھے اور اس کا کچھ حصہ ۱۹۴۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

اس سے مودودی صاحب یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے سیاسی کشمکش حصہ سوم میں جو کچھ قائداعظمؒ (اور دیگر زعمائے لیگ) کے خلاف لکھا تھا وہ قراردادِ پاکستان منظور ہونے سے پہلے کے زمانے (یعنی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۰ء) میں لکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں اس کتاب کا کچھ حصہ لکھا تھا۔ اس میں جو لفظی تلبیس ہے وہ قابلِ داد ہے۔ واقعہ یہ ہے۔

وہ سلسلۂ مضامین جو بعد میں سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے شائع ہوا تھا، پہلے ترجمان القرآن کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ پہلا شمارہ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ مطابق فروری ۱۹۴۱ء کا تھا۔ اور دوسرا شمارہ محرم ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ ۱۹۴۱ء کا ــــ یعنی قراردادِ پاکستان کی منظوری کے ایک سال بعد۔ انہی دونوں شماروں کے مضامین، بعد میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کئے گئے تھے۔ ہمارے پاس ترجمان القرآن کے وہ دونوں شمارے بھی موجود ہیں، اور سیاسی کشمکش حصہ سوم کا وہ ایڈیشن بھی جسے مودودی صاحب نے "آری پریس۔ دہلی" میں چھپوا کر "مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام، پٹھانکوٹ" سے شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ کے آخر میں صرف جماعت اسلامی کی تشکیل اور دستور سے متعلق چند صفحات کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ "شعبان ۱۳۶۰ھ (اگست ۱۹۴۱ء) میں ہم نے ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورہ سے جماعت اسلامی قائم کی جس کا دستور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔" (ص ۲۰۰)

اب اگر کوئی شخص مودودی صاحب پر گرفت کرے گا کہ جو مضامین فروری۔ مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے تھے، ان کے متعلق آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ وہ ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۰ء میں لکھے گئے تھے، تو ان کا جواب یہ ہوگا کہ میں نے وہ مضامین ۱۹۳۹ء۔۱۹۴۰ء ہی میں لکھے تھے۔ میں نے یہ تو کہیں نہیں کہا کہ وہ ۱۹۳۹ء۔۱۹۴۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ اور اس پر ان کے حلقہ بگوش شور مچا دیں گے کہ دیکھئے۔ مولانا صاحب پر ایک اور جھوٹا الزام لگایا گیا۔ حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے ..... یہ واضح ہے کہ کسی مضمون یا کتاب کی ذمہ داری تاریخ اشاعت سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے مسودہ کی تحریر کی تاریخ سے۔ مودودی صاحب نے جب یہ مضامین ۱۹۴۱ء میں شائع کئے ہیں تو (ان کے اپنے بیان کے مطابق) انہیں اس سے کم از کم ایک سال پہلے سے اس کا علم تھا کہ قائداعظمؒ نے اس باب میں کیا اعلان کیا تھا۔ اس علم کے باوجود ان مضامین میں وہ کچھ شائع کرنا جس کا ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے، اور اس "جرم" کو اس عذر کے لبادہ میں چھپانا کہ وہ مضامین ۱۹۳۹ء۔۱۹۴۰ء کے لکھے ہوئے تھے، صریح تلبیس نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر مودودی صاحب نے وہ کچھ مارچ ۱۹۴۰ء سے پہلے لکھا بھی تھا، تو اس کے بعد اس مسودہ کو ضائع کر دینا چاہیئے تھا۔ انہوں نے نہ اسے ضائع کیا اور نہ کہیں معذرت

کی۔ بلکہ دھڑلے سے اسے شائع کیا —— پہلے رسالہ میں اور پھر کتاب کی شکل میں۔ اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟

(۱۰)

اب آگے بڑھیئے۔ مودودی صاحب کا حالیہ اعلان آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۰ء میں ضمنی طور پر کہہ دیا تھا کہ پاکستان "اسلامی نظام کے قیام کے لئے" حاصل کیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد "سیاسی کشمکش حصہ سوم" کی یہ تحریر پڑھیئے جو مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

مخالفت اور غلط بیانیاں

اس موقعہ پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۷، سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۳۰)

یعنی قرارداد پاکستان کے ایک سال بعد بھی یہ حضرت مسلمانوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے آج تک یہ بات واضح نہیں کی کہ ان کا مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظام رائج کرنا ہے، جبکہ (ان کے موجودہ بیان کے مطابق) انہیں علم تھا کہ خود قائداعظمؒ نے ایک سال پہلے اس کا اعلان کر دیا تھا اور وہ (انہی کے بیان کے مطابق) اس بات کو بار بار دہرایا بھی کرتے تھے۔ قائداعظمؒ بار بار پاکستان کے اس مقصد کو دہراتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ

اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔ (ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۲۸ ؛ ۲۹

سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ صفحہ ۱۳۱ ؛ ۱۳۲)

اب آیئے قائداعظمؒ کی طرف۔ ان کے متعلق مودودی صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔

افسوس کہ لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔

(ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۱۱۳/۱۱۴) (سیاسی کشمکش صفحہ ۳۷)

اور سنیئے۔

(یہ وہ لوگ ہیں) جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔

(ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۱۴/۱۱۳۔ سیاسی کشمکش صفحہ ۳۷)

۔ اور۔

یہ (لوگ) مسلمانوں کی قوم میں پیدا ہوئے ہیں اسلئے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوئرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۱ء۔ بحوالہ ۱۹۴۱ء۔ سیاسی کشمکش صـ۱۲)

قائداعظمؒ پر پھبتی

جماعتِ اسلامی کے ترجمان (ایشیا) کے اداریہ کا اقتباس آپ پہلے دیکھ چکے ہیں جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ۱۹۳۶ء ہی سے مسلم لیگ نے اپنا نصب العین پاکستان یا اسلامی نظام کا قیام قرار دے لیا تھا۔ لیکن اسی (ایشیا) کے مدیر نصر اللہ خان صاحب عزیز نے اپنے اخبار دفتر کی ۱۳ر جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں قائداعظمؒ کی شان میں ایک قصیدہ ارشاد فرمایا تھا جس کا عنوان تھا۔

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

اس کے بعد لکھا تھا۔

اس زمانے میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی قوم کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح ترقی کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اظہارِ خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا۔

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی اور مسٹر جناح نے اپنی درخواست قیادت قوم کے حضور گذران دی ...... قائداعظمؒ نے بھی اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ مہدی علیہ السلام نہ سہی، مگر مالوی، مونجے۔ ہٹلر اور مسولینی کی طرح تو وہ قوم کی خدمت کر ہی سکتے ہیں۔

(بحوالہ مولانا مودودی۔ وعادی اور عمل۔ صـ)

یہ جنوری ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ۱۸/۱۲ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا جس

۱۹۴۷ء میں مخالفت

میں مودودی صاحب سے یہ سوال کیا گیا کہ جب غیر مسلم (انگریز اور ہندو) مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے تک کے درپے ہو رہے ہیں تو کم از کم اس حد تک ہی

ہمیں مسلم لیگ کا ساتھ دے دینا چاہیئے کہ مسلمان ان دشمنوں کی غلامی سے نجات حاصل کر سکے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ (ترجمان القرآن جلد نمبر ۳ - عدد ۶)

یہ اس تحریک کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کے متعلق (مودودی صاحب کے اعتراف کے مطابق) مارچ ۱۹۴۰ء میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ اس کا مقصد پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔

(۰)

پاکستان بن گیا اور قائد اعظمؒ نے بکمال کشادہ نگہی' ان لوگوں کو جو آخر دم تک پاکستان اور خود قائد اعظمؒ کے خلاف اس قدر دریدہ دہنی سے کام لیتے چلے آرہے تھے' اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی۔ لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا ہوا' اسے بھی سن لیجئے۔ ترجمان القرآن کا پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا جس میں' ہندوستان کی مختلف تحریکات کا بالعموم اور تحریکِ پاکستان کا بالخصوص تجزیہ کرنے کے بعد' مودودی صاحب نے لکھا کہ

پاکستان کے بعد مخالفت

یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

۱۹۴۸ء سے ماقبل کے پچیس سالوں (ربع صدی) میں کون کون سے حضرات نے مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی تھی' اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ مودودی صاحب نے ایک ہی جھاڑو سے ان سب کا منہ کالا کر دیا!

اس کے بعد جولائی ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں' تحریکِ پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

(اس میں) عام کارکنوں سے لے کر بڑے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے۔

ظاہر ہے کہ "بڑے بڑے ذمہ دار لیڈروں" میں خود قائد اعظمؒ کا نام سرفہرست آئیگا۔ پھر اگست ۱۹۴۸ء کے ارشادات میں فرمایا کہ

اس پورے گروہ میں ایک کو بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازیگروں سے بھری پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب تلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت

اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے

اس وقت کہا جا رہا تھا جب قائداعظمؒ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے! وہی قائداعظمؒ جن کے متعلق دی صاحب نے قومی مجلس لاہور کے نام اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ

> بابائے ملت نے انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کر کے دنیا کے نقشہ پر سب سے بڑا مسلم ملک قائم کر دیا۔ (مساوات ۔ ۹/۱۱)

(۰)

دلاوراست دزدے

یہ ہے نمونہ ان ارشادات عالیہ کا جو مودودی صاحب نے قائداعظمؒ کے خلاف ۱۹۴۱ء سے لیکر ۱۹۴۸ء تک ارزانی فرمائے۔ اور جس کے بعد آپ ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے قائداعظمؒ کے خلاف تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ چہ دلاوراست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

سائیکالوجی کی رو سے ایک نفسیاتی مرض ہے جسے (SADISM) کہتے ہیں۔ اس مرض کا مریض دوسروں کو اذیت دینے میں بڑی لذت محسوس کرتا ہے۔ اس سے اس کی انانیت کی تسکین ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے مودودی صاحب اس مرض میں مبتلا ہیں۔ وہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل میں بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ بڑے فخر سے لکھتے ہیں۔

> میں نے اب تک کوئی چیز ایسی نہیں لکھی ہے جس پر کسی نہ کسی گروہ کو چوٹ نہ لگی ہو۔ اور اگر میں یہ فیصلہ کر لوں کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو ناگوار نہ ہو، تو شاید کچھ بھی نہ لکھ سکوں۔
>
> (رسائل و مسائل حصہ اول ۔ صـ۲۸۳ ۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

اس کے ساتھ ہی مصیبت یہ ہے کہ مودودی صاحب اس اخلاقی جرأت سے عاری ہیں کہ وہ دوسروں کو اس قسم کی چوٹیں کرنے کے بعد سینہ تان کر اقرار کریں کہ ہاں میں نے ایسا کہا ہے اور ہزار بار ایسا کہوں گا۔ وہ دوسروں کے خلاف جو جی میں آئے کہتے بھی چلے جاتے ہیں اور جب اس پر گرفت کی جائے (بسبب چار ووٹ چھننے کا خطرہ ہو) تو پھر اس سے صاف مکر بھی جاتے ہیں۔ لیکن مکرتے ہیں اس بڑے طریقے سے کہ دوسرے ہی سانس میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ (SADISM) کی لذت اور اخلاقی جرأت کے فقدان کا نتیجہ وہ قلبی اضطراب ہے جس میں وہ آجکل اس بری طرح سے مبتلا ہیں۔ اسے

خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس میں دیر تو ہو سکتی ہے' اندھیر کبھی نہیں ہوتا۔ اگر مودودی صاحب کو عمر کے اس آخری حصہ میں توبہ کی سعادت نصیب ہوجاتی تو وہ زندگی کے اس قدر الم انگیز اور ذلت آمیز انجام سے بچ جاتے۔ لیکن توبہ کے لئے تو بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے' اور توبہ کے بغیر خدا کا عذاب ٹل نہیں سکتا۔ لہٰذا' نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

———(۰)———

پس تحریر — ایک اور شہادت

جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات اس واقعہ کو بڑے فخر سے بیان کیا کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے اسلامی آئین کی ترتیب کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی جس میں مودودی صاحب کو بھی ایک رکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے متعین طور پر کبھی نہیں بتایا۔ کہ وہ کمیٹی کب متشکل کی گئی تھی۔ ہمارے اس وقت کے پیشِ نظر موضوع کے اعتبار سے یہ واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی طرف سے ۱۹۵۷ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا "اسلام کا سیاسی نظام"۔ اس کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا۔

"یہ کتاب جو آپ کے پیشِ نظر ہے' اپنی تسوید و تالیف کی ایک مختصر سی، گو ذرا افسوسناک تاریخ بھی رکھتی ہے۔ سنہ غالباً ۱۹۴۲ء تھا یا شاید اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا کہ اربابِ لیگ کو خیال یہ پیدا ہوا کہ ———

— جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شد و مد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام نامہ یا قانونِ اساسی بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہیئے۔ اور اسی غرض کے لئے یو۔ پی کی صوبہ مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظامنامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلسِ نظامِ اسلامی کے چار ممبران کے نام تو اچھی طرح یاد ہیں

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(۳) مولانا آزاد سبحانی (۴) مولانا عبدالماجد دریابادی

باقی دو ممبر غالباً اور تھے۔ ان کے نام اب ذہن میں نہیں۔ مسلم لیگ کی فراغ مشربی اس سے

واضح ہے کہ اس مجلس کے بیشتر ممبر لیگ کے ممبر نہ تھے۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ طے یہ پایا تھا کہ اس آئین کا خاکہ مولانا حکیم محمد اسحاق سندیلوی (ندوی) تیار کریں۔ اس کی ایک نقل ہر ممبر کے پاس بھیجی جائے۔ یہ ارکان اس پر نقد و تبصرہ کریں اور پھر ایکبار جمع ہو کر بحث و گفتگو کے بعد مسودہ کی آخری شکل طے کر دیں۔ چنانچہ مولانا اسحاق صاحب نے اس کا مسودہ تیار کر دیا اور اس کی نقول ممبروں کے پاس بھیجدی گئیں۔ لیکن ممبران کے یکجا کرنے اور بحث و گفتگو ہونے کی منزل کبھی نہ آسکی۔ اس مسودہ کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا (جسکا پیش لفظ مولانا دریابادی نے ۱۹۵۲ء میں لکھا تھا)۔

اس سے واضح ہے کہ ۱۹۴۱ء (یا اس سے بھی قبل) مسلم لیگ نے یہ طے کر لیا تھا کہ جس مملکت کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کر رہی ہے اس میں اسلامی نظام رائج کیا جائیگا۔ اور اس اسلامی نظام کا دستور مرتب کرنے کے لئے اس نے ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی تھی جس کے ایک ممبر مودودی صاحب تھے (اور اس کا خود مودودی صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ وہ اس کمیٹی کے ممبر تھے)۔ اس کے بعد مودودی صاحب، مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھتے ہیں کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آجتک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت مارچ ۱۹۴۱ء۔ ص۳۲)

۱۹۴۱ء یا اس سے بھی کچھ عرصہ پہلے، مودودی صاحب مسلم لیگ کی طرف سے مقرر کردہ اس کمیٹی کے ممبر منتخب کئے گئے تھے جس کے ذمے یہ فریضہ عاید کیا گیا تھا کہ وہ پاکستان کے لئے اسلامی نظام کا دستور مرتب کریں اور مودودی صاحب ۱۹۴۱ء میں یہ تحریر فرما رہے ہیں کہ مسلم لیگ کیطرف سے آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اس کا مطمح نگاہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ اگر اسکا مطمح نگاہ یہ نہیں تھا تو وہ کمیٹی کاہے کیلئے مقرر کی گئی تھی؛

اس قدر کھلی ہوئی غلط بیانی کی مثال آپ کو شاید ہی کہیں اور ملے! اور اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ جماعت کے متوسلین مودودی صاحب کو بدستور "امام حنبلؒ" اور امام ابن تیمیہؒ کے ہم پایہ" قرار دیتے چلے جائیں گے!

واضح رہے کہ ۱۹۴۱ء سے قبل کا زمانہ وہ تھا جب مودودی صاحب، متحدہ قومیت کے نظریہ کے خلاف مضامین لکھ رہے تھے۔ اسی وجہ سے تحریکِ پاکستان کے حامیوں کی نگاہ میں ان کی وقعت تھی اور مسلم لیگ کی مولہ بالا کمیٹی کی رکنیت کے لئے ان کے انتخاب کا جذبہ محرکہ بھی غالباً یہی تھا۔ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اس کے بعد شروع کی تھی۔ جب (خود مودودی صاحب کے اعتراف کے مطابق) مسلم لیگ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اس کا مطمح نگاہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام ہے۔

(باقی)

باسمہٖ تعالیٰ

(جو کثرتِ تعبیر سے پریشاں ہوگیا)

"کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں
جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہوں"

(مودودی صاحب)

اِسلامی مملکت کا خواب

جو کثرتِ تعبیر سے پریشاں ہو گیا

آپ طلوعِ اسلام کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ ہم مسلسل تئیس سال سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی موجودگی میں نہ اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی قانونِ شریعت رائج کیا جا سکتا ہے۔ اگر پاکستان کے مسلمان فی الواقعہ چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی قوانین رائج ہوں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اولاً مختلف فرقے اپنے مؤقف میں یہ تبدیلی پیدا کریں کہ وہ اپنی اپنی فقہ اور اپنے اپنے ہاں کی احادیث (روایات) پر جسم کر بیٹھنے کے بجائے، قرآن کریم کو سند اور حجت تسلیم کریں اور اس کی روشنی میں، ازسرِ نو، قوانینِ شریعت کی تدوین کریں۔ یہ وہ ضابطۂ قوانین ہوگا جو تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی قرار پا سکے گا — اور ثانیاً یہاں ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جائے کہ ہماری آنے والی نسلیں، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، بریلوی کے بجائے صرف مسلمان بن کر ابھریں۔ چونکہ مذہبی پیشوائیت کی بقاء کا راز فرقہ بندی میں ہے، اس لئے ان کی طرف سے ہماری اس دعوت کی سخت مخالفت ہوئی۔ لیکن، اس مخالفت میں، بجائے اس کے کہ ہمارے دلائل کا جواب دیا جاتا، انہوں نے (حسبِ معمول) طلوعِ اسلام پر مختلف لیبل چسپاں کرنے شروع کر دیئے — یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ سنت ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کر رہا ہے۔ یہاں سیکولر نظام لانا چاہتا ہے (اور مقطع کا بندیہ کہ) یہ ملحد ہے کافر ہے۔ ہماری دعوت کی مخالفت کرنے والوں میں اکثریت تو ان کی تھی جن کے نزدیک شریعت نام ہے نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج یا نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق قوانین کا — اور اسلامی نظام کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں شرعی تعزیرات (سزائیں) رائج کر دی جائیں۔ اس لئے وہ قوانینِ شریعت کے نفاذ میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو سمجھتے تھے

کہ طلوعِ اسلام جو کچھ کہتا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ لیکن چونکہ وہ "اسلامی نظام" اور "اقامتِ دین" وغیرہ مجمل اصطلاحات کی آڑ میں اپنا اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لئے وہ اس مخالفت میں سب سے پیش پیش اور متشدد تھے۔ لیکن اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ طلوعِ اسلام جو کچھ کہتا تھا وہ ابھر کر سامنے آرہا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب کیا کیا جائے۔

قبل اس کے کہ ہم ان تازہ حالات کو قارئین کے سامنے لائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (تجدید یادداشت کے لئے) ذرا تفصیل سے بتا دیا جائے کہ طلوعِ اسلام کی اس باب میں دعوت کیا تھی جس کی مخالفت کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں (مثال کے طور پر) ذیل میں وہ مقالہ درج کیا جاتا ہے جسے طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۶۹ء میں "قانون سازی اور علماء کرام" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ اسے بغور ملاحظہ فرمایئے[1]۔

"قانون سازی اور علمائے کرام"

تشکیلِ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس مملکت میں اسلامی نظام رائج کیا جاسکے اور نظام اپنی عملی شکل میں، قوانین کی رُو سے بروئے کار آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، کسی مملکت کا آئین ان اصولوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جن کے مطابق وہ مملکت وجود میں آتی ہے، اور مملکت کے قوانین ان اصولوں کی عملی تعبیر کرتے ہیں۔ بنا بریں قیامِ پاکستان کے بعد سب سے اہم سوال، مملکت کے لئے آئین وضع اور قوانین مرتب کرنے کا تھا۔ صدرِ اوّل کے بعد (کہ جب امّت میں فرقوں کا وجود نہیں تھا) ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ آیا تھا کہ کسی مملکت نے یہ طے کیا ہو کہ مملکت کے قوانین اسلامی ہوں یعنی ایسے قوانین جن کا اطلاق مملکت میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے، ورنہ اس سے پہلے، مسلمانوں کی سلطنتوں میں اُس فرقہ کا قانون نافذ ہوتا تھا جس سے مملکت کے اربابِ اقتدار منسلک ہوتے تھے۔ اور چونکہ، باستثنائے چند، مسلمانوں کی مختلف سلطنتوں میں اربابِ اقتدار حنفی العقیدہ ہوتے تھے، اس لئے عام طور پر ان سلطنتوں میں فقہ حنفی مملکت کا قانون قرار پاتی تھی۔ اقلیتی فرقوں کے لئے اتنی رعایت رکھ دی جاتی تھی کہ شخصی معاملات میں، وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق فیصلے کر لیا کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال، اسلام کے منشاء کو پورا نہیں کرتی تھی۔ سب سے پہلے تو یوں کہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق ہی غیر اسلامی ہے اور دوسرے یہ کہ کسی فرقہ کو (خواہ اس کے ماننے والے کتنی ہی اکثریت میں کیوں نہ ہوں) اس کا حق کیسے پہنچ سکتا ہے کہ وہ اقلیت کے فرقہ سے اپنی فقہ منوائے۔ اکثریت کے فیصلہ کو ملک کا قانون قرار دینا، مغربی جمہوریت کی رُو سے تو صحیح قرار پا سکتا ہے، اسلامی اصول قرار نہیں پا سکتا۔ اسلام میں، صحیح اور غلط، حق اور باطل کا معیار، وہ ابدی حدود ہیں جنہیں خدا نے (بذریعہ وحی) متعین کر دیا ہے

[1] بہتر ہو کہ اس کے ساتھ وہ مقالہ بھی دیکھ لیا جائے جو "کیا پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے" کے عنوان سے طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۰ء میں شائع

نہ کہ اکثریت (یا اقلیت یا کسی ایک فرد) کے فیصلے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ایسے ملک میں جس میں مسلمانوں کے مختلف فرقے بستے ہوں، ایک ایسے ضابطۂ قوانین کا مرتب کرنا جس کا اطلاق (اسلامی قوانین کی حیثیت سے) تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے، نہایت نازک اور مشکل مسئلہ تھا ہم نے اس کا حل یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں، ایک (اور صرف ایک) چیز بطور قدرِ مشترک موجود ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب —— قرآنِ کریم —— کی ابدیت اور حکمیت پر ایمان —— اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآنِ کریم میں بیان کردہ احکام و اصول کے خلاف ہو، تو یہ چیز تمام فرقوں کے لئے وجۂ جامعیت بن سکیگی ہماری طرف سے پیش کردہ یہ حل، قرآنِ کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھا جس نے واضح الفاظ میں کہا ہے ——
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔ اسی کو خدا نے تفرقہ مٹانے کا واحد علاج بتایا تھا جب کہا تھا ——
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ (۳/۱۰۲) تم سب کے سب اس ضابطۂ خداوندی کے ساتھ متمسک رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس قرآنی حل کی مخالفت ہوئی اس لئے کہ فرقوں کے مٹ جانے سے ان کا الگ الگ وجود ختم ہو جاتا تھا اور وہ چاہتے ہی نہیں کہ امت میں وحدت پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ تجویز کیا کہ قانون سازی کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ

(۱) ملک کا کوئی قانون کتاب سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور

(۲) شخصی قوانین میں ہر فرقہ کی کتاب سنت کی اپنی اپنی تعبیر ہوگی۔

اس پر ہم نے گزارش کیا کہ (قطع نظر اس کے کہ شخصی اور ملکی قوانین کی یہ تفریق ہی سراسر غیر اسلامی ہے) اس اصول کے ماتحت، کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکیگا جس پر تمام فرقے متفق ہو سکیں۔ اس لئے کہ ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی فقہ عین مطابق "سنت" ہے۔ بنا بریں آپ جو قانون بھی مرتب کریں گے، وہ فرقہ اسے خلافِ کتاب وسنت قرار دے گا جس کی فقہ اس قانون کی تائید نہیں کرے گی۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن چونکہ وہ فرقوں کو مٹانا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے قدیم حربے سے کام لیا اور طلوعِ اسلام کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ منکرِ حدیث، منکرِ سنت، اور منکرِ رسالت ہے۔ چونکہ حدیث یا سنت کا تعلق امت کے نازک ترین گوشہ سے ہے، اس لئے ان کا یہ پراپیگنڈہ کارگر ہو گیا اور اصل سوال اس شور وغوغا میں گم ہو کر رہ گیا۔

اس گروہ کے سیاسی مہرہ بازوں نے (جن میں جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے) اس صورتِ حال سے

مدہ اٹھایا کہ جو حکومت برسر اقتدار آئی اس کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ وہ ملک میں اسلامی
ین نافذ نہیں کرتی۔ یہ لوگ مسلسل یہی شور مچاتے رہے اور ہم مسلسل یہ کہتے رہے کہ ان کے اس اعتراض کا
یہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ان سے کہا جائے کہ آپ تمام حضرات مل کر ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب
یجئے جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اسی ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دیا جائیگا۔
ہم اطمینان ہے کہ (بیس برس کے بعد ہی سہی) یہ بات ارباب حکومت کی سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ صدر مملکت
(ایوب خان) نے ۳۰ ر دسمبر کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ صدر نے کہا کہ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جس طرح کہ خدا اور رسول کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ صدر نے کہا کہ میں نے علماء سے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس طرح اس قانون کے حق میں عوام کی تائید بھی حاصل کریں، اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اور اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دونگا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہے۔
>
> (نوائے وقت۔ ۳۱ ر دسمبر ۱۹۶۶ء)

اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں اگر ان حضرات کا مطالبہ خلوص اور دیانت پر مبنی ہوتا تو انہیں صدر مملکت کی اس پیشکش کو آگے بڑھ کر لبیک کہنا چاہیئے تھا۔ آپ غور فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر مسرت انگیز بات اور کون سی ہو سکتی ہے کہ سربراہِ مملکت خود دعوت دے کہ آپ حضرات ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں، صدر مملکت نے طریق کار کے سلسلہ میں جو تجاویز پیش کی ہیں، ان کے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اور ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کرائی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ علماء کرام کو صدرِ مملکت کا یہ چیلنج فوراً قبول کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ قبول تو اس صورت میں کرتے جب انہیں یقین ہوتا کہ اس قسم کا متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ہزار برس سے یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں یا باندھنے چاہئیں اور اگر باندھنے چاہئیں تو

کس مقام پر. کیا وہ لوگ مملکت کے لئے متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کر سکتے ہیں؟ کتاب و سنت کے مطابق متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کرنا تو ایک طرف، ہم انہیں برسوں سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ آپ حضرات متفق طور پر یہ بتا دیجئے کہ "سنت" کہتے کسے ہیں اور یہ کونسی کتاب میں ملے گی۔ ان کے پاس اس کا جواب بھی سوائے گالیوں کے کچھ نہیں۔

بہر حال، صدرِ مملکت کی اس پیشکش کے جواب میں ان کی طرف سے جس بوکھلاہٹ کا مظاہرہ ہوا ہے، اس سے ان کے بادبانوں سے ہوا نکل گئی ہے اور یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آ گئی ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہوتا تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قانون سازی کا جو اصول یہ حضرات پیش کرتے ہیں، اس کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو نہیں سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صدرِ مملکت کی اس پیش کش کے خلاف، چند ایک مولوی صاحبان کے سوا، کسی نے لب کشائی تک نہ کی۔ سب نے چپ سادھ لی ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں جنہوں نے جواب دیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے یا تو ان شرائط کو ہدفِ اعتراض بنا لیا ہے جو صدرِ مملکت کی طرف سے عاید کی گئی ہیں اور یا یہ کہا گیا ہے کہ فلاں فلاں قانون (مثلاً عائلی قوانین یا خاندانی منصوبہ بندی) کے خلاف علماء نے اعتراض کیا تھا۔ انہیں کیوں نہیں منسوخ کیا گیا۔ یہ دعویٰ کسی ایک کی طرف سے بھی نہیں کیا گیا کہ اگر صدر ان شرطوں میں فلاں فلاں تبدیلی کر دے تو ہم اس قسم کا متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ان جوابات میں البتہ ایک چیز بطور قدرِ مشترک سامنے آئی ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۵۱ء میں اکتیس علماء نے (جن میں ہر فرقہ کے نمائندگان شامل تھے) بائیس نکات پر مبنی ایک مسودۂ سفارشات پیش کیا تھا۔ ایسے متفق علیہ مسودہ کی موجودگی میں، ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین کا مطالبہ چہ معنی دارد! اس جواب سے عوام کو یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ غلط ہے کہ فرقوں کا وجود متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کی راہ میں حائل ہے مختلف فرقوں کے علماء تو ۱۹۵۱ء میں متفق ہو چکے تھے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ

> سب سے پہلے تو انہوں نے (یعنی صدرِ مملکت نے) مسلمانوں کے مذہبی تفرقوں کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہی چیز اسلامی قانون کے نفاذ میں مانع ہے۔ حالانکہ جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون، شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہو گا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور قلیل التعداد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لاز (یعنی ان کی اپنی فقہ) کے مطابق کئے جائیں گے۔ ۔۔۔ لہٰذا شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر

کوئی رکاوٹ عاید ہوسکتی تھی تو وہ پہلے ہی دور کی جا چکی ہے اور اب ان اختلافات کو نفاذِ شریعت میں مانع قرار دینے کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔

(نوائے وقت۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۶۹ء)

واقعی یہ دعویٰ بہت بڑا ہے۔ اور اگر ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں کے علماء کسی ضابطہ قوانین پر متفق ہو چکے تو آج ان کے اختلافات کو نفاذِ قانون کے راستے میں رکاوٹ قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔ لہٰذا، آیئے ہم دیکھیں کہ ۱۹۵۱ء میں یہ حضرات کس بات پر متفق ہوئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اواخر جنوری ۱۹۵۱ء میں مولوی صاحبان کی ایک کانفرنس، زیر صدارت سید سلیمان ندوی (مرحوم) منعقد ہوئی تاکہ دستور پاکستان کے بنیادی اصول مرتب کئے جائیں۔ اس کانفرنس میں اکتیس مولوی صاحبان نے شرکت کی جن میں اہل فقہ، اہل حدیث، شیعہ حضرات اور کچھ پیر صاحبان بھی شامل تھے۔ ان کی طرف سے اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کے عنوان سے ایک مسودہ شائع ہوا تھا اسے ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

(۲)

مسودہ | اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصولوں کی تصریح لازمی ہے۔

(۱) اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

(۲) ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جاسکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جاسکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت تک کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

(۳) مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

(۴) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کرکے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

(۶) مملکت، بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ، اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(۷) باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان ومال وآبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل وحرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

(۸) مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائیگا۔ اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعہ صفائی وفیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دیجائے گی۔

(۹) مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیرووں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کرسکینگے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہونگے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

(۱۰) غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب وعبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم ورواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

(۱۱) غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی۔ اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ مملکت سب برابر کے شریک ہونگے۔

(۱۲) رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا انکے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

(۱۳) رئیسِ مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کرسکتا ہے۔

(۱۴) رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی۔ یعنی وہ ارکان اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

(۱۵) رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً و جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

(۱۶) جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرتِ آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

(۱۷) رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

(۱۸) ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کے لئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا۔ اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کرینگی۔

(۱۹) محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

(۲۰) ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

(۲۱) مملکت کے مختلف ولایات و اقطاع مملکتِ واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہونگے۔ ان کی حیثیت، نسلی، لسانی، یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

(۲۲) دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(۰)

طلوعِ اسلام کی تنقید

پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ مسودہ، مملکت کے آئین کے اصولوں سے متعلق ہے اور اس وقت بات ایک ضابطۂ قوانین کے مرتب کئے جانے کی ہو رہی ہے۔ آئین و قوانین میں جو بنیادی فرق ہے اسے ہر صاحبِ شعور جانتا ہے۔

پھر یہ دیکھئے کہ اس میں قوانین سازی کا وہی اصول دیا گیا ہے جو ۱۹۶۲ء کے آئین میں موجود ہے یعنی ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ اصول بیشک متفق علیہ ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس اصول کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین بھی مرتب کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں "سنت" کا مفہوم اور تعین ہی تو مختلف فرقوں میں مابہ النزاع ہے۔ ان علماء نے سنت کے لفظ پر تو اتفاق کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ سنت کے مفہوم اور تعین پر بھی ان کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ ہم کئی بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔ سنت کا تعین تو ایک طرف، اس کی (DEFINITION) کے متعلق خود مودودی صاحب اور جمعیت اہلِ حدیث میں اس قدر اختلاف ہے کہ اہلِ حدیث حضرات، مودودی صاحب کے پیش کردہ سنت کے مفہوم کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے پر تلے

بیٹھے ہیں۔

اس کے بعد حنفی حضرات اور اہل حدیث حضرات کو لیجئے۔ اہل حدیث حضرات کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار بھی کفر کا مستلزم ہے اور حنفی حضرات کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو احادیث ناقابلِ تسلیم ہیں اور جن احادیث پر فقہ حنفی کا مدار ہے، اہلحدیث ان میں سے بیشتر سے انکار کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث کے متعلق، حنفی حضرات کا عقیدہ کیا ہے، اس کی بابت، فقہ حنفی کے ایک مقتدر امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا فتویٰ ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو مؤول ہے اور یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤول یا منسوخ ہے۔
>
> (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی۔ خضری ص۳۱۲)

پھر سنی (جن میں حنفی یعنی دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث سب شامل ہیں) اور شیعہ حضرات کے اختلاف کا اس سے اندازہ لگائیے کہ سنیوں کے نزدیک جس حدیث کے رواۃ میں کوئی ایک شیعہ راوی ہو، وہ حدیث ناقابلِ قبول قرار پاجاتی ہے اور شیعہ حضرات کے مجموعہ ہائے احادیث، سنی حضرات کے مجموعوں سے بالکل الگ اپنے ہیں۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جن علماء میں سنت (یا احادیث) کے صحیح اور غلط ہونے کے متعلق اس قدر باہمی اختلافات ہوں، ان کے متعلق یہ کہنا کہ قانون سازی کے سلسلہ میں ان سب کا اتفاق ہوگیا تھا، اگر کھلی ہوئی فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے؟

مودودی صاحب نے اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں

> تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے۔

ہم نے ۱۹۵۱ء کا مسودہ، من وعن اوپر درج کر دیا ہے۔ آپ اس کی ایک ایک شق کو دیکھئے اور پھر تلاش کیجئے کہ اس میں کہیں بھی یہ کہا گیا ہے کہ "ملک کا قانون، شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے"۔ آپ دیکھئے ہیں کہ مودودی صاحب کس جرأت اور دیدہ دلیری سے غلط بیانی کرتے ہیں۔!

۱۹۵۱ء کو تو چھوڑیئے، اُس وقت جن اکتیس علماء نے اس مسودہ پر دستخط کئے تھے، ان میں سے حنفی حضرات کو چھوڑ کر باقی حضرات سے پوچھئے کہ کیا وہ اس اصول سے متفق ہیں کہ ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہونا چاہیئے جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے ان سے پوچھئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ ان کے جواب سے مودودی صاحب کے جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی۔

اور دیگر علماء کو چھوڑ دیتے۔ ہم خود مودودی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شریعت کی جس تعبیر کو مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے، کیا آپ خود بھی اسے کتاب و سنت کی صحیح تعبیر تسلیم کرتے ہیں؟ خود مودودی صاحب کی تشریح کے مطابق، مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت فقہ حنفی کو کتاب و سنت کی صحیح تعبیر مانتی ہے۔ اس فقہ کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات کیا ہیں؛ انہیں ذرا غور سے سنئے۔ وہ اپنی تالیف "رسائل و مسائل" (حصہ اول) میں لکھتے ہیں۔

> امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں۔　　　(صفحہ ۲۷)

وہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

> جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنتِ رسولؐ روشن ہو جائے۔ اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔
> (تفہیمات۔ حصہ اول صفحہ ۲۲۵)

حنفی مسلک کا مدار تقلید ائمہ فقہ پر ہے۔ اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> میرے نزدیک ایک صاحب علم کے لئے تقلید، ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔　　　(رسائل و مسائل۔ حصہ اول۔ صفحہ ۲۴۴)

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا ایک مجتہد کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے واجب العمل ہو سکتا ہے؛ وہ فرماتے ہیں۔

> یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علم الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اسلئے اسکے احکام تمام ازمنہ واحوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اسکے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔　　(تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۲۶)

فقہ حنفی میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اسے مودودی صاحب، وہ جامد اور بے روح مذہبیت قرار دیتے ہیں جسے آجکل اسلام کہا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں

سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم ص۳۶)

یہ ہیں اس فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات جسے اب وہ ملک کا قانون بنانا چاہتے ہیں اور جس کی سند وہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت اس کی حامل ہے۔ اس سند (یعنی اکثریت کے مسلک کے برسرِ حق ہونے) کے متعلق بھی مودودی صاحب کا فیصلہ سن لیجئے۔ وہ محولہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں۔

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے۔ اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ ہمیشہ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی، جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبیؐ نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں۔ اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ (ص۸۱)

یہ ہے مختصر الفاظ میں اس دعویٰ کی حقیقت کہ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے علماء قانون سازی کے مسئلہ پر متفق ہو چکے تھے۔ اسلئے فرقوں کی موجودگی اس میں مانع نہیں ہو سکتی۔

اس ضمن میں ایک اور مغالطہ بھی دیا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قانون سازی کا متفق علیہ اصول یہ ہے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا اور شخصی قوانین کے سلسلہ میں ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریگا۔ اس سے تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ مختلف فرقوں میں اختلاف صرف شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی حد تک ہے کتاب و سنت کی روشنی میں 'پبلک لاز' ایسے بنائے جا سکتے ہیں جو تمام فرقوں کے لئے یکساں طور پر قابلِ قبول ہوں۔ یہ دعویٰ بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ پبلک لاز میں بھی مختلف فرقوں میں اسی قسم کے اختلافات موجود ہونگے جس قسم کے اختلافات پرسنل لاز میں ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں، اور اس مثال کا انتخاب بھی ہم نے خود نہیں کیا۔ کراچی کے (مولانا) احتشام الحق صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ

کیا ملک میں شراب کو حرام قرار دینے کے بارے میں بھی کوئی فرقہ وارانہ اختلاف موجود ہے، جو اب تک خلافِ قانون قرار نہیں دی گئی۔

(نوائے وقت۔ ۳ر جنوری ۱۹۶۹ء)

پیئے ہم دیکھیں کہ کیا اس باب میں بھی مختلف فرقوں میں اختلاف موجود ہے؟ یا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

[اس کے بعد ہم نے شراب اور زنا کے دو مسائل کے متعلق وضاحت سے بتایا تھا کہ ان میں شیعہ سنی اور پھر سنیوں کے مختلف ائمہ فقہ میں کس قدر اختلافات ہیں۔ ہم بغرض اختصار ان تفصیلات کو حذف کر رہے ہیں۔ جو حضرات انہیں دیکھنا چاہیں وہ طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۶۹ء میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان تفصیلات کے بعد ہم نے لکھا تھا ———]

ہم سردست انہی تفاصیل پر اکتفا کرتے ہیں، اور قارئین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے اختلافات کی موجودگی میں ان حضرات علماء کرام کا یہ ارشاد کہ فرقوں کی موجودگی، ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین کے مرتب اور نافذ کرنے کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی، کہاں تک دیانت اور صداقت پر مبنی ہے؟ ہمارے بس میں ہو تا تو ہم ابھی انہیں اقتدار کی کرسیوں پر بٹھا کر کہتے کہ لیجئے سرکار! اب ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین نافذ کر کے دکھائیے۔

یاد رکھیئے۔ ایک اسلامی مملکت میں متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کئے جانے کی شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ مختلف فرقے اپنی اپنی فقہ کو الگ رکھ کر قرآنِ کریم کو دین میں آخری حجت اور سند تسلیم کر لیں اور اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، باہمی مشورے سے ازسرِ نو فقہ کی تدوین کریں۔ اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو پھر ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین قیامت تک مرتب نہیں ہو سکتا۔ مشکلات کا حل نہ عوام کو دھوکا دینے سے مل سکتا ہے، نہ زور زور سے ڈگڈگی بجانے سے۔ ان کا حل حقائق کا سامنا کرنے ہی سے مل سکتا ہے اور اسی سے یہ گریز کرتے اور فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

——— (۰) ———

یہ ہم نے فروری ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا۔ اس کے بعد بھی ہم وقتاً فوقتاً اپنے ان خیالات کو دہراتے رہے اور ان حضرات کی طرف سے ہماری مخالفت ہوتی رہی۔

شیعہ حضرات کا اعتراض

کچھ دن ہوئے ادارۂ تحفظ حقوقِ شیعہ نے یہ سوال اٹھایا کہ پاکستان میں جس اسلامی نظام کے نفاذ کی کوشش کی جا رہی ہے، اس میں شیعوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں امیر جماعتِ اسلامی مودودی صاحب نے (جماعت کے ترجمان اخبار "ایشیا" کی ۲۳ اگست کی اشاعت میں) حسب ذیل بیان شائع کیا۔

"۲۰ اگست کے اخبارات میں سید مظفر علی شمسی صاحب جنرل سیکرٹری ادارۂ تحفظ حقوقِ شیعہ نے اپنی پریس کانفرنس میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ ان کے ادارے کی طرف سے ملک کی تمام دوسری جماعتوں کے لیڈروں کی طرح مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کے پاس بھی بھیجے گئے تھے۔ مولانا نے ان کے جواب میں ادارۂ مذکور کو جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے جواب میں فرمایا ہے کہ جماعت اسلامی نے کبھی یہ نہیں کہا (نہ اسکے لٹریچر یا منشور میں کہیں آپ یہ بات پا سکتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست کا صدر لازماً فلاں مسلک کا مسلمان ہونا چاہئیے۔ ہم صدر ریاست کے لئے صرف مسلمان ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ جب ہم خلافتِ راشدہ کے نمونے کی پیروی کرنے کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور بھی شامل ہوتا ہے، اور کم از کم وہ تو ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے۔ باقی رہے پہلے تین خلفاء۔ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ملک کے اہل سنت ان کی خلافت کو بھی خلافتِ راشدہ مانتے ہیں۔ ان کے اس عقیدے کو آپ چاہے صحیح نہ سمجھیں' لیکن اس بات کو تو آپ تسلیم کرینگے کہ وہ یہ عقیدہ رکھنے کا ویسا ہی حق رکھتے ہیں جیسا آپ اپنا ایک عقیدہ رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ اب اگر مسلمانوں کی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم ہونے کے لئے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ ملک میں جتنے مختلف مسلکوں کے مسلمان موجود ہیں' وہ سب کسی ایک مسلک پر متفق ہو جائیں تو یہ شرط نہ کبھی پوری ہوگی نہ اس شرط کے ساتھ دنیا میں کوئی اسلامی ریاست قائم ہو سکے گی۔

کتاب و سنت کی تعبیر کے معاملے میں ہمیں اور آپ کو عام ملکی قانون (پبلک لاز) اور شخصی قانون (پرسنل لاز) کے درمیان لامحالہ فرق کرنا ہوگا۔ عام ملکی قانون بہرحال کتاب و سنت کی اسی تعبیر پر بنے گا جسے اکثریت مانتی ہے۔ مراکو میں اکثریت مالکیوں کی ہے اس لئے وہاں کا پبلک لاز مالکی تعبیر پر بنے گا۔ انڈونیشیا اور ملایشیا میں اکثریت شافعی ہے اس لئے وہاں کا پبلک لاز شافعی تعبیر پر بنے گا۔ ایران میں اکثریت شیعہ ہے' اس لئے وہاں پبلک لاز شیعہ تعبیر پر بنے گا۔ اور پاکستان میں اکثریت سنی ہے' اس لئے اگر یہاں آپ کوئی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا پبلک لاز لازماً سنی تعبیر پر ہی بنے گا۔ البتہ پرسنل لاز کے معاملے میں شیعوں کے لئے شیعہ تعبیر، اہل حدیث کے لئے اہل حدیث تعبیر اور حنفیوں کے لئے حنفی تعبیر ہی مسلّم ہوگی۔ اس اصولی بات کو اگر تسلیم نہ کیا جائے تو پھر یوں کہئیے کہ ہم اور آپ انگریزی، جینی، روسی یا کسی اور غیر اسلامی قانون پر متفق ہو جائیں۔ کیونکہ کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

تعلیم کے معاملے میں ہم نے اپنے منشور کے صفحہ ۱۸ پر یہ تصریح کر دی ہے کہ ثانوی تعلیم تک ہر مسلمان بچے کو لازماً اسلامی عقاید اور ضروری احکام سے واقف کرایا جائے گا اور جو مسلمان فرقے اکثریت سے مختلف عقائد رکھتے ہیں ان کے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام ان کی مرضی کے مطابق الگ کیا جائے گا۔

مسلمہ اسلامی فرقوں کے حقوق ہم نے اپنے منشور کے صفحہ ۲۳ پر ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ میں بیان کئے ہیں جو ۱۹۵۱ء میں سنی اور شیعہ علماء کے باہمی اتفاق سے اسلامی ریاست کے ۲۲ اصولوں میں طے ہوئے تھے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں۔

• مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا پورا حق ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کرسکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی کہ انہی کے قاضی یہ فیصلہ کرینگے۔"

آخر میں مولانا مودودی نے امید ظاہر کی ہے کہ اس وضاحت سے شیعہ بھائیوں کو جماعت اسلامی کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی۔"

آگے بڑھنے سے پیشتر، آپ ذرا مودودی صاحب کے ان الفاظ پر غور کیجئے کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں اور شیعوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق علیہ ہو" اور سوچئے کہ یہ وہی بات نہیں جسے طلوع اسلام تئیس سال سے دہراتے چلا آرہا ہے اور جس کی پاداش میں اسے کافر و مرتد قرار دیا گیا ہے۔ دیکھئے، حقیقت اپنے آپ کو کس طرح منوا لیتی ہے!

مودودی صاحب کے اس بیان کے جواب میں، ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ کے صدر، سید اظہر حسین زیدی صاحب نے ذیل کا بیان شائع فرمایا۔

"مرکزی ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ کے صدر سید اظہر حسین زیدی نے امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی کے آئین کے بارے میں حالیہ بیان کی پرزور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مودودی نے اہل تشیع کو جو ایک مسلمہ مسلمان فرقہ ہیں اسلام کے دائرے سے نکال کر عیسائیوں، اچھوتوں اور دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی صف میں کھڑا کر کے شیعہ مسلمانوں کی توہین کی ہے۔ سید اظہر حسین زیدی ایک پریس کانفرنس سے مخاطب تھے۔ انہوں نے کہا کہ چند ہفتے پیشتر میں تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو مراسلے بھیجے تھے کہ اب جبکہ آپ سواد اعظم کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ملک میں خلافت راشدہ کا نظام لانا چاہتے ہیں تو ایسے نظام میں مسلمہ اسلامی فرقہ شیعہ جو کتاب و سنت کے مطابق تعلیمات محمدؐ و آل محمدؐ سمجھتا ہے اور پاکستان کے حصول اور تعمیر میں سواد اعظم کے ساتھ برابر کا حصہ دار ہے اس کے مذہبی اور سیاسی جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے اسے کس طرح نمائندگی دی جائے گی۔

انہوں نے کہا کہ اس خط کے جواب میں مولانا مودودی نے جو آئینی خاکہ پیش کیا ہے اس کی رو سے عام ملکی قانون کتاب و سنت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے اکثریت مانتی ہو اور اکثریت کتاب و سنت سے مراد خلافت راشدہ کا نظام سمجھتی ہے جس میں شیعہ شریک نہیں اس اصول کے تحت وہی شخص صدر مملکت ہو سکتا ہے جو خلافت راشدہ کا قائل ہو۔

انہوں نے کہا کہ مولانا شاید بھول گئے ہیں کہ پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد میں شیعہ فرقے کے مسلمان

کے شریک رہے ہیں اور انہوں نے یہ ملک اس لئے نہیں بنایا تھا کہ ان کا "پرسنل لاء" محفوظ ہوگا" پرسنل لاء" تو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت کے بھی محفوظ ہونگے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی نے اپنے بیان کے جواز میں مراکش، ایران انڈونیشیا اور ملایا کی مثالیں دی ہیں۔ لیکن موصوف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کا معاملہ پاکستان سے بالکل مختلف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر مولانا مودودی لبنان کی مثال دیتے تو شاید قابلِ غور سمجھی جاتی۔ وہاں عیسائی اور شیعہ اور سنی مسلمانوں نے مل کر فرانسیسیوں سے اقتدار چھینا اور ایک ملک بنایا اور اس کے آئین میں اکثریتی فرقہ کا صدر سنی وزیر اعظم اور شیعہ سپیکر کا انتخاب ضروری قرار دیا گیا۔ اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی متحدہ جدوجہد سے انگریز سے اقتدار چھینا اور پاکستان بنایا۔ لہٰذا اس نسبت سے اقتدار میں بھی شیعہ فرقہ کا عمل دخل ہونا چاہیئے۔

انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی جو اسلام کی نمائندگی کے دعویدار ہیں وہ اس سے بھی باخبر ہیں کہ شیعہ مسلمان اسلامی فرقہ ہے اور سوادِ اعظم کے دوش بدوش پاکستان کے لئے ان کی قربانیاں کسی سے کم نہیں۔ لہٰذا جو بھی نظام یہاں پر رائج ہوگا شیعوں کو اس میں مذہبی ملکی اور شخصی تحفظ دینا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ فقہی مسائل اور عبادات کا تحفظ تو غیر مسلموں کو بھی حاصل ہے۔ لہٰذا مولانا مودودی شیعوں کو سوادِ اعظم کی سطح پر رکھیں نہ کہ ہندوؤں، سکھوں، اچھوتوں اور عیسائیوں جیسے غیر مسلم اقلیتوں کے برابر سمجھیں۔"

(بحوالہ روزنامہ "مساوات" مورخہ ۱۹ راگست ۱۹۷۰ء)

اور اسی ادارہ کے ایک اجلاس میں حسب ذیل قرار داد بھی منظور کی گئی۔

"شیعانِ پاکستان کسی ایسے پرسنل یا پبلک لاء کو تسلیم نہیں کریںگے جس میں اہل تشیع کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کی مکمل ضمانت نہ دی گئی ہو۔ اس عزم کا اظہار آج ادارہ تحفظِ حقوقِ شیعہ پاکستان کے اجلاس میں ایک قرار داد کے ذریعے کیا گیا۔ یہ اجلاس آج باغ بیرون موچی دروازہ میں مولانا سید اظہر حسین زیدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک اور قرار داد میں مطالبہ کیا گیا کہ اسمبلیوں کے انتخابات کے طریق کار میں ترمیم کر کے ایسے قانون کو نافذ کیا جائے جس میں شیعہ فرقہ کو اسمبلیوں میں مناسب نمائندگی دے جائے۔ ان قرار دادوں کی تائید میں سید مظفر علی شمسی، مولانا سید محبوب علی شاہ، مولانا ظفر الحسن، مولانا خادم حسین بخاری، ڈاکٹر سید ریاض حسین اور ڈاکٹر سید خادم حسین نے بھی تقاریر کیں۔

پاکستان شیعہ پولیٹیکل پارٹی کی کونسلنگ کمیٹی کے رکن جناب غلام ربانی مرزا نے صدر مملکت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مسلمانوں میں گروہی انتشار پیدا کرنے والوں کے خلاف موثر اقدام کریں۔ ایک اخباری بیان میں انہوں نے کہا کہ قائد اعظمؒ نے قیام پاکستان سے قبل اور بعد متعدد بار اس امر کا اعلان کیا کہ پاکستان میں ایک اسلامی فلاحی

مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے گا جس میں ہر قسم کے جبر و استحصال کا خاتمہ کیا جائے گا اور ہر فرد کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ لیکن وہ عناصر جو آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ آج نہ صرف نظریۂ پاکستان کے خالق و محافظ بن گئے ہیں بلکہ وہ قرآن و سنت کی سنّی تعبیر پر پاکستان کے دستور کی تدوین کرنا چاہتے ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ "مساوات" مورخہ ۲۹ جون)

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے حسب ذیل بیان شائع فرمایا۔

مودودی صاحب کا جواب

"میرے محترم دوست مولانا سید اظہر حسین زیدی صاحب کا جو بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے اُسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے میرے اُس بیان کو شیعہ حضرات کے لئے دل آزار قرار دیا ہے جو میں نے ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ کی طرف سے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں دیا تھا۔ اور اس کے متعلق بعض ایسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں جنہیں میں غلط فہمی پر ہی مبنی قرار دے سکتا ہوں۔ میں نے ان کے ادارے کے ارسال کردہ خط کا جواب براہ راست ان کے ادارہ ہی کو دیا تھا اور اسے اخبارات میں اشاعت کے لئے مجبوراً اس لئے بھیجا تھا کہ برادرم سید مظفر علی شمسی صاحب نے وہی سوالات اپنی ایک پریس کانفرنس میں چھیڑ دیئے تھے۔ اب میں ان کی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے چند امور کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

صدر مملکت کے بارے میں یہ بات میں نے اپنے بیان میں واضح طور پر کہی تھی کہ ہمارے نزدیک اس کا صرف مسلمان ہونا کافی ہے خواہ وہ مسلّمہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ اس سے قادیانی تو بے شک خارج ہو جاتے ہیں مگر جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ان کا ایک اسلامی فرقہ ہونا مسلّمہ ہے بلکہ مسلمانوں میں اب تک یہ سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا کہ صدر مملکت کا تعلق کس فرقے سے ہے۔ قائد اعظمؒ کو سب نے اپنا قائد مانا اور کسی نے یہ سوچا تک نہیں کہ وہ سنّی ہیں یا شیعہ۔ سکندر مرزا ایک مدت تک صدر مملکت رہے۔ ان کے سیاسی کاموں پر تو ہر طرح کے اعتراضات کئے گئے مگر کبھی کسی شخص نے اس بنا پر اعتراض نہیں کیا کہ وہ شیعہ تھے موجودہ صدر بھی شیعہ ہیں۔ کیا کبھی ان کے مذہبی مسلک کی بنا پر کسی نے ان کی صدارت پر اعتراض کیا ہے؟ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت یہ سوال چھیڑنے کا کیا خاص فائدہ سوچا گیا ہے۔

پبلک لاء کے بارے میں جو بات میں نے کہی ہے میرے شیعہ بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر اس ملک میں آمریت یا بادشاہی نہیں چلنی ہے بلکہ ہمیں جمہوری طریقے پر ہی ملک کا نظام چلانا ہے تو ملک کی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جو قانون سازی بھی ہوگی وہ بہرحال اکثریت کی رائے سے ہی ہوگی۔ پاکستان میں اکثریت سنیوں کی ہے اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ قرآن و سنت کی وہی تعبیر پبلک لاء کی بنیاد بنے۔ جسے سنّی

اکثریت مانتی ہے۔ یہ اصول اگر شیعہ بھائیوں کو قبول نہیں ہے تو ان کے لئے دو راستوں میں سے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے جسے وہ اختیار کرسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کہیں کہ پبلک لا شیعہ اقلیت کی تعبیر کے مطابق بننا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ وہ کہیں کہ قرآن وسنت کو یہاں سرے سے ماخذ قانون قرار ہی نہیں دینا چاہیئے کیونکہ پبلک لا کے معاملہ میں قرآن وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک مسلّم ہو۔ کیا ہمارے شیعہ بھائی ان دو راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرینگے، یا کوئی تیسرا راستہ بھی ہے جسے وہ تجویز کرسکتے ہوں؟ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ شیعہ بھائیوں نے پاکستان کے قیام میں برابر کا حصہ لیا ہے اور ان کے حقوق یہاں کسی سے کم نہیں ہیں۔ جہاں تک انتظامیہ اور عدلیہ کا تعلق ہے، اس میں کسی فرقہ وارانہ امتیاز کا سوال نہ یہاں کبھی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ لیکن حکومت کے شعبۂ قانون سازی کے معاملہ میں یہ ایک عملی دشواری ہے کہ پبلک لا کی حد تک قانون سازی بہرحال کتاب وسنت کی کسی ایک ہی تعبیر پر ہوسکتی ہے۔ اس عملی دشواری کا کوئی منصفانہ حل اگر اس کے سوا پیش کیا جاسکتا ہو جو میں نے بیان کیا ہے تو اسے ضرور پیش کیا جائے۔ اس پر ضرور کھلے دل سے غور کیا جائے گا۔ مولانا زیدی صاحب نے علماء کے جن متفقہ بائیس اصولوں کا حوالہ دیا ہے ان کو وہ پھر اٹھا کر دیکھ لیں۔ ان میں صرف پرسنل لاء کی حد تک سنّی و شیعہ علماء کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ ہر فرقے کے لئے قرآن وسنت کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جسے وہ فرقہ مانتا ہو۔ پبلک لاء کے بارے میں اگر کوئی ایک لفظ بھی ان بائیس اصولوں میں سے میرے بیان سے مختلف پایا جاتا ہو تو وہ براہ کرم اس کا حوالہ دے دیں۔"

(بحوالہ ایشیا۔ بابت ۲۳ر اگست ۱۹۷۰ء)

———(٥)———

شیعہ حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب دیا گیا، وہ اِن سطور کی تسوید تک ہماری نظروں سے نہیں گزرا لیکن سوال ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ پاکستان میں قانونِ شریعت بہرحال اصولِ جمہوریت کی رو سے، اکثریت کے مسلک کے مطابق نافذ ہوگا — لیکن شیعہ حضرات تو بنیادی طور پر جمہوریت، شوریٰ، انتخاب، وغیرہ کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اگر وہ ایسا تسلیم کرلیں تو سنّیوں اور شیعوں کے درمیان بنیادی مابہ النزاع مسئلہ (خلافت) نہ منٹ میں طے ہوجائے۔ ان کے نزدیک، خلافت کا حق صرف امامِ معصوم کو حاصل ہے جو مامور من اللہ ہوتا ہے، نہ لوگوں کا منتخب کردہ۔ اور اس امام (یا ائمہ معصومین) کا ارشاد فرمودہ قانون ہی قانونِ شریعت کہلا سکتا ہے۔

شیعہ حضرات تو ایک طرف رہے، یہ اصول تو مسلمانوں کے کسی فرقے کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ جس بات کو ملک کی اکثریت حق وصداقت کہے اسے حق وصداقت تسلیم کرلیا جائے۔ شیعہ حضرات منتخب شدہ فرد کو بھی شرعی سربراہ مملکت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے خواہ وہ کیسا ہی متقی اور نیکوکار کیوں نہ ہو۔ مثلاً واقعہ کربلا کے سلسلہ میں سنی اور شیعہ باہمد گر متفق نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک اس واقعہ کی علت کا تعلق

ہے' دونوں میں بنیادی اختلاف ہے۔ سنیوں کے نزدیک یزید اسلئے سزاوارِ خلافت نہیں تھا کہ وہ فاسق و فاجر تھا۔ ...... لیکن شیعہ حضرات کے نزدیک' یزید کے مستحقِ خلافت نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ اس کی وجہ سرگودہا سے شائع ہونے والے ہفت روزہ' المفید' نے (جس کے ایڈیٹر سید بشیر حسین بخاری تھے) اپنی اشاعت بابت ۱۶ جولائی ۱۹۶۰ء میں یہ بتائی تھی کہ

> یہ کہنا کہ چونکہ یزید فاسق و فاجر تھا اس لئے سیّدنا امام حسینؓ نے اس کی بیعت نہیں کی' سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ اگر یزید تقویٰ کے بلند ترین مقام کا بھی حامل ہوتا تو فرزندِ رسولؐ پھر بھی اس کی بیعت نہ کرتے کیونکہ معصوم کسی غیر معصوم کی بیعت نہیں کرتا۔ امام کسی غیر امام کی بیعت نہیں کرتا۔ حسین علیہ السلام کی عصمت و امامت پر قرآن شاہد ہے۔
>
> (بحوالہ ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث۔ بابت ۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء)

لہٰذا' شیعہ حضرات کے نزدیک' اکثریت و جمہوریت وغیرہ قسم کے دلائل کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتے۔ بایں ہمہ' مودودی صاحب نے اپنے بیان میں جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے۔ یعنی یہ کہ پاکستان میں پبلک لاز کس طرح مدوّن کئے جائیں جو سنّی اور شیعہ دونوں کے نزدیک اسلامی ہوں! اور اگر ایسے قوانین کا مرتب ہونا ممکن نہیں تو پھر یہاں کس قسم کے قوانین نافذ کئے جائیں۔

یہی سوال' طلوعِ اسلام' تئیس سال سے خود مودودی صاحب سے کرتا چلا آ رہا تھا۔

قبل اس کے کہ ہم مودودی صاحب کے بیان کے ایک اہم گوشے کو سامنے لائیں' ہم یہاں ان سے ایک وضاحت چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان میں قانونِ شریعت وہی رائج ہوگا جسے پارلیمان کی اکثریت منظور کریگی اور چونکہ یہاں کی آبادی میں سنّیوں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں سنّیوں کا قانونِ شریعت رائج ہوگا۔ جمہوریت کا یہی تقاضا ہے۔

یہ منطق ہی غلط ہے کہ چونکہ یہاں سنّیوں کی اکثریت ہے اس لئے پارلیمان میں بھی بالضرور سنّیوں کی اکثریت ہوگی۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ملک میں سنّیوں کی اکثریت کے باوجود پارلیمان میں اکثریت غیر سنّیوں کی ہو جائے۔ آبادی کے لحاظ سے پارلیمان میں سنّیوں کی اکثریت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پارلیمان میں ہر فرقے کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے الگ الگ نشستیں مخصوص ہوں۔ اس وقت تک تو یہاں یہ صورت نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمان میں (مثلاً) شیعوں کی اکثریت ہو جائے تو کیا سنّی حضرات' ان کے منظور اور رائج کردہ قوانین شریعت کو اسلامی قوانین تسلیم کر لینگے؟ کیا خود مودودی صاحب انہیں ایسا تسلیم کر کے ان کی اطاعت اختیار کر لینگے؟ اور اگر پارلیمان میں "اسلامی سوشلسٹوں" کی اکثریت ہو جائے'

اور وہ کتاب و سنت کی اپنی تعبیر کے مطابق اسلامی قوانین رائج کرنا چاہیں' تو کیا مودودی صاحب انہیں اسلامی قوانین تسلیم کر لینگے ؟ (واضح رہے کہ مسٹر بھٹو نے بھی اعلان کیا ہے کہ اگر وہ برسر اقتدار آگئے تو ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں بنے گا)۔ جمہوریت کا تقاضا تو بہر حال یہی ہوگا کہ انہیں اسلامی قوانین تصور کیا جائے۔ کیا فرماتے ہیں مودودی صاحب اس باب میں !

——— (۰) ———

اب آگے بڑھیئے۔

پھر مغالطہ آفرینی

مودودی صاحب نے اپنے بیان میں پھر ایک مغالطہ دیا ہے (ان کی ٹیکنیک ہی مغالطہ آفرینی ہے)۔ انہوں نے کہا ہے کہ چونکہ پاکستان میں اکثریت سنیوں کی ہے اس لئے کتاب و سنت کی وہی تعبیر پبلک لاء کی بنیاد بنے گی جسے سنی اکثریت مانتی ہے۔ اس سے مودودی صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر شیعوں کو الگ کر دیا جائے تو اس کے بعد یہاں صرف ایک گروہ باقی رہ جاتا ہے جسے سنی کہا جاتا ہے۔ لہذا، پبلک لاء سنیوں کی صوابدید کے مطابق مرتب ہوگا۔

ایسا کہنا کھلا ہوا فریب ہے۔ سنی کسی ایک فرقہ کا نام نہیں۔ ان میں بھی بہت سے فرقے شامل ہیں جن میں باہمی بے حد اختلاف ہے۔ ان میں دو بنیادی فرقے ——— اہل حدیث اور اہل فقہ ہیں ——— چونکہ پاکستان میں اہل فقہ، حنفی ہیں' اس لئے یوں کہیئے کہ سنیوں میں دو بڑے گروہ' اہل حدیث اور حنفی ہیں۔ اگرچہ اہل حدیث میں بھی باہمی اختلافات ہیں اور حنفیوں میں بھی۔ لیکن چونکہ مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہاں حنفی فقہ رائج کر دی جائے تو وہ "سنیوں" کے نزدیک قابلِ قبول ہوگی، اس لئے ہم ان کی اس فریب دہی کو بھی بے نقاب کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ پبلک لاز کے متعلق حنفیوں اور اہلحدیث میں کس قدر شدید اختلاف ہے، اس کے متعلق طلوع اسلام نے اپنی مارچ ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا ——— ان سے اسلامی قوانین بنوائیے۔ ——— موضوع زیر نظر کی وضاحت کے پیشِ نظر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مقالہ کو ایک بار پھر قارئین کے سامنے لایا جائے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے۔

اِن سے اسلامی قوانین بنوائیے!

(غیر منقسم) ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک خطۂ زمین کا مطالبہ کیا جس میں وہ اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ وہ خطۂ زمین مل گیا۔ اس بات کو سترہ برس سے اوپر ہو گئے لیکن اس ملک میں اسلامی قوانین کا مرتب کرنا یا نافذ ہونا تو ایک طرف، ابھی تک یہی طے نہیں ہونے پایا کہ اسلامی قوانین کہتے کسے

ہیں اور ان کے مرتب کرنے کا اصول کیا ہے۔ بات مذہبی پیشواؤں کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور جو بات ان کے ہتھے چڑھ جائے اس کا حشر کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق حکیم الامت نے مدت ہوئی کہہ دیا تھا کہ

میں جانتا ہوں انجام اس کا   جس معرکے کے ملا ہوں غازی

یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ہم سترہ برس سے مسلسل و متواتر کہتے چلے آرہے ہیں کہ اگر معاملہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ ہی میں رہا تو اسلامی قوانین قیامت تک مرتب نہیں ہو سکیں گے۔ جو لوگ تیرہ سو برس میں اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں کیا وہ ایک اسلامی مملکت کے لئے ایسے قوانین مرتب کر سکیں گے جو تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ ہو سکیں؟ یا یوں کہئے کہ کیا یہ لوگ ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکیں گے جو ان سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی تازہ مثال ملاحظہ فرمایئے۔

پاکستان میں ایک فرقہ حنفی کہلاتا ہے (اگرچہ ان میں بھی باہمی اختلافات ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی دونوں حنفی کہلاتے ہیں اور ان دونوں میں جو آئے دن سر پھٹول ہوتی رہتی ہے' اس سے آپ واقف ہیں) دوسرا فرقہ اہلحدیث کا ہے، (یہ اہلِ سنت والجماعت کے فرقے ہیں۔ شیعہ فرقہ ان سے الگ ہے) حنفیوں کی یہاں اکثریت بتائی جاتی ہے۔ اس لئے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دیجائے۔ یہ تجویز مودودی صاحب نے بھی پیش کی تھی ___ اگرچہ وہ فقہ کو مجدد شاستر سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی تجویز اب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے پیش کی ہے۔ دوسری طرف اہل حدیث ہیں اور ان کا ترجمان' لاہور سے شائع ہونے والا جریدہ الاعتصام ہے۔ اب دیکھئے کہ ان دونوں میں' اس سوال پر کس قدر کشمکش ہو رہی ہے۔ الاعتصام میں ایک سلسلہ مضامین شائع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے ___ کیا فقہ حنفی اسلام کی کامل اور صحیح تعبیر ہے؟ ___ اس سلسلہ میں الاعتصام کی ۱۶ ستمبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں جو کڑی شائع ہوئی ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں لکھا ہے۔

الاعتصام کا مضمون

"نیو ٹاؤن۔ کراچی کے مدرسہ عربیہ کا ایک ماہوار مجلہ ہے' نام "بینات"۔ یہ رسالہ اور مدرسہ گو فقہ العراق کے ترجمان ہیں لیکن اس کے نگران حضرت مولانا محمد یوسف بنوری علمی حلقوں میں بڑی عزت سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی نظر فقہ اور حدیث دونوں پر ہے۔ ان کے متعلق ہماری رائے یہ تھی کہ وہ اپنے مسلک کی حمایت کے ساتھ اسلام کی عمومی اقدار کا بھی خیال رکھیں گے اور دوسرے سنی مسالک کے ساتھ بھی وہ انصاف کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ لیکن "بینات" شمارہ ۲ جلد ۳ کا اداریہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی۔ قارئین کرام بھی یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ اتنے اونچے لوگ بھی اس قدر نیچے آسکتے ہیں اور ایسی سطح کی بات کہہ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اس وقت دنیائے اسلام میں ہماری ہی مملکت وہ مملکت ہے جو اسلام کے نام پر بنی اور اسلامی حکومت کے قیام کے عزم سے قائم ہوئی ہے۔ اس لئے اس کو اسلامی قالب عطا کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہم ہی پر عاید ہوتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر عزم صمیم ہو تو یہ کام ایسا دشوار بھی نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت بلکہ بڑی غالب اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے اور جمہوری اصول کے ماتحت جب بھی اسلامی حکومت قائم ہو، اسی فقہ کی ترویج ضروری ہوگی۔ اور یہ وہ فقہ ہے جو نہایت منظم، مدوّن، محفوظ، اور ہر عملی پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس پر صدیوں تک عظیم الشان حکومتیں کامیابی سے چل چکی ہیں۔ اس لئے ہم کو فوری طور پر قانون سازی میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان قوانین کا نفاذ ہمارا پہلا قدم ہونا چاہیئے۔

بلاشبہ موجودہ معیشت کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہماری قدیم فقہ میں نہیں ملتا۔ اور ان مسائل کو حل کئے بغیر پوری توانائی سے آگے بڑھا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ کام مدونہ قانونِ اسلامی کی تنفیذ کے ساتھ زیادہ آسانی اور مستعدی سے انجام پا سکتا ہے۔ کیونکہ جب ایک بار فقہ حنفی کی سرکاری حیثیت مسلّم ہو جائے گی، تو لازمی طور پر ان نئے مسائل کا حل اسی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا، تاکہ اہل ملک کے لئے قابلِ تسلیم ہو۔ اور اس کام کے اہل صرف وہی علماء ہو سکیں گے جو فقہ حنفی کے ماہر ہوں اور جن کے علم و قوت، اجتہاد اور دیانت پر مسلمانوں کو اعتماد ہو۔ اس طرح موجودہ تحقیقاتی رسّہ کشی بھی ختم ہو جائے گی۔ مکیگل اور شکاگو کے تعلیم یافتہ یا قیادت اور صحافت کی راہ سے بنے ہوئے محققین خود بخود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ہم نے یہ ارشاد بار بار پڑھا، اور ہمیں افسوس ہوا۔ اس لئے کہ حضرت مولانا بنوری کی نگرانی میں ملکی اور ملّی ضرورت کے متعلق جو کچھ لکھا جائے اس کا معیار اس سے بہت اونچا اور انداز اس سے بہت وسیع ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق تنقیدی گزارش سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آسانی کے لئے اس کا اختصار اور تجزیہ کر لیا جائے۔ اس تجزیہ کے جس حصہ کا انکار فرمایا جائے۔ ہمیں اس پر اصرار نہیں ہوگا۔

(۱) یہ ملک اسلامی ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ اس کے نظام کو اسلامی قالب عطا کرے۔

(۲) اور یہ کام اس لئے مشکل نہیں کہ اس ملک کی اکثریت فقہ حنفی کو مانتی ہے۔

(۳) جمہوری اصولوں کے مطابق اس ملک میں فقہ حنفی کی ترویج ضروری ہے۔

(۴) فقہ حنفی کے سہارے پر بڑی حکومتیں چلتی رہیں۔

(۵) معیشت کے نئے مسائل واقعی فقہ حنفی میں نہیں اور ان کے حل کے سوا چارہ بھی نہیں۔

(۶) فقہ حنفی کو اگر سرکاری حیثیت مل جائے تو اسلامی قانون کے نفاذ میں آسانی ہوگی۔

(۷) نئے مسائل کا حل فقہ حنفی کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔

(۸) ان مسائل کے حل کے لئے صرف فقہ حنفی کے ماہرین سے کام لینا چاہیئے۔

یہ بالکل درست ہے۔ یہ ملک اسلامی ہے اور اس میں قوانین کو اسلامی قالب دینا چاہیئے۔ مطالبہ ۱ کے بعد ۲ بالکل بے جوڑ ہے۔ جب ائمہ اربعہ اور ان کی فقہ اور صحابہ اور تمام ائمہ سلف مسلمان ہیں اور وہ سب اسلام کی ترجمانی فرماتے ہیں ــــ تو ــــ پھر اسلام کو سکیڑ کر صرف فقہ حنفی کے قالب میں کیوں بند کر دیا جائے فقہ حنفی صرف ایک مکتب فکر ہے جس میں علماء عراق کے خیالات اور اہل رائے کے تصورات کی ترجمانی کی گئی۔

۱۹۵۲ء میں دستور کے متعلق جو میٹنگ بتیس ۳۲ علماء کی کراچی میں ہوئی تھی۔ اس میں دستوری سطح پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ تمام مکاتب فکر کو اپنے اپنے نقطۂ نظر کی پابندی کے لئے کھلی اجازت ہوگی حتیٰ کہ سنت کا مفہوم وہی معتبر ہوگا جو اس مکتب فکر کے ارباب حل وعقد کے نزدیک مسلم ہوگا۔ دستور میں اس قدر توسیع اور گنجائش اور قوانین میں یہ تنگ دلی بے جوڑ سی بات ہوگی۔

جب ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے تو اس میں پورے اسلام کو برسر اقتدار رہنا ہے۔ کسی مکتب فکر کو بھی خارج البلد نہیں ہونا چاہیئے۔ اختلاف کی صورت میں قضاۃ اور قانونی عدالتوں کو مخصوص اختیارات دیئے جانے چاہئیں جنھیں وہ استعمال کریں اور مختلف مکاتب فکر کے لوگوں میں فیصل خصومات کر سکیں یا مخصوص حالات میں کسی مکتب فکر کو ترجیح دے سکیں۔ لیکن ملک پر کسی مکتب فکر اور اس کی فقہیات کو مسلط نہیں کرنا چاہیئے۔ ــــ اگر واقعی اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے تو غیر احناف کی اس سے نہ اہمیت کم ہوتی ہے جب کہ ان کو اہمیت حاصل ہے اور نہ ان کی مشکلات کو نظر انداز ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) دین کے معاملات میں مروجہ جمہوری اصولوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ ائمہ کی فقہیات کا تعلق دین سے ہے۔ دینی امور کا فیصلہ کبھی مروجہ جمہوری اصولوں کے ماتحت نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی سیاسی مسئلہ ہوتا یا کسی دنیوی نزاع کا رفع کرنا پیش نظر ہوتا تو غیر جمہوری اصول زیر بحث آ سکتے تھے۔ لیکن ــــ نکاح، طلاق، نماز، وغیرہ ــــ معاملات میں جب شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا ہو تو کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ فیصلہ اس لئے قبول کرلے کہ یہ اکثریت کا خیال ہے۔ فقہ حنفی کو قانونی حیثیت تو بڑی بات ہے، اس مطالبہ کا خیال بھی نہیں آنا چاہیئے۔

اکثریت کہاں

آپ فرماتے ہیں، اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے۔ میں یہ گزارش کروں گا۔ آپ مختلف طبقات اور ان کے مذہبی خیالات پر نگاہ ڈالیں۔ کیا بریلوی حضرات آپ کے نزدیک یقیناً حنفی ہیں؟ کیا ملک کا عام تعلیم یافتہ طبقہ جس کو ملک کا دماغ کہنا چاہیئے، وہ بھی اکثر ان مصنوعی پابندیوں سے آزاد نہیں؟ اور آزاد رہنا نہیں چاہتا؟

اگر آپ بوقتِ ضرورت بریلوی کو اپنا رفیق تصور فرمالیں تو بھی تقلید کے پابند حضرات کچھ زیادہ نہیں ہوں گے۔ ویسے مذہب کے معاملہ میں ایسا تساہل آپ حضرات کے لئے مناسب بھی نہیں ہوگا۔ اکثریت کے شوق میں حنفیت کو بھی خطرے میں نہ ڈال دیں۔ پھر یہ اکثریت کی پناہ دین میں واقعی اگر اصول کا مقام رکھتی ہو تو کیا فقہ کے مسائل کی چھان پھٹک بھی اس اصل کے ماتحت ہو سکتی ہے؟ کیا جن مسائل میں حضرت امام ابو حنیفہؒ جمہور کے خلاف ہوں، وہاں حضرت امامؒ کا مسلک ترک کر دیا جائے اور جمہور کے مسلک کو ترجیح دیجائے؟ جہاں ائمہ ثلاثہ حضرت امام کے خلاف ہوں، وہ بھی ترک کر دیئے جائیں اور جہاں حضرت امام کے تلامذہ حضرت امام سے اختلاف فرمائیں انہیں خیر باد کہہ دیا جائے۔

پھر اس چیز پر بھی غور فرمائیں۔ آیا آپ کی نظر میں متعارف اصطلاح کے مطابق یہ ملک جمہوری ہے؟ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ چونکہ حکومت نے شہروں، دیہاتوں اور قصبات میں یونین کمیٹیاں بنائی ہیں، انہیں جمہوریتوں کا بھی کہیں کہیں نام دیا جاتا ہے۔ جناب اسے اس اصطلاح کے مطابق جمہوری ملک کہہ دیں تو ہو سکتا ہے لیکن اصل جمہوریت کے لئے تو لوگ جیلوں کی زیارت پر مجبور ہیں۔ اس وقت ساری جمہوریت لپیٹ کر کنونشن مسلم لیگ کے پیٹ میں رکھ دی گئی ہے۔ یہ جمہوری اصولوں کی بات جناب کس انداز میں فرما رہے ہیں؟

فقہ حنفی اور حکومتیں

مولانا! پچھلی تاریخ پر غور فرمائیں۔ آیا واقعی جو بڑی بڑی حکومتیں مذہباً حنفی تھیں، وہ فقہ حنفی پر چلتی بھی رہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ حکومتیں اپنے مادی اسباب، اور قوت کے سہارے چلتی رہی ہیں۔ یعنی چلنے کی اصل وجہ قوت تھی ---- فقہ نہ تھی۔ بلکہ ایسے واقعات آپ کو تاریخ میں ملیں گے کہ جب کوئی فقہ یا کوئی فقیہہ حکومت کی خواہشات کی راہ میں حائل ہوا تو اسے زورِ بازو سے ہٹا دیا گیا۔

چنانچہ دیکھئے کہ اس وقت بھی حکومت حنفی ہی ہے۔ آپ صدر ایوب صاحب سے دریافت فرمائیں، ان کے وزراء سے پوچھیں۔ وہ فرمائیں گے، ہم حنفی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ مطالبہ فرما رہے ہیں کہ اس ملک میں فقہ حنفی کو قانونی حیثیت دی جائے ---- بادشاہ کا حنفی ہونا اور بات ہے اور ملک کا قانون قرار پانا دوسری بات ہے۔

پھر کسی فقہ کے سہارے پر کسی حکومت کا چلنا، اس کی صداقت یا صحت کا ثبوت نہیں۔ پورے یورپ میں "لادینی فقیہوں" کے سہارے پر بڑی بڑی بادشاہتیں چل رہی ہیں۔ رومن فقہ اور کمیونزم کی فقہ دو نوں دو بڑے عظیم الشان ملکوں کے قانون کی اساس ہیں۔ ان ملکوں میں مادی قوتوں کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان "فقیہوں" کے تقاضوں کو قبول کریں ــــ یہ کوئی دلیل نہیں۔ کوئی فقہ ہو جس کی سرپرستی حکومت کرے وہ نظام اسی سرپرستی کے سہارے پر چلے گا۔ یہ فقہ کی خوبی نہیں، سرپرست کی خوبی کہی جا سکتی ہے۔

پھر یہ فقہ حنفی پر کیا موقوف ہے، ائمہ اربعہ کی فقہوں کے اعتماد پر کئی حکومتیں چلتی رہیں۔ حجاز، مصر، یمن، خراسان، وغیرہ ممالک میں شافعی حکومت رہی ــــ الجزائر، بربر اور مغرب کے کئی ممالک میں سلفی الخیال حکومت کرتے رہے۔ اندلس پر مالکی اسی طرح حکومت کرتے رہے جس طرح کئی سال ہندوستان اور افغانستان پر حنفی حکومت کرتے رہے۔ ایران پر مدت سے روافض حکومت کر رہے ہیں ــــ یہ حق کے لئے کہاں تک دلیل ہو سکتی ہے؟ ــــ یہ معلوم نہیں کہ جن ممالک پر حنفی فقہ کے تعاون سے حکومت ہوتی رہی، ان ممالک میں دوسرے مکاتب فکر کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا۔ جبراً ان پر فقہ حنفی ٹھونسی گئی یا ان کو ان کی صوابدید کے مطابق عمل میں مراعات دی گئیں۔ اور آپ حضرات کی طرح درخواست کر کے فقہ حنفی کو مسلط کیا گیا۔

متوازن مشورہ ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس ملک میں پورے اسلام کو موقع ملنا چاہیئے۔ تمام مکاتب فکر کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور لوگ آزادی سے جس مسئلہ میں چاہیں جس مکتب فکر کو پسند کریں اسے اپنا لیں، اس پر عمل کریں اور کوئی تعصب نہ ہو۔ اس لحاظ سے یہ ملک دنیا کے لئے مثالی ہو کہ اس میں کسی عصبیت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ (الاعتصام کا اقتباس ختم ہوا۔ اس کے بعد طلوع اسلام کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے)

طلوع اسلام آپ نے "بینات" کی تجویز اور اس پر الاعتصام کا تبصرہ ملاحظہ فرما لیا۔ سوال زیر غور یہ تھا کہ ملک میں ایسے قوانین نافذ کئے جائیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں (یعنی مختلف فرقوں کے مسلمانوں) پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اور اس سلسلہ میں تجویز یہ کیا جا رہا ہے کہ ہر فرقہ کو اجازت ہو کہ وہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کر لیا کریں!

حنفی حضرات کو تو چھوڑیئے کہ وہ اپنے ائمہ کی مرتب کردہ فقہ کے متبع ہیں۔ ہم الاعتصام سے ــــ جو سنت رسول کے اتباع کا مدعی ہے ــــ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ

کیا رسول اللہ کے زمانے میں بھی اسلامی قوانین کا اتباع اسی طرح ہوتا تھا کہ ہر فرقہ کا مسلمان اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کرتا تھا؛

(۲) اگر رسول اللہ کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا تو کیا ایسا کرنا خلافِ سنّت (یعنی بدعت) نہیں ہوگا؟
(۳) کیا رسول اللہ کے زمانے میں بھی مسلمانوں میں مختلف فرقے تھے؟
(۴) کیا قرآن کریم نے فرقوں کے وجود کو شرک قرار نہیں دیا؟ (۳۰/۳۱-۳۲)
(۵) کیا نبی اکرمؐ کو خدا نے یہ نہیں کہا تھا کہ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں ان سے تیرا کوئی واسطہ نہیں (۶/۱۵۹)
(۶) کیا مسلمانوں سے خدا نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم فرقوں میں نہ بٹ جانا اور باہمی اختلافات نہ کرنے لگ جانا۔
اس لئے کہ جو لوگ ایسا کریں ان پر خدا کا عذاب ہوتا ہے۔ (۳/۱۰۵)
(۷) الاعتصام کی پیشانی پر قرآن کریم کی جو آیت درج ہوتی ہے یعنی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔ کیا اس کی عملی تفسیر یہی ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کیا کرے؟
(۸) کیا آپ کے نزدیک اب کوئی صورت ایسی نہیں جس سے تمام مسلمانوں کے لئے واحد ضابطۂ قوانین مرتب ہوسکے۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے (یعنی آپ کے نزدیک اب ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہوسکتی) تو کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں کہ اب اس اسلام پر چلنے کی کوئی صورت نہیں رہی جو اسلام نبی اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھا؟

ہم شکر گزار ہونگے اگر ہمارا مؤقر معصر (الاعتصام) ان سوالات کا جواب اپنے ہاں شائع کردے یا ہمیں اشاعت کے لئے بھیج دے۔ ہم اُسے بخوشی شائع کرینگے۔ اس سے بہت سے شکوک رفع ہو جائیں گے اور بہت سی الجھنیں دور۔

——— (۰) ———

ان سوالات کا کوئی جواب ہوتا تو الاعتصام شائع کرتا۔ ان کا جواب ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ اور ان کا جواب خود مودودی صاحب کے پاس بھی نہیں جو اقامتِ دین کے اتنے بڑے داعی بنے پھرتے ہیں۔ ان کے پاس جواب ہے تو یہ کہ یہاں چونکہ اکثریت فقہ حنفی کے ماننے والوں کی ہے اسلئے یہاں فقہ حنفی پبلک لاز نافذ کرائے جائیں۔ ہم مودودی صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ (آپکے اس تصورِ جمہوریت کے مطابق) فقہ حنفی کا جو قانون غیر حنفی مسلمانوں کے نزدیک خلافِ شریعت ہوگا، کیا آپ کی "اسلامی حکومت" اُن سے اُس (خلافِ شریعت) قانون کی اطاعت 'بزور' کرائے گی؟ اور ایسی صورت میں، اس شخص (یا فرقہ) کو اس کا حق حاصل ہوگا یا نہیں کہ وہ ایسے قوانین کے خلاف علمِ جہاد بلند کرکے حکومت سے بغاوت کرے؟ آپ اس کا جواب نفی میں نہیں دے سکتے اسلئے کہ آپ، لوگوں کو، خود ہی مشورہ دے چکے ہیں کہ ایسی صورت میں، لوگوں کو وہی کچھ کرنا چاہیئے جو ان کے نزدیک، مطابقِ شریعت ہو۔ خواہ ان کا یہ عمل، حکومت کے نافذ کردہ قوانین کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جب مودودی صاحب نے، حکومت کے نافذ کردہ عائلی قوانین کی مخالفت کی تو ان سے ایک صاحب نے پوچھا کہ

اگر ایک شخص قانون شریعت کے مطابق اپنی بیوی کو طلاق دے دے لیکن حکومت کا قانون اسے جائز تسلیم نہ کرتا ہو، تو ایسی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کا جواب مودودی صاحب نے یہ دیا تھا کہ

> کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائمقام بن سکتے ہیں۔ اس لئے جو طلاق شرعی قواعد سے دے دی گئی ہو وہ عند اللہ اور عند المسلمین نافذ ہو جائے گی خواہ ان قوانین کی رُو سے نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً قابلِ نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہوگی خواہ یہ قوانین اس کو نافذ کر دیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیئے کہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات، خدا اور رسول کی شریعت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں یا ان عائلی قوانین کے مطابق۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۶۲ء)

حکومت کے قوانین اور (لوگوں کے اپنے نزدیک) شرعی قوانین میں تصادم کی جو شکل مودودی صاحب نے اوپر بیان کی ہے، وہی صورت ان تمام پبلک لاز کی صورت میں پیدا ہوگی جنہیں کوئی فرد یا فرقہ، مطابق شریعت تسلیم نہیں کریگا ـــ یعنی حکومت کی طرف سے نافذ کردہ ان حنفی قوانین کی جنہیں غیر حنفی، مطابق شریعت تسلیم نہیں کرینگے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب یہاں، اسلامی نظام اور شرعی قوانین کی آڑ میں، کس قسم کی صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں؟

> ہم جو کچھ تیئیس برس سے کہتے چلے آرہے ہیں، اسے ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان (یا کسی اور ملک میں) اسلامی حکومت صرف اس صورت میں قائم ہو سکتی ہے کہ مختلف فرقوں کے مسلمان، اپنے اپنے فرقہ کی فقہ سے صرفِ نظر کر کے، قرآنِ خالص کی بنیادوں پر، حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں، ایک جدید فقہ مرتب کریں جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔

یہ صورت ایک دن میں پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس مقام کو بطور منزل اپنے سامنے رکھے اور ملک میں اس قسم کا نظامِ تعلیم رائج کرے جس سے آہستہ آہستہ فرقوں کے امتیازات ختم ہو کر، ہمارے نوجوان صرف مسلمان پیدا ہوں۔

اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر نہ اپنے آپ کو فریب دیجئے نہ دنیا کو دھوکا۔ دیانتداری سے اس کا اعتراف و اعلان کیجئے کہ ہم اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ جس حکومت میں کسی ایک فرقہ کے قوانین رائج ہوں، وہ اس فرقہ کی حکومت تو کہلا سکے گی۔ اسلامی حکومت نہیں کہلا سکے گی۔

اس کھلی ہوئی حقیقت کو اگر آپ آج نہیں مانتے تو، جس طرح، مودودی صاحب کو ہار تھک کر آج یہ ماننا پڑا ہے کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو حنفیوں، شیعوں اور اہلحدیثوں کے درمیان متفق علیہ ہو، خواہ اسکا تعلق پرسنل لاء سے ہو، خواہ پبلک لاء سے"، اسی طرح زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر انہیں (اور ان کے ساتھ تمام فرقوں کے مسلمانوں کو) یہ بھی ماننا پڑیگا کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف قرآن کی بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے۔

باقی رہے مودودی صاحب، تو ان کے پیشِ نظر نہ اسلام ہے، نہ قانونِ شریعت۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ یا تو اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر مسلمانوں میں مسلسل انتشار اور خلفشار پیدا کیا جائے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ لوگ، جن میں، ڈھونڈنے سے بھی اسلام کی چھینٹ تک نہیں مل سکے گی، ان کی قیادت چھوڑ کر، مجھے اپنا امیر تسلیم کرو، ورنہ میں عوام کے دلوں میں ایسے وسوسے پیدا کر دوں گا جن سے وہ اس تحریک کی کشتی ہی کو ڈبو دیں ـــــ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد، یہ مطالبہ کہ حکومت میرے حوالے کر دو، ورنہ میں اس مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجا دونگا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے "اسلامی نظام" اور "اسلامی حکومت" کی آڑ میں مسلسل خلفشار پیدا (CHAOS CREATE) کرتے چلے آ رہے ہیں اور اب یہاں اسلامی حکومت کا ایسا نقشہ مرتب کر رہے ہیں جو اسلامی تو بہرحال نہیں ہوگی لیکن اس میں وہ باہمی سر پھٹول اور خانہ جنگی ہوگی جس کے سامنے بغداد کی گلیوں کی خونی داستانیں بھی ماند پڑ جائینگی۔ فقنا ربنا عذاب النار۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے پاس، سید محمد رضا رضوی، کنوینر ادارہ فلاحِ ملت (حیدر آباد) کی طرف سے شائع کردہ ایک پمفلٹ آیا جس کا عنوان ہے "آئینِ اسلامی اور مسلمہ اسلامی فرقے"۔ اس میں انہوں نے مودودی صاحب کی اس تجویز کی مخالفت کرنے کے بعد، آخر میں لکھا ہے ـــــ "اگر سوادِ اعظم کے راہ نماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائینگے، خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی"! سن لیا آپ نے مودودی صاحب! اور ابھی تو ابتداء ہے۔ اس کے بعد انتظار فرمایئے کہ دوسرے (غیر حنفی) فرقے کیا کہتے ہیں اور حنفی اور غیر حنفی کا کیا ذکر، وہ عوام جو معاشی پروگرام کی دعوت پر پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں، ان کا ردِّ عمل اس حنفی فقہ کے خلاف کیا ہوتا ہے جس کا معاشی نظام خالصۃً سرمایہ دارانہ ہے۔ آپ یہاں حنفی (یا کسی فرقہ کی) فقہ نافذ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ملک کا کیا حشر ہوتا ہے۔

لیکن مودودی صاحب تو اس سے بہت خوش ہونگے کہ میں جس مقصد کو لے کر یہاں آیا تھا اس میں کیسے کامیاب ہوا!

ــــــــ (ش) ــــــــ

قرآن کریم کیخلاف سازش

امیر جماعتِ اسلامی سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب، جہاں اس امر کے لئے مامور ہیں کہ وہ قوم میں مسلسل انتشار پیدا کرتے رہیں، یہ بات بھی ان کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اسلام کے خلاف ایسے شبہات ابھارتے رہیں جن سے، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ آہستہ آہستہ اس سے برگشتہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں، حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ، اور صحابہ کبارؓ کی عظمتِ کردار کے خلاف انہوں نے جس قدر وساوس پھیلائے ہیں، ان کا شہرہ اب عام ہو رہا ہے۔ ان کے اسی سلسلہ کے کارناموں کی ایک کڑی اور ہے جو دین کو اس کی اصل و بنیاد سے اکھیڑ دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کی اصل و بنیاد یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم جس شکل میں امت کے پاس اس وقت موجود ہے، وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے بذریعہ وحی رسول اللہ کو عطا فرمایا اور جسے حضورؐ نے امت کو دیا۔ اگر قرآن سے متعلق اس حقیقت میں ذرا سا بھی شبہ لاحق ہو جائے تو نہ دین باقی رہتا ہے نہ ختم نبوت کی حکمت و غایت۔ دین کی اس بنیاد میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے، مودودی صاحب نے 'ترجمان القرآن' کی اشاعت بابت جون ۱۹۵۹ء میں (ایک سائل کے جواب میں) ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا جس میں (منجملہ دیگر امور) یہ بھی مذکور تھا کہ

> یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلعم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی، اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوتی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی۔
>
> کٮاٮ احکمٮ اٮٮه ٯٮصلٮ مں لدں حکم حٮٮر

اس طرح قرآن کریم کی کتابت کا نتیجہ کیا تھا، اس کے متعلق انہوں نے تحریر فرمایا تھا۔

> اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہل زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال بامعنی بنا کر

ہی پڑھتے تھے۔ لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رُو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہلِ زبان کو بھی بکثرت التباسات پیش آجاتے اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ لکھنے والے کا منشاء کیا تھا۔

غور فرمایئے کہ اس وسوسہ اندازی کے بعد قرآن کریم کی صحت کے متعلق کس قسم کے شکوک و شبہات دلوں میں نہیں ہو سکتے ؟ (للہ الحمد کہ) طلوع اسلام نے اسی زمانہ میں اس کا تعاقب کیا اور اپنی نومبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت (عنوانِ بالا سے) ایک مبسوط مقالہ میں مودودی صاحب کی ان ہفوات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ طلوع اسلام کی اشاعت میں علامہ تمنا عمادی کا ایک مفصل تحقیقاتی مقالہ بھی شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز (عہدِ جاہلیہ کے ادب سے لیکر بعد کے دور تک کی مثالوں سے) واضح کیا کہ مودودی صاحب اس باب میں قدر جاہل واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ' ابتدا ہی ایک ایسی مثال سے کی جسے وہ بچہ بھی بآسانی سمجھ جائے جس نے دن عربی زبان کا قاعدہ پڑھنا شروع کیا ہو۔ انہوں نے لکھا تھا۔

ہر صاحبِ عقل و ایمان سے میری التجا ہے کہ برائے خدا ذرا غور کیجئے ـــ ب ۔ ت ۔ ث ج ۔ ح ۔ خ ۔ د ۔ ذ ۔ ر ۔ ز ۔ س ۔ ش ۔ ص ۔ ض ۔ ط ۔ ظ ۔ ع ۔ غ ۔ ف ۔ ق ن ۔ ي۔ عربی زبان کے ۲۸ حروفِ تہجی میں سے یہ تیئیس حروف ایسے ہیں جن میں امتیاز' نقطوں ہی کے ہونے نہ ہونے یا اوپر نیچے ہونے یا کم و بیش ہونے کی وجہ سے ممکن ہے۔ واضعِ حروف نے جس دن ان حرفوں کو وضع کیا تھا، اگر اسی دن، اسی وقت نقطے بھی ایجاد نہیں کئے تھے اور نقطوں ہی کے ذریعے ان میں امتیاز نہیں رکھا تھا تو اس نے یہ بائیس ہمشکل حروف وضع ہی کیوں کئے تھے ..... اگر نقطوں کا فرق واضع نے نہیں رکھا تھا' تو یقیناً وہ واضع دیوانہ تھا۔ فقط واضع ہی نہیں' پوری کی پوری قوم دیوانی تھی کہ کسی نے تحریر کی اس واضح گمراہ کن خامی کی طرف توجہ نہ کی اور اپنے رسم الخط کی اس بدترین خرابی کو دور کرنے کی ضرورت کسی شخص نے کبھی محسوس نہ کی۔

انہوں نے یہ کہا تھا کہ آپ ان حروف کو (بلا نقطہ) سامنے رکھیئے۔

ٮ ۔ ٮ ۔ ٮ ۔ ح ۔ ح ۔ ح ۔ د ۔ د ۔ ر ۔ ر ۔ س ۔ س ۔ ص ۔ ص ۔ ط ۔ ط ۔ ع ۔ ع ۔

بتلایئے کہ یہ کیا ہیں ؟ جب یہ حروف پہلی بار وضع ہوئے تھے، تو انہیں اس شکل میں وضع کرنے کی ضرورت کیا

تھی، اور اس شکل میں لکھے ہوئے ان حروف کو پڑھ کون سکتا تھا؟ اس کے بعد علامہ تمنا عمادی نے لکھا تھا۔

> خیر زمانہ جاہلیت کی باتیں جانے دیجئے۔ جب وحی آنی شروع ہوئی اور رسول اللہؐ نے قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں لکھوانا شروع کر دیں تو آپ کو تو اس کا خیال ہوتا کہ بے نقطوں کی تحریر اتنے باہم متشابہ حروف والی رسم خط میں کس طرح صحیح طور سے پڑھی جائے گی۔ کاتبین وحی سے آپؐ فرماتے کہ نقطے دے دیا کرو۔ اور اگر واضعِ حروف پاگل تھا اور عہد جاہلیت کے سب لکھے پڑھے دیوانے تھے کہ ایسی گمراہ کن رسم خط کو گلے لگائے ہوئے تھے تو آپؐ خود نقطے لگانے کی ترکیب بتا دیتے۔ فراستِ نبویہ، عبدالملک اور حجاج کی عقل سے تو یقیناً بڑھی ہوئی تھی (جن کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے اس خرابی کو محسوس کیا اور قرآن میں نقطے لگائے۔ (طلوع اسلام

اس کے بعد ہم نے فروری ۱۹۶۱ء کے طلوع اسلام میں محترم رحمت اللہ طارق (جو اُس زمانہ میں دارالحدیث مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے) کا ایک تحقیقاتی مقالہ شائع کیا جس میں انہوں نے ثابت کیا تھا کہ عربی رسم الخط (نقاط کے ساتھ) زمانہ نزول قرآن سے قریب چار سو سال قبل ایجاد ہو چکا تھا اور عہد رسالتمآبؐ میں حروف پر نقاط اور ان پر اعراب وغیرہ (ضوابط تحریر) رائج تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اس زمانہ کے دو مخطوطات کا بھی ذکر کیا تھا جن میں سے ایک ۲۲ھ کی تحریر ہے اور دوسری ۳۱ھ (عہد حضرت عثمانؓ) کی۔

ہم نے اِس موضوع کو، اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی کو سامنے لانے کی غرض سے دوبارہ چھیڑا ہے۔ ماہنامہ فکر و نظر (اسلام آباد) کی اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں فواز احمد طوقان کے مقالہ کا اردو ترجمہ (قسط دوم) شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ــــ عربی رسم الخط کا آغاز اور ارتقاء ــــ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ حال ہی میں طائف میں حضرت معاویہؓ کا ایک مخطوط ملا ہے جو ۵۸ھ کا ہے۔

> اس میں ہر اس لفظ پر نقطے موجود ہیں جہاں ان کی ضرورت ہے۔ ش کے تکون بنانے والے تین نقطے عام استعمال کے برعکس، الٹے ہیں۔ ن اور ب کے نقطے حرف کے سروں کے اوپر یا ان کے نیچے لگائے گئے ہیں۔ آخر میں ختم ہونے والی لمبی ب کا نقطہ اس کی افقی لکیر کے نیچے وسط میں لگانے کے بجائے اس کے ابتدائی اٹھے ہوئے سرے کے نیچے لگایا گیا ہے۔ مثلاً "ب" کے بجائے "ب" ہے۔ اسی طرح ي اور ت کے نقطے ترچھی صورت میں لگائے گئے ہیں۔ مثلاً معوٰیہ کے بجائے معوٰیہ

ہے۔ (اسی طرح) ایک اور دستاویز یا تحریر یا نوشتہ بھی موجود ہے جس پر حرکات کے نشان موجود ہیں۔ یہ ۲۲ھ کا ہے۔ جن حروف پر نقطے موجود ہیں وہ یہ ہیں۔ خ۔ ذ۔ ز۔ ش۔ ن۔ لہٰذا ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ عربی خط میں حرکات اور نقطے قدیم زمانہ سے موجود تھے۔

یہ ہیں محققین کی تحقیق کے نتائج اور دوسری طرف ہمارے مودودی صاحب ہیں جن کے متعلق ان کے مریدوں کا پراپیگنڈہ ہے کہ ان جیسا مفکر اور محقق آسمان کی آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا —— اور کیا معلوم انہوں نے کتنے سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ اور کتنے نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کر دیا ہے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

۱۔ قرآنِ کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے خدا کی طرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطہ ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اسلئے حضورؐ کی سیرت کے نقوش قدم اسلامی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

۲۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتب روایات و تاریخ میں آئی ہیں ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ جو حکومت، قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی، اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت یا مملکت کہا جائے گا۔

۴۔ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی —— خوراک، مکان، لباس وغیرہ —— بہم پہنچائے اور انکی انسانی صلاحیتوں کے نشو و نما پانے کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خودساختہ قوانین کا عمل) تھیا کریسی (قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھے جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

۶۔ اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

۷۔ طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرقہ سازی قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اسکا ساتھ دیں۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ ــــ پاکستان ــــ دس روپے

سالانہ ــــ ہندوستان ــــ پندرہ روپے

سالانہ ــــ غیر ممالک ــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ــــ ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد (۲۳) | نومبر ۱۹۷۰ء | نمبر (۱۱)

فہرست

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ۔ اشرف پریس ایبٹ روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سعدی نے ایک جگہ لکھا ہے

خواجہ در بند و زیب ایوان است خانہ از پائے خویش ویران است

یعنی صاحبِ خانہ، گھر کے رنگ و روغن کی فکر میں ہے اور گھر کی حالت یہ ہے کہ اس کی بنیادیں تک کھوکھلی ہو چکی ہیں

اس سے ملتی جلتی بات، ہمارے ہاں کے ایک شاعر نے یوں کہی ہے کہ

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

بعینہ یہی حالت آج اس مظلوم خطۂ زمین — پاکستان — کی ہو رہی ہے۔ سارا ملک اسی تگ و تاز میں دیوانہ وار مصروف ہے کہ مملکت کی زمامِ اقتدار کسی طرح ان کی پارٹی کے ہاتھ میں آجائے، اور مملکت ہے کہ اس کی وہ بنیادیں ہی ختم ہو رہی ہیں جن پر اس کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ پاکستان کے مطالبہ کی بنیادِ اول، دو قومی نظریہ تھا۔ یہ پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد ہی نہیں تھا، خود اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ کی اساس و بنیاد بھی یہی نظریۂ حیات ہے کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک الگ، جداگانہ، مستقل بالذات قوم ہیں اور غیر مسلم، اس کے مقابل میں، دوسری قوم کے افراد — دین کی دعوت کی داستان کا آغاز قصۂ حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ انہیں خدا نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ (اور تو اور خود) تیرا بیٹا جو ایمان نہیں لایا، تیرے اہل میں سے نہیں۔ تیرے اہل تیری جماعت کے وہ افراد ہیں جنہیں یہ بڑے بڑے سردارانِ قوم، بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ (ان کے خیال کے مطابق) نچلے طبقہ سے متعلق ہیں، لیکن وہ ایمان میں تمہارے شریک ہیں۔ انہیں بچا کر اپنے ساتھ لے چلو۔ یہی اعلان حضرت ابراہیمؑ نے کیا جب اپنے باپ اور اپنی ساری قوم سے کہا کہ تم چونکہ خدا پر ایمان نہیں لائے، اس لئے میرا تمہارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے وطن کو اس طرح چھوڑا کہ پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہی پیغام حضرت

لوطؑ نے اپنی بیوی کو دیا جب کہا کہ چونکہ تم ایمان میں میرا ساتھ نہیں دے رہیں اس لئے تمہارا اور میرا رفاقت کا رشتہ باقی نہیں رہ سکتا۔ تم میرے اہل میں شامل نہیں ہو سکتیں۔ اور یہی اعلانؑ اپنی مکمل شکل میں خدا کے آخری رسول حضورؐ نبی اکرم نے اپنے تمام خویش و اقارب، اعزہ و اقرباء، ہم قبیلہ و ہم وطن قریش کو مخاطب کر کے کہا جب ان سے کہا کہ تم خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود میرے اپنے نہیں ہو سکتے کیونکہ تم ایمان میں میرے ساتھ مشترک نہیں۔ اس کے برعکس حبش کا بلالؓ، روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ میرے اہل میں سے ہیں کیونکہ وہ دین کے رشتے میں مجھ سے منسلک ہیں۔ دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کا یہی اسلامی تصور تھا، جس کی بنیاد پر اقبالؒ اور جناحؒ ہندو اور انگریز دونوں سے یہ کہہ کر لڑتے رہے کہ تمہارا معیارِ قومیت یہ ہے کہ ایک ملک میں بسنے والے تمام افراد بلالحاظ مذہب، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور ہمارا معیار قومیت یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے دین کے اشتراک کی بنا پر ایک الگ قوم کے افراد ہیں، اور غیر مسلم، ایک جداگانہ قوم کے افراد۔ اسی کو دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ ان کی یہ لڑائی، ہندو اور انگریز ہی کے ساتھ نہیں تھی خود مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسا تھا ــــ اور بدقسمتی سے وہ گروہ وہ تھا جو اپنے آپ کو دین کا علمبردار کہتا تھا ــــ جو اس نظریہ کی مخالفت کرتا تھا۔ یہی تھا (متحدہ قومیت کے مؤیدین کا) وہ گروہ جس کے ایک ممتاز نمائندہ ــــ (مولانا) حسین احمد مدنی مرحوم نے جب کہا کہ "ملّت از وطن است" تو اقبالؒ نے اپنے بسترِ مرگ سے، ایک آہِ جگر سوز کے ساتھ کہا کہ

چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

مطالبہ پاکستان کی یہ پہلی بنیاد تھی۔ اور اس کی دوسری بنیاد یہ تھی کہ مغربی تصورِ جمہوریت کے مطابق، ملک کا اقتدارِ اعلیٰ، ملک کے باشندوں کو حاصل ہوتا ہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے روبہ عمل لاتے ہیں۔ ان نمائندوں کی اکثریت جو فیصلہ کر دے، وہ مملکت کا قانون بن جاتا ہے جس کی اطاعت تمام افرادِ مملکت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، اسلام کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ، خدا کو حاصل ہے جسے وہ اپنی آخری کتاب قرآن مجید کی رُو سے بروئے کار لاتا ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآن کے احکام کو نافذ کرے اور اس کے اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مملکت کا نظم و نسق سرانجام دے۔ اس کو اسلامی نظام، اسلامی مملکت یا قانونِ شریعت کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مملکت، مغرب کے تصورِ جمہوریت کی رُو سے قائم ہی نہیں ہو سکتی۔

یہ تھے وہ نظریات جن کی بنیادوں پر پاکستان کی جداگانہ، آزاد مملکت کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا اور انہی بنیادوں پر اس مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا۔

جہاں تک پہلے (دو قومی) نظریہ کا تعلق ہے، قیام پاکستان کے بعد اسے اس طرح فراموش کیا گیا گویا اس کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو جو تقریر پاکستان اسمبلی میں کی تھی، اس میں اس نظریہ سے انحراف کر دیا گیا تھا لیکن ان پر یہ الزام غلط ہے۔ اس کی تردید حال ہی میں ان کے سب سے بڑے مخالف، مودودی صاحب نے بھی کر دی ہے جب کہا ہے کہ وہ (قائداعظمؒ) دو قومی نظریہ اور اسلامی نظام کے قیام کے دعاوی سے منحرف نہیں ہوتے تھے ـــ (تفصیل اس کی اسی اشاعت میں دوسری جگہ آپ کے سامنے آئیگی)، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ کے بعد مملکت پاکستان میں، نہ صرف یہ کہ اس نظریہ کو پس پشت ڈال دیا گیا بلکہ عملاً اس کے خلاف کیا گیا۔ پاکستان میں بسنے والے تمام باشندوں ـــ مسلمانوں اور غیر مسلموں ـــ کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا گیا۔ اسی نظریہ (متحدہ قومیت) کے مطابق یہاں آئین بنتے رہے اور اسی کے مطابق نظم و نسق مملکت انجام پاتا رہا۔ اس میں "مسٹر اور مولوی" کی بھی کوئی تخصیص نہیں تھی، نہ ہے۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی، جو اپنے زعم کے کردار میں سب سے بڑا وزنی عمل یہ بتاتی ہے کہ مودودی صاحب نے دو قومی نظریہ کا پرچار کیا تھا، بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ یہ نظریہ وضع ہی انہوں نے کیا تھا ـــ ان کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو، جو متحدہ قومیت کے نظریہ کے مطابق وضع کیا گیا تھا، عین مطابق اسلام قرار دیتی ہے اور اب تک مُصر ہے کہ مملکت کا آئین اسی کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس جماعت کی طرف سے جو انتخابی منشور شائع ہوا ہے، اس میں بھی پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم کی حیثیت نہیں دی گئی ـــ بلکہ مودودی صاحب یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ، کنونشن لیگ کے مسلمان امیدوار کے مقابلہ میں ایک ہندو کو ترجیح دیں گے جو ان کی جماعت کے اصولوں کا ہم نوا ہو۔ جماعت اسلامی کے علاوہ بھی، اسلام کی کسی دعویدار جماعت نے اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں دو قومیں بستی ہیں حتیٰ کہ کسی نے، غیر مسلموں کے لئے جداگانہ انتخاب بھی تجویز نہیں کیا۔ (پاکستان کی بعض غیر مسلم جماعتوں کی طرف سے جداگانہ انتخاب کی تجویز پیش کی جاتی ہے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے)۔ پاکستانی مولوی صاحبان میں اکثریت ان کی ہے جو اُن علماء کے متبعین ہیں جنہوں نے تقسیم سے پہلے، دو قومی نظریہ کی مخالفت کی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات دانستہ اس نظریہ کو پس پشت ڈال رہے ہیں تاکہ انہیں کہنے کا موقعہ ملے کہ تم نے دیکھ لیا کہ ہمارے بزرگوں کا موقف کس قدر مبنی بر حقیقت تھا۔

بہرحال جب "مولویوں" کی یہ کیفیت ہے تو مسٹروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دو قومی نظریہ کو مملکت کی اساس قرار دیں گے! یوں مطالبہ پاکستان کی پہلی بنیاد، نسیاً منسیاً ہو چکی ہے۔

جہاں تک دوسری بنیاد ـــ یعنی مملکت میں اسلامی قوانین کے نفاذ ـــ کا تعلق ہے، اس کے لئے

یہاں نہایت سادگی و پُرکاری سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔ مولویوں نے اسے پیش کیا اور مسٹروں نے مصلحتاً اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ لیکن طلوع اسلام نے پہلے دن سے اس کی، یہ کہہ کر، مخالفت کی کہ جذباتی طور پر یہ مطالبہ بڑا مقدس ہے لیکن عملاً اسے بروئے کار لانا ناممکن ہوگا کیونکہ ان بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مدون نہیں ہو سکیگا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں۔ بیس بائیس برس تک (طلوع اسلام کو ہدفِ ملامت بنانے کے ساتھ ساتھ) اس مطالبہ کو مسلسل دہرایا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں بھی اس شق کو شامل کرالیا گیا اور ۱۹۶۲ء کے آئین میں بھی۔ لیکن اس پر عملدرآمد کی باری ابھی تک نہ آتی۔ اور اب، بالآخر، ان حلقوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی فی الواقعہ کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو — چلئے۔ اسلامی نظام کا قصہ یوں پاک ہوا۔ اس کے بعد تجویز یہ کی گئی کہ یہاں اُس فرقہ کی فقہ (حنفی) کو بطور قانونِ مملکت نافذ کر دیا جائے جس کی یہاں عددی اکثریت ہے۔ اس کے خلاف، اقلیت کے فرقوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیں اس مملکت کے متعلق مختلف نقطۂ نگاہ سے سوچنا پڑے گا — اور یوں اس مملکت کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا۔

یہ حشر ہوا اس دوسری بنیاد کا جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی۔

کتنے بے ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے!

ظاہر ہے کہ جن خطوط پر مولوی سوچتا ہے ان کی رُو سے پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہی نہیں ہو سکتے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ طبقہ جو پہلے ہی سے سیکولر نظام حکومت کا قائل ہے، اسے یہ کہنے کا موقعہ مل جائے گا کہ فرمائیے! اس کے سوا اور چارہ کار کیا ہے۔ اس کا کوئی معقول جواب تو کسی کے پاس ہوگا نہیں لیکن چونکہ سیکولر نظام میں مولوی کا اقتدار ختم ہو جاتا (یا شخصی قوانین تک سکڑ کر رہ جاتا) ہے، اس لئے وہ محض اپنے اقتدار کی خاطر، یہاں کفر اور اسلام کی جنگ چھیڑ دے گا۔

اس مسئلہ کے متعلق ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے، اس کے نتائج و عواقب کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائے گا۔ یہاں صورتِ حالات یہ ہوگی کہ

(۱) اگر آئندہ الیکشن کے نتیجہ میں، مجوزہ مجلسِ دستور ساز میں مولوی طبقہ (جسے اب "اسلام پسند" کی جدید اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے) کی اکثریت ہوتی تو وہ کسی ایک فرقہ کی فقہ (مثلاً فقہ حنفی) کو ملک کا قانون قرار دینے کا طے کرلیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مختلف فرقوں میں معرکہ (یعنی خانہ جنگی) شروع ہو جائے گی۔ اور

(۲) اگر اس اسمبلی میں وہ لوگ اکثریت میں آگئے جو، یا تو ویسے ہی سیکولر نظام کے حامی ہیں، اور یا جو مذکورہ

صدرِ خطرہ کے پیشِ نظر اس کے سوا چارہ ہی نہیں دیکھیں گے کہ یہاں سیکولر نظام رائج کر دیا جائے تو مولوی طبقہ ان کے خلاف اعلانِ جہاد (خانہ جنگی) کر دے گا۔

اول تو ان دونوں صورتوں میں، ملک ایسے خلفشار کی نذر ہو جائے گا جس میں مملکت کا وجود ہی مخدوش ہو جائے گا اور اگر مملکت کا وجود باقی بھی رہا تو ملک میں یہ خیال ابھرے گا کہ

(۱) جب یہاں دو قومی نظریہ بھی باقی نہیں رہا۔ اور

(۲) ملک میں اسلامی نظام بھی قائم نہیں ہو سکا۔ تو

مملکتِ پاکستان کے الگ وجود کی وجہ جواز کیا ہے۔ کیوں نہ اس کا ہندوستان سے الحاق کر کے دونوں ملکوں میں جنگ کے امکانات کے مستقل خطرہ کو ختم کر دیا جائے۔ اس سے وہ لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔ جو پہلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں کنفیڈریشن کے تصورات ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ نیز وہ بھی جو مشرقی پاکستان کو جداگانہ مملکت بنانے کی آوازیں اٹھا رہے ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جس پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، اور ملک کے لیڈرانِ کرام ہیں کہ ان کے سامنے الیکشن جیت کر اقتدار حاصل کرنے کے سوا، کوئی اور مقصد نہیں۔ آپ ان کی دعواں دار تقریروں کو سنئے، ان کے شعلہ بار بیانات کو پڑھئے۔ ان میں آپ کو پاکستان کی بنیادِ اوّل ــــ دو قومی نظریہ کا تو کہیں سراغ تک نہیں ملے گا۔ باقی رہی دوسری بنیاد سو اس کے لئے وہ محض روشِ عامہ کی تقلید میں ــــ عوام کو بہلانے کی خاطر ــــ "کتاب و سنت" کا نام تبرکاً ضرور لیں گے لیکن اس کے ان مضمرات کا کبھی ذکر تک نہیں کریں گے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ نہ ہی کوئی ان سے پوچھے گا کبھی کہ جب کتاب و سنت کی رُو سے ملک کے لئے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین بن ہی نہیں سکتا، تو آپ اٹھتے بیٹھتے اس کی رٹ کیوں لگاتے رہتے ہیں؟ آپ نے دیکھا کہ الیکشن کے لئے کس قدر دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر مملکتِ پاکستان کے قیام و بقا کا دارومدار ہے، ان کا کسی کو خیال تک بھی نہیں۔ ایسے شیخ چلّی قسم کے لوگ بھی شاید ہی کہیں ملیں جو کرسیاں کھینچنے کے لئے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیں لیکن اس کا کبھی خیال تک بھی نہ کریں کہ اس زمین کی کیا حالت ہے جس پر ان کرسیوں کو بچھایا جائے گا۔

الیکشن اور ووٹ کے متعلق اگرچہ ہم اپنا موقف اچھی طرح واضح کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود احباب ہم سے مشورہ طلب کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے دل میں ان احباب کی قدر ہے جنہیں ہم پر اتنا اعتماد ہے کہ ہم جو مشورہ بھی دیں گے وہ خلوص، دیانت اور قرآنی بصیرت پر مبنی ہوگا۔ تصریحات بالا کی روشنی میں ان احباب سے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے پاس ووٹ کے لئے آئیں آپ ان سے حسبِ ذیل سوالات مزید کریں اور دیکھیں کہ وہ ان کا کیا جواب دیتے ہیں۔

(۱) کیا آپ دو قومی نظریہ کو اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے سمجھتے اور قیام پاکستان کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا تصور نہیں کرتے تو پھر انہیں اسلام یا پاکستان کے بہی خواہ ہونے کی حیثیت سے ووٹ مانگنے کا حق ہی نہیں۔ اگر وہ اس کا اقرار کریں تو پھر ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے اپنے منشور میں یہ شق رکھی ہے۔ وہ کہیں گے کہ اس میں عملی دشواریاں ہیں۔ تو ان سے کہیئے کہ جو چیز اسلام اور پاکستان دونوں کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، آپ کا فریضہ ہے کہ اس کی راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کا حل تلاش کرو۔ نہ یہ کہ دشواریوں کی وجہ سے سرے سے اس بنیاد ہی کو ڈھا دو۔

(۲) دوسرا سوال ان سے یہ پوچھئے کہ کیا آپ کے پروگرام میں یہ شامل ہے کہ مملکت پاکستان کو اسلامی مملکت بنایا جائے۔ اس کا جواب ہر ایک کی طرف سے "ہاں" میں ملے گا۔ تو پھر ان سے پوچھئے کہ اس کے لئے آپ عملی پروگرام کیا اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہم آئین میں یہ شق رکھیں گے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نافذ نہیں کیا جائے گا۔ آپ ان سے کہیئے کہ یہ بات کا تو اب ہر ایک کو اعتراف ہے کہ "کتاب و سنت" کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس صورت میں آپ کتاب و سنت کی بنیاد پر ایسا ضابطۂ قوانین کیسے مرتب کر لیں گے جس کا اطلاق تمام مسلمانان پاکستان پر (بطور قانون شریعت) یکساں طور پر ہو؟ یہاں پہنچ کر ان کا یہ دعویٰ بھی خاک بسر ہو جائے گا۔

یہ دو باتیں تو اساسی اور اصولی ہیں۔ اور جس کے پاس ان کا اطمینان بخش جواب نہیں، اسے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اسلام اور پاکستان کے نام پر ووٹ مانگنے کا کوئی حق نہیں۔ ان کے علاوہ عملی سیاست کی روشنی میں پوچھنے کی بات یہ ہے کہ کیا آپ کے نزدیک، مملکت کے استحکام کا راز وحدت میں ہے یا انتشار میں۔ اس کا یقیناً جواب یہ ہوگا کہ اس کا راز وحدت میں ہے۔ تو اس پر ان سے پوچھئے کہ کیا حقیقی وحدت کا طریق یہ نہیں کہ مملکت کے حصوں بخروں کو ختم کر کے، وحدانی انداز (UNITARY FORM OF GOVERNMENT) قائم کیا جائے۔ یا کم از کم مرکز کو اس قدر مضبوط رکھا جائے کہ مختلف اعضائے مملکت کے لئے من مانی کرنے کا امکان نہ رہے۔

یاد رکھیئے۔ اسلام کا وفادار اور پاکستان کا بہی خواہ وہ ہے۔ جو

(۱) اس حقیقت پر ایمان رکھے اور اس کا اقرار کرے کہ اس کا عمل بھی اس کے مطابق ہوگا، کہ مملکت کے آئین و قوانین کے سلسلہ میں، سند اور حجت، خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ یہی ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتی ہے۔ جو، سیاسی، معاشی، معاشرتی۔ تمدنی نظام اس کے مطابق ہوگا، وہ اسلامی کہلائیگا جو اس کے خلاف ہوگا وہ غیر اسلامی۔

(۲) دو قومی نظریہ، اسلام کا اساسی اصول اور مملکت پاکستان کی بنیاد ہے۔ اس اصول کی رو سے،

پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان ۔۔۔ بلا لحاظ رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدود، ملتِ واحدہ کے افراد، ان میں، ان اختلافات کی بنا پر کسی قسم کی تفریق و تمیز غیر اسلامی ہے جسے پاکستان میں بار نہیں پانے دیا جانا چاہیئے۔ ان کے برعکس، پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم، اس قوم کے افراد نہیں۔ انہیں انسان ہونے کی جہت، وہ تمام حقوق و مراعات دی جائیں گی جو غیر مسلموں کے لئے قرآن میں مذکور ہیں۔ لیکن وہ اور مسلمان مل کر ایک نہیں بن سکیں گے، اور نہ ہی وہ امورِ مملکت میں دخیل ہو سکیں گے۔

(۳) وحدتِ ملت کا فطری نتیجہ وحدتِ مملکت ہے۔ اس نئی مملکت پاکستان کو نظم و نسق کی سہولتوں کی خاطر تو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (جیسے کمشنریاں، ڈسٹرکٹ، تحصیلیں وغیرہ) لیکن اس میں کوئی ایسی تقسیم نہیں کی جا سکتی جس سے مملکتی اختیارات اور اقتدار مختلف اقطاع میں بٹ جائیں۔

جو ان نظریات کا قائل ہے اور انہیں عمل میں لانے کا اقرار کرتا ہے اور جس پارٹی کے منشور میں یہ شقیں درج ہیں، اس کو اسلام اور پاکستان کے نام پر ووٹ مانگنے کا حق ہے۔

(۰)

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

اگرچہ کارگہِ کائنات کے اکثر و بیشتر پوشیدہ راز، چشمِ انسانی کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں مگر ایک راز ایسا ہے جو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہے اور انسانی فکر کی مژگانِ کاوش ان پردوں کو اٹھانے میں ہنوز کامیاب نہیں ہو سکی جن سے وہ مستور ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ ایک ایسی قوم میں، جو ہر اعتبار سے پستی کی انتہا تک پہنچ چکی ہو، ایک ایسا بطلِ جلیل کس طرح پیدا ہو جاتا ہے جو انسانی صلاحیتوں کے اعتبار سے گویا ان میں کا ہوتا ہی نہیں (ہم نبی کی بات نہیں کر رہے کیونکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ اور جب وہ جاری بھی تھا تو نبی کی تخلیق کا ادراک حیطۂ فکرِ انسانی سے باہر تھا۔ ہمارا مطلب ایک نابغہ (GENIUS) کی پیدائش سے ہے)۔ نظریۂ ارتقاء کے ماہرین، عام قوانینِ فطرت میں اس قسم کی استثنا کو ہنگامی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن یہ درحقیقت فکرِ انسانی کا اعترافِ عجز ہے جسے اصطلاح کے پردہ میں چھپا دیا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں، جمال الدین افغانی، سرسید، اقبال، جناح اسی ہنگامی ارتقاء کی نمود تھی۔ اور انہی میں مصر کے مردِ جلیل جمال عبدالناصر کا بھی شمار ہوتا ہے۔ مصر جیسی فرعونیت، ملوکیت، اور قارونیت زدہ قوم میں، ایک ایسے فوجی افسر کی اچانک نمود، جو ان ہر سہ عفاریت کے خلاف، شعلۂ جوالہ بن کر ابھرے، ان پر برقِ خاطف بن کر گرے۔ اور اس خس و خاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دے، فطرت کا سربستہ راز نہیں تو اور کیا ہے۔ اور پھر اس سے بھی زیادہ

سرِ مستور یہ کہ وہ جس طرح اچانک ابھرا تھا اسی طرح اچانک نگاہوں سے غائب ہوگیا۔ اس عظیم انسان کو اپنی انقلاب آفریں سرگرمیوں کے لئے بہت تھوڑا وقت ملا لیکن اس قلیل مدت میں اس نے سلطان ٹیپو کے اس زندہ جاوید مقولہ کو سچ کر دکھایا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی، بکری کی سوسالہ زندگی سے بھی زیادہ گراں بہا ہوتی ہے"۔ اس کی عظمت کا راز اس کی بے لوث زندگی اور بے داغ کردار تھا اور اسی نے اُسے عربوں جیسی ناقۂ بے زمام قوم میں ایک گونہ بزرگ خاندان کا قابلِ رشک مقام عطا کر دیا تھا۔ اس کی سترہ سالہ انقلابی زندگی کے شب و روز جن برق رفتار سرگرمیوں اور جگر سوز پریشانیوں میں گزرے، انہیں دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی تھی کہ یہ شخص زندہ کس طرح سے ہے؟ لیکن اب معلوم ہوا — اور اس کی تصدیق اس کے قریبی رفیق محمد حسنین ہیکل کے بیان سے ہوئی — کہ وہ اتنا عرصہ درحقیقت موت کو فریب دے رہا تھا۔

بڑے آدمی کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں اور ان کے اثرات بھی اسی نسبت سے دور رس اور مضرت رساں۔ ناصر سے بھی اسی قسم کی غلطیاں ہوئیں، اور انہی کی پیدا کردہ پریشانیاں درحقیقت اس کی جان لیوا ثابت ہوئیں لیکن اس کی محیر العقول کامیابیوں کا پلڑا اتنا جھکا ہوا ہے کہ تاریخ انسانیت اسے فراموش نہیں کر سکتی۔ اس جواں سال مردِ انقلاب آفریں کی بے وقت موت، خود انسانیت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ
چو من از دودۂ آتش نفساں می خیزد

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا —

(۰)

طلوعِ اسلام کنونشن

جیسا کہ سابقہ پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا۔ طلوعِ اسلام کی تیرہویں سالانہ کنونشن اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ ۲۳، ۲۴، ۲۵ اکتوبر کو منعقد ہو رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس مرتبہ یہ کنونشن، سابقہ کنونشنوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پُرشکوہ اور نتیجہ خیز ہوگی۔ طلوعِ اسلام کا پرچہ ہر مہینے کی ۲۰، ۲۱ تاریخ تک پریس میں چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں افسوس ہے کہ ہم اشاعتِ حاضرہ میں کنونشن کی روئداد شائع نہیں کر سکتے، البتہ اس میں محترم پرویز صاحب کے دو خطابات شامل کئے جاتے ہیں — سکونِ گہر، وہ خطاب جس سے وہ مندوبین کا استقبال کریں گے اور "قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں" جسے وہ کھلے اجلاس میں پیش کریں گے اور جو وقت کی اہم آواز ہے۔ طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ کنونشن نمبر ہوگا جس میں کنونشن کی روئداد اور دیگر خطابات و تقاریر وغیرہ شامل ہوں گی۔

—— پرویز صاحب کے دوسرے خطاب کا عنوان ہے۔

جدید و قدیم میں کشمکش —— کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

ایجنٹ حضرات، کنونیشن نمبر کی مطلوبہ کاپیوں سے ہمیں جلد مطلع فرمائیں۔

——(٥)——

مفہوم القرآن

للہ الحمد کہ مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب یہ حسبِ ذیل شکل میں ملیگا۔

(۱) پارہ اول جس کی ضخامت بھی زیادہ ہے اور جس کا جدید ایڈیشن مصنف کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

قیمت۔ تین روپے۔

(۲) پارہ ۲ تا پارہ ۲۷ ۔ دو ۲/- روپیہ فی پارہ

(۳) پارہ ۲۸، ۲۹، ۳۰ ۔ تینوں یکجا، جو ضخیم بھی ہیں اور حال ہی میں شائع کئے گئے ہیں۔ قیمت۔ دس ۱۰/- روپے

(۴) مجلدات ۔ دس دس پارے، تین نہایت خوبصورت، مضبوط، سنہری جلدوں میں مجلد۔

قیمت۔ جلد اول پچیس ۲۵/- روپے، جلد دوم۔ پچیس ۲۵/- روپے، جلد سوم۔ تیس ۳۰/- روپے

مکمل سیٹ۔ اسی ۸۰/- روپے

یہ سب قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں۔ جلد حاصل کر لیجئے تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

ملنے کا پتہ:۔ (۱) ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور

(۲) مکتبہ دین و دانش ۔ چوک اردو بازار ۔ لاہور

——(٥)——

مودودی صاحب کی تقریر (۲)

طلوع اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء میں، مودودی صاحب کی اس تقریر کا، جو انہوں نے جماعت اسلامی کے یوم تاسیس کی تقریب پر (۲۶ اگست کو) کی تھی، جو تجزیہ پیش کیا گیا تھا، بللہ الحمد کہ اس نے بڑے خوشگوار نتائج پیدا کئے۔ ان لوگوں میں جو نیک نیتی سے مودودی صاحب کو اقامت دین کی تحریک کا داعی سمجھے ہوئے تھے، بیشتر نے یہ تاثر لیا ہے کہ اس تجزیہ سے مودودی صاحب کی غلط بیانیاں اور فریب دہیاں اس طرح بے نقاب ہوئی ہیں کہ ان کی اصل وحقیقت واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اس جماعت سے متعلقین کے دوسرے طبقہ کی طرف سے جس قسم کے سب وشتم سے لبریز (لیکن گمنام) خطوط موصول ہوتے ہیں، ان سے ان کی بلبلاہٹ نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اور تیسری چیز یہ کہ اس وقت تک ہماری نظروں سے اس جماعت کا کوئی جریدہ ایسا نہیں گذرا جس میں ہمارے پیش کردہ حقائق کی تردید کی گئی ہو ـــــ ان کی تردید ممکن ہی نہیں۔ طلوع اسلام کبھی کوئی غیر مستند بات نہیں لکھا کرتا ـــــ

ہم نے لکھا تھا کہ مودودی صاحب کی تقریر میں اور بھی بہت سی غلط بیانیاں ہیں جن کا جائزہ کسی آئندہ اشاعت میں لیا جائے گا۔ ان میں سے چند ایک اشاعت حاضرہ میں سامنے لائی جاتی ہیں۔

مسلمان قوم

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں جب انہوں نے "سیاسی کشمکش" لکھنی شروع کی تھی،

> تو اس وقت میرے پیش نظر اولین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو کسی طرح اپنی قومی شخصیت اور قومی انفرادیت فراموش نہ ہونے دوں اور ان کو غیر مسلم قوم کے اندر جذب ہونے سے بچاؤں۔

ظاہر بات ہے کہ جو شخص بھی اسلام کو یہاں سربلند کرنا چاہے وہ تو در یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس پہلے سے جو سرمایہ موجود ہے وہ ضائع نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جو لوگ پہلے سے کلمہ لاالٰہ الا اللہ کے قائل ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں پہلے مجھے ان کی فکر ہونی چاہیئے کہ کہیں وہ بھی ضائع نہ ہو جائیں۔ دوسرا

> کو مسلمان بنانے کی فکر تو بعد ہی میں کی جا سکتی ہے۔ اس لئے میں نے اپنا پورا زور اس کام میں صرف کر دیا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم قومیت کے اندر جذب ہونے سے بچایا جائے۔ اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ تم اپنی ایک مستقل قومیت رکھتے ہو۔ تمہارے لئے کسی طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ تم دوسری قومیت میں ضم ہو جاؤ۔
>
> (ایشیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۹ء)

یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، مسلم لیگ اور مودودی صاحب کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ ہی یہ تھا کہ مسلم لیگ کہتی تھی کہ موجودہ مسلمان، جیسے کچھ یہ ہیں، انہیں ہندوؤں کے اندر جذب ہونے سے بچا لیا جائے اور اس کا عملی حل یہ ہے کہ ان کی ایک جداگانہ مملکت قائم کر لی جائے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کا موقف یہ تھا کہ یہ "پیدائشی مسلمان" ایک جنس کاسد ہیں جنہیں بچانے کی کوشش بے معنی ہے۔ یہ رہیں یا نہ رہیں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انہیں "مسلمان" بنانے کی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ "انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔" "آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔" (سیاسی کشمکش، حصہ سوم)۔ ان مسلمانوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ "اسلام کو تلنے کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا گیا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔" (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کے نزدیک ان مسلمانوں کی قیمت کیا تھی جن کے متعلق وہ فرما رہے ہیں کہ انہیں ان کے بچانے کی بڑی فکر تھی۔ کہا جائے گا کہ انہوں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ یہ مسلمان باقی رہیں یا ہندوؤں میں جذب ہو جائیں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے یہی کہا تھا۔ اور انہی الفاظ میں کہا تھا۔ غور سے سنیئے۔ ان کے الفاظ تھے۔

> اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے

میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کمبخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔
(ترجمان القرآن۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"
بابت فروری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۱۵)

اس کے بعد ان کی ۲۶ اگست کی تقریر کا وہ اقتباس دوبارہ پڑھیئے جسے پہلے درج کیا گیا ہے؛ اور پھر آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ کھلا ہوا جھوٹ اور فریب دہی ہے یا نہیں۔ مودودی صاحب نے سمجھ رکھا ہے کہ ان کی جماعت نے سیاسی کشمکش حصہ سوم کے سابقہ ایڈیشن (یا ترجمان القرآن کے متعلقہ پرچے) سب تلف کر دیئے ہیں اس لئے اب وہ دھڑلے سے غلط بیانی کر سکتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ (ان کے نامۂ اعمال کے علاوہ) لوگوں کے پاس ان کی یہ تحریریں اب بھی محفوظ ہیں اس لئے وہ بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

کافرانہ حکومت

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ
اب گویا تین مسئلے درپیش تھے۔ اگر ملک تقسیم نہ ہو تو مسلمانوں کو بچانے کے لئے کیا کیا جائے۔ ملک تقسیم ہو جائے تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کے لئے کیا کیا جائے۔ ملک تقسیم ہو جائے جو ملک مسلمانوں کے حصے میں آئے گا اس کو مسلمانوں کی کافرانہ حکومت بننے سے کیسے بچایا جائے اور اسے اسلامی حکومت کے راستے پر کیسے ڈالا جائے۔

ان تین مسئلوں میں سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم نہ ہو تو مسلمانوں کو بچانے کے لئے کیا کیا جائے اس سلسلہ میں آپ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا وہ اقتباس دیکھ چکے ہیں (جسے ہم پہلے درج کر چکے ہیں اور) جس میں مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان کا مسلمان باقی رہتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔
جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے (یعنی ملک تقسیم ہو جائے تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کے لئے کیا کیا جائے۔ سو اس سلسلہ میں ان کا مجاہدانہ کارنامہ یہ تھا کہ خود بھاگ کر پاکستان تشریف لے آئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق فتوے صادر فرما دیا کہ پاکستان کے مسلمانوں کا ان کے ساتھ شادی بیاہ کرنا بھی ناجائز ہے۔ پاکستان آنے کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

آج بعض حضرات مجھے یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم بھاگ کر پاکستان کیوں آ گئے؟ مجھے اس کا اندازہ ہے کہ پاکستان میں میرا موجود ہونا ان کے لئے کس قدر شدید غم کا موجب ہے اور اس غم میں میری دلی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں لیکن انہیں شاید معلوم نہیں کہ میں اس وقت

مشرقی پنجاب میں تھا اور اس علاقہ کو جس طرح جبراً مسلمانوں سے خالی کرایا گیا تھا اس کی وجہ سے میرے لئے پاکستان آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اور ہم کہیں گے کہ مودودی صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ ہندوؤں کے اس تمام جبر و استبداد کے باوجود ایسے مسلمان بھی تھے جو مشرقی پنجاب میں بدستور ڈٹے رہے اور انہوں نے حالات کا بڑی جانبازی سے مقابلہ کیا۔ اور مرتے دم تک وہیں رہے۔ ہمارے سامنے ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ساری بستی میں تنہا (ایک) مسلمان گھرانا رہا۔ مسلمان کی حیثیت سے جیا اور مسلمان کی حیثیت سے مرا۔ لیکن سنئیے۔ مودودی صاحب تو یہ فرما رہے تھے کہ ان کے پیش نظر جو تین مسائل تھے ان میں تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلام کے راستے پر کس طرح ڈالا جائے۔
دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا آپ پاکستان' اپنے اس مشن کے لئے برضا و رغبت آئے تھے یا ہندوؤں کے بھگاتے ہوئے جبراً؟

اب آئیے ان کے اس دعوے کی طرف کہ ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلام کی طرف کیسے لایا جائے ـــــ یہ بھی صریحاً غلط بیانی ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مودودی صاحب سے کہا جا رہا تھا کہ اس وقت' انگریز اور ہندو کے خلاف جو سیاسی جنگ ہو رہی ہے' اس میں ہمارے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک خطۂ زمین حاصل کر لیا جائے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے گا تو پھر اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے کوشش کی جائے گی ـــــ سنئیے کہ اس کا مودودی صاحب کیا جواب دیتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا۔

> بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے' پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات، اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے' تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔　　(ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۹۰)

اب یہ ہے کہ جب آپ کو یہ یقین تھا کہ اگر قومی حیثیت سے مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو اس میں اسلامی حکومت قائم کرنا ناممکن ہے' تو پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت آپ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اگر تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلامی کس طرح بنایا جائے! کیا یہ دونوں باتیں باہمدگر متضاد نہیں؟ پھر یہ کہ جب آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ قومی اسٹیٹ، اسلامی مملکت نہیں بن سکتا، تو آپ تئیس سال سے یہاں اسی نظام کے قیام کی جدوجہد کیوں کر رہے ہیں؟

جماعت اسلامی سے متعلق (یا عقیدت مندوں) میں سے بعض حضرات نے ہمیں لکھا ہے کہ اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ مودودی صاحب نے جو کہا ہے کہ بانیانِ پاکستان کا یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کا ارادہ نہیں تھا' یہ بالکل صحیح ہے ــــ ہم اسے تسلیم کریں گے یا نہیں' اسے چھوڑیئے۔ آپ یہ فرمائیے کہ اسے آپ تسلیم کرینگے یا نہیں کہ مودودی صاحب کے اس بیان کے بعد کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد' اس قومی اسٹیٹ میں اسلامی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہوگا' ان کی طرف سے یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی تگ و تاز' محض فریب ہے یا نہیں جس بات کو ایک شخص ناممکن العمل سمجھے' اس کے لئے کوشاں ہونا' یا خود فریبی ہے یا فریب دہی۔

لیکن ان حضرات کو اس میں بھی کوئی تضاد دکھائی نہیں دے گا۔ اندھی عقیدت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

اسلامی نظام

یہ حضرات کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے اس راز کو پالیا تھا کہ بانیانِ پاکستان کا یہ ارادہ ہی نہیں تھا کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو' اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مودودی صاحب کی پہلے دن سے آج تک یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں اسلامی نظام رائج نہ ہونے پائے۔ اور اس کے لئے ہمارے پاس کھلے کھلے دلائل موجود ہیں' بغور سنیئے۔

مودودی صاحب نے یہاں روزِ اول سے یہ کہنا شروع کیا ــــ اور اب تک کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلامی نظام سے مقصد یہ ہے کہ

(۱) پبلک لاز تمام مسلمانوں کے لئے کتاب و سنت کے مطابق نافذ ہوں۔ اور

(۲) پرائیویٹ (شخصی) قوانین کی حد تک' مختلف فرقوں کی کتاب و سنت کی تعبیر اپنی اپنی ہو۔

پہلے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کتاب و سنت کی رُو سے وہ کونسا اسلامی نظام ہے جس میں پبلک لاز اور پرائیویٹ لاز کی اس طرح کی تفریق جائز ہو؟ کیا کتاب اللہ کی رُو سے یہ تفریق جائز ہے؟ یا کیا سنتِ رسول اللہ میں اس کا کہیں جواز آیا ہے؟ کتاب و سنت کی رُو سے تو فرقوں کا وجود ہی غیر اسلامی ہے۔

اب آگے چلئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے ایسے پبلک لاز مدوّن کئے جا سکیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک" اسلامی ہوں! (جیسا کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں بالتصریح لکھا جا چکا ہے۔) اب خود مودودی صاحب کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔" جب صورت یہ ہے تو کیا' مودودی صاحب کے اصول کے مطابق' پاکستان میں کوئی ایسا ضابطہ قوانین نافذ کیا جا سکتا ہے جسے تمام فرقوں کے مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں!

فرمائیے! پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے راستے میں کون روک بن کر کھڑا ہے؟ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں فقہ حنفی کو بطور ضابطہ قوانین نافذ کر دیا جائے۔ کیا اس ضابطہ کو تمام فرقے اسلامی تسلیم

کریں گے ؟

لیکن ٹھہریئے. مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے گی' اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کا حربہ ہے' ورنہ عملاً وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ تمام مسلمان ایک نظام کے تابع زندگی بسر کریں۔ وہ اپنی (۱۳؍ اگست والی) تقریر میں کہتے ہیں کہ

> لیکن ہر مسئلہ میں قرآن وسنت کے ارشادات واحکام کی لازماً صرف ایک ہی تعبیر نہیں ہوسکتی بلکہ مختلف تعبیریں ممکن ہیں' اور عملاً کی بھی گئی ہیں جن کی بدولت مسلمانوں میں مختلف مکاتب فکر[1] رکھنے والے گروہ پائے جاتے ہیں۔ اب اگر ہم اپنے اندر یہ رواداری پیدا نہیں کرینگے کہ کہ ہم میں سے جو گروہ جس تعبیر کو صحیح سمجھتا ہو اس پر خود عمل کرے اور دوسرے گروہ پر اپنی تعبیر کو زبردستی نہ ٹھونسے بلکہ اس کا بھی یہ حق تسلیم کرے کہ جو تعبیر اس کے نزدیک صحیح ہے اس پر وہ عمل کرتا رہے' تو ہمارے لئے مل کر کام کرنا اور پورے ملک میں قرآن وسنت کا قانون نافذ کر دینا کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔

یعنی یہ رواداری (کہ ہر فرقہ اپنی اپنی تعبیر کے مطابق عمل کرے اور دوسرا' پر اپنی تعبیر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے) جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر اسلامی نظام کے قیام کی کوشش تک تو برقرار رہے گی' لیکن جب اسلامی نظام قائم ہو جائے گا تو پھر اس رواداری کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس وقت مودودی صاحب کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ قرآن وسنت کی جس عملی تعبیر کو یہ صحیح سمجھتے ہیں' اسے دوسروں پر زبردستی ٹھونس دیا جائے۔

یہ ہے وہ" اسلامی نظام جس کی تنفیذ کے لئے مودودی صاحب کوشاں ہیں! کیا اس قسم کے نظام کا قیام ممکنات میں سے ہے؟ جو شخص خالی الذہن ہو کر ان حقائق پر غور کرے گا اُسے اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ مودودی صاحب کی ساری زندگی تضادات کا مجموعہ ہے' اور ان کی زیر نظر تقریر غلط بیانیوں کا مرقع. لیکن اس کا کیا علاج کہ چاندی اور سونے کی چمک نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ ان لوگوں کو اس قدر کھلی ہوئی حقیقتیں بھی دکھائی نہیں دیتیں!

——— (باقی) ———

[1] آپ دیکھتے ہیں کہ فرقوں کے وجود کو لفظی ایر پھیر سے کن پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے!

باسمہٖ تعالیٰ

سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا
با اضطرابِ موج ـــــــــ

سکونِ گہر

بدہ

پرویز صاحب کا خطاب

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے مندوبین کا

استقبال کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سکون گہر

ساز ی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

رفیقانِ محترم و زمیلانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت!

بِللہ الحمد کہ عمر کی کشتیٔ رواں نے اتنی مہلت اور دے دی کہ ایک سال کی مفارقت کے بعد آپ رفقاء منزلِ قرآنی کی اجتماعی ملاقات ایک بار پھر وجہ نشاطِ روح اور موجب سرورِ قلب بن گئی۔ لیکن میری عمر کی یہ مہلتیں بھی ایک گونہ آپ ہی کی عطا کردہ ہیں۔ آپ کنونشن میں تشریف لاتے ہیں تو آپ کے محبت بھرے سینوں کی حرارت اور خلوص آمیز نگاہوں کی تمازت۔ آپ کی پرکشش مسکراہٹوں کی لطافت اور آپ کی کشادہ جبینوں کی طلعت، جو آپکے ذوقِ قرآنی کی آئینہ دار اور آپ کے جذب دروں کی عکاس ہوتی ہے، میری آرزوؤں کو اس قدر جان اور میرے ارادوں کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ مجھے زندہ رہنے کا سہارا مل جاتا ہے۔ لہٰذا میرے عزیزو اور غمخوارو! میرے رفیقو اور ہمسفرو! یہ جو مجھے پھر سے جینے کی مہلت مل جاتی ہے تو یہ درحقیقت آپ ہی کی نوازشہائے پیہم کا تصدق ہے۔

یہ غنچوں کی نکہت ، یہ پھولوں کی رنگت
انہی کا تبسم ، انہیں کے اشارے

آپکے اس کاروانِ شوق و مستی میں اکثریت ان رفقاء کی ہے جنہوں نے میری دعوت کی اولین منزل میں اس بانگِ درا پر لبیک کہا اور اس کے بعد راہ طلب کی ہزار صبر آزما دشواریوں، اور جادۂ منزل کی صد ہزار ہمت شکن صعوبتوں کے باوجود، نہ کہیں ایک قدم پیچھے ہٹے، نہ کسی اور جانب کنکھیوں سے بھی دیکھا۔ اگر یہ درست ہے — اور اس کے درست ہونے میں شبہ ہی کیا ہے — کہ، وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے، تو اس قسم کے پیکرانِ خلوص و استقامت کی پختگیٔ ایمان میں کس کافر کو شک ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! اگر

کسی کو سفرِ زندگی میں اس قسم کا ایک ساتھی بھی مل جائے تو یہ اس کے بخت کی انتہائی فیروزمندی کی دلیل ہوتی ہے۔ سو چئے کہ دنیا میں میرے جیسا خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے جسے اس قسم کے رفقائے سفر اتنی کثرت سے میسر آ گئے ہوں۔ اپنے بخت کی اس سعادت پر میری جبینِ نیاز بدرگاہِ رب العزت جس قدر سجدہ ہائے تشکر بھی پیش کرے کم ہے۔ یہی تو وہ مقام ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ ــــ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں۔

ـــــــــــ (۰) ـــــــــــ

سالِ گذشتہ کے طوفان

برادرانِ عزیز! جب سالِ گذشتہ ہم انہی دنوں اس مقام پر جمع ہوئے تھے تو اس وقت ہمارا ملک جن آندھیوں کے طوفان میں گھرا ہوا تھا میں نے ان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔ کہ

> یہ سال، پاکستان کے لئے ہی نہیں، تمام اقوامِ عالم کے لئے عجیب ہنگامہ خیزیوں اور شورش انگیزیوں کا سال رہا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ تاریخِ انسانیت کے شش ہزار سالہ ہنگامے جو فضا کی سرمائی چادریں اوڑھے، ساکت و صامت محوِ خواب تھے، زمانے کے تقاضوں کے صورِ اسرافیل سے یک بیک بیدار ہو کر۔ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ـــ فضا کی پہنائیوں سے فرشِ زمین پر آن اترے ہیں اور آتشیں عفاریت کی طرح چیختے چلاتے، دھاڑتے، غرّاتے، اطرافِ عالم میں پھیل گئے ہیں۔ اور یہ سیلاب جہاں آشوب کسی کے تھامے نہیں تھمتا ــــ جلسے، جلوس، احتجاجات، مظاہرات، الزام تراشیاں، دشنام طرازیاں، خشت باریاں، آتش زنیاں، خوں ریزیاں، غارت گریاں، پتھراؤ، گھیراؤ ــــ غرضیکہ کونسا حربہ تھا جو قصرِ آئین و قوانین کی بنیادوں تک کو ہلا دینے اور شجرِ تہذیب و تمدن کو جڑ سے اکھیڑ دینے کے لئے اختیار نہ کیا گیا ہو۔ یہ آگ چونکہ عالم سوز تھی، اس لئے خطۂ پاکستان اس سے کس طرح محفوظ رہ سکتا تھا؟ یہ بھی اس کی لپیٹ میں آیا، اور بُری طرح آیا۔

لیکن، اس کے ساتھ ہی میں نے یہ کہہ کر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ

> بِلّٰہ الحمد کہ ہمارا یہ مختصر سا کاروانِ جذب و مستی۔ ان ہنگامہ خیزیوں سے یکسر محفوظ رہا اور کہیں سے اس قسم کی خبر موصول نہیں ہوئی کہ بزمہائے طلوعِ اسلام کے کسی رکن نے ان ہنگاموں میں کسی قسم کا بھی حصہ لیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآنی تعلیم کا اعجاز ہے جو اس

قسم کی عالمگیر شورشوں میں بھی دماغی توازن کھونے نہیں دیتا۔

درجنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست!

یہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی بات ہے جب یہاں ہنوز سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عاید تھیں جب جنوری ۱۹۷۰ء

سالِ رواں کی تلاطم خیزیاں

میں یہ پابندیاں اٹھا دی گئیں تو اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ الٰہ دین کے افسانے کا جن اس طرح بوتل سے باہر نکل آیا کہ اسے پھر سے بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس میں بھی نہ رہا۔ پہلے جو آندھیاں تھیں وہ بے پناہ جھکڑ بن گئیں۔ جو چنگاریاں تھیں وہ شعلۂ جوّالہ میں تبدیل ہو گئیں۔ پہلے جو دریائے پُرشور تھے وہ بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑے۔ جو دھمکے تھے انہوں نے ارض پاش زلزلوں کی صورت اختیار کر لی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا ملک ان جھکڑوں اور سیلابوں ان شعلوں اور زلزلوں کے نرغہ میں اس طرح آ گیا کہ پھر نہ کسی کی عزت محفوظ رہی نہ آبرو مصئون۔ نہ جان کا تحفظ رہا نہ مال کا۔ شرافتیں لٹ گئیں، نجابتیں برباد ہو گئیں۔ نظم و نسق تہ و بالا ہو گیا۔ اطمینان و سکون عہد رفتہ کا افسانہ بن گیا۔ کیا لیڈر اور کیا ان کے متبعین سب اس آتشیں رقص میں ننگے ناچ رہے تھے۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ ان تمام قیامت فراموش ہنگاموں میں ایک طلوعِ اسلام تھا جس نے نہ اپنے ہوش و حواس کھوئے، نہ دماغی توازن بگڑنے دیا۔ سارے ملک میں یہی ایک گوشہ تھا جہاں سے

طلوعِ اسلام کی پکار

یہ آواز برابر ابھرتی رہی کہ پاگلو! سوچو۔ یہ جو تم اپنے ہاتھ سے تباہیاں لا رہے ہو، یہ کس کی تباہیاں ہیں؟ ذرا ہوش میں آؤ۔ آنکھ کھول کر دیکھو۔ وہ کون ہیں جن کی عزتیں برباد ہو رہی ہیں؛ وہ کون ہیں جن کی شرافتیں لٹ رہی ہیں؟ وہ کون ہیں جن کی بربادیوں کا تماشا ساری دنیا دیکھ رہی ہے اور جن کی تباہیوں پر دشمن کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے جا رہے ہیں۔ اپنی ان مجنونانہ حرکات کو ذرا روکو اور سوچو کہ

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

ہرچند طلوعِ اسلام کی یہ پکار (بظاہر) نقار خانہ میں طوطی کی آواز تھی لیکن اس نے اسے برابر جاری رکھا۔ اقبالؒ نے اپنے دور کی ہنگامہ خیزیوں سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

وہ اگر آج زندہ ہوتے تو اپنے اس دور کی ہوائے تند و تیز کو اس زمانے کے جھکڑوں کے مقابلہ میں نسیمِ سحری کہہ کر

پکارتے۔ للہ الحمد کہ طلوعِ اسلام نے ان عفریتی جھکڑوں میں اپنے اس ننھے سے دیئے کو روشن رکھا اور اس چراغ نہ داماں کو لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ سرکش جذبات کی آندھیوں اور بیباک ہنگامہ خیزیوں کے جھکڑوں میں قرآنی بصیرت کے چراغ کو روشن رکھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اس کے لئے آپ اپنی تحریک کے دو ایک دعاوی اور اس بیس بائیس سال کی کشمکش کے بعد ان کے نتائج کو مثالاً سامنے لائیے، بات واضح ہو جائے گی۔

(۱) تقسیمِ ہند سے بہت پہلے، جب ہندوستان میں جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، تو طلوعِ اسلام نے اس تحریک کے مضمرات پر غور کیا اور دیکھا کہ اس میں ملت اور دین دونوں کے لئے کس قدر خطرات پوشیدہ ہیں — مذہب انفرادی رہتا

جماعتِ اسلامی کی مخالفت

ہے تو جہالت اور توہم پرستی کا موجب بنتا ہے، لیکن جب وہ منظم ہو کر سیاست کا روپ دھار لیتا ہے تو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے اس سے زیادہ شدید اور مہیب استبدادی پنجہ کوئی اور نہیں ہوتا۔ یورپ کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ عیسائیت جب تک انفرادی مذہب رہی مسلکِ خانقاہیت اختیار کئے رہی۔ لیکن جب اس نے منظم کلیسا کی شکل اختیار کر لی تو جو کچھ انسانوں کے ساتھ ہوا، تاریخ کے رنگین اوراق اس کی بین شہادت ہیں۔ انبوہ در انبوہ مخالفین کو زندہ جلایا گیا۔ ان کی کھالیں کھنچوائی گئیں، زبانیں کاٹی گئیں، ہونٹ سئے گئے۔ انہیں پھانسیوں پر لٹکایا گیا، ایک ایک عضو کاٹ کر انہیں تڑپا تڑپا کر مارا گیا، تنگ و تاریک غاروں میں عمر بھر کے لئے محبوس رکھا گیا۔ ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ کتابیں جلائی گئیں، مسودات تلف کئے گئے۔ ان کے گھر بار نذرِ آتش کئے گئے۔ ان کے بال بچوں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ اربابِ کلیسا کی سبعیت و بربریت کی دہشت سے عوام تو ایک طرف، سلطنتیں اور حکومتیں بھی لرزاں و ترساں رہتی تھیں — یہ ہوتا ہے منظم مذہب سیاست کے پیرہن میں — یہ تھا وہ احساس جس کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام نے جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ اس کی یہ آواز سارے ملک میں یکّا و تنہا تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس جماعت کے عزائم بیرونِ پردہ آنے شروع ہو گئے، اور طلوعِ اسلام کی طرف سے اس کی مخالفت بھی اسی نسبت سے ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس جماعت کے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ یہ اقامتِ دین کی داعی اور اسلامی نظام کے لئے کوشاں ہے اس لئے طلوعِ اسلام کی طرف سے اس کی مخالفت سطح بین حضرات کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کیونکہ طلوعِ اسلام کی تحریک خود اقامتِ دین کی داعی اور اسلامی نظام کی مبلغ تھی۔ یہ غلط فہمی، یا ان دونوں تحریکوں کے مقاصد میں التباس، اس قدر عام تھا کہ اور تو اور، خود طلوعِ اسلام کے قریبی حلقوں سے بھی اس قسم کی آوازیں اکثر سنائی دیا کرتی تھیں کہ اسے اس جماعت کی مخالفت کی روش ترک کر دینی چاہیئے۔ لیکن طلوعِ اسلام جو کچھ کر رہا تھا، علیٰ وجہ البصیرت کر رہا تھا۔ اس میں نہ کسی قسم کی ذاتی رقابت کا کوئی شائبہ تھا نہ مفادات کے تصادم کا اندیشہ۔ اس کی مخالفت کی بنیاد صرف اس جذبہ اور احساس پر تھی کہ پاکستان

اور اسلام کو اس تحریک کے مہیب خطرات سے بچا لیا جائے۔ اس لئے اس نے اپنوں کی نصیحت اور بیگانوں کی سرزنش کے باوجود، اس مخالفت کو جاری رکھا۔ اس کی اس استقامت کا نتیجہ ہے کہ آج اس جماعت کے عزائم یکسر بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آگئے ہیں اور پبلک کے ہر گوشے سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی ہے۔

طلوع اسلام نے جو آواز آج سے تیس سال پہلے اٹھائی تھی،

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

یہ ہے عزیزانِ من! حق و صداقت کے مٹی کے دیئے کو حوادث زمانہ کے تھپیڑوں کے علی الرغم جلائے رکھنے کا نتیجہ ـــ اب دوسری مثال کو سامنے لائیے۔

قوانینِ شریعت کی تدوین

(۲) تشکیلِ پاکستان کے بعد، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ چونکہ اس مملکت کو اسلامی مملکت بنانا مقصود ہے اسلئے یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ یہ مطالبہ اس قدر مقدس، مسلّمہ اور معصوم سا تھا کہ کسی کے حیطۂ تصوّر میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کسی طرف سے اس کی مخالفت ہو گی۔ لیکن طلوع اسلام نے اس کی بھی مخالفت کی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اسلامی ضابطۂ قوانین اسے کہتے ہیں جسے تمام مسلمان اسلامی تسلیم کریں اور اس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو۔ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو پاکستان میں بسنے والے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ جب ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے تو اپنے آپ کو، یا اہلِ پاکستان کو اس فریب میں رکھنے سے کیا حاصل؟ اور اگر کسی ایک فرقہ کے ضابطۂ قوانین کو تمام فرقوں پر زبردستی ٹھونسا گیا تو اس کے نتائج اس قدر خطرناک ہونگے جس سے خود مملکت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسلامی مملکت کے لئے ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مختلف فرقے، اپنی اپنی فقہ کو الگ رکھ کر، قرآن کریم کو قانون کی سند اور حجت تسلیم کریں اور حالاتِ حاضرہ کو سامنے رکھتے ہوئے، ایک جدید فقہ مرتب کریں۔ اگر مختلف فرقے ایسا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو فریب میں رکھا جائے، اس کا اعتراف کر لیا جائے کہ مملکت میں اسلامی قوانین نافذ کرنا ممکن نہیں۔

طلوع اسلام کی اس آواز کی جس شد و مد سے مخالفت ہوئی اس سے آپ احباب مجھ سے بھی زیادہ واقف ہیں، کیونکہ اس کے ہدف، ہر مقام پر آپ حضرات تھے۔ آپ کو اس کا براہِ راست تجربہ ہے ـــ یہ منکرینِ حدیث ہیں، منکرِ شانِ رسالت ہیں، ملحد ہیں بے دین ہیں، ایک نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں ـــ یہ، اور نہ جانے اور کس کس قسم

کے لیبل ہم پر چسپاں کئے گئے۔ یہ غوغا اتنی شدت سے بلند کیا گیا کہ میرے مخلص ترین دوستوں تک نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا کہ تم خواہ مخواہ حدیث اور سنت کی نظری بحث میں الجھ رہے ہو اور اس طرح ساری قوم کی مخالفت مول لے رہے ہو۔ ہماری دعوت رجعت الی القرآن کی دعوت ہے۔ تم اسے مثبت طور پر پیش کئے جاؤ۔ حدیث یا سنت کا تعلق مسلمانوں کے نازک ترین جذبات سے ہے۔ ان مباحث میں الجھ کر تم اس قدر بدنام ہو جاؤ گے کہ غیر تو غیر، جن لوگوں کے تمہارے ساتھ نہایت مخلصانہ تعلقات ہیں وہ بھی — کم از کم دوسروں کے سامنے — تمہاری مخالفت نہیں تو لاتعلقی کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے — مجھے بھی اس کا علم اور احساس تھا کہ اس مخالفت کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن قرآن اور پاکستان کی طرف سے جو فریضہ مجھ پر عاید ہو رہا تھا، اس کی اہمیت میرے نزدیک، ان مخالفتوں کے مآل و عواقب سے کہیں زیادہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکنات میں سے نہیں جس پر مختلف فرقوں کے مسلمان متفق ہو سکیں، اس لئے اگر ہم نے آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ لی اور اس کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہ کر سکے، جسے یہاں کے تمام مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں، تو غیر مسلم اقوامِ عالم تو ایک طرف خود مسلمان بھی یہ محسوس کرنے لگ جائیں گے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ کسی زمانے میں تو یہ ایک زندہ نظامِ زندگی بن گیا تھا لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ کسی مملکت کا آئین اور ضابطۂ قوانین اس کے مطابق مرتب ہو سکیں۔ یہ تھا وہ احساس جو مخالفتوں کے اس بے پناہ سیلاب کے علی الرغم، مجھے اس آواز کو بلند کئے جانے پر مجبور کر رہا تھا، میں نے ان مخالفتوں کی پرواہ نہ کی اور اپنی بات کو دہرائے چلا گیا — آج میرا سرِ نیاز بدرگاہِ صمدیت ما بیں جھکا ہے کہ بیس بائیس سال کی مسلسل تگ و تاز کے بعد، حقیقت نے اپنے آپ کو منوا لیا، اور — جیسا کہ آپ نے طلوعِ اسلام کی ماہِ رواں کی اشاعت میں دیکھ لیا ہوگا، اس آواز کی سب سے بڑی مخالف جماعتِ اسلامی کے امیر کو بالآخر یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ فی الواقعہ۔

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہوں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی تحریک کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے ایک کنونشن کے اجتماع میں کہا تھا کہ ؎

یہاں تک تو لگا لائے ہیں ہم رستے پہ واعظ کو
کہ سمجھاتا ہوا اب تا درِ میخانہ آتا ہے

زمانے کے تقاضوں نے ان حضرات کو اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کر دیا ہے کہ کتاب و سنت کی بنیاد پر کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لا کے بعد، اگر یہ حضرات اِلّا کی منزل تک بھی پہنچ گئے اور اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لیا کہ ایسا ضابطۂ قوانین قرآن مجید کی بنیادوں ہی پر مرتب ہو سکتا ہے، تو پھر اہلِ پاکستان ہی نہیں، عالمِ انسانیت کی سوئی ہوئی تقدیر جاگ اٹھے گی اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے

نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو .... اس تو کا جواب مجھ سے نہیں، اقوامِ سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھئے! (یٰلیتنی مِتُّ قبل ھذا و کنت نسیا منسیا)۔ (چونکہ میں ان موضوعات پر اپنے آئندہ خطابات میں تفصیلی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، اس لئے اس وقت اس اختصار پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا)۔ بہرحال، آپ کی اس خاموش دعوت کے جو نتائج اس وقت تک میرے سامنے آئے ہیں وہ بھی کچھ کم اطمینان بخش اور حوصلہ افزا نہیں۔

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

اور یہ آپ حضرات کی بہت بڑی کامیابی ہے اور خوش بختی کی علامت جس کے لئے میں آپ تمام احباب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

جو گرمجوش نوجوان اعتراض کیا کرتے ہیں کہ طلوع اسلام کی فکری تحریک کیا نتائج پیدا کر سکتی ہے، اسے چاہیئے کہ کوئی عملی پروگرام اختیار کرے۔ آپ ان سے پوچھئے کہ جو نتائج اس فکری تحریک نے پیدا کئے ہیں، ان کا کوئی شائبہ تک بھی اُن جماعتوں کے ہاں نظر آتا ہے جنہیں آپ رو بہ عمل سمجھتے تھے۔ انہیں اپنی عمر بھر کی صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں کے بعد، بالآخر اسی مقام کی طرف آنا پڑا جس کی دعوت طلوع اسلام دیتا تھا۔ آپ کو ان کے ہاں گرج، کڑک، چمک تو ملے گی لیکن اس ابرِ گہر بار کا چھینٹا تک دکھائی نہیں دے گا جس سے زمینِ مردہ میں حیاتِ تازہ کی نمود ہوتی ہے۔ یہ ابرِ نیساں آپ کو قرآنی فکر کی پیامبر تحریک ہی کے ہاں ملیگا۔

——— (۰) ———

دعوت الی اللہ کے ساتھ اگر استقامت شامل ہو تو اس تحریک کو کس طرح خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے (﴿﴾)، اس کی دو شہادتیں آپ کے سامنے آگئیں۔ اب میں اسی ضمن میں ایک اور گوشے کی طرف آتا ہوں جو ان سے بھی زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ آپ احباب، اس حقیقت سے تو بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے، بیج بونے اور فصل پکنے کے درمیان مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ یہی وہ وقفہ ہے جس کی وجہ سے، خدائی پروگرام کو سست خرام، فلہٰذا صبر آزما کہا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (غالب کے الفاظ میں، جنہیں کئی بار دہرایا جا چکا ہے) بیتابیٔ تمنا کی شدت کی وجہ سے، صبر طلبیٔ عشق کا یہ عرصہ دراز بڑا ہمت شکن، اور زہرہ گداز ہوتا ہے لیکن جب خزاں کے بعد بہار کی آمد آمد ہوتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ صحنِ چمن کے ذرے ذرے سے، حیاتِ تازہ کس طرح انگڑائیاں لے کر ابھرنی شروع ہو جاتی ہیں — یہ شگوفہ پھوٹا، وہ غنچہ چٹکا، یہ کلی مسکرائی، وہ پھول مہکا — قرآن کی بنیادوں پر استوار فکری تحریک کا بھی یہی انداز ہوتا ہے۔ جب مہلت

کا درمیانی عرصہ ختم ہونے کو آتا ہے' تو معاشرہ میں ہر طرف اس کے برگ و بار ابھرتے دکھائی دینے لگ جاتے ہیں۔

حدیثِ یار کے عنوان نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (۱۱۰/۲۔۱)
کا یہی مفہوم ہے۔

نظامِ ربوبیت کی دعوت

بیس سال پہلے طلوع اسلام نے یہ آواز بلند کی کہ خدا نے انسانوں کو رزق مہیا کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے' وہ اسلامی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ اس مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ہر فرد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ اور مملکت اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائل رزق اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ لہذا' اسلامی نظام میں ذاتی املاک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس آواز کا اٹھنا تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچا دیا گیا کہ یہ کمیونسٹ ہے' دہریہ ہے۔ یہ کارل مارکس کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ روس اور چین کی نقالی ہے۔ اسلام میں اس قسم کی مزدکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نظریات' اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیں گے — اور یہ ڈگڈگی اس زور سے بجائی گئی کہ سرمایہ دار طبقہ تو ایک طرف' اربابِ نظم و نسق بھی اس سے متاثر ہو گئے۔ طلوع اسلام کے لئے یہ مرحلہ' سابقہ مراحل سے بھی زیادہ دشوار گزار اور ہمت طلب تھا۔ اس سے اس تحریک کو بے حد دھچکے لگے۔ طلوع اسلام کی اشاعت اور اس کے شائع کردہ لٹریچر کے فروغ پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ اسے مسلسل نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ اس کے خلاف کئی قسم کے الزامات تراشے گئے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ حالات کی اس قدر شدید نامساعدت کے باوجود' طلوع اسلام کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی جنبش نہ آنے پائی اور اس نے قرآن کریم کے اس معاشی نظام کے تصور کو عام کرنے میں' اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھی۔ قرآنی فکر کی یہ جوئے رواں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی۔ تا آنکہ زمانے کے تقاضوں نے اس میں ایسا تموج پیدا کر دیا کہ اس معاشی نظام کا مطالبہ' اب ملک کا واحد مطالبہ بن گیا ہے جس کے مدمقابل کوئی دوسرا مطالبہ ٹھہر نہیں سکتا اس کی حدت اس قدر شدید ہے کہ نظام سرمایہ داری کے بڑے بڑے ستون جو ہامانی تنگدروں میں نصب تھے' پگھل پگھل کر بہتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مدعیانِ اقامتِ دین' جن کا فتویٰ یہ تھا کہ املاک و مقبوضات کی کسی قسم کی حدبندی از روئے اسلام حرام ہے' اور مالی تنظیمات کا قومیانہ ابلیس کا وضع کردہ انسانیت کش نظام' وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اسلام کی رُو سے زمین کی ملکیت کی تحدید بھی کی جا سکتی ہے اور کلیدی صنعتوں کو مملکت اپنی تحویل میں بھی لے سکتی ہے۔ یوں' عزیزانِ گرامی قدر! حقیقت اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔

رند و صوفی ہمہ سرمست گذشتند و گذشت
قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

جو حضرات طلوع اسلام کی اس دعوت کو الحاد و بے دینی قرار دیا کرتے تھے، آپ ان سے کہیئے کہ تم طلوع اسلام کی قرآنی فکر کے ننھے سے دیئے کی لَو کو تو برداشت نہیں کرسکتے تھے اور اسے اپنی کف آلود پھونکوں سے گل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، اب اس لَو کا عکس' ملک کے بچے بچے کے آئینہ جبیں میں جھلک رہا ہے۔ ذرا ہمت کرکے انہیں گل کرکے دکھاؤ۔

بجھا سکو تو بجھا دو، ستم کے متوالو!
پلک پلک پہ فروزاں ہیں آرزو کے دیئے

لیکن انہیں پھونک مار کر بجھانے کی کوشش سے پہلے' سعدی کی اس انتباہ کو ذہن میں رکھ لینا کہ

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
کسے کو پف زند ریشش بسوزد

رفیقانِ محترم! سوچیئے کہ کیا یہ حقیقت آپ کے لئے کچھ کم باعثِ فخر و مباہات ہے کہ آپ نے جس آواز کو اتنا عرصہ پہلے بلند کیا اور جسے اتنی مدت تک صدا بصحرا سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جاتا رہا' وہ آواز آج' ملک کے ہر دھڑکنے والے دل کی ترجمان بن رہی ہے۔ کیا آپ کی دعوت کی صداقت کی اس سے زیادہ درخشندہ شہادت کوئی اور بھی ہوسکتی ہے؟ آپ کی اس قابلِ رشک کامیابی پر' آسمان کے فرشتے تبریک و تہنیت کے پھول برسا رہے ہیں اور ـــ حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زنند

(o)

ایک مہیب خطرہ

لیکن عزیزانِ من! اسی حسین و دلکش مقام پر مجھے آپ احباب کو ایک فریب انگیز خطرے کی چٹان سے بھی آگاہ کرنا ہے۔ وہ جو سنا کرتے تھے کہ آندھی کے طوفان میں پگڑی سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے' اور جسے اقبالؒ نے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا تھا کہ

درجنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

میرے پیشِ نظر بھی کچھ ایسا ہی منظر ہے جسے آپ احباب کے سامنے بے نقاب لانا ضروری ہے۔

جن حضرات نے طلوع اسلام کی تحریک کا سطحی نظروں سے مطالعہ کیا تھا، ان کی طرف سے اب اس قسم کی آوازیں اٹھنی شروع ہوگئی ہیں کہ لیجیئے صاحب! طلوع اسلام جس معاشی نظام کی فکری اور نظری دعوت

دیتا تھا، اس کے لئے اب ملک میں عملی پروگرام شروع ہو گیا ہے، اس لئے تحریک طلوع اسلام سے وابستگان کو چاہیئے کہ وہ اس عملی پروگرام میں شریک ہوں یا کم از کم اس سے تعاون کریں۔ ان آوازوں کی سحر انگیزی کا نتیجہ ہے کہ وہ گرمجوش طبقہ جو تحریکِ طلوع اسلام سے متفق ہونے کا دعویدار ہونے کے باوجود شاکی رہتا تھا کہ طلوع اسلام کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتا — یعنی ان کے نزدیک فکری کاوشوں کو عمل نہیں کہا جا سکتا — عمل وہی ہے جس کی نمود ہنگاموں اور شورشوں سے ہو — وہ جذبات کی اس رَو میں تیزی سے بہے چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں ضروری ہے کہ ہم ذرا رک کر، قلبی سکون اور ذہنی توازن کے ساتھ حقائق کا جائزہ لیں۔

آپ احباب کو بخوبی معلوم ہے کہ طلوع اسلام، نظامِ سرمایہ داری کو اسلام کی ضد قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی اسی شد و مد سے واضح کرتا چلا آرہا ہے کہ روس یا چین کی سوشلزم کا معاشی نظام گو قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے، لیکن اس کے باوجود اُسے قرآنی (یا اسلامی) نظام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ دونوں کی بنیاد مختلف ہیں — اور دین کے نقطۂ نگاہ سے، اگر بنیاد کا اختلاف ہو تو بیرونی عمارت (SUPER - STRUCTURE) کی مماثلت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ آپ غور کیجئے کہ ہمارے ہاں (یعنی عالمِ اسلام میں) مروجہ نماز، روزہ، حج وغیرہ ارکان کی شکل و شباہت وہی ہے جو صدرِ اول میں تھی لیکن ان سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے جو اُس دور میں ظہور پذیر ہوتے تھے۔ اس لئے کہ ان اعمالِ حیات کی بنیاد وہ نہیں رہی جو اُس زمانے میں تھی — اقبالؒ کے الفاظ میں

سوشلزم اور اسلام

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

آج ہر مسلمان وہی کلمہ پڑھتا ہے جو صدرِ اول کے مسلمان پڑھتے تھے، لیکن اس کلمہ نے جو قیامت خیز انقلاب اُس دور میں برپا کر دیا تھا، آج ہم اس کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں لا سکتے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ کلمہ کے الفاظ تو وہی ہیں لیکن اس کی بنیاد وہ نہیں جو اُس دور میں تھی۔ وہ بنیاد، جس پر اعمالِ حیات کے اسلامی قرار پانے کا دار و مدار ہے، قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہلاتی ہے، اور ایمان نہ رام داس کی جگہ عبداللہ نام رکھ لینے کو کہتے ہیں نہ کلمہ کے الفاظ دہرا لینے کو۔ نہ یہ نماز، روزہ کی رسمًا ادائیگی کا نام ہے، نہ چند مقدس اصطلاحات اختیار کر لینے کا۔ ایمان، قلب اور دماغ کے کامل اطمینان کے بعد، صداقت کے اس طرح دل میں اتر جانے کا نام ہے جس سے انسان کی ذہنیت بدل جاتے۔ اس کے مقاصدِ حیات بدل جائیں۔ اس کی آرزوئیں بدل جائیں۔ اس کے قلبی تقاضے

بدل جائیں، اس کے جذباتی میلانات بدل جائیں. اس کی زندگی ایک خاص قالب میں ڈھل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ان بدوؤں کو جنہوں نے کلمہ پڑھ لینے کے بعد سمجھ لیا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ تم ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہو، اس لئے کہ وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ (۴۹/۱۴) ہنوز ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے، اور مسلمان ہونے میں جو فرق ہے اس کی وضاحت کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ (۲/۸) ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں لیکن وہ مومن ہوتے نہیں۔ وہ ان نمازیوں کو جو نماز کی مرئی حرکات و سکنات ہی کو صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور صلوٰۃ کی غرض و غایت سے بے خبر رہتے ہیں، نہ صرف بے نماز کہتا ہے بلکہ دین کی تکذیب کرنے والے قرار دیتا اور اس روش زندگی کا مآل تباہی اور بربادی بتاتا ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۔ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (۱۰۷/۴-۶)۔ حتیٰ کہ وہ اُس انفاق کو بھی جس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی، کوئی وقعت نہیں دیتا۔ آپ نے کیا سورۃ النسآء کی اس آیت پر کبھی غور کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (۴/۳۸) وہ لوگ جو مال و دولت خرچ کرتے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد دوسروں کی نگاہوں میں بڑا بننا ہوتا ہے، وہ درحقیقت خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ محض اتنی بات کہ کسی نظام کے اجزاء و تفاصیل، قرآنی نظام کے مماثل ہیں، اسے اسلامی نظام نہیں بنا سکتا۔ اور جب اس قدر مماثلت بھی اس نظام کو اسلامی نہیں بنا سکتی تو کسی تحریک یا نظام کے ساتھ محض "اسلامی" کا لفظ بڑھا دینا اسے کس طرح اسلامی بنا سکتا ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جماعتِ اسلامی نے اپنی تحریک، اپنی جماعت، اپنے ارکان، اپنے پروگرام کے چن چن کر اسلامی نام رکھ لئے، لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کی نسبت سے وہ جماعت فی الواقعہ اسلامی بن گئی اور اس کا نظام اسلامی ہو گیا؟ جب ان تمام مماثلتوں اور الفاظ کی نسبتوں کے باوجود، نہ یہ تحریک اسلامی قرار پا سکی نہ اس کا نظام دین کا نظام، تو ایک معاشی تحریک کو، محض اس بنا پر کس طرح اسلامی تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے معاشی ڈھانچے کے خط و خال قرآنی نظام کے مماثل ہیں اور اس نے اس کا نام "اسلامی" رکھ لیا ہے۔ ان تحریکوں کو اسلامی قرار دینے کے لئے ہمیں ظواہر کی مماثلت اور الفاظ کی نسبتوں سے زیادہ گہرائی میں جانا ہو گا۔ علامہ اقبالؒ نے

جب روس سے کہا تھا کہ تمہارا معاشی پروگرام بے شک قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے لیکن اس کے باوجود تمہارا نظام پائدار نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی عمارت "اساسِ محکم" پر استوار نہیں ہو رہی' تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم اگر سوشلزم کا نام اسلامی سوشلزم رکھ لو' تو اسے اساسِ محکم میسر آجائے گی۔ اس اساسِ محکم کے سلسلہ میں انہوں نے کہا تھا کہ جس طرح انسانی زندگی کو مختلف ٹکڑوں میں نہیں بانٹا جاسکتا — یہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، اسی طرح' اس کی زندگی سے متعلق نظام کے بھی حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ وہ ایک کلی نظام ہوگا جس میں سیاست معاشرت، تمدن' معیشت، تعلیم، تربیت وغیرہ تمام شعبہ ہائے حیات' سموئے ہوئے ہونگے۔ اس نظام کی بنیاد' وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر قائم ہوگی' اور اس عظیم عمارت کا بوجھ ان افراد کے کندھے اٹھا سکیں گے جن کے قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہوچکی ہوگی جو خدا اور آخرت پر ایمان کا فطری نتیجہ ہے۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کی آزادی اور پابندی کی حدود' خدا کی طرف سے عطا کردہ وحی کی رُو سے متعین کی جائیں۔ یہی قرآن کی رُو سے کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہے جس نے کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) جو لوگ زندگی سے متعلق معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے' تو انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق قوانین کی اطاعت بھی اگر طوعاً و کرہاً کی جائے تو وہ ایمان نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۴/۶۵) ان فیصلوں کی اطاعت اس طرح کی جائے کہ دل کی گہرائیوں میں بھی ان کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو — یہ ہے خدا پر ایمان کا قرآنی مفہوم۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کیفیت قلب و نگاہ کی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں — اور آخرت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی' اسی طبیعی زندگی کا نام نہیں۔ انسان' اپنے طبیعی جسم کے علاوہ' ایک اور شے کا بھی حامل ہے' جسے اس کی ذات (نفس) کہا جاتا ہے۔ اگر اس کی ذات کی مناسب نشو و نما ہو جائے تو یہ طبیعی جسم کی موت سے بھی نہیں مرتا۔ اس کی ذات' زندگی کے اگلے مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ اس کی نشو و نما' مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے' جس کی ایک بنیادی شق یہ ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان اپنے استعمال میں لاتا ہے' اس کی ذات کی نشو و نما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتا ہے۔ اور اسی سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اگر انسانی اعمال کے نتائج اس زندگی میں سامنے نہیں آتے تو اس سے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہاں نہ سہی' مرنے کے بعد سہی — زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود —

یہ تھی وہ اساسِ محکم جس کے لئے علامہ اقبال' نے روس سے کہا تھا کہ

داستانِ کہنہ شُستی باب باب
فکر را روشن کن از امّ الکتاب

اور یہی طلوع اسلام کا پیغام ہے ہر اس تحریک اور تحریک کے داعیان اور متبعین کے لئے، جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ خواہ وہ اقامتِ دین کی اصطلاح سے متعارف ہو اور خواہ اسلامی سوشلزم کے نام سے موسوم — کہ اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرنے کا حق صرف اس تحریک کو ہو سکتا ہے جس کی بنیادیں اس

مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ

ایمان پر استوار ہوں جسے قرآن نے ہر عملِ صالح کی اولین شرط قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان کی اہمیت اس قدر ہے کہ وہ اصطلاحی مسلمانوں سے بھی تقاضا کرتا ہے کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ .... (۴/۱۳۶)۔ اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے — مسلمانوں سے ایمان لانے کے مطالبہ سے مراد یہی ہے کہ اپنا یا اپنی تحریکوں کا نام اسلامی رکھ کر، اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ ہم مؤمن ہو گئے ہیں اور ہماری تحریکیں فی الواقعہ اسلامی۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی اس فریب میں مبتلا رکھے چلے جا رہے ہیں، اور دوسروں کو بھی یہ فریب دیئے جا رہے کہ محض چند الفاظ کی تبدیلی سے مملکتیں اور تحریکیں اسلامی بن جاتی ہیں۔ جب پاکستان اسمبلی نے قرار دادِ مقاصد پاس کی تھی تو جماعتِ اسلامی نے اعلان کر دیا تھا کہ اب مملکت مسلمان ہو گئی ہے، اور اب وہ یہاں، کسی ایک فرقہ کی فقہ نافذ کر دینے سے یہ احساس دلا رہی ہے کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح کچھ دوسرے لوگ یہ سمجھ اور سمجھا رہے ہیں کہ موجودہ معاشی نظام کے ڈھانچے کی جگہ ایک دوسرے نظام کا ڈھانچہ قائم کر دینے سے، ملک میں اسلامی نظامِ معیشت رائج ہو جائیگا۔

طلوع اسلام نہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے، اور نہ ہی اُن حضرات کو جو اس تحریک سے وابستہ ہیں یا اس سے متفق۔ اس التباس میں مبتلا — اس کے ساتھ ہی وہ ان حضرات سے، جو ملک میں مختلف تحریکوں کے داعی ہیں، یہ گزارش کرنا چاہتا ہے کہ وہ موجودہ نظامِ مملکت میں جس قسم کی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، اس کے لئے وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہیں کریں، لیکن اپنی تحریکوں کو اسلامی کہہ کر نہ پکاریں۔ اس لئے کہ اس سے، علاوہ دیگر امور، ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوگا کہ جب ان کا نظام ناکام رہے گا — اور یہ ظاہر ہے کہ ہر وہ نظام جو قرآن کی اساسِ محکم پر استوار نہ ہو، ناکام رہے گا — تو (جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے) دنیا یہ کہے گی کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسان کو کوئی محکم نظام دے سکے۔

باقی رہے وہ گرمجوش حضرات (جو بیشتر نوجوانوں کے طبقہ پر مشتمل ہیں۔ اور) جو ان ہنگامی تحریکوں میں

شامل ہو کر اپنے تند و تیز جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا چاہتے ہیں' وہ ان میں شوق سے شامل ہوں' لیکن یہ کہہ کر اپنے آپ کو یا دوسروں کو مبتلائے فریب نہ کریں کہ وہ تحریک' اُس اسلامی نظام کے حصول کیلئے عملی اقدام ہے جس کی دعوت طلوعِ اسلام دیتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت' جو قلبِ نگاہ کی تبدیلی کی دعوت ہے' پہلے بھی ملک کی دیگر تحریکات سے الگ اور منفرد دعوت تھی' اور آج بھی اسی طرح الگ اور منفرد دعوت ہے۔ جہاں تک بزمہائے طلوعِ اسلام کے ارکان کا تعلق ہے' دستوراساسی کی رُو سے' کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا اور طلوعِ اسلام عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیتا۔ لہٰذا' اگر کسی بزم کا کوئی رکن کسی ہنگامی سیاسی تحریک میں حصہ لینا چاہیے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ بزم کی رکنیت سے مستعفی ہو جائے۔ البتہ ہم ان سے جاتے جاتے اتنا ضرور کہیں گے کہ

اُتر تو سکتے ہو پار لیکن مآل پر بھی نگاہ کر لو
خدا نکردہ سکوتِ ساحل نہ راس آیا تو کیا کرو گے

طلوعِ اسلام کی تحریک' فکری تحریک ہے۔ یہ شروع ہی سے فکری تھی اور جوں جوں ہنگامی تحریکوں کے تجربات سامنے آتے جاتے ہیں' یہ حقیقت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی جاتی ہے کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے' ہنگاموں سے نہیں۔ اس سے ہمارا یہ یقین اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ طلوعِ اسلام کی تحریک حق و صداقت پر مبنی ہے۔ اسے ہنگاموں اور شورشوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ ہمارا مطمحِ نگاہ ان سے کہیں بلند ہے۔

فضا کی پہنائیوں کی تسخیر اپنی تقدیر بن چکی ہے
ہمارا مقصد فقط چمن میں نمائشِ بال و پر نہیں ہے

(۰)

کنونشن کا تحفہ

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے' امسال کنونشن کا تحفہ' مفہوم القرآن کی طباعت کی تکمیل ہے۔ گزشتہ تین سال کے صبر آزما اور جگر گداز تعطل کے بعد' اس سلسلۂ زریں کا تکمیل تک پہنچ جانا' چمنِ خزاں دیدہ میں بہاروں کا لوٹ آنا ہے۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔

مفہوم القرآن (اور اس کے ساتھ لغات القرآن) میری قرآنی فکر کا ماحصل ہیں' اور مبدارِ فیض کی کرم گستری سے انہیں جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے' اس سے یہ توقع بندھتی ہے کہ یہ شمعیں میرے مرنے کے بعد بھی تا دیر روشن رہیں گی۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہماری فضا کے مقابلہ میں مغرب کی سرزمین' فکرِ قرآنی کی تخم گیری کے لئے زیادہ سازگار ہے اس لئے میں نے مفہوم القرآن کا انگریزی ترجمہ بھی مکمل کر رکھا ہے۔ میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اس کی طباعت کا مرحلہ خاصا ساماں طلب ہے' اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا موقعہ کب آتے۔ بہرحال' جو کچھ

میرے امکان میں تھا' وہ میں نے کر دیا ہے۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔

(٥)

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

آج کی اس محفل میں' عزیزانِ من! میری یہ حالت رہی کہ — جگر میں ٹیس' لب ہنسنے پر مجبور۔ میں چاہتا تھا کہ درد و غم کے جس قطرہ کو میں سینے میں دبائے بیٹھا تھا وہ طوفان بن کر نہ اُمنڈ پڑے۔ لیکن

دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج

نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

میرے غمخوار رفیقو! آج کی محفل میں میری آنکھیں اُس جان سے بھی زیادہ عزیز' غمگسار دوست کو تلاش کرتی رہیں جس کی تلاش اب میری بقیۃ العمر کی سرگذشت ہو گی۔ آپ پہچان گئے ہوں گے کہ ہمارے قافلۂ بہار کا وہ طائرِ پیش رس کون تھا جو ہم سے یوں بچھڑ گیا —

سمجھنے والے بالآخر سمجھ ہی جائینگے ہزار اشک پیئے کوئی لاکھ چاک سیئے

آہ! عبدالحکیم خان —

تاباں تھیں جن سے غمکدۂ جاں کی وسعتیں

پلکوں پہ وہ چراغ سرِ شام بجھ گئے

ہماری یہ قرآنی محفلیں زندہ و پائندہ رہیں گی — خدا انہیں ہمیشہ تابندہ و درخشندہ رکھے۔ کہ ان کا مدار شخصیتوں کی طبیعی زندگی پر نہیں۔ لیکن عبدالحکیم خان نے جو نشست خالی کی ہے وہ ہمیشہ خالی رہے گی۔

فروغِ شمع جو اے' رہیگا صبحِ محشر تک

مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

آیئے ہم اُس رفیقِ محترم کی یاد میں دعا کریں کہ لیلائے قرآنی کے اس مجنوں نے سرحد کے دشت و جبل میں حق کی جو آواز بلند کی تھی وہ ایک قافلۂ نو کے لئے بانگِ رحیل ثابت ہو۔ جن راہوں میں اس نے اپنے آنسو بکھیرے تھے وہ راہیں سدا آباد رہیں۔ اور اس کی پاکیزہ زندگی کی جوئے رواں' جنت الفردوس کے چمن زاروں کی شادابیوں میں اضافہ کا موجب بنے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

والسّلام

باسمہٖ تعالیٰ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!

پاکستان کی عوامی تحریکوں کا بے لاگ تجزیہ

پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے خطاب کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!

صدر گرامی قدر و عزیزانِ محترم۔ سلام و رحمت!

حیوان اور انسان میں ایک (اور میرے نزدیک سب سے اہم 'بنیادی) فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیتوں سے نواز گیا ہے۔ حیوان کے ہر عمل کا جذبہ محرکہ، جبلی تقاضا (Instinctive urge) ہوتا ہے — اسی کو آگے بڑھ کر انسان کے معاملہ میں 'جذبات' سے تعبیر کیا جاتا ہے — حیوانات کے برعکس، انسان کے سامنے جب کوئی معاملہ آئے تو اس کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کرے، اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا 'دلائل و براہین کی رُو سے' موازنہ کرے۔ تجربات اور مشاہدات کے فراہم کردہ نتائج کو سامنے رکھ کر اس کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالے اور اس طرح 'امکان بھر کے تدبر و تفکر کے بعد' نہایت ٹھنڈے دل سے کسی فیصلے پر پہنچے۔ حیوان کے پیشِ نظر مقصد کے راستے میں جب کوئی موانعات آتے ہیں تو اس کے جذبات میں شدت آجاتی ہے — بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اس کا غصہ تیز ہو جاتا ہے — اس لئے کہ اُس کے پاس' اس کے علاوہ، مدافعت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ جب اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوں تو ان پر اور بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرے اور کامل سکون و اطمینان سے ان کا حل سوچے۔

حیوانات کے جبلی تقاضوں پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عاید ہوتا ہے — بڑے سے بڑا خونخوار درندہ بھی' جب تک اسے اپنی حفاظت کے متعلق کسی خطرہ کا احساس نہ ہو' یا اسے بھوک نہ ستائے' کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ جب کسی بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اُسے اِس کی پرواہ نہیں رہتی کہ باقیماندہ چارہ کون کھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ حیوانات کا جنسی تقاضا بھی — جو جبلی تقاضوں میں شدید ترین تصور کیا جاتا ہے — فطرت کے اشارے کے بغیر بیدار نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کے جبلی تقاضوں' یعنی جذبات پر' فطرت نے اپنا کنٹرول عاید نہیں کیا۔ اسے اپنے جذبات پر خود کنٹرول عاید کرنا پڑتا ہے اور یہ کنٹرول عقل و فکر کی رُو سے

فطرت کا کنٹرول نہیں

ہی عاید کیا جا سکتا ہے۔ لہذا، عقل و فکر اور دانش و بینش باعثِ شرفِ آدمیت اور موجبِ جوہر انسانیت ہے اور جبلی تقاضوں (جذبات) کی بیباکی حیوانیت سے بھی پست سطح زندگی کی مظہر۔

جہاں تک طبیعی قوتوں کا تعلق ہے انسان حیوانات کے مقابلہ میں بڑا کمزور واقعہ ہوا ہے — نہ اسے ہاتھی جیسی طاقت حاصل ہے نہ شیر جیسی قوتِ درندگی۔ نہ یہ ہرن جتنا تیز دوڑ سکتا ہے نہ عقاب جیسا بلند اُڑ سکتا — لیکن وہ ان تمام حیوانات کو اپنی عقل و فراست کے زور سے مغلوب اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

فطرت کی طرف سے سب انسان یکساں واجب التکریم پیدا ہوتے تھے لیکن جب انسانی معاشرہ میں میری اور تیری کی تفریق و تخصیص پیدا ہوئی تو اُن لوگوں نے جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود فراموش اور اپنے جذبۂ حرص و آز کو قیود ناآشنا بنانا چاہتے تھے، اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (Exploit) کیا جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ عقل و فکر سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرماں پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل و فکر سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج اور رفتہ رفتہ مغلوب کر دیا جائے — عزیزانِ گرامی قدر!

عقول کی جنگ

آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانوں میں باہمی کشمکش . . . . یعنی عقول کی جنگ Battle of wits مسلسل چلی آ رہی ہے۔

حاکم و محکوم، آمر و مامور، مطاع و مطیع، مقتدی و مقتدی، آجر و مستاجر، محتاج و مستغنی کی تفریق و تمیز اسی کشمکشِ پیہم کے مختلف مظاہر ہیں۔ جو زیادہ زیرک اور چالاک تھے انہوں نے ایسے انداز اور طریقے وضع کئے جن سے اُن لوگوں کو جو نسبتاً کم عقل و فہم کے مالک تھے، اپنے دامِ تزویر میں لے آئے، اور اس طرح گوشۂ سیاست میں حاکم و آمر، دنیائے مذہب میں مطاع و مقتدیٰ اور جہانِ معیشت میں ربکم الاعلیٰ اور اُن داتا بن بیٹھے۔ اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ محکوم و مطیع و محتاج طبقہ کی فکری صلاحیتیں ابھرنے نہ پائیں۔ اس نظام کو جس کی رُو سے انسانوں کی عقل و فکر کے چراغ گُل کئے جاتے ہیں مذہب کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسے مذہب کہتے ہیں

آپ اس لفظ کو سن کر شاید چونک اٹھیں کیونکہ مذہب کا تصور تو عام طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے — مذہب نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔ یہ تو مذہب کا ایک گوشہ ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع بنائے مذہب کہلاتا ہے، خواہ وہ دہریت ہی کا نظام کیوں نہ ہو۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔ وہ

سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت بھی حاصل کیوں نہ ہو — کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ — یہ دین کا سب سے پہلا اعلان ہوتا ہے جسے وہ بغرضِ اختصار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے نظریۂ حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جب دنیائے انسانیت میں ایسا عظیم انقلاب لائے گا تو وہ سب سے پہلے اس اصل و بنیاد کو اکھیڑے گا جس پر انسانی تغلب، استبداد اور استحصال کی عمارت استوار ہوتی ہے — یعنی فرعونیت (سیاسی استبداد) ہامانیت (مذہبی اقتدار) اور قارونیت (معاشی استحصال) کی عمارت — وہ اُن اغلال و سلاسل کو توڑے گا جن میں انسانی عقل و فکر کو جکڑ دیا گیا تھا۔ اور اُن برفانی سلوں کو اٹھا کر پھینک دے گا جن کے نیچے عقل و شعور کو دبا کر مفلوج کر دیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے جب حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷) تو اس کا مفہوم یہی تھا یعنی انسانوں کو ان شکنجوں سے آزاد کر کے وہ ایسا انتظام کرے گا کہ اس کی فکری صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی بلند سے بلند تر ہوتی جائیں تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم و مطیع بنا کر، ان کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔ آپ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔

دینِ خداوندی

عقل و فکر کی عظمت

آپ کو اس کے ورق ورق پر عقل و شعور کی اہمیت اور فہم و فراست کی عظمت، تابندہ حروف میں لکھی ملے گی۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ آؤ! تمہیں بتائیں کہ جہنم کے مستحق کون سے لوگ ہیں۔ وہ کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ جو سینے میں دل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں لیکن عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ یہ لوگ انسان نہیں، حیوانات کے مانند ہوتے ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (۷/۱۷۹) اسلئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کا داروغہ پوچھے گا کہ تم کس جرم کی پاداش میں یہاں آگئے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اس جرم کی پاداش میں کہ جو لوگ ہم سے عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہتے تھے، ہم ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔ (۶۷/۱۰) اگر ہم

ان کی بات سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہل جہنم میں کیوں ہوتا۔ سورۃ یٰسین میں ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ اپنے بیباک جذبات کے پیچھے نہ لگنا اور عقل و فکر سے کام لینا۔ تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ جہنم ہے جس سے تمہیں پہلے ہی متنبہ کر دیا گیا تھا۔ (۳۶/۶۳) آسمانی انقلاب کے اس پیامبرِ عظیم نے اپنی دعوت پیش کی تو کہا کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸) میں جو تمہیں خدا کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔ تم اس پر عقل و فکر کی رُو سے غور کرو۔ علم و بصیرت کی روشنی میں اسے پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جاؤ تو قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کا اعتراف کرو (اسے ایمان کہا جاتا ہے) اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں، جبر و استبداد نہیں۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹)

دین میں جبر نہیں

اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ (۲/۲۵۶) تو اس کے یہی معنی نہیں کہ اسے تم سے بزورِ شمشیر نہیں منوایا جائے گا۔ یہ تو جبر و اکراہ کی ایک شکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جور و اکراہ یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کو مفلوج کرکے کسی سے کوئی بات منوائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اپنے آپ کو فوق الفطرت معجزات اور محیر العقول کرامات کے زور سے نہیں منواتا۔ قرآن کے اولین مخاطب، جو مذہب کے خوگر تھے، رسول اللہ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہے اور حضورؐ ان سے ہر بار یہی فرماتے رہے کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر دیکھو کہ میری دعوت، حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کرکے تم سے اپنی بات منوالوں۔ تم عجیب قسم کے انسان ہو؟ چنانچہ آپؐ ان سے تاکیداً فرماتے کہ انسانی زندگی کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۔ (۱۷/۳۶) سماعت، بصارت اور فہم و ادراک، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری تحقیق کے بعد ایسا فیصلہ کیا تھا؟ رسول اللہ اپنی دعوت کو عقل و بصیرت کی رُو سے پیش فرماتے اور اپنے مخالفین سے کہتے کہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (۲/۱۱۱) تم اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ دھاندلی سے نہ میں کوئی بات منوانا چاہتا ہوں، نہ تم منواؤ۔ میں بھی اپنی بات کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتا ہوں، تم اگر اسے رد کرتے ہو تو تم بھی دلیل و برہان کی رُو سے ایسا کرو۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ سبا کی ایک

سوچا کرو

آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور اگر کہا جائے کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرمؐ عمر بھر اپنی دعوت کو پیش کرتے رہے۔ اس کے لئے آپؐ نے مختلف طرق و اسالیب اختیار فرمائے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس تعلیم کی وسعتیں حدود فراموش اور اس کے موضوع قیود ناآشنا ہیں۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ اس قسم کی تعلیم کا مبلغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات۔ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی ہوگی۔ وہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا نچوڑ آجائے ــ ظاہر ہے کہ ایسی بات سننے کے لئے ہر مخاطب آمادہ ہوجائے گا۔ اسکے بعد آپؐ اُن سے کہتے ہیں کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ۔ اس بات کے سننے کے لئے اگر تم سب کے سب رُکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کرکے ہی رُک جاؤ اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ جب آپؐ نے اس طرح ان کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو فرمایا کہ وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶)۔ تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ عقل و بینش سے کام لیا کرو۔ بس یہی تھی وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو میرا مرحلہ آسان ہوگیا۔

مومن کسے کہتے ہیں

آپ کو عزیزانِ گرامی قدر! معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مومن کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ یعنی وہ خصوصیت جس کے بغیر ایک انسان 'مومن' نہیں کہلا سکتا۔ سنیئے اور غور سے سنیئے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ۔ (۲۵/۷۳) مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے ــ یہ ہے مومن کی بنیادی خصوصیت ــ ہمارے ہاں، ــ عزیزانِ من! لفظ ایمان کا انگریزی زبان میں ترجمہ (Faith) کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایمان (Faith) یعنی اندھی عقیدت نہیں۔ یہ اُس اعترافِ حقیقت کا نام ہے جو دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد عقل و فکر کی رُو سے کیا جائے۔ اسے آپ (Conviction) کہہ سکتے ہیں۔ مذہب کی بنیاد (Faith) یعنی اندھے یقین پر ہوتی ہے۔ دین علیٰ وجہ البصیرت By conviction اختیار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا

اور دین یہ کہتا ہے کہ سالک تو ایک طرف، تم خدا کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہ مانو۔ اس سے واضح ہے کہ دین، درحقیقت مذہب کیخلاف چیلنج ہے۔ ضمناً اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ میں نے اپنی کتاب کا نام جو (Islam: A Challenge To Religion) رکھا تھا تو وہ قرآن ہی کی پیش کردہ حقیقت پر مبنی تھا۔

قرآن کریم نے جذبات، عقل اور وحی کے تعلقات کو دو آیات میں اپنے مخصوص حسنِ ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ سورۂ جاثیہ میں ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ.

جذبات، عقل اور وحی

کیا تو نے اس شخص یا اس قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ وہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً۔ اور اس کے سننے، دیکھنے، سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ...... (۴۵/۲۳) جو اس طرح جذبات سے مغلوب ہو جائے اسے صحیح راستہ کون دکھا سکتا ہے۔ یعنی جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اور اس کی فکر و دانش کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ تم تاریخ کے اوراق پر غور کرو۔ اس میں تمہیں ایسی قومیں دکھائی دیں گی جو بڑی بڑی وسیع و عریض سلطنتوں کی مالک تھیں۔ نہایت درخشندہ و تابناک تہذیب کی حامل تھیں، علم و فضل میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنے علم و عقل کو مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھا فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ۔ (۴۶/۲۶)، جب انہوں نے اقدار و قوانینِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی تو ان کا علم و بصیرت ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ تباہی کے جہنم میں جا گریں۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹنے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے زمانے میں اقوامِ مغرب کی حالت اس کی شاہد ہے۔ علم و عقل کا یہ عالم کہ اس سے پہلے کوئی اور قوم شاید ہی اس بلندی تک پہنچ پائی ہو، اور اس کے باوجود جہنمی زندگی کی یہ کیفیت کہ شاید ہی کوئی قلب ایسا ہو جسے اطمینان نصیب ہو۔ یہ اس لئے کہ ان اقوام نے اپنے حیوانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع نہیں رکھا اور عقل و بصیرت سے مستقل اقدارِ خداوندی کی روشنی میں کام نہیں لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں عصرِ حاضر کے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کا اساسی اصول یہ ہے کہ انسانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع رکھا جائے اور عقل و بصیرت سے اقدار و قوانینِ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے جو وحی کی رُو سے عطا ہوتے ہیں۔

(۰)

دین کا نظام

یہ تھا وہ دین جو خدا نے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے دیا تھا۔ اس کی روشنی میں حضور نبی اکرمؐ نے ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں (۱) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں تھا۔ اس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ (۲) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں تھا۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھے۔ (۳) اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم کر دیا گیا تھا۔ اور (۴) انسانی عقل و فکر پر وحی کی مستقل اقدار کے علاوہ اور کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سے انسانی فکر کو اپنی نشو و نما کے پورے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔ آسمان کی آنکھ نے، صفحۂ ارض پر اس سے زیادہ انسانیت ساز دور اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اور کیفیت یہ تھی کہ:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

دین کی جگہ مذہب

یہ نظام تھوڑی دور چلا تھا کہ استحصالی قوتوں (Forces of exploitation) نے پھر سر اُبھارا اور رفتہ رفتہ دین کی جگہ پھر سے مذہب نے لے لی۔ میں اس وقت، عزیزانِ من! اس تاریخی تحقیق کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ اس تبدیلی کے اسباب و علل کیا تھے۔ یہ بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے۔ اور اگر میں نے اسے اس مقام پر چھیڑا تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا بلکہ قلتِ وقت کی بنا پر دونوں موضوع تشنہ رہ جائیں گے۔ (جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری تصنیف — سلیمؑ کے نام — میں وہ خط ملاحظہ فرمائیں جس کا عنوان ہے — اسلام آگے کیوں نہ چلا؟) بہرحال، سلطنت مذہب کی قوتیں پھر

ابھریں اور دین کے خلاف نبرد آزما ہوگئیں۔ ان کے پیش نظر اولین مقصد یہ تھا کہ عقل و فکر کی شمعیں گل کر دی جائیں۔ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا گیا؟ یہ پھر تاریخی تفصیل ہے جس میں میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت میں صرف اتنا اشارہ کرکے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ وہ جسے ہماری تاریخ میں اشاعرہ اور معتزلہ کی کشمکش کو یوں بیان کرکے آگے بڑھایا جاتا ہے گویا وہ دو فرقوں کے عقائد کی آویزش تھی، وہ درحقیقت مذہب اور دین کی وہی کشمکش تھی جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ مذہب کے پاس دلیل و برہان تو ہوتی نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ لیبل تراشی ہوتا ہے۔ وہ ایک لیبل وضع کرتا ہے اور مسلسل پراپیگنڈہ سے اسے اس قدر گھناؤنا اور نفرت انگیز بنا دیتا ہے کہ وہ جس پر اسے چسپاں کر دے، عوام اس کے خلاف اُمنڈ پڑتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے اس قسم کی لیبل تراشیوں نے کس قدر تباہیاں مچائی ہیں، اس کے لئے تاریخ میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تین چار صدیاں پہلے، یورپ کی اس تاریخ کا سامنے لانا کافی ہوگا جس میں مذہب اور عقلیت (Rationalism) کی معرکہ آرائیاں انسانیت کے خون سے لکھی ملتی ہیں۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا ہے جب جہالت عملاً میدان میں آجائے۔ مذہب کی عقل پرستی کے خلاف جنگ اسی قسم کے وحشت و بربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو اور فریق مقابل کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔ ہماری تاریخ میں بھی، عقل و فکر اور علم و بصیرت کے چراغ گل کرنے کے لئے اسی قسم کے جھگڑے چلے۔ اس میں افراد کے ساتھ کیا ہوا، اسے تو چھوڑیئے، انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں کی کتابوں کا ایک ایک ورق تلف کر دیا گیا۔ جب اس بحران میں ذرا کمی ہوئی تو رہی سہی کسر تصوف کی

تصوف اور عقل

برفانی سلوں نے پوری کر دی۔ تاریخ فلسفہ سے واقف حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ تصوف (خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی پیکر میں جلوہ فرما ہو) درحقیقت افلاطون کے اسی نظریہ کی صدائے بازگشت ہے جس کی رُو سے اس نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل شدہ علم، قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ قابلِ اعتماد وہی علم ہے جو باطنی طور پر حاصل ہو۔ اس طرح مذہب اور تصوف، دونوں نے مل کر، علم و عقل کے چراغ گل کر دیئے اور اس کا نام دین کی خدمت رکھا۔ لاک نے کہا تھا کہ جو لوگ وحی کا چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دیئے بجھا دیتے ہیں، وہ درحقیقت عقل اور وحی دونوں کے چراغ گل کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی نمایاں مثال ہے۔ یہاں عقل و فکر کے چراغ گل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں، ان سے یہ چراغ تو گل ہوتے ہی تھے، ان کے ساتھ ہی قرآن جیسی قندیل جہاں تاب بھی ان کی توہم پرستیوں اور افسانہ طرازیوں کے فانوسوں میں اس طرح چھپی کہ اس کا صرف نام زبانوں

پھر باقی رہ گیا۔

(۰)

میں ابھی ابھی برادرانِ گرامی قدر! ان معرکہ آرائیوں کا ذکر رہا تھا جو گزشتہ چند صدیوں میں یورپ میں عقل اور مذہب کے مابین ظہور میں آئیں۔ اس کشمکش میں بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے عقل پرستی کی تحریک کامیاب ہو اور مذہب کو گرجوں کی پناہ گاہوں میں دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کا وہاں یہی حشر ہوا لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے' مذہب' صرف مزعومہ " خدا پرستی " کا نام نہیں۔ مذہب' ہر اس تحریک کو کہتے ہیں جو علم وعقل کے چراغ گل کرنے کے لئے اٹھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مذہب بڑا سخت جان واقع ہوا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ ابلیس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کی مہلت دے دی گئی ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے کسی ایک پیکر کو شکست ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے پیکر میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات

یورپ میں عیسائیت کو شکست ہوئی تو مذہب ایک اور لبادہ اوڑھ کر مقابلہ میں آگیا۔ اس کے اس جدید لبادہ کا نام' عوامی تحریک یا (Mass Movement) ہے۔ جس طرح

عوامی تحریک

دورِ حاضر کے آلاتِ جنگ' سابقہ زمانوں کے آلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں' اسی طرح مذہب کا یہ جدید لبادہ' اس کے سابقہ پیکروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہیب اور تخریبی ہے۔ نازی ازم' فاشی ازم' کمیونزم' وغیرہ عوامی تحریکات' مذہب کے انہی جدید لبادوں کا نام ہے میں سمجھتا ہوں' انہیں تحریک کہنا غلطی ہے۔ انہیں ہنگامہ' یا شورش یا ہیجان (Agitation) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تحریک تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے ___ یعنی کاروانِ انسانیت کا عقل اور وحی کی روشنی میں' آہستہ آہستہ' نسیمِ سحری کی خوش خرامیوں کے ساتھ اپنی متعینہ منزل کی طرف بڑھتے چلے جانا ___ تحریک صرف یہی کہلا سکتی ہے۔ باقی سب' جذباتی تلاطم خیزیوں کی وقتی ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں جو سیلاب کی طرح امنڈتی ہیں اور چند دنوں کی قیامت خیز تخریب کے بعد وقت کے سمندر میں جا ڈوبتی ہیں ___ یہی وہ ہنگامے ہوتے ہیں جن کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لیکن یورپ کی یہ تحریکیں (یعنی مشتعل اور بیباک جذبات کے طوفانوں پر مبنی شورشیں) بڑی ہمہ گیر تھیں۔ دوسرے اس دور میں عام وسائل رسل و رسائل کی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا کا کوئی حصہ بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جب ان کے اثر و نفوذ کی عالمگیریت کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس سے کیسے غیر متاثر رہتے ــــ اور اصل تو یہ ہے کہ مسلمان اس قسم کی جذباتی تحریکوں کی زد میں سب سے پہلے آنے والی قوم تھی۔ ان کے ہاں صدیوں سے مذہب، یعنی عقل و فکر کے خلاف جذبات پرستی کا دور دورہ تھا۔ یہ تو وہ "بھک سے اڑنے والا مادہ (Explosive) تھا جسے صرف فتیلہ دکھانے کی دیر تھی کہ وہ شعلۂ جوالہ بن جاتا۔ آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر طائرانہ نگاہ

ہندی مسلمانوں کی زندگی

ڈال لیجئے۔ اگر آپ اس مطالعہ کی ابتدا جنگ بلقان اور طرابلس سے کریں؛ ۱۹۳۵-۳۶ء تک اس کے ساتھ ساتھ چلے آئیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی؛ آتشِ سیال کا طوفانی دریا تھا جو ذرا ذرا سے اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی شعلہ فشانیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان شرر باریوں سے اس کے ماحول میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہی راکھ کا ڈھیر پھر ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری فضا کو طوفان آمیز کر دیتا۔ اس طوفانِ بلاخیز کی برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہانِ ناسازگار کے محکم ترین قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر انہیں خس و خاشاک کی طرح نذرِ باد کر دیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو جاتا کہ یہ طوفان انگیزی بس بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر خاموش ہو گیا لیکن اس کے بعد اس کی یہ خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تازہ تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ بے کراں سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں محسوس ہوتا گویا اس جہانِ پیر کی موت قریب آگئی ہے اور اس سیلِ بے پناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد یہ مضطرب بیقرار موجیں باہمد گر ٹکرا کر غرقِ دریا ہو جاتیں اور سطحِ آبِ پران کا نقشِ قدم تک دکھائی نہ دیتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ صدیوں کی مذہب پرستی سے اس کی عقل و فکر کی صلاحیتیں شل ہو چکی تھیں۔ اور یہ ہمہ تن جذبات بن کر رہ گئی تھی۔ سرسید نے ــــ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا! ــــ تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی لیکن مذہب پرستی کے جھکڑوں نے انہیں چراغِ تہِ داماں بنا دیا ــــ اقبالؒ نے جب اس قوم کی ان بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بلا تعینِ منزل صحرا نوردیوں پر نگاہ ڈالی

اقبال کا پیغام

تو اس کے دلِ درد مند سے اِک ہوک اٹھی اور اس نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں، اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا

اور قوم کو اس پر متانت اور سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن قوم جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدانِ راہِ حیات کی اس صدائے رحیل کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اسے ایک شاعر کا تخیل اور دیوانے کا خواب کہہ کر حوالۂ طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ آرائیوں میں منہمک ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے آغاز میں قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ

> اگر ان حالات میں ہمارے لیڈروں نے قوم کے لئے کوئی متعین راہِ عمل تجویز نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادثِ زمانہ کے سیلِ بے پناہ میں بلا سوچے سمجھے کود پڑے گا۔

اقبالؒ نے کہا کہ ایک طرف سے یہ آواز آتی ہے تو دوسری طرف سے ایک نوجوان انتہائے جوش و خروش میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ

> ان شورش انگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے ــــ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں فکری صلاحیت نہیں رہتی وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

ان کے اپنے الفاظ جو میرے خیال میں آج پاکستان کے ہر در و دیوار پر تا بندہ حروف میں لکھ دینے چاہئیں یہ تھے کہ (Where there is no vision people perish) اقبالؒ کی یہ آواز بظاہر قوم کی ہنگامہ آرائیوں کے نقار خانہ میں گم ہو کر رہ گئی، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ــ (No true voice is ever lost) حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی ــــ تو ایک ایسا کان بھی تھا جس نے ان ہنگاموں سے دور بیٹھے اسے سُنا۔ اور اپنے صدفِ قلب

قائدِ اعظمؒ

میں محفوظ رکھ لیا۔ یہ تھا قائداعظم محمد علی جناحؒ ——— وہ محمد علی جناح' جو فکر و تدبر کا مجسمہ، متانت و سنجیدگی کا پیکر، صداقت و دیانت کا فشردہ' اور اقبالؒ کی اس مقدس دعا کی حسین آئین تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ

سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا
با اضطرابِ موج' سکونِ گہر بدہ

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہنگامہ آرائی اور شورش انگیزی کا شائبہ تک نہ تھا جو قرآنی فکر کی روشنی میں' سکوتِ دریا میں بط کی سی خاموشی کے ساتھ' جانبِ ساحلِ منزل رواں چلی جارہی تھی ——— مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار ——— اس کا نتیجہ تھا کہ اس سے' دس سال کی قلیل ترین مدت میں' ایک قطرۂ خون بہائے بغیر ——— حتیٰ کہ کسی کو ایک گالی تک دیئے بغیر ——— پاکستان جیسی وسیع و عریض مملکت حاصل کرلی گئی اور اس طرح ثابت کرکے دکھا دیا گیا کہ قوموں کی تعمیر' فکر سے ہوتی ہے' ہنگاموں سے نہیں۔ اور اس قسم کی فکری تحریکیں ان قائدین کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں' جن کی کیفیت یہ ہو کہ

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

———(۰)———

اس طرح یہ فکری تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن جس طرح یورپ میں' مذہب نے اپنی شکست خوردگی کے بعد' عوامی تحریکوں کا پیکر اختیار کیا تھا، بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی' وہ مذہب' جو تحریکِ پاکستان کے دوران کونوں کھدروں میں چھپ گیا تھا، پاکستان میں ایک منظم عوامی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا اور اپنے آپ کو اقامتِ دین کے داعی' اور اسلامی نظام کے علمبردار' کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

پاکستان کی عوامی تحریکیں

اس تحریک نے اپنے نظریات اور تنظیمی پروگرام کو کس طرح یورپ کی عوامی تحریکوں سے مستعار لیا تھا' اس کا اندازہ خود ان کے اپنے بیانات سے لگ سکتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد اپنی اسٹیٹ قائم کرنا تھا۔ وہ اسٹیٹ کس قسم کی ہوگی اس کے متعلق امیر جماعت اسلامی' مودودی صاحب' اپنی کتاب' اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں لکھتے ہیں۔

اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کرسکتا۔
یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے

یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے

ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ وہ انہیں اطمینان دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

فاشستی تحریکوں کے قدم قدم

> جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لیکر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف تیس لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے سترہ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت تین لاکھ تھی۔ مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار لاکھ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔
> (ترجمان القرآن۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ ص)

آپ نے خود فرمایا کہ اس تحریک نے کس طرح اپنے نظریات اور تنظیمی پروگرام کو یورپ کی فاشسٹ۔ نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیا تھا۔ ان پارٹیوں کی طرح ان کے پیشِ نظر بھی قوت کے ذریعہ حکومت چھین کر اپنا سلطنت قائم کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے کہتے ہیں کہ اسلام اپنے متبعین سے کہتا ہے کہ

> تم روئے زمین پر سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بیدخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات۔ ص ۲۲۵)

اور چونکہ تم صالحین کی جماعت ہو اس لئے یہی تمہارا فریضہ بھی قرار پاتا ہے۔ وہ اس صالحین کے گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

> جب صالحین کا گروہ منظم ہو۔ اہل ملک کی عظیم اکثریت ان کے ساتھ ہو۔ یا کم از کم اس بات کا ظن غالب ہو کہ عملی جدوجہد شروع ہوتے ہی اکثریت ان کا ساتھ دے گی۔ ...... تو اس صورت میں بلاشبہ صالحین کی جماعت کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ ان کے اوپر یہ شرعی فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت منظم کرکے ملک کے اندر شدید ہمہ گیر انقلاب پیدا کریں اور حکومت پر قبضہ کر لیں۔
> (اسلامی ریاست۔ ص۔ ص)

اس کے لئے بھی وہ مثال روس ہی کی پیش کرتے ہیں. چنانچہ وہ اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کے جدید ایڈیشن (جنوری ۱۹۶۹ء) میں لکھتے ہیں.

موجودہ زمانے کا اسٹیٹ حضرت یوسفؑ کے اسٹیٹ سے کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور منظم ہے. اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لئے جو انقلاب بھی ہوگا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گزرے گا جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا. (ص ۱۱۲)

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں.

ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ طریق کار (Method) سے. لیکن اگر برِامن ذرائع سے جوہر اقتدار (Substance of Power) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم دعوت جاری رکھیں گے اور تمام شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے. (۷۱۹)

فاشسٹ تحریکوں میں پارٹی لیڈر کے احکام کی اطاعت ڈکٹیٹر کے طور پر کی جاتی ہے. اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے لکھا تھا.

وہی آمریت

آج آپ کی آنکھوں کے سامنے جرمنی اور اٹلی کی مثالیں موجود ہیں ہٹلر اور مسولینی نے جو عظیم الشان قوت حاصل کی ہے تمام دنیا اسکی معترف ہے. مگر کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کامیابی کے کیا اسباب ہیں؟ وہی دو. یعنی ایمان اور اطاعتِ امر. نازی اور فاشسٹ جماعتیں ہرگز اتنی طاقت ور اور اتنی کامیاب نہ ہو سکتی تھیں اگر وہ اپنے اصولوں پر اتنا پختہ اعتقاد نہ رکھتیں اور اپنے لیڈروں کی اس قدر سختی کے ساتھ مطیع نہ ہوتیں.

(ترجمان القرآن. دسمبر ۱۹۳۷ء. بحوالہ مولانا مودودی کی تحریک ص ۲۵۹)

مسولینی اور ہٹلر اپنی اطاعت ایک پارٹی لیڈر کی حیثیت سے کراتے تھے. لیکن مودودی صاحب نے چونکہ اپنی تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کیا تھا اس لئے، انہوں نے پارٹی لیڈر کی اطاعت کو "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" سے تعبیر کیا. چنانچہ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا.

اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزو ہے

جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی
کو امیر مانا ہے، وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے' دراصل اس کی نہیں'
بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ (ہدایات۔ ص ۳۷)

اور" اللہ اور رسول" کی اطاعت میں عقل و فکر کو قطعاً دخیل نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ وہ اپنی کتاب تنقیحات'
میں لکھتے ہیں کہ

عقل و فکر کے چراغ گُل کر دو

کسی حکم خداوندی میں چون و چرا کرنے کا تم کو حق نہیں خواہ کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں
آئے یا نہ آئے۔ خواہ کوئی حکم تمہاری عقل کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے۔۔۔۔
تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم (ان عقاید و احکام کو) اپنی عقل' اپنے علم' اپنے
تجربات' یا دوسرے اہل دنیا کے افکار و اعمال کے معیار پر جانچنا چھوڑ دو۔
۔۔۔۔۔۔ ڈسپلن صرف ماننے اور اطاعت کرنے سے قائم ہوتا ہے۔
(پانچواں ایڈیشن ص ۱۵۵)

ظاہر ہے کہ جب پارٹی لیڈر کی اطاعت' خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کی طرح کی جائے گی' تو جو کچھ خدا
اور رسول کے احکام کے متعلق کہا گیا ہے' اس کا بالواسطہ اطلاق' پارٹی لیڈر۔ امیر جماعت کے احکام کی اطاعت
پر خود بخود ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ بات کس طرح پھر پھرا کر وہیں آ گئی کہ عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے
کہ اپنے متبعین کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا جائے۔

——— (۰) ———

یورپ کی ان پارٹیوں کا مسلک یہ تھا کہ اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے جو حربہ ضروری سمجھا جائے اسے
بلا تأمل اختیار کر لیا جائے۔ یہی مسلک جماعتِ اسلامی کا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے
اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض
ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات
میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔
(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

نہ صرف جھوٹ بولنا بلکہ ہر قسم کا حربہ اختیار کر لینا۔ حکیم عبدالرحیم اشرف[1] جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رکن تھے (وہ اب ان سے الگ ہو چکے ہیں) انہوں نے اپنے اخبار المنبر کی ۱۹ ستمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

وہی حربے

میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ۷ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ملتان جیل میں ملاقات کی۔ اس موقعہ پر منجملہ دیگر امور منکرین سنت اور ان کے فتنے کا بھی ذکر آگیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعت لٹریچر کی ایک اسکیم بتائی اور اس کی تکمیل کے سلسلہ میں فرمایا کہ آپ چوہدری غلام محمد صاحب سے کہیں کہ وہ دفتر طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کریں اور وہاں کسی شخص کی تالیف قلب کر کے طلوع اسلام کے پتے حاصل کریں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عوامی تحریک جب مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے تو اس کی اصطلاحات بھی کس طرح مذہبی ہو جاتی ہیں۔ نازی اور کمیونسٹ جسے کھلے الفاظ میں "رشوت" کہتے، مودودی صاحب نے اس کے لئے "تالیف قلب" کی اصطلاح استعمال فرمائی۔

فاشسٹوں، نازیوں اور کمیونسٹوں کے نزدیک طاقت حاصل ہونے پر "اپنے" مخالفین کا صفایا کر دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی مسلک مودودی صاحب کا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے رسالہ "مرتد کی سزا" میں لکھتے ہیں کہ

مخالفین کو ختم کر دو

جس علاقے میں اسلامی نظام رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے، فرائض و واجبات دینی پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا (یعنی جس بات کو مودودی صاحب "اسلام کہدیں گے" اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ طلوع اسلام) اسے قتل کر دیا جائے گا۔　　(صفحہ ۸۰)

یہ تھی وہ جماعت جو ان عزائم کو لے کر نزول فرمائے پاکستان ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے یہاں عوامی تحریک (Mass Movement) کی بنیاد رکھی۔

———— (۰) ————

[1] یہ صاحب جو اب مرحوم ہو چکے ہیں اس زمانے میں جماعت اسلامی کی کراچی کی شاخ کے امیر تھے۔

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ ایسی تحریکیں

عوامی تحریک کے عناصر ترکیبی

کن عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ ان کی خصوصیات اور لزومات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور انہیں کامیاب بنانے کے کیا طریق ہیں۔ یہ ہمارے پیشِ نظر موضوع کا بڑا اہم اور بنیادی گوشہ ہے۔ اسلئے مجھے امید ہے کہ آپ اسے کامل غور و فکر سے سماعت فرمائیں گے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا۔ ان کے پیشِ نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (CHAOS) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل و فکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے۔ ایسے لوگوں کو مذہبی دیوانے (Religious Fanatics) کہا جاتا ہے۔

(۲) عوامی تحریک میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں اور مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔ یوں تو طبقاتی تفریق کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب ابلیس نے ابنِ آدم کے کان میں "میری اور تیری" کا افسوں پھونکا تھا لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے ہی دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (Haves) اور (Have-nots) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ عوامی تحریک چلانے والے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (Present) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذباتِ نفرت کو مشتعل کئے چلے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں۔ اور عوام کے دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں۔

(۳) اس تحریک کے علمبردار حال کو اس قدر قابلِ نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ، مستقبل کو اس قدر درخشندہ و تابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسوں اور محروموں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ ان کے دلوں میں

ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آگیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کس طرح مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے، اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اسی قسم کی جنتی زندگی کا نقشہ دکھا دے گا، تو وہ دیوانہ وار لبیک کہ کر ان کے پیچھے ہولیں۔

(۴) عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کرکے، مستقبل کے فریب تخیل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعین طور پر نہ کہی جائے بلکہ اپنے پروگرام کو مبہم لیکن نہایت دلکش اور جاذب اصطلاحات کے پردوں میں پیش کیا جائے۔ متعین اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ متبعین (Followers) قدم قدم پر ملپٹ لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جارہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا تو وہ بددل ہوجاتے ہیں۔

(۵) اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ — وہ آئی، لو وہ آئی، دلِ ناصبور صبح — ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے انہیں جلدی سے تباہ کر دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جانے کا۔ عوامی تحریک میں (Tempo) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دور نہیں۔ اس ضمن میں اُس گدھے کی مثال نہایت برجستہ ہے جس کی گردن میں چھوٹی سی لکڑی باندھ کر اس کے اگلے سرے پر گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اس میں ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس گاجر کو گدھے کی آنکھ سے ذرا ہی دور رکھا جاتا ہے اگر اسے لمبے فاصلے پر رکھا جائے تو گدھا اس فریب میں نہیں آسکتا۔

(۶) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق و صداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے — اس میں کوئی دوسری پارٹی شریک نہیں۔ ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

(۷) عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہوجاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد، وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں، وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پُر ہوجاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہوگیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں

Complexes کا شکار ہو رہے تھے۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ لوگ اپنی پارٹی کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

(۸) عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فِٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرمس (Thermos) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے، تو وہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ — عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا —!

(۹) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے یہ امر لاینفک ہے کہ عوام کو مسلسل مصروفِ حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگاتار چلاتے رہیں اور انہیں فرصت ہی نہ دیں — کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے، عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جاتا ہے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اگر کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہوگا تو کسی دوسری عوامی تحریک ہی میں شامل ہوگا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغہ آرائی کا، اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رُخ نہیں کرتا۔

(۱۰) مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شَل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینے سے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے، ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انگریزی زبان میں (Faith) کہتے ہیں (FAITH) کی وضاحت برگساں نے بڑے جامع انداز میں کی ہے جب کہا ہے کہ (Faith) یہ نہیں کہ اپنے متبعین کو دکھا دیا جائے کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیتے ہیں۔ (Faith) یہ ہے کہ ایسا سحر پھونک دیا جائے کہ انہیں چلتے ہوئے پہاڑ بھی دکھائی نہ دیں۔ عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ جو حقائق دوسروں کو یونہی نظر آجائیں، ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

یہ تو ہے عزیزانِ من! عوامی تحریک (Mass Movement) کے لزوم و خصائص۔

عوامی تحریک کے لیڈر

جہاں تک اس تحریک کے لیڈر کا تعلق ہے، اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً

(۱) وہ اصول پرستی کی جگہ حکمت عملی کو اپنا مسلک قرار دے۔ یعنی جیسا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مصلحت کا تقاضا ہو، بلا جھجک ویسا کر گزرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو باور کرادے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہوئی۔

(۲) اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس "کہہ مکرنے" کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

(۳) وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو خواہ اس کے لئے اُسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں۔ اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا حسنِ عمل قرار پائے گا اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

(۴) اس کے لئے ایسا ضدی ہونا ضروری ہے کہ وہ خواہ اپنے آپ کو تباہ اور اپنی تحریک کو ختم کر دے لیکن نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے، نہ کسی مقام پر (Surrender) کرے۔

(۵) اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود، اور اس طرح اسے (One-man show) بنائے رکھے۔ اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو کبھی بار نہیں پانے دے گا۔ جن کے متعلق اسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہم دوش ہو جائیں گے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوامی تحریک کی بنیاد طبقاتی تفاوت کی شدتِ احساس پر ہوتی ہے۔ اس تفریق کو کم اور رفتہ رفتہ ختم کرنے کا فکری اور تعمیری طریق یہ ہے کہ نچلے طبقہ کی سطح کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اوپر اور نیچے کی تفریق باقی نہ رہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں طبقاتی تفاوت کو اسی طرح مٹایا گیا ہے۔ اس میں محلات کو گرا کر جھونپڑیوں میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس میں جھونپڑیوں کو ابھار کر محلات کے برابر لایا گیا ہے۔ لیکن عوامی تحریک میں مشتعل ہجوم ہر تعمیر کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح خوش ہو جاتا ہے کہ ہم نے مساوات پیدا کر دکھائی ہے۔ حالانکہ یہ وہ مساوات ہے جس کا مکمل ترین نمونہ قبرستان میں ملتا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ــــ اندھیرے میں نشیب و فراز بالکل نظر نہیں آتے۔ سب تاریکی کی چادر میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہیں عزیزانِ من! وہ عناصر جن سے ایک عوامی تحریک ترتیب پاتی ہے۔ اور یہ ہیں وہ محرکات جن کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتی ہے۔ یعنی یہ کہ عقل و فکر کے چراغوں کو گل کرکے' عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مضطرب رکھا جائے اور معاشرہ میں مسلسل خلفشار و انتشار (Chaos) برپا کیا جائے۔

(۰)

کوئی تعمیری کام نہیں

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی' یہاں مذہب کے نام پر ایک عوامی تحریک کی طرح ڈال دی گئی۔ ملک میں بدقسمتی سے' غلط نظامِ زندگی اور اربابِ نظم و نسق کی بدعنوانیوں سے' جوں جوں عوام کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی' یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی' اور اس کے ساتھ ہی اس کے تخریبی نتائج بھی ابھرتے چلے گئے۔ آپ اس تحریک کی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ کو اس میں کوئی تعمیری کام دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے برعکس' اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی ملک کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ یہ مسلسل (create Chaos) کرتے رہے۔

بحالیٔ جمہوریت

یہ تحریک بڑھتی تو گئی لیکن جن خوش آئند وعدوں سے عوام کو اپنے پیچھے لگایا گیا تھا ان کے ایفا ہونے میں اتنا لمبا عرصہ لگ گیا کہ اس کے بعد اس کا (Tempo) قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس وجہ سے اسے اپنا رُخ دوسری طرف موڑنا پڑا اور "بحالیٔ جمہوریت" کے نام سے اس میں نیا ایندھن ڈالا گیا اور پھر اس روڈ رولر نے جس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا' جو تباہی مچائی اس کے نشانات اب تک اس ملبے کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں جس کے نیچے علم و عقل' ہوش و خرد اور تہذیب و شرافت کی لاشوں کو دبا دیا گیا۔

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا ہوں اور میری چشمِ تصور کے سامنے بعض پیشانیوں کی وہ خشم آلود شکنیں آرہی ہیں جو انتہائی غم و غصہ کے عالم میں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ غلط نظام کیوں مٹ گیا؟ میں اس سوال کا تفصیلی جواب تو ذرا آگے چل کر دوں گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ میں اس غلط نظام کے مٹنے کا افسوس نہیں کر رہا ___ غلط نظام کو تو مٹنا ہی چاہیئے ___ مجھے افسوس ہے اس غلط طریق کا جو اس غلط نظام کو مٹانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا؛ غلط کو غلط سے مٹایئے تو غلط پھر بھی موجود رہے گا۔ صرف اس کے پیکر میں فرق آجائے گا۔

بحالیٔ جمہوریت کے اس کہرام کی تان اس پر ٹوٹی کہ "ہمیں ووٹ دو"۔ ظاہر ہے کہ "ہمیں ووٹ دو" ایسا پروگرام نہیں جس سے عوامی تحریک کے چھکڑے کو زیادہ عرصہ تک برقرار رکھا جا سکے۔ ایک زیرک نگاہ نے جس نے

میں سمجھتا ہوں کہ عوامی تحریک کی نفسیات کا زیادہ گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا تھا، اس حقیقت کو اسی زمانے میں بھانپ لیا اور "ہمیں ووٹ دو" کی جگہ "ہمیں روٹی دو" کا فتیلہ اس انداز سے پھینکا کہ محرومین کے جذبات جنگل کی آگ کیطرح بھڑک اُٹھے۔

معاشی تحریک

اب اس تحریک کو صحیح معنوں میں عوامی بننے کے لئے ٹھیک ٹھیک جذبۂ محرکہ مل گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی، دوسروں نے بھی یہی راگ الاپنا شروع کر دیا لیکن عوامی تحریک میں تو جو پہل کر جاتے وہی میر کی ہوتا ہے۔ اس لئے اب میدان سوشلزم کی معاشی تحریک کے ہاتھ میں ہے۔ باقیوں کے ہاں، اپنے ناکام تجارب کی نوحہ گری کے سوا کچھ نہیں جو "سوم" یا زیادہ سے زیادہ "چالیسویں" تک جاری رہ سکتی ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں، عزیزانِ من! ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق نہ

ہماری پوزیشن

کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قرآن کی رُو سے، مذہبی فرقوں کا وجود شرک ہے اور سیاسی پارٹیاں حکمتِ فرعونی کی مظہر۔ میری تحریک یکسر فکری ہے اس لئے ہم عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ میں نے جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے وہ نہ کسی پر تنقید ہے نہ کسی کی تنقیص۔ یہ میری قرآنی بصیرت کے مطابق، یہاں کے حالات کا معروضی (Objective) تجزیہ ہے۔ مجھے دین سے عشق ہے اور پاکستان سے اس لئے محبت کہ یہ سرزمین، دین کا نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی۔ اور اس کے حصول کی جدوجہد میں، میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تھا۔ تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں، عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلابِ بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس لئے مملکتِ پاکستان، جو ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، اس کا کیا مقابلہ کر سکے گی۔ جب ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے ان کے آتش بجاں رہرو کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں

شکنی، دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں گاندھی نے (Quit India) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بے باک چھوڑ دیا تو اس نے قائداعظمؒ کو بھی دعوت دی تھی کہ جب، انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اسکے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام سکھائیے، قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے

ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑگئی تو آج جس سیلاب کا رُخ انگریز کی طرف ہے کل کو اُس کا رُخ خود آپ کی سمت ہو جائیگا۔ اُس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہیگا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اُس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقص آتش پر جشن مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی۔ لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخور اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور حکومت سے فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے!

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (Lawlessness) کی زد میں آرہا ہے۔

اس سے بھی آگے، مجھے ایک اور خطرہ نظر آرہا ہے جس کے تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس معاشی تحریک میں لوگوں کو جس قدر سنہرے خواب دکھائے جارہے ہیں، اس سے ان کے دل میں یہ یقین پیدا ہوتا جارہا ہے کہ جونہی ہماری پارٹی برسر اقتدار آئی، ہم میں سے ہر ایک کے پاس بنگلہ، موٹر، کارخانہ، سینکڑوں مربعے زمین، چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہونگے۔ اور انہی تصورات کی کشش ہے جو انہیں اس تحریک کی طرف کشاں کشاں لئے جارہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ پارٹی برسر اقتدار آبھی گئی تو عوام کے ساتھ کئے گئے اس قسم کے وعدے کبھی پورے نہیں ہوسکینگے۔ ان کا

مایوسی کی سرکشی

راتوں رات پورا کرنا کسی کے بس کی بھی بات نہیں ہوگی۔ اُس وقت یہ لوگ مایوس ہو جائینگے، اور جب مایوس (Desperate) ہو جائے تو اس کی تباہ کاریاں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب بلی کسی ایسے کمرے میں گھر جائے جس سے باہر نکلنے کے سب راستے مسدود ہوں تو وہ آنکھیں نوچ لیا کرتی ہے۔ علم النفس کی رُو سے، مایوسی (Frustration) کا ردعمل شدید قسم کا (Aggression) ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے ابلیس اور شیطان ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں: ابلیس کے معنی ہیں مایوسی اور شیطان کے معنی ہیں سرکشی۔ جب ابلیس، شیطان بن جاتا ہے تو قرآن اسے عَدُوٌّ مُّبِیْن کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی تمہارا کھلا ہوا دشمن۔ یہ ہے وہ خطرہ جس کا احساس میری روح پر کپکپی طاری کر دیتا ہے کہ جب یہ لوگ مایوس ہونگے تو ان کے ہاتھوں یہاں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ خداوند کو بھی یہ خواب بد دکھلائے!

———— (٠) ————

قرآنِ کریم جس دین کو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ برومندی قرار دیتا ہے اس کی رُو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو، باطل (فلہذا ابلیسی) ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے ۔۔ وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو۔ اسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سیکولر نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ

باطل کے نظام

فرعون تھا۔ دوسرے اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ، دوسرے انسانوں کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلط کرے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ہامان تھا۔ اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان روٹی کے لئے دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ قارون تھا قرآن کی رُو سے، دین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک باطل کے ان نظامہائے حیات کو مٹا یا نہ جائے۔ لیکن وہ انہیں مٹانے کا طریق عوامی تحریک قرار نہیں دیتا جس میں جذبات کو مشتعل کر کے، تخریبی سرگرمیاں اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ اس کا طریق، فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی

داخلی تبدیلی

پیدا کی جاتی ہے ۔۔ تبدیلی پیدا کیا کی جاتی ہے؛ قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ایکہ منزل راہمی دانی ز راہ	قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود	ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مقصد انسانی قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود	جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقائے جلیلؓ کے مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا ۔۔ اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (Means are justified by the ends achieved) میکیاولی سیاست کا اصول ہے قرآن کا نہیں۔

قرآن کی رُو سے غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا اس لئے قرآنی انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین حق کے مطابق ہونا چاہیئے، اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہیئے۔ اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، حضورؐ نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپؐ نے اس نظامِ نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر سکون واطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد جب وہ اس کی صداقت کے متعلق دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اسکے ساتھ ہی انکی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ "صلاحیتوں کی اس نشوونما" سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوونما و ارتقا بھی ہے جنکی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابنِ آدم حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اُس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ

(۱) جنہوں نے سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔ اور

(۲) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہؐ نے فرمائی اور اس طرح اُنکے قلب و نگاہ میں قرآنی انداز کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

رسول اللہؐ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ تزمیل[1] (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رُکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمرِ رسالت صرف تئیس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تئیس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تزمیل میں صرف ہو گئی اور اس کا ماحصل

[1] رسول اللہؐ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمّل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔

چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات "بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں، اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو "بے عملی" کا دور کہلائے گی۔

اس جماعت مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعت کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابل برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا۔ نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا۔ نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ مصیبتیں اٹھاتے رہے لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی۔ نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی ۔۔۔ "مملکت قائم کی" کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (۲۴/۵۵)

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا ۔۔۔ ایمان ۔۔۔ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم، اور اعمال صالحہ ۔۔۔ قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے موقع اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔

جب یہ جماعت یوں صاحب اقتدار ہوگئی۔ تو معاشرہ میں نظام اسلامی خود بخود نافذ ہوگیا۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ یہ کاروان مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی منزل مقصود تک جا پہنچا۔ اس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے، نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی ۔۔۔ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد کسی کے دل میں یہ سوال نہ ابھرا کہ یہ ہماری منزل مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں

سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا سب کچھ دیکھ بھال، سوچ سمجھ کر ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا۔ حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد اپنے آپ کو اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اسکے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروف جہاد رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق عہدِ اول میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بدلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا۔ اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں، مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا۔ اور یہی طریق ہر اس شخص اور اس جماعت کو اختیار کرنا ہو گا جو صحیح اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہو۔

———— (۱۰) ————

نوجوانوں کا اضطراب

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے نہ علاج کے لئے چار پیسے۔ غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے کی آج ضرورت ہے اور آپ اُن سے کہہ رہے ہیں کہ اُس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے، اور نہیں سمجھتے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود ؎

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ معاشی مسئلہ کو ملک میں آج ابھارا گیا ہے اور میں گزشتہ بیس سال سے مسلسل اس کے لئے پکار رہا ہوں لیکن اس کے باوجود میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمار داروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمل سے گزاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے — ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوا لائے اور بچوں کو روٹی کھلائے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟ انکی بھوک کا

مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بویا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

صحیح انقلاب کے لئے عزیزانِ من! وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزارہا تمناؤں اور آرزوؤں، بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود، فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی۔ جس غالبؔ نے یہ کہا تھا کہ — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک — اُسے اس کا بھی احساس تھا کہ — عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — ہماری بیتابیٔ تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ ہمارے یہ نوجوان چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جد و جہد کی مدت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا۔ جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

چین کی مثال

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیسا جانے
جانیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

چین کے مشہور مجلہ پیکنگ ریویو کی ۱۰ر مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں، انقلابِ چین کے قائد ماؤزے تنگ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے، نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ (تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر سکیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

آپ سوچئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو، اس قسم کے طویل المیعاد صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لئے جس میں انسان کے غلط معتقدات، نظریات تصورات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں

حالت مطلوب ہو، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآن کا معاشی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قوم کی دولت ابنائے قوم کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھایا جائے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے۔ اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے انہیں قانون کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاق حسنہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے۔ ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اگر پیشِ نظر مقصد موجودہ نظام میں (جیسا کچھ یہ ہے) اقتدار حاصل کرنا ہے، تو اس کے لئے بھی نہایت پُرامن آئینی طریق اختیار کیا جائے۔ ملک میں معاشی تبدیلی کے لئے قانونی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ لیکن اسے اپنے پروگرام کا منتہیٰ نہ سمجھ لیا جائے۔ اسے محض عارضی تدبیر کہا جائے۔ منتہیٰ، افرادِ قوم کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی قرار دی جائے۔ اس تبدیلی کی بنیادی شرط ایمان بالآخرۃ ہے۔ یعنی اس حقیقت پر

ایمان بالآخرۃ

کامل یقین کہ انسان کا کوئی عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے، اور ان نتائج کا خمیازہ ہر انسان کو بھگتنا ہوگا، خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آجائیں اور خواہ مرنے کے بعد ___ اس ایمان کے بعد قانون کی اطاعت، یا مستقل اقدار کی پابندی، نہ پولیس کے ڈر سے کی جائے گی نہ قید و بند کے خوف سے۔ یہ چیز اس شخص کے دل کی آواز اور زندگی کا تقاضا بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جسے اسلامی نظام کہتے ہیں وہ اس وقت قائم ہوگا جب کیفیت یہ ہو کہ یہ لوگ (اے رسولؐ!) اپنے ہر نزاعی معاملہ کے تصفیہ کے لئے تیری طرف رجوع کریں۔ یعنی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں بلکہ ہر معاملہ میں فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کے بعد ہے۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا

اسلامی نظام کے قیام کی شرط

تَسْلِيمًا۔ (۴/۶۵)۔ اور پھر جو فیصلہ تو دے، اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف ذرا سی گرانی محسوس نہ ہو۔ جب تک معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو آپ کسی نظام کو اسلامی نہیں کہہ سکتے خواہ اس کی شکل و صورت کیسی ہی اسلامی کیوں نہ دکھائی دے اور ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی ہنگامہ خیزیوں اور زور آزمائیوں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف فکری تحریک سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا مقصد افرادِ معاشرہ کی

قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہو۔ میں نے عزیزانِ من! جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے، تحریکِ پاکستان میں اپنی بساط کے مطابق حصّہ لیا تو اس لئے کہ میرا ایمان تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اور قرآن کریم پر غور و تدبّر سے یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب نونہالانِ ملّت کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کی جائے جس سے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے۔ اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ میں نے اس کے لئے طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جو بتوفیقِ ایزدی اس بائیس سال کے عرصہ میں کامل سکوت و سکون سے اس طرح آگے بڑھتی چلی گئی جس طرح طلوعِ ماہتاب کے ساتھ چاندنی کی حسین چادر، نہایت خاموشی سے، فرشِ صحرا پر بچھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یا گوئٹے کے "نغمۂ محمدؐ" میں اس آسمانی ندی کی طرح جسے اقبالؒ نے ان الفاظ سے دو آتشہ کر دیا ہے کہ

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
باخود بیگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

اس تحریک نے کبھی کسی ہنگامے میں حصہ نہیں لیا۔ اس نے قوم کو سوچنا سکھایا — اور قرآنی روشنی میں سوچنا سکھایا۔ میں نے قوم سے یہ کہا کہ ہم جس قسم کے مسلمان بھی ہیں، ہمارا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس خطۂ پاک کو بیرونی خطرات سے محفوظ اور اندرونی خلفشار سے مامون رکھیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہیئے جس سے وہ اسلامی زندگی کا پیکر بن کر ابھریں۔ اس سلسلہ میں میں نے، پاکستان میں مروجہ طریقِ و نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم اور اربابِ حل و عقد کی بالخصوص مبذول کرائی — اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں جذب رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم عزیزانِ من! آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں، یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس سال

تعلیمی نظام

سے اپنی درسگاہوں — اسکولوں، کالجوں، مکتبوں، دار العلوموں — میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی۔ یعنی ہم اپنی مروجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملولِ خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے عزیزانِ من! چاروں طرف سے مار تھک کر بالآخر یہی سوچا کہ اگر اس کے لئے قوم اجتماعی طور تیار نہیں ہوتی تو ہم انفرادی طور پر ایک ایسی درسگاہ قائم کریں جو اس باب میں ماڈل کا کام دے سکے۔ اس درسگاہ میں تعلیم کا انداز کیا ہوگا، اس کا تصور علامہ اقبالؒ نے نہایت جاذب اور حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ہے

کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!

لیکن ـــ

اسی سرود میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوز لا الٰہ نہیں

اس درسگاہ میں نصابِ تعلیم تو وہی ہوگا جو یونیورسٹی تجویز کرتی ہے تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلباءِ تعلیم کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ ہوں لیکن اس نصاب کو پڑھایا اس طرح جائے گا کہ طلباء میں اس بات کے پرکھنے کی تمیز پیدا ہو جائے کہ اس میں حق کیا ہے اور باطل کیا۔ کونسی چیز قرآنی نظریۂ زندگی اور مستقل اقدار کے مطابق ہے اور کونسی ان کے خلاف۔ اور اس کے بعد ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ قرآنی نظامِ حیات کو دنیا کے سامنے علومِ حاضرہ کی روشنی میں اس طرح پیش کر سکیں کہ سننے اور سمجھنے والے علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھیں کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس نظام کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

ہم عزیزانِ من! آجکل اسی درسگاہ کے قیام کی کوششوں میں مصروف ہیں ـــ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ ـــ یہی وہ نوجوان ہونگے جو عوامی اور ہنگامی تحریکوں کا خس و خاشاک بننے کے بجائے قرآنی فکری تحریک کا وہ شجرِ طیب بنیں گے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ اس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی بلندیوں میں جھولے جھولتی ـــ انہی کے ہاتھوں دین کا نظام بھی قائم ہوگا اور یہی بہی خواہانِ انسانیت روٹی کے مسئلہ کا صحیح حل بھی پیش کر سکیں گے۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ مسولینی نے کہا ہے کہ جس کے پاس فولاد ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ میں نے (یعنی علامہ اقبالؒ نے) کہا کہ یوں نہیں بلکہ یوں کہ جو خود فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔

فکر و نظر کی تبدیلی عزیزانِ من! سیرت و کردار کی پختگی سے انسان کو فولاد بنا دیتی ہے ـــ اور یہ وہ فولاد ہے جسے کبھی زنگ نہیں لگتا۔

اور یہی طلوعِ اسلام کی تحریک کا منتہیٰ ہے۔ والسلام!

بابُ المراسلات

بانیانِ پاکستان کے ارادے

ناظم آباد کراچی سے ایک صاحب کا طویل مکتوب موصول ہوا ہے جسے ہم بجنسہٖ شائع کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

مکرمی، سلام و رحمت

"طلوع اسلام" بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء کے صفحات ۳۵ تا ۴۰ کے مطالعہ کے بعد میرے (اور شاید میرے ہم خیال بے شمار پاکستانی مسلمانوں کے) ذہن میں ایک بات آتی ہے کہ مودودی صاحب نے ساری عمر میں ایک بات تو ایسی کی جس کی صحت کے شواہد کے لئے کسی دقتِ نظر کی ضرورت نہیں ہے اور وہ یہ کہ "پاکستان بننے کے بعد ان کے (یعنی قائداعظم یا جملہ بانیانِ پاکستان کے) طرزِ عمل سے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اس ملک کو اسلامی ریاست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے"۔ ایک بدیہی شہادت اس کی یہ ہے کہ پاکستان بنتے ہی اِن حضرات نے اُس دو قومی نظریہ کو ترک کر دیا جس کی بنا پر پاکستان کے حصول کی جد و جہد کی گئی تھی۔ اور بجائے اسلامی اصول کے مطابق، قومیت کے عصرِ جدید کی سیاست کو اپنا کر جغرافیائی قومیت کو اپنا لیا جس کے نتیجہ میں قومی اسمبلی میں آئین سازی و قوانین سازی کے لئے غیر مسلموں کو بھی (جن کو پاکستان سے پہلے تک دوسری قوم کے افراد کہا جاتا تھا) وہی حقوق دے دیئے گئے جو مسلمانوں کو تھے۔ اس طرح "شوریٰ بینھم" میں "بینھم" کے مفہوم میں وہ تمام افراد شامل ہو گئے جو اسلام کے مخالف تھے۔ کیا "شاورھم فی الامر" میں "ھم" کی ضمیر کے معنی یہی ہیں؟ کیا شارعؑ نے اُس اسلامی مملکت کی تشکیل میں (جس کے احیاء کے وعدے ہم سے کئے گئے تھے) مدینہ کی جغرافیائی حدود میں رہنے والے تمام لوگوں کو اپنی مجلسِ شوریٰ میں اسی طرح شامل کیا تھا؟۔ اور پھر یہ کہ اس اسلامی مملکت (بزعمِ بانیانِ پاکستان) کی آئین و قوانین ساز اسمبلی میں نہ صرف غیر مسلموں اور مسلموں کو شوریٰ کے حقوق برابر دیئے گئے بلکہ وزارتِ قانون کا سربراہ بھی ایک غیر مسلم اور اُس قوم کے فرد کو بنایا گیا جس قوم کو ہم اسلام کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے (یا کم از کم کہتے) رہے تھے۔ وہ روایت آج بھی قائم ہے اور آج بھی یہ وزارت اُسی طرح ایک غیر مسلم کے ماتحت ہے۔ یہ صاحب اسلامی قوانین اور اصولوں کے بہت بڑے مداح ہیں لیکن کوئی معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی یہ بات سمجھ سکتا

ہے کہ کسی طریقۂ حیات کے اصول اور قوانین کی صداقتوں کا قائل ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص اُسے اختیار نہیں کرتا (جس میں کوئی مجبوری بھی نہیں ہے) تو وہ کہاں تک اپنی مدح سرائی میں پُرخلوص ہوگا۔ اور کیا یہ صرف "کرسی" پر قائم رہنے کی غرض تو نہیں ہے۔

آئین و سازی و قوانین سازی کی اسمبلی تو بڑی چیز ہے۔ اگر وہ حضرات اپنے وعدوں پر قائم رہنے کا ارادہ رکھتے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی کم از کم اُن بعض کھلی اور بدیہی امور کی طرف تو توجہ کر سکتے تھے جو اسلام کے ہر مدرسۂ فکر کے نزدیک قرآن و "حدیث" کے خلاف تھے۔ مثلاً اگر قمار بازی اور شراب کی خرید و فروخت بند کر دی جاتی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا۔ بلکہ ریس (RACE) اور دیگر قسم کی قمار بازیوں کو بند کر کے قومی سرمایہ کو بہتر اور مفید کاموں پر استعمال کرایا جا سکتا تھا اور شراب کی بندش سے لاکھوں روپیہ کا زرِ مبادلہ بچایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ دو کام تک بھی اُن حضرات سے نہ ہو سکے جو اسلامی مملکت کے احیاء کے وعدوں سے لوگوں کو فریب دیتے رہے تھے۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ شراب و قمار کی بندش سے اُن حضرات میں سے بیشتر افراد کی اُس تفریح پر اثر پڑتا تھا جس کی ضرورت انہیں امورِ مملکت کی تھکاوٹ کے بعد ہوتی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ بھی کہ ان دو مشاغل کو بند کرنے سے ہمیں ہمارے "خداوندانِ نعمت" غیر مہذب اور جاہل سمجھ لیتے اور "ترقی" کے لئے "امداد" دی جا رہی تھی وہ روک لیتے۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ جن ملکوں میں شراب خانے اور قمار خانے ممنوع ہیں ان کی وقعت بھی یورپ اور امریکہ کی نظروں میں محض اس وجہ سے کم نہیں ہے۔ مثلاً سعودی عرب میں اور خلیج فارس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں شراب و قمار ممنوع ہیں مگر اُن ممالک کی وقعت و عزت میں کوئی فرق اس وجہ سے نہیں آیا اور روس جن سے تو امریکہ اور یورپ والے بھی لرزہ براندام ہیں مگر اُن ممالک میں جوئے خانے اس طرح برسرِ عام نہیں ہیں۔

تو محترم بات وہی ہے جو آپ دیگر سیاسی حضرات کہہ رہے ہیں کہ قائدِ اعظم اور ان کے رفقاء کی نیت بیشک پُرخلوص لیکن اُن کا مقصد آخر صرف معاشی اور سیاسی طور پر مسلمانانِ ہند کی اکثریت کو ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے کا تھا اول کی اسلامی مملکت کے احیاء کے وعدے محض ترغیب کے لئے کئے گئے تھے جن کے ایفاء کے لئے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بعد انہوں نے کوئی ظاہری و باطنی کوشش نہیں کی۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اُن بانیانِ پاکستان میں سے زیادہ تر اس قسم کے لوگ تو ان وعدوں کو بھول ہی گئے تھے مگر وہ "مولانا و اولنا" حضرت بھی جو تحریکِ پاکستان میں شریک ہے اور جو ان وعدوں کے معانی سمجھتے تھے جو قوم سے کئے جاتے رہے تھے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد "لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ" کو بھول گئے۔ کیا مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا ظفر احمد انصاری و مفتی محمد شفیع علماء کا یہ ایمانی فریضہ نہیں تھا کہ جب بانیانِ پاکستان نے اپنے وعدوں سے انحراف کیا تو وہ اُس سے اپنی بیزاری و قطع تعلق کا اظہار کرتے جو ایمان کا آخری درجہ ہے۔ اگر اُس وقت نہیں تو جنوری ۱۹۵۱ء میں جب ۳۱ "علماء اسلام" دستور کے بنیادی اصول مرتب فرمائے تھے اس وقت بھی اگر انہیں قرآن و سنت میں کہیں یہ نکتہ نظر نہیں آیا

تھا تو کم از کم مطالبۂ پاکستان کے بنیادی اصول یعنی دو قومی نظریہ کا بھی لحاظ رکھتے اور ایک دفعہ اُن ۲۲ دفعات میں اور شامل کر دیتے۔ لیکن اس کے لئے ایمانی جرأت کی ضرورت ہے جو نہ ۲۳ برس پہلے تھی اور نہ اب ہے۔

تو بات یہ ہوئی کہ جو لوگ قرونِ اولیٰ کی اسلامی مملکت کے احیاء کی فی الحال خواب دیکھ رہے ہیں وہ جنت الحمقاء میں ہیں۔ اس کے لئے پاکستان کا ذہن ابھی تیار نہیں ہے۔ پاکستان میں اسلامی اصول صرف اُس وقت صحیح سمجھے جائیں گے جب ہمارے ذہنی اور علمی مرشدوں (اقوام یورپ و امریکہ) پر رفتہ رفتہ اِن اصول کی صداقت ثابت ہو جائے گی اور وہ اس پر عمل پیرا ہوں گے۔ ہم تو صرف اندھی تقلید کے قائل ہیں۔ اگر ہمارے مرشدینِ مغرب کوئی بُری بات کریں گے تو ہم اس کی تقلید کریں گے اور اگر وہ کوئی اچھی بات کریں گے تو ہم اس کی تقلید کریں گے۔ ہم میں وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہونے دی جا رہی ہے کہ ہم خود اپنی بصیرت سے کسی چیز کی بنفسہ برائی اور اچھائی کو سمجھ کر ترک یا اختیار کر سکیں۔ اگر آپ کی یہ آرزو ہے کہ اسلام کی صداقت اور اس کے عالمگیر اصول کو پاکستانیوں سے عملاً منوا لیں تو اس وقت کا انتظار کیجئے جب امریکہ اور یورپ والے اسے مان لیں اور پھر ان کی تقلید میں ہم بھی مان لیں۔ ممکن ہے اس میں دو چار سو برس لگ جائیں جو قوموں کی زندگی میں کوئی لمبا عرصہ نہیں ہے۔ مگر یہی ہونا ہے کہ ہم کسی اسلامی اصول پر اُسی وقت گامزن ہوں گے جب امریکہ اور یورپ اس کی تقلید کریں گے۔

بطاء۔ آپ مجھے یہ الزام دیں گے کہ میں بانیانِ پاکستان کو منافق سمجھتا ہوں۔ مگر محترم! اُن کے اقوال و اعمال کو تضاد کو کیسے چھپایا جائے۔ اُن لوگوں کی نیت کے خلوص میں شک نہیں لیکن ان کا مقصد محض یہی تھا کہ غیر منقسم ہند کی مسلم اکثریت کو سیاسی و معاشی آزادی دلائی جائے اور وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ کیونکہ بقول فلسفیانِ مغرب کے "محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے" اسلئے غیر مسلموں سے "جنگ" اور مسلمانوں "سے محبت" میں انہوں نے اُن وعدوں سے بھی کام لیا جس کے ایفاء کے خیال کو بھی پاکستان بننے کے بعد کبھی ذہن میں نہیں لایا تھا۔ کیا کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ قائداعظم اور بنا مذملت اور ان کے ذی علم اور ذی ہوش سیاسی اور مذہبی رفقاء یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اسلامی مملکت کے کیا معنی ہیں جس کے لئے وہ دس کروڑ مسلمانوں سے وعدہ کر رہے ہیں۔ اور کیا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہی اُن کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ وہ برسوں سے مسلم و غیر مسلم افراد کو دو جداگانہ اقوام کہتے رہے ہیں اور کیا آج بھی ان بانیانِ پاکستان میں سے جو لوگ میدانِ سیاست میں قلا بازیاں کھا رہے ہیں وہ کبھی بھول کر بھی ان وعدوں کی اصلیت کا ذکر کرتے ہیں۔

مکرمی! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر مودودی صاحب نے کم از کم اس نکتہ میں صداقت سے کام لیا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ محض مصلحت کی بنا پر انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ بات انہیں بعد میں معلوم ہوئی کہ بانیانِ پاکستان نے اپنا ارادہ بدل دیا ورنہ تو بات یہی ہے کہ پاکستان کے لئے ترغیب دلانے والا وعدہ جو وہ لوگ کرتے رہے تھے اُس کے متعلق اُس وقت بھی وہ سمجھتے تھے کہ اس کا ایفاء ان کے لئے ناممکن ہوگا۔ ممکن ہے ان کے رفقاء کا مذہبی طبقہ اس امید پر ساتھ

ہوگیا ہو کہ یہ وعدے پورے کر دیئے جائیں گے۔ لیکن اگر یہ بات ہوتی کہ مذہبی طبقہ بھی فریب خوردہ ہوتا تو وہ پاکستان کے بعد ہی جب انہیں یہ آثار نظر آنے لگے تھے کہ ہم سے غلط وعدے کئے اور کرائے گئے تو فوراً احتجاج کرتا۔ مگر بات تو

درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری "!

اگر آپ کو میرے خیالات سے اختلاف ہو تو براہِ کرم 'طلوعِ اسلام' کے صفحات پر اپنی مدلل تردید شائع فر(مائیں) تاکہ مجھ جیسے دیگر افراد بھی اس مسئلہ پر کوئی فیصلہ کر سکیں۔ والسلام! "

طلوعِ اسلام

مودودی صاحب مبہم اصطلاحات استعمال کرنے کے فن کے ماہر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ۲۶؍اگست (کی) تقریر میں "بانیانِ پاکستان" کی اصطلاح استعمال کر کے اس کی "اپنی مصلحت کے مطابق" تشریح کے جملہ حقوق مصنف "محفوظ کر لئے"۔ اس کے بعد جب ان پر لے دے ہوئی تو انہوں نے قائد اعظمؒ کو اس زمرہ سے نکال دیا۔ (حضرات (بانیانِ پاکستان) کی تفصیل پھر مبہم رکھی کہ اس کی مزید تفسیر کا دروازہ کھلا رہے۔ لیکن صاحبِ مکتوب نے قائد اعظمؒ کو بھی شامل رکھا ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس "بانیانِ پاکستان" یا کسی اور کا وکالت نامہ نہیں کہ ان کی مدافعت کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہو۔ ہم ذمہ دار صرف اپنے آپ کے ہیں۔ اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ حق کی آواز کسی طرف سے بھی بلند ہو' اس کی تائید کی جائے اور باطل (قرآن کے خلاف) کی آواز کسی گوشے

طلوعِ اسلام کا مسلک

سے بھی ابھرے اس کی مخالفت کی جائے۔ جہاں تک "بانیانِ پاکستان" کا تعلق ہے' ان میں سے ہم قائد اعظمؒ کے متعلق اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اس سے بہت دور تھے کہ دل میں کچھ رکھیں اور زبان سے کچھ کہیں۔ ان کی سیرت کا یہ وہ درخشندہ پہلو تھا جس کا اعتراف اور اعلان ان کے دشمنوں تک بھی کرتے تھے۔ اور ہمیں چونکہ انہیں بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب تھی اس لئے اس کی شہادت ہم اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر بھی دے سکتے ہیں۔ یوں بھی آپ غور کیجئے اگر وہ تحریکِ پاکستان کے دوران 'اسلام' کا نام محض مصلحتاً لیتے تھے تو حصولِ پاکستان کے بعد یہ مصلحت باقی نہیں تھی۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد کی ان کی تحریریں اور تقریریں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ وہ کس طرح اپنے اس نصب العین کو یہاں بھی بار بار دہراتے رہے۔ (ذرا آگے چل کر اس کی شہادت خود مودودی صاحب کی زبان سے آپ کے سامنے آجائے گی)

باقی رہے مودودی صاحب' سو آپ ان کی گزشتہ تیس چالیس سال کی تحریریں پڑھئے اور دیکھئے کہ (بانیانِ پاکستان تو ایک طرف رہے) انہوں نے کسی کو بخشا بھی ہے؟ انہیں اپنے سوا دنیا بھر میں کوئی شخص صاحبِ کردار

ہی نہیں دیتا ۔۔۔ نہ ماضی میں نہ حال میں ۔۔۔ وہ اپنے ہم نواؤں کی کسی حد تک ضرور تعریف کرتے ہیں لیکن وہ بھی اس وقت تک جب تک وہ ان کا حاشیہ نشین رہے۔ جونہی اس نے ان سے اختلاف کیا' انہوں نے اس کی سیرت و کردار میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ہم ذاتیات میں نہیں الجھا کرتے ورنہ ہم اس باب میں بہت کچھ کہہ سکتے تھے کہ خود ان کی گفتار اور کردار میں کس قدر تفاوت ہے۔ ہم صرف ان دو چار مثالوں پر اکتفا کریں گے، جو ان کے اپنے حلقہ سے باہر آ گئیں۔ ان سے آپ اندازہ لگائیے کہ یہ جو اس طمطراق سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ (بانیانِ پاکستان) زبان سے کچھ اور کہتے تھے اور ارادے ان کے کچھ اور تھے' اس باب میں خود ان کے اپنے کردار کی حالت کیا ہے۔

مودودی صاحب کا کردار

(۱) مودودی صاحب نے جب غلافِ کعبہ کے جلوس نکالے ہیں' تو اس پر لائل پور کے حکیم عبدالرشید اشرف صاحب نے اپنے جریدہ المنبر کا غلافِ کعبہ نمبر شائع کیا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس ڈرامے کے پس پردہ کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ واضح رہے کہ اشرف صاحب کسی زمانے میں جماعتِ اسلامی میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے ہیں۔ انہوں نے اس پرچہ میں ایک اور واقعہ بھی لکھا تھا جسے ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

"۱۹۵۵ء میں مرکزی شوریٰ کے ایک اجلاس کے دوران مولانا مودودی صاحب سے انتہائی عقیدت و محبت رکھنے والے ایک عظیم تر رکن مجلسِ شوریٰ نے (عظیم تر اس لئے کہ وہ مولانا کے نزدیک بھی بے حد قابلِ اعتماد تھے اور جماعتی مناصب و معاملات میں بھی انہیں آخری درجے کے مواقع سالہا سال تک میسر رہے ہیں) سخت اضطراب کی حالت میں یہ بیان کیا کہ امیر جماعت سے میری عقیدت کا شیشہ اس وقت چکنا چور ہوا جب مولانا نے ترجمان القرآن میں ایک سوال کے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ

'میں خود نہ سپاسناموں کو پسند کرتا ہوں نہ پھولوں کے ہاروں اور ان کی بارش کو' یہ سب کچھ میری مرضی کے بغیر بلکہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا ہے اور مجھے مجبوراً اس لئے گوارا کرنا پڑتا ہے کہ ایک طرف سے اخلاص و محبت کا اظہار اگر کسی نامناسب صورت میں ہو تو دوسرا فریق لیا اوقات سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ اگر میں کسی جگہ جا کر اتروں اور وہاں بہت سے لوگ ہار لے کر آئے ہوں تو کیا یہ کوئی اچھا اخلاق ہوگا کہ میں ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دوں اور ان سے کہوں کہ لے جاؤ اپنے ہاروں کو' میں انہیں قبول نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعوت میں بلایا جاؤں اور عین وقت پر مجھے معلوم ہو کہ داعیوں نے ایک سپاس نامہ نہ صرف تیار کر رکھا ہے بلکہ طبع بھی کرا لیا ہے اور میں کہوں کہ رکھو اپنا سپاسنامہ۔'

ان محترم رکن مجلسِ شوریٰ نے گہرے تاثر سے فرمایا کہ مولانا کی یہ بات صراحتاً خلافِ واقعہ ہے۔ اور تو اور ہمارے اپنے ہاں کا واقعہ ہے کہ ہم نے ..... سے بتوسط ..... سپاسنامہ مرکز میں بھجوایا اور یہاں سے ترمیمات کے ساتھ واپس آ گیا۔ مولانا جب ہمارے ہاں تشریف لائے تو یہی سپاسنامہ ان کی خدمت میں مع تفصیل کے پیش کیا گیا۔ مولانا کا یہ جواب کیا صریح طور پر ..... کی تعریف میں نہیں آتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا اقامتِ دین ہم سے ہو سکے گی جو مولانا کے زیرِ قیادت اس کا علم اٹھائے پھرتے ہیں .....

(۱) مودودی صاحب نے ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۴۸ء میں بالتصریح لکھا تھا کہ تصویر اتروانا حرام ہے۔ اس کے وجود ان کی اپنی تصاویر آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے ان سے سوال کیا کہ آپ اخباری نمائندوں کو منع کیوں نہیں کرتے کہ وہ آپ کا فوٹو نہ اتاریں۔ اس پر مودودی صاحب نے فرمایا۔

بار بار منع کر چکا ہوں۔ ایک شخص کو اچانک شوٹ کر لیا جائے اور کیمرہ بندوق کی طرح کام کر جائے تو اس میں مقتول کا کیا قصور ہے۔

معترض نے کہا کہ جس وقت وہ فوٹو لینے لگیں آپ اسی وقت منع کر دیا کریں۔

اس پر مودودی صاحب نے فرمایا۔

جب ایک آدمی حرام کا ارتکاب کرنے لگتا ہے تو اسے اگر روکا جائے اور وہ نہ رکے تو وہ شدید گنہگار ہو گا۔ مجھے چونکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس وقت نہیں رکیں گے اس لئے اس موقعہ پر منع نہیں کرتا۔ ویسے اس معاملہ میں اسلام کے احکامات سے کون سا اخباری نمائندہ یا فوٹو گرافر بے خبر ہے۔ (آئین۔ لاہور - ۱۶ راپریل ۱۹۶۶ء)

آپ نے سن لی۔ اب کردار کی طرف آیئے۔ المنبر نے اپنی ۷ - ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں، جماعتِ اسلامی ارباب حل و عقد کو مخاطب کرتے ہوئے سوالات کی شکل میں حسب ذیل انکشافات کئے تھے۔

(۱) آپ مرکزی جماعت سے معلوم کیجئے کہ کیا کبھی کراچی سے کوئی انگریزی ہفت روزہ جمعیت طلبا کے کارکنوں کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ اس پر مرکزی بیت المال کے دس ہزار روپے صرف ہوتے تھے اور اس میں غیر اسلامی تصاویر شائع ہوا کرتی تھیں۔

(۲) کیا کبھی جماعت کے عظیم تر رہنما نے یہ تجویز مرکزی شوریٰ میں رکھی تھی کہ پاکستان کے فلاں حکمران کے دورۂ امریکہ کی تصاویر کا البم جماعت اسلامی اپنے اہتمام سے شائع کرے اور اسے انتخابی مہم میں استعمال کرے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح امان اللہ خاں مرحوم افغان کی ملکہ کے

دورہ کی تصاویر بیچ سفر کے انقلاب کے وقت شائع کی گئی تھیں۔)

(۳) کیا یہ درست ہے کہ جماعتِ اسلامی کے صفِ اول کے راہ نماؤں کے نیم جماعتی اور ذاتی مجلات و اخبارات میں غیر اسلامی تصاویر شائع ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اور

(۴) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بعض کارکنوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے بعض دوروں کی تصاویر کے البم بنائے ہوں اور ان البموں کی تفصیلات مرکزی مجلسِ شوریٰ میں زیرِ بحث آئی ہوں۔ اور اس کے باوجود جماعتِ اسلامی کے مرکز یا امیر نے ان کارکنوں کو اس فعل سے نہ روکا ہو۔

(۳): اسی اخبار کی ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں یہ واقعہ بھی شائع ہوا تھا۔

۱۹۵۸ء کی معرکۃ الآراء شوریٰ جماعت اسلامی جس میں جائزہ کمیٹی کی "رپورٹ" زیرِ بحث آئی، اس رپورٹ میں متعدد ارکانِ جماعت کی جانب سے یہ الزام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لگایا گیا تھا کہ مولانا مودودی نے تحریکِ اسلامی کے محرکِ اول اور جماعتِ اسلامی کے بانی و امیر کی حیثیت سے یہ تصور پیش کیا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں "قتل گاہیں ہیں، اس لئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرنا انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے — چنانچہ مولانا کی اس زوردار تنقید سے متاثر ہو کر جماعتِ اسلامی کے متعدد کارکنوں اور ارکان نے اپنی اولاد کو مروجہ تعلیم سے محروم رکھا۔ اور ان میں سے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کی اولاد کا اس تعلیم سے محروم رہ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی برادری میں "نکو" بنا دیں اور ان کے رشتوں ناطوں تک کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس تنقید اور مسلمانوں کو موجودہ تعلیم گاہوں سے اپنی اولادوں کو اٹھا لینے کی دعوت کے بعد خود امیر جماعت نے اپنے لڑکوں کو انہی کالجوں میں داخل کرایا — یہی اقدام ناقابلِ تصور تھا، مگر جب ارکانِ جماعت نے یہ سنا کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرا دیا ہے تو ارکانِ جماعت کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ اگر خود داعی ہی اپنی دعوت کے پرخچے اڑانے لگے تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔

جب یہ سوال مرکزی شوریٰ کے زیرِ بحث آیا اور ارکانِ شوریٰ اس پر اظہارِ رائے کر چکے، تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس الزام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

"میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ظالم باپ بننے اور ایک داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنے کا، اور دوسرا راستہ زیورِ تعلیم سے اپنی اولاد کو آراستہ کرنے کا —

اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں میں بعض لوگوں کے تصور کے مطابق داعی کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر "ظالم باپ" ضرور بنتا۔ اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتا اور جہاں تک بس چلتا اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی۔"

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے اس جواب کا ردعمل شوریٰ میں کیا ہوا؟ یہاں اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ جماعت اسلامی کے ایسے کارکن جو دوسروں کے تنکوں پر بحث ہی نہیں کرتے، ان پر تبرے بھی برساتے ہیں، وہ اپنے شہتیروں کو کیوں نظر انداز کئے ہوئے ہیں؟ کیا وہ مولانا مودودی صاحب کے اس اسوہ سے بے خبر ہیں؟

(۴)۔ ماہنامہ میثاق لاہور کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۶۶ء میں حسب ذیل واقعہ مرقوم تھا۔ واضح رہے کہ یہ مجلہ (مولانا) امین احسن اصلاحی صاحب کی زیر سرپرستی شائع ہوتا ہے جو کسی زمانے میں مودودی صاحب کے دست راست اور ان کی عدم موجودگی میں جماعت کے امیر ہوتے تھے۔ تحریر تھا۔

مجلس شوریٰ کے ایک بزرگ ترین رکن کا ایک بیان ہے جس سے مودودی صاحب کے قائم کردہ نظریہ حکمت عملی کی حقیقت پر بڑی اچھی روشنی پڑ سکتی ہے کہ جب ملک میں مرزائیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا تو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس تحریک میں عملاً کوئی حصہ نہ لے۔ لیکن جب جماعت کے حلقہ حیاتی امرا کا اجتماع منعقد ہوا تو جماعت کے امیر جناب مودودی صاحب نے ان کو ہدایات دیں کہ اب جتنی بھی آگ بھڑکائی جا سکتی ہے بھڑکاؤ۔ اس پر ان بزرگ رکن شوریٰ نے اعتراض کیا کہ یہ ہدایات مجلس شوریٰ کے فیصلے کے قطعی خلاف ہیں، تو انہیں حکماً خاموش کر دیا گیا۔ اور پھر جب تحقیقاتی عدالت کے سامنے مودودی صاحب نے اپنا بیان دیا تو اس میں صاف طور پر یہ کہا گیا کہ جماعت نے عملاً اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ ہے نظریہ حکمت عملی کی ایک عملی مثال جس کے شاہد ایک سابق بزرگ ترین رکن شوریٰ ہیں۔

بانیان پاکستان، تو اس لئے اسلامی نظام قائم نہ کر سکے کہ وہ کہتے کچھ تھے اور نیتیں ان کی کچھ اور تھیں۔ لیکن ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جس شخص کا کردار یہ ہو (جس کی چند ایک جھلکیاں اوپر دکھائی گئی ہیں) کیا وہ اسلامی نظام قائم کر سکتا ہے؟ چھاج تو بولے، چھلنی کیا بولے؟

اور لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھتے جائیے کہ مودودی صاحب کو "اردو" کا نکتہ کب اور کیوں یاد آیا۔ انہوں

نے مارچ ۱۹۴۰ء میں لکھا تھا کہ مسلم لیگ کے کسی لیڈر نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ان کا مقصد پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ آپ نے خود اس کا اقرار کیا ہے کہ قائداعظمؒ نے پاکستان ریزولیوشن (مارچ ۱۹۴۰ء) کے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہوگا! اس پر انہوں نے کھسیانے ہو کر فرمایا کہ ہاں! ان لوگوں نے ایسا کہا تو تھا لیکن پاکستان بننے کے بعد نظر آیا کہ ان کا ارادہ اسلامی نظام قائم کرنے کا نہیں تھا۔

(۰)

دوسرا اعتراض

صاحبِ مکتوب نے کہا ہے کہ

اگر وہ حضرات (بانیانِ پاکستان قائداعظمؒ سمیت) اپنے وعدوں پر قائم رہنے کا ارادہ رکھتے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی شراب اور قمار کو بند کر دیتے۔

جذبات میں بہ کر انسان کس طرح حقائق کو نظرانداز کر دیتا ہے؟ اس کی شہادت اِس اعتراض سے بخوبی مل سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منکرات (شراب جوا وغیرہ) کا روکنا اسلامی حکومت کا فریضہ ہوتا ہے لیکن ذرا سوچئے کہ یہاں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوری بعد حالات کیا تھے۔ اس وقت ایک نوزائیدہ مملکت اس طرح وجود میں آئی تھی کہ اسکے حصہ کا نقد سرمایہ تمام ہندوستان کے قبضہ میں تھا۔۔۔ حکومتِ پاکستان کے پاس تنخواہیں دینے تک کے لئے بھی روپیہ نہیں تھا۔ فوج اور اسلحہ بھی ہنوز ناتقسیم شدہ بھارت کی تحویل میں تھا۔ باؤنڈری کمیشن کے غیر متوقع فیصلے نے عجیب پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ جوناگڑھ حیدر آباد وغیرہ پر ہندوستان پولیس ایکشن کے ذریعے ناجائز قبضہ کر چکا تھا کشمیر میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ ادھر ہندوستان میں سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان پناہ گزیں کارواں درکارواں پاکستان کی طرف دھکیلے جا رہے تھے۔۔۔ خانماں خراب۔ تباہ حال۔ متاع بردہ۔ نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔ نہ جیب میں ایک پیسہ۔ بھوکے، ننگے، زخمی۔۔۔ دن۔ رات رواں دواں' روتے کراہتے چلے آ رہے تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں رکھا کہاں جائے اور سنبھالا کیسے جائے۔ اِدھر یہ حالت، اُدھر ہندوستان' اندر ہی اندر اس قسم کی تجویزیں کر رہا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے۔۔۔ آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں پاکستان کے گورنر جنرل' قائداعظمؒ کو اتنی فرصت تھی کہ یہاں شراب خانے اور قمار خانے بند کرانے کے اقدامات کرتا؟ کیا اس وقت سب سے مقدم مسئلہ پاکستان کی حفاظت اور لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کو سنبھالنے کا تھا یا اصلاحی اقدامات کا؟ اگر اُس وقت ملک کی حفاظت اور مہاجرین کی آبادکاری جیسے اہم ترین بنیادی مسائل کی طرف پوری پوری توجہ نہ دی جاتی، تو آج نہ ہمارے مکتوب نگار کراچی کے ایک محلے میں محفوظ بیٹھے' اس قسم کے خطوط لکھ سکتے اور نہ ہی ہم لاہور کے ایک مامون و مصئون گوشے میں اس کا جواب۔۔۔ جماعتِ اسلامی نے اپنے تباہ کن پراپیگنڈے

سے ملک میں اس قدر نفرت کی فضا پیدا کر رکھی ہے کہ بجائے اس کے کہ آج ہم شکر گذار ہوں کہ قائد اعظمؒ نے ایسے نازک اور پُر خطر حالات میں اپنی جان دے کر ہماری حفاظت کا سامان پیدا کر دیا، ہم اُلٹے انہیں (معاف فرمائیں) منافق اور بددیانت قرار دیتے ہیں ــــ ایسی احسان فراموش قوم بھی دنیا نے کہیں نہیں دیکھی ہو گی ــ ہمارے محترم! حالات کے پیشِ نظر تقدم و تأخر کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ خود حضورِ نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں خمر، میسرہ اور زنا جیسے منکرات کی ممانعت کے احکام مکہ کی تیرہ سالہ زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں جا کر نازل ہوئے تھے۔ اگر جماعتِ اسلامی یا اس کے پراپیگنڈہ سے متأثر حضرات وہاں ہوتے تو یقیناً خدا پر بھی (نعوذ باللہ) اعتراض کر دیتے کہ اس نے سلسلہ وحی کے آغاز کے فوری بعد شراب، جوا وغیرہ بند کرنے کے احکامات کیوں نہ نازل کئے!

اب رہا ۱۹۴۷ء کے بعد کا زمانہ ــــ سو بیشک بعد کی حکومتیں مجرم ہیں کہ انہوں نے اس باب میں بڑا تساہل برتا۔ لیکن ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب جو (ان کے بیان کے مطابق) یہاں آئے ہی اس لئے تھے کہ پیدائشی مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کو اسلام کی طرف لے آیا جائے وہ اس تمام بیس تیئیس سال کے عرصہ میں کیا کرتے رہے! انہوں نے عائلی قوانین کے خلاف ملک گیر مہم چلائی۔ انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ایسے ایسے محاذ قائم کئے گویا اسلام کی بقا کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کی اُس صدارت کے لئے جسے وہ شرعاً قطعی طور پر ناجائز قرار دے چکے تھے، "جہادِ عظیم" کہا۔ انہوں نے انتخابات جیتنے کے لئے لاکھوں، کروڑوں روپے خرچ کر دیئے ــــ حالانکہ وہ کسی شخص کے بطور امیدوار کھڑے ہونے کو یکسر خلافِ اسلام قرار دے چکے تھے۔ انہوں نے (بزعم خویش) بحالیٔ جمہوریت کے لئے مسلسل خلفشار پیدا کیا ــــ انہوں نے یہ سب کچھ کیا، لیکن یہ فرمایئے کہ انہوں نے شراب خانے، قمار خانے، ریس، زناکاری، وغیرہ بند کرانے کے لئے ایک انگلی تک بھی اٹھائی؟ "بانیانِ پاکستان" تو گردن زدنی ٹھہرے کہ ان کا ارادہ ہی یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کا نہیں تھا، اور اربابِ حکومت (بقول ان حضرات کے) فسق کار تھے، اس لئے وہ ان فحاشیوں کو کیوں روکتے۔ لیکن ان صالحین کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں بھی ایک عملی قدم بھی نہ اٹھایا۔

خزاں تو موردِ الزام ہی سہی، لیکن
بہ فیضِ بادِ صبا بھی تو گل کہیں نہ کھلے

(۵)

اب ہم اس آخری اور سب سے محکم، دلیل کی طرف آتے ہیں جو اس دعوے کے ثبوت میں دی گئی ہے کہ

دو قومی نظریہ

"بانیانِ پاکستان" کا ارادہ ہی نہیں تھا کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے اور دلیل یہ ہے کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کو تج کیا۔

اگر صاحبِ مکتوب "طلوعِ اسلام" کا مطالعہ باقاعدہ کرتے ہیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ طلوعِ اسلام مسلسل سال بہ سال سے پکار رہا ہے کہ اگر ہم نے اپنے آئین کی بنیاد دو قومی نظریہ پر نہ رکھی تو نہ صرف یہ کہ یہ مملکت کبھی اسلامی نہیں بن سکے گی بلکہ خود وہ بنیاد ہی ختم ہو جائے گی جس پر مطالبہ اور اس کے نتیجہ میں تشکیلِ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ دو قومی نظریہ ہی ہمارے "ہندوستان سے علیحدہ ہونے کی بنیاد تھا۔ اور اگر یہ بنیاد باقی نہ رہتا تو پاکستان کے ایک جداگانہ مملکت رہنے کا جواز بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس باب میں موردِ الزام کون ہے؟

جہاں تک قائداعظمؒ کا تعلق ہے، ان کی بریت کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس باب میں ان کے سب سے بڑے مخالف — مودودی صاحب — نے ان کی بریت کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔ قائداعظمؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مجلسِ دستور سازِ پاکستان میں جو تقریر کی تھی اس سے بعض گوشوں کی طرف سے یہ شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اس سے دو قومی نظریہ کا ابطال ہوتا ہے۔ یہ سوال منیر انکوائری کمیٹی میں بھی اٹھایا گیا تھا جس کے جواب میں مودودی صاحب نے اپنا ایک بیان کمیٹی کو بھیجا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا۔

> قائداعظمؒ کی اس تقریر کے الفاظ خواہ بظاہر پہلے اور دوسرے مفہوم کے حامل ہیں مگر ہمارے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کا منشا بھی حقیقت میں وہی تھا جو ان کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے مرتبے کے انسان سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ پاکستان کے قیام سے پہلے دس سال تک جن اصولوں کو بنیاد بنا کر لڑتے رہے تھے ان سے وہ پاکستان قائم ہوتے ہی یک لخت پلٹ گئے ہوں گے اور انہی اصولوں کے قائل ہو گئے ہونگے جن کے خلاف انہوں نے اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر جنگ کی تھی۔ نیز ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ وہ قیامِ پاکستان کے پہلے ہی دن یکایک اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے ہونگے جو انہوں نے بارہا صاف اور صریح الفاظ میں اپنی قوم سے کئے تھے اور جن کے اعتماد ہی پر قوم ان کو اپنا لیڈر مان کر اپنی جان و مال ان کے اشاروں پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوئی تھی۔ پھر ہمارے لئے یہ ماننا بھی ممکن نہیں ہے کہ قائداعظمؒ ایسی متضاد باتیں کر سکتے تھے کہ ۱۱ اگست کو ایک اعلان کریں اور پھر اس کے بعد بار بار اس کے بالکل خلاف باتوں کا مسلمان پبلک کو یقین دلاتے رہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان کی مذکورہ بالا تقریر کو ان کے اگلے اور پچھلے ارشادات کی روشنی میں سمجھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت

اس کے کہ ہم اس کا کوئی ایسا مفہوم لیں جو ان کی تمام باتوں کے خلاف پڑتا ہے جو انہوں نے اس سے پہلے فرمائیں، اور اس کے بعد بھی فرماتے رہے۔

سب کو معلوم ہے کہ قائداعظمؒ کی کانگریس سے لڑائی تھی ہی دو قومی نظریئے کی بنیاد پر۔ اراگست ۱۹۴۷ء تک ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ ملکر ایک متحدہ وطنی قومیت نہیں بنا سکتے۔ اس کے متعلق ان کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں سے صرف ایک تحریر کا اقتباس میں یہاں نقل کروں گا جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے ساتھ اپنی خط و کتابت کے سلسلے میں لکھی تھی۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے قائداعظمؒ کی چٹھی کا اقتباس دیا تھا اور پھر لکھا تھا۔

اب کیا ہم یہ باور کرلیں کہ ۱۱راگست کو یک لخت وہ تمام خصوصیتیں مٹ گئیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جدا کر کے ایک الگ قوم بناتی تھیں اور یکایک ایک ایسی نئی قومیت کے اسباب فراہم ہو گئے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا جذب ہونا ممکن ہو گیا؟ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو قائداعظمؒ کو اس الزام سے نہیں بچایا جا سکتا کہ وہ ایک با اصول آدمی نہ تھے بلکہ محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر اصول بناتے اور بدلتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے پانچ سال بعد ان کی روح کو ایسے الزامات کا تحفہ پیش کرنے کے لئے میں تو کسی طرح تیار نہیں ہو سکتا۔

(بحوالہ ایشیا۔ ۱۳ر ستمبر ۱۹۷۰ء)

نا' مودودی صاحب نے اپنے اس بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ

بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی قائداعظمؒ مسلمانوں سے ایک اسلامی ریاست کا وعدہ کرتے رہے تھے۔ اور اس کے بعد بھی وہ اس وعدے کو دہراتے رہے۔

ودی صاحب کی شہادت سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ حصولِ پاکستان کے بعد (کم از کم) قائداعظمؒ نے دو قومی نظریہ کو تیاگ دیا تھا اور نہ ہی وہ اس مملکت میں اسلامی نظام قائم کرنے کے وعدے سے پھر ے تھے۔ ان کے بعد اس معاملہ کو آئینِ پاکستان میں واضح کیا جانا تھا لیکن ۱۹۵۶ء کے آئین اور ۱۹۶۲ء آئین' دونوں میں' اس نظریہ کے خلاف' پاکستان میں بسنے والے تمام افراد (مسلم و غیر مسلم) کو ایک قوم دیا گیا۔ طلوعِ اسلام نے اس پر سخت احتجاج کیا، لیکن جماعتِ اسلامی نے ۱۹۵۶ء کے آئین کا استقبال طرح سے کیا' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس آئین کو ضروری یمات کے ساتھ اپنا لیا جائے کیونکہ وہ اسلام کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ حتیٰ کہ اس جماعت نے جو اپنا

انتخابی منشور شائع کیا ہے اس میں بھی پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔ جماعتِ اسلامی اپنے امیر (مودودی صاحب) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ گنایا کرتی ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کے حق میں بہت کچھ لکھا تھا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے وہاں یہ کچھ کیا تھا اور دو قومی نظریہ کو کفر اور اسلام میں حدِ فاصل قرار دیا تھا۔ (تفصیل ان امور کی طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۰ء کے لمعات میں ملاحظہ فرمائیے)۔ انہوں نے "مسلم و غیر مسلم کے اختلاط سے جمہوری حکومت کو "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" قرار دیا تھا اور یہی تھی وہ "کافرانہ حکومت" جسے اسلامی بنانے کے لئے وہ پاکستان تشریف لائے تھے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد وہ خود متحدہ قومیت کے اس قدر حامی ہو گئے کہ انہوں نے ۱۹۵۶ء کے آئین کے بعد انتخابات کے سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعتِ اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ اس کے برعکس، اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہو گی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۶۴ء۔ صفحہ ۲۲)

اور ان کے حالیہ منشور کے سلسلہ میں جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ آپ پہلے تو یہ کہا کرتے تھے کہ "اسلامی حکومت کی پارلیمان میں غیر مسلموں (اہلِ ذمہ) کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ہو گا" اور اب آپ انہیں برابر کا حق دیتے ہیں۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ

> یہ دراصل ایسے ذمی نہیں ہیں جیسے ابتدائے اسلام میں ہوا کرتے تھے۔ یعنی وہ غیر مسلم جو جنگ سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کی حکمرانی قبول کرتے تھے۔ یہ لوگ ایک سیاسی نظام کے تحت ذمی ہوئے ہیں، اس لئے اگر وہ قومی اسمبلی میں آتے ہیں تو ہمیں یہ صورتِ حال قبول کرنی پڑے گی۔
>
> (جماعتِ اسلامی کے منشور پر تبصرہ مطبوعہ طلوعِ اسلام۔ بابت فروری ۱۹۷۰ء)

باقی رہے اُن علماء کے ۲۲ اصول (جن کا ذکر مکتوب میں کیا گیا ہے) سو اس کے آج بھی سب سے زبردست حامی مودودی صاحب ہیں جو بار بار کہتے ہیں کہ آئندہ آئین ان نکات کی بنیادوں پر مرتب کیا جائے گا۔

آخر میں ہم دہرا دیں کہ ملک میں جو عناصر ایسے تھے یا اب ہیں جو نظریہ پاکستان (دو قومی نظریہ) یا ملک میں صحیح اسلامی (قرآنی) نظام کے خلاف ہیں یا ان کے راستے میں کسی قسم کی بھی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں وہ ہمارے نزدیک اسلام اور پاکستان دونوں کے بدترین مجرم ہیں اور ان کا مواخذہ نہایت ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مواخذہ سے اس شخص اور اس جماعت کو کیوں مستثنےٰ قرار دیا جاتا ہے جو ان ہر دو امور کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں — کیا محض اس لئے کہ ان کے قبضہ میں پروپیگنڈا کی زبردست مشینری ہے؟

— — (ختم) — —

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت ماہ اگست ۱۹۷۰ء)

حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے:

فہرست "الف"

نام	مقام	رقم
۱۔ محترم محمد رفیق لون صاحب	دہران	۲۵/- روپے

فہرست "ب"

نام	مقام	رقم
۱۔ محترم علاء الدین صاحب	چک گ ب	۱۰/-
۲۔ " عبدالواحد صاحب	"	۱۰/-
۳۔ " خواجہ سمیع الحق صاحب	نوشہرہ	۵۰/-
۴۔ " خان بخشد جمال خان صاحب	مردان	۱۰/-
۵۔ " خالد صاحب	ابوظہبی	۵۰/-
۶۔ " عبدالقادر مظفر صاحب	لاہور	۱۰۰/-
۷۔ " محمد اسمٰعیل صاحب	مری	۳/-
۸۔ " چوہدری عبدالغنی صاحب	گجرات	۷/-
۹۔ " چوہدری محمد حسین صاحب	"	۱۰۰/-
۱۰۔ " مرزا محمد یوسف صاحب	دلیونہ منڈی	۲/-
۱۱۔ " علی اکبر شاہ صاحب	"	۵/-
۱۲۔ " سردار خان صاحب	"	۵/-
۱۳۔ " محمد صدیق صاحب	"	۱۰/-
۱۴۔ " ثناء اللہ قریشی صاحب	اسلام آباد	۲۰/-
۱۵۔ محترم محمد حسین جعفری صاحب	سیالکوٹ	۱۰۰/-
۱۶۔ " اکبر علی صاحب	گلاسگو	۹۵/۶۰
۱۷۔ " عبدالعزیز صاحب	"	۹۵/۶۰
۱۸۔ " حاجی ابن حسین صاحب	"	۹۵/۶۰
۱۹۔ " غلام رسول صاحب	"	۱۹/۱۲
۲۰۔ " غلام رسول صاحب (جنرل سٹور)	"	۹۵/۶۰
۲۱۔ محترمہ فضیلت رفیق صاحبہ	دہران	۱۵۳/۳۰
۲۲۔ محترم عبدالحمید صاحب	مانچسٹر	۹۵/۵۰
۲۳۔ " سرور خان صاحب	"	۳۸/۲۰
۲۴۔ " صوبان علی خان صاحب	"	۱۹/۱۰
۲۵۔ " عبدالرشید گوندل صاحب	"	۱۹/۱۰
۲۶۔ " ایم۔ اے حنیف صاحب	"	۱۹/۱۰
۲۷۔ " محمد اقبال بٹ صاحب	"	۹/۵۵
۲۸۔ " محمد صابر صاحب	"	۱۹/۱۰
۲۹۔ " ایم۔ اے جاوید صاحب	"	۱۹/۱۰
۳۰۔ " اعجاز صاحب	"	۹۵/۵۰
۳۱۔ " سید عالم صاحب	"	۱۹/۱۰

نام	مقام	روپے
۳۳۔ محترم محمد خان صاحب۔	مانچسٹر ۱۹۷۰	۱۹/۱۰
۳۴۔ " بشیر احمد صاحب۔	" ۱۹۷۰	۱۹/۱۰
۳۵۔ " نذیر احمد صاحب۔	" ۱۹۷۰	۱۹/۱۰
۳۵۔ " ابرار حسین صاحب	" ۱۹۷۰	۱۹/۱۰
۳۶۔ " عمر حیات و محمد یوسف صاحبان۔	انگلینڈ	۴۲/۳۸
۳۷۔ " اشتیاق احمد صاحب	لندن	۴۲/۳۸
۳۸۔ " رحمت علی صاحب	بریڈفورڈ	۴۲/۳۸
۳۹۔ " محمد حسین صاحب	ڈیوزبری	۴۲/۳۸
۴۰۔ " محمد اسلم صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۱۔ " محمد اقبال صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۲۔ " محمد مجتبیٰ صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۳۔ " سلیم اختر صاحب	مانچسٹر ۱۹۷۰	۴۲/۳۸
۴۴۔ " راجہ محمد نواز صاحب۔	برمنگھم ۶۹	۱۰۵/۹۵
۴۵۔ محترم محمد عظیم صاحب	برمنگھم ۶۹	۴۲/۳۸
۴۶۔ " نذیر احمد صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۷۔ " عبدالخالق صاحب	" ۷۰	۲۱/۱۹
۴۸۔ " محمد رفیق صاحب	" ۷۰	۲۱/۱۹
۴۹۔ " خالد محمود صاحب	" ۷۰	۴۲/۳۸
۵۰۔ " محمد ایوب صاحب	" ۷۰	۴۲/۳۸
۵۱۔ " ضلع ساہیوال کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے		۱۰۰/-
۵۲۔ " محمد امین الحق صاحب	ڈھاکہ	۱۰/-
۵۳۔ " سیف الاسلام صاحب	"	۲۵/-
۵۴۔ " محمد سلیمان صاحب	رنگون	۵۰/-
۵۵۔ " محمد اکرم راٹھور صاحب	ڈھاکہ	۱۵/-
۵۶۔ " کرم الٰہی صاحب ڈھاباں سپری (جہلم)		۵/-

نوٹ :۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ ۲۵/بی، گلبرگ لاہور کو دیئے گئے عطیات ' ایس ۔ آر ۔ او نمبر ۶۵ (K) ۶۵ مؤرخہ ۴ راگست ۱۹۶۵ء مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ II مؤرخہ ۱۲ اگست ۱۹۶۵ء کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵-۱۵ کے ماتحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

عطیات "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ، ۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور" کے نام بھیجے جائیں۔

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ - لاہور

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

(۱) قرآن کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے خدا کی طرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطۂ حیات ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اس لئے حضورؐ کی سیرت کے نقوشِ قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

(۲) حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں آئی ہیں' ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآنِ کریم کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) جو حکومت، قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی' اسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت' یا اسلامی مملکت کہا جائے گا۔

(۴) اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ——— خوراک، مکان، لباس، علاج، وغیرہ ——— بہم پہنچائے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشو و نما پانے کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا عمل)، تھیاکریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھا جانا۔) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کے بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

(۶) اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

(۷) طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رُو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں' وہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

(۸) اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اس کا ساتھ دیجئے۔

(ناظم)

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون
سالانہ — پاکستان — دس روپے	پاکستان — ایک روپیہ	۸۰۸۰۰
سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے	ہندوستان	خط و کتابت
سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ	ڈیڑھ روپیہ	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد (۲۳) — دسمبر ۱۹۷۰ء — نمبر (۱۲)

فہرست

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر: سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور، پرنٹر: شیخ محمد اشرف، مطبوعہ: اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

جشنِ نزولِ قرآن

دنیا کی ہر قوم سال میں کوئی نہ کوئی دن بطورِ تہوار ضرور مناتی ہے۔ ان کے یہ تہوار، قومی ہوتے ہیں یا وطنی، گروہی ہوتے ہیں یا مذہبی۔ اس گروہ بندانہ تفریق کی بنا پر ان تہواروں کا تعلق انسانوں کے ایک خاص حلقہ تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان میں کوئی تہوار بھی ایسا نہیں جسے تمام نوعِ انسانی بطورِ جشنِ مسرت منائے —— آج تو اس قسم کا کوئی تہوار نہیں، لیکن قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے، ایک ایسا تہوار تجویز کیا تھا جسے پوری کی پوری عالمگیر انسانیت بطورِ جشنِ شادمانی منائے۔ اس تقریب کے سلسلہ میں اس نے کہا تھا —— يَآاَيُّهَا النَّاسُ۔ اے نوعِ انسان قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، تمہارے پاس ایک ایسا ضابطۂ قوانین آگیا ہے جس میں ہر قسم کی نفسیاتی کشمکش کا علاج ہے اور جو ہر اس قوم کو جو اسے بطورِ ضابطۂ حیات اختیار کر لیتی ہے۔ کامیابیوں کی راہ کی طرف راہ نمائی عطا کر دیتا ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ رَحْمَتِهٖ۔ ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ حیات کا مل جانا محض خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم اسے کسی قیمت پر بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر اور گراں بہا ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو۔

یہ تھی وہ تقریب جسے خدا نے تمام نوعِ انسان کے لئے جشنِ مسرت منانے کے لئے تجویز کیا تھا۔ یعنی نزولِ قرآن کی یاد میں جشنِ شادمانی۔ اور جو اب دنیا کی دوسری قوموں کے تہواروں کی طرح "صرف مسلم قوم" کا تہوار بن کر رہ گیا ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ مسلمان اسے عید الفطر کہہ کر مناتے تو ہیں لیکن ان سے کتنے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ہم یہ تہوار کیوں مناتے ہیں، اور یہ تقریب کس عظیم و جلیل واقعہ کی یاد میں مقرر کی گئی تھی۔ انہیں اب اتنا ہی علم ہے کہ اس عید پر سویاں کھائی جاتی ہیں اور بھک منگوں کو فطرانے کے پیسے

جاتے ہیں۔ آیئے، ہم آج کی صحبت میں دیکھیں کہ اس تقریب کو خدا نے پوری نوع انسانی کے لئے جشن مسرت کیوں قرار دیا تھا۔

——— (۰) ———

قرآن کریم میں انسان کی سرگذشت کو قصۂ آدم (یعنی آدم کی کہانی) کے تمثیلی پیرایہ میں نہایت بصیرت افروز اور حقیقت کشا انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس داستان کے آغاز ہی میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم ایک عالمگیر برادری کے افراد ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ تم میں وحدت رہے۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲/۳۵)۔ اگر تم نے باہمی "مشاجرت" اختیار کرلی تو یاد رکھو! وہ جنتی زندگی جو وحدت انسانیت سے پیدا ہوتی ہے، تم سے چھن جائے گی اور اس سے تمہیں سخت نقصان پہنچے گا۔ "مشاجرت" کہ جس کا مادہ "شجر" ہے، کے معنی اختلاف اور تفرقہ کے ہیں۔

لیکن جب انسانوں میں "میری اور تیری" کی تفریق نمودار ہوئی تو ان کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ اس ٹکراؤ کا لازمی نتیجہ باہمی اختلاف اور افتراق تھا۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا۔ (۱۰/۱۹) تمام انسان ایک واحد برادری کی طرح رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اس تحزّب و تشیع میں پھر سے وحدت پیدا کرنا تنہا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں تھی، کہ عقل ہر فرد یا ہر گروہ کو اس کے اپنے مفاد کے تحفظ کا طریقہ تو بتا اور بتا سکتی ہے، عالمگیر انسانیت کے مفادات کا تحفظ اس کے حیطۂ کار سے باہر کی بات ہے۔ یہ وحدت، وحی کی راہنمائی ہی سے پیدا ہو سکتی تھی۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ تمام انسان شروع میں ایک برادری کی طرح رہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے تو فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ۔ اللہ نے انبیاء کو بھیجنا شروع کیا جو انہیں تشتت و افتراق کی انسانیت سوز زندگی کے عواقب سے آگاہ کرتے، اور اس کے برعکس وحدت و اخوت کے جنت بداماں نظام حیات کے خوشگوار نتائج ان کے لئے وجہ نشاط روح بناتے۔ اس کے بعد قرآن نے اس امر کی بھی صراحت کر دی کہ وہ کونسا نسخۂ کیمیا تھا جس سے حضرات انبیاء کرام ان اختلافات کو مٹانے کا طریق بتاتے تھے۔ کہا وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)۔ اور ان انبیاء پر خدا کی طرف سے کتاب نازل ہوتی جو یکسر حق و صداقت پر مبنی ہوتی۔ وہ (انبیاء کرام) لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ اس کتاب کی رُو سے کرتے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ انسانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لئے خدائی پروگرام یہ تھا کہ:

(۱) ایک ضابطۂ قوانین جو جس میں اختلافی امور میں عادلانہ فیصلہ دینے کی صلاحیت ہو۔ اور
(۲) ایک زندہ اور محسوس اتھارٹی ایسی ہو جو اس ضابطۂ قوانین کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کرے۔

اس نظام کا نام الدّین تھا۔ اور یہی وہ الدّین تھا جسے قائم کرنے کے لئے حضرات انبیاء کرام مبعوث ہوتے تھے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے کہ "اے رسول! ہم نے تمہیں الدّین کا وہی راستہ دکھایا ہے جو راستہ بذریعہ وحی انبیاء سابقہ۔ نوحؑ ابراہیمؑ موسیٰؑ، عیسیٰؑ — کو دکھایا گیا تھا"۔ انہیں یہ راستہ دکھایا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا۔ (۴۲/۱۳)

وہ الدّین کا نظام اس طرح قائم کریں کہ انسانوں میں تفرقہ باقی نہ رہے۔

ایک رسول آتا اور اس طرح الدّین کا نظام قائم کر کے چلا جاتا۔ لیکن اس کے بعد اس کے نام لیوا پھر باہمی تفرقہ پیدا کر لیتے۔ اس لئے نہیں کہ اس الدّین میں اختلاف واتحاد برقرار رکھنے کی صلاحیت نہیں رہتی تھی۔ وَ مَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَهُمْ (۴۲/۱۴)۔ ان کے نام لیوا مذہبی پیشوا، باہمی حسد اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کے جذبہ کی وجہ سے اپنے اپنے فرقے بنا لیتے اور اس طرح انسانیت پھر گروہوں میں بٹ جاتی۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا نکہ خدا کا آخری رسولؐ اس کی طرف سے آخری ضابطۂ حیات لے کر آ گیا۔ یہ تھا وہ ضابطۂ حیات جس کے ملنے پر نوعِ انسانی سے کہا گیا تھا کہ وہ جشنِ مسرت منائیں کیونکہ اس سے ان کے باہمی اختلافات مٹ جائیں گے اور دنیا میں پھر سے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل ہو جائے گی۔

قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ خدا کی کتاب ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں اس نے متعدد دلائل دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں کئی اختلاف پاتے۔

کسی کتاب میں اختلاف کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ (مثلاً) اس میں ایک جگہ کہا گیا ہو کہ خدا ایک ہے۔ اور دوسری جگہ ہو کہ خدا تین ہیں۔ تو یہ باہمی تضاد ہوگا۔ صرف اس قسم کا عدم تضاد کسی تصنیف کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کسی کتاب میں تضاد بہت بڑا عیب ہے اور معیاری مصنفین کی تصنیفات اس قسم کے عیوب و اسقام سے بالعموم پاک ہوتی ہیں۔ بے شک قرآنِ کریم میں اس قسم کا بھی کوئی سقم نہیں لیکن

اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی جو دلیل دی ہے وہ اس سے بہت بلند .... ہے۔ اس آیت میں لفظ تدبر بڑا معنی خیز ہے۔ تدبر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے پیچھے پیچھے چل کر اس کے انجام یا مآل سے کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ قرآن کی پیش کردہ دلیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم پر جب اور جہاں بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ ہمیشہ ایک جیسا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک گروہ اس پر عمل کرے تو وہ ایک نتیجہ پر پہنچے اور دوسرا اگر وہ عمل کرے تو وہ اس کا نتیجہ کچھ اور (اور دوسرے کے مخالف) ہو۔ یہ نکتہ' قوانینِ فطرت کی مثال سے زیادہ واضح ہو جائے گا۔ طبیعات (سائنس) کا ایک بنیادی قانون ہے۔ وحدتِ فطرت (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فطرت کے قوانین پر جہاں بھی عمل کیا جائے گا' نتیجہ یکساں مرتب ہوگا۔ پانی ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بننا شروع ہو جائے گا اور خاص برودت پر پہنچ کر منجمد ہو جائے گا۔ گندم کے بیج سے گندم پیدا ہوگی اور چنے کے بیج سے چنا ہر جگہ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ فطرت کے قوانین انسانوں کے وضع کردہ نہیں۔ یہ خالقِ فطرت کے پیدا کردہ ہیں۔ یہی دلیل قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دی ہے۔ یعنی اس پر عمل کرنے سے انسان ہمیشہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ لہذا ان کے اختلافات مٹ کر ان میں وحدت پیدا ہو جائے گی۔

اگر دو سائنٹسٹ' اپنی اپنی لیبارٹری میں کسی فارمولے پر عمل کر رہے ہوں' اور ان کا نتیجہ ایک دوسرے سے مختلف ہو' تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ دونوں ایک ہی فارمولے پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ دو مختلف فارمولوں پر عمل کر رہے تھے۔ فارمولوں کے اس طرح کے اختلاف کو قرآن کی اصطلاح میں شرک کہا جاتا ہے۔ اگر ایک فارمولے پر عمل کرنے والوں میں باہمی اختلاف نہیں تو اسے توحید کہا جائے گا اور اگر ان میں باہمی اختلاف ہوگا تو اسے شرک سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے' امتِ واحدہ کے فرقوں میں تقسیم ہو جانے کو شرک کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ اے جماعتِ مومنین' تم توحید پرست ہو جانے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲) اس فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہم تو حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔

جس قوم میں وحدت نہیں رہتی ـــــ وہ گروہوں، فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے۔ تو اس پر ذلت و خواری کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ اختلافات کا یہی وہ مآل ہے جس سے متنبہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ۔ دیکھنا! کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے باہمی اختلافات کئے اور فرقوں میں بٹ گئے' حالانکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے واضح تعلیم آچکی تھی۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴)۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سخت عذاب

(۱) ایک ضابطۂ قوانین جو جس میں اختلافی امور میں عادلانہ فیصلہ دینے کی صلاحیت ہو۔ اور
(۲) ایک زندہ اور محسوس اتھارٹی ایسی ہو جو اس ضابطۂ قوانین کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کرے۔
س نظام کا نام السّابقہ تھا۔ اور یہی وہ الدّین تھا جسے قائم کرنے کے لئے حضرات انبیاء کرام مبعوث ہوتے تھے سورۂ
وریٰ میں ہے کہ "اے رسول! ہم نے تمہیں الدّین کا وہی راستہ دکھایا ہے جو راستہ بذریعہ وحی انبیاء سابقہ۔ نوحؑ
براہیمؑ موسٰیؑ، عیسٰیؑ۔ کو دکھایا گیا تھا۔" انہیں یہ راستہ دکھایا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا (۴۲/۱۳)

وہ الدّین کا نظام اس طرح قائم کریں کہ انسانوں میں تفرقہ باقی نہ رہے۔

یک رسول آتا اور اس طرح الدّین کا نظام قائم کرکے چلا جاتا۔ لیکن اس کے بعد اس کے نام لیوا پھر باہمی تفرقہ
یدا کر لیتے۔ اس لئے نہیں کہ اس الدّین میں ائتلاف و اتحاد برقرار رکھنے کی صلاحیت نہیں رہتی تھی۔ وَمَا
تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴)۔ ان کے نام لیوا (مذہبی
پیشوا) باہمی ضد اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کے جذبہ کی وجہ سے اپنے اپنے فرقے بنا لیتے اور اس طرح
نسانیت پھر گروہوں میں بٹ جاتی۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ خدا کا آخری رسولؐ اس کی طرف سے آخری ضابطۂ حیات لے کر آگیا۔ یہ تھا وہ
ضابطۂ حیات جس کے ملنے پر نوعِ انسانی سے کہا گیا تھا کہ وہ جشنِ مسرت منائیں کیونکہ اس سے ان کے باہمی اختلافات
مٹ جائیں گے اور دنیا میں پھر سے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل ہو جائے گی۔

قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ خدا کی کتاب ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں
س نے متعدد دلائل دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ
لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف
سے ہوتا تو یہ اس میں کئی اختلاف پاتے۔

کسی کتاب میں اختلاف کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ (مثلاً) اس میں ایک جگہ کہا گیا ہو کہ خدا ایک ہے۔
ر دوسری جگہ ہو کہ خدا تین ہیں۔ تو یہ باہمی تضاد ہوگا۔ صرف اس قسم کا عدم تضاد کسی تصنیف کے منجانب اللہ
ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کسی کتاب میں تضاد بہت بڑا عیب ہے اور معیاری مصنفین کی تصنیفات
س قسم کے عیوب و اسقام سے بالعموم پاک ہوتی ہیں۔ بے شک قرآنِ کریم میں اس قسم کا بھی کوئی سقم نہیں لیکن

اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی جو دلیل دی ہے وہ اس سے بہت بلند .... ہے۔ اس آیت میں لفظ تدبر بڑا معنی خیز ہے۔ تدبر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے پیچھے پیچھے چل کر اس کے انجام یا مآل سے کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ قرآن کی پیش کردہ دلیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم پر جب اور جہاں بھی عمل کیا جائے گا، اس کا نتیجہ ہمیشہ ایک جیسا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک گروہ اس پر عمل کرے تو وہ ایک نتیجہ پر پہنچے اور دوسرا گروہ عمل کرے تو وہ اس کا نتیجہ کچھ اور (اور دوسرے کے مخالف) ہو۔ یہ نکتہ، قوانینِ فطرت کی مثال سے زیادہ واضح ہو جائے گا۔ طبیعات (سائنس) کا ایک بنیادی قانون ہے۔ وحدتِ فطرت (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فطرت کے قوانین پر جہاں بھی عمل کیا جائے گا، نتیجہ یکساں مرتب ہوگا۔ پانی ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بننا شروع ہو جائے گا اور خاص برودت پر پہنچ کر منجمد ہو جائے گا۔ گندم کے بیج سے گندم پیدا ہوگی اور چنے کے بیج سے چنا، ہر جگہ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ فطرت کے قوانین انسانوں کے وضع کردہ نہیں۔ یہ خالقِ فطرت کے پیدا کردہ ہیں۔ یہی دلیل قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دی ہے۔ یعنی اس پر عمل کرنے سے انسان ہمیشہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ لہذا ان کے اختلافات مٹ کر ان میں وحدت پیدا ہو جائے گی۔

اگر دو سائنٹسٹ، اپنی اپنی لیبارٹری میں کسی فارمولے پر عمل کر رہے ہوں، اور ان کا نتیجہ ایک دوسرے سے مختلف ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ دونوں ایک ہی فارمولے پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ دو مختلف فارمولوں پر عمل کر رہے تھے۔ فارمولوں کے اس طرح کے اختلاف کو قرآن کی اصطلاح میں شرک کہا جاتا ہے۔ اگر ایک فارمولے پر عمل کرنے والوں میں باہمی اختلاف نہیں تو اسے توحید کہا جائے گا اور اگر ان میں باہمی اختلاف ہوگا تو اسے شرک سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے، امتِ واحدہ کے فرقوں میں تقسیم ہو جانے کو شرک کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ روم میں ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ اے جماعتِ مومنین تم توحید پرست ہو جانے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲) اس فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہم تو حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ جس قوم میں وحدت نہیں رہتی ـــــ وہ گروہوں، فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے۔ تو اس پر ذلت و خواری کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ اختلافات کا یہی وہ مآل ہے جس سے متنبہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۔ دیکھنا! کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے باہمی اختلافات کئے اور فرقوں میں بٹ گئے، حالانکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے واضح تعلیم آچکی تھی۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴)۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سخت عذاب

میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں فرقہ بندی اور باہمی اختلافات کو "کفر بعد ایمان" کہہ کر پکارا گیا ہے (۳/۱۰۵)
یعنی سورۂ روم میں فرقہ بندی کو شرک کہا گیا ہے اور یہاں اسے کفر بعد از ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں اسے ارتداد
(مرتد ہو جانا) کہا گیا ہے۔ (۴۷/۲۵ - ۲۲)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ امت میں فرقوں کا وجود شرک ہے، کفر ہے، ارتداد ہے۔ یہاں سے یہ سوال سامنے
آتا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں باہمی اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے رفع کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟ اس کے لئے قرآن
میں ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) جس بات میں تم میں اختلاف
پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لیا کرو۔ کتاب اللہ کے نازل کرنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ اختلافی
امور میں واضح طور پر بتائے کہ صحیح بات کیا ہے۔ (۱۶/۶۴)

لیکن اختلافی معاملات میں قرآن سے فیصلہ لینے کی صورت یہ نہیں کہ فریقین اپنے اپنے طور پر قرآن سے فیصلہ
لینے لگ جائیں۔ اس کے لئے خدا نے ایک عملی نظام مقرر کیا تھا اور وہ عملی نظام یہ تھا کہ فریقین ایک ثالث کے پاس
جائیں اور اس کے فیصلہ کو بطیبِ خاطر منظور کریں۔ نبی اکرمؐ کی حیاتِ ارضی میں یہ ثالث خود رسول اللہؐ تھے، جو
بہ حیثیت مرکزِ حکومتِ خداوندی جملہ اختلافی امور کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کے متعلق
کہا گیا تھا کہ "تیرا رب اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملات میں
(اے رسولؐ) تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کریں۔ اور پھر ان کی کیفیت یہ ہو کہ جو کچھ تو فیصلہ کرے اس کے خلاف یہ اپنے دل
کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ دل و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ (۴/۶۵)
اسی سورہ میں دوسرے مقام پر اس عملی نظام کی تصریح ان الفاظ سے کر دی کہ جماعتِ مومنین کے لئے ضروری ہے کہ یہ
اللہ۔ اس کے رسول۔ اور ان افسرانِ ماتحت کے احکام کی اطاعت کریں جنہیں اس مقصد کے لئے تعینات کیا گیا ہو۔ پھر
اگر کسی کو ان افسرانِ ماتحت کے کسی فیصلے سے اختلاف ہو تو وہ اس کے خلاف "خدا اور رسولؐ" (مرکزی حکومتِ خداوندی)
کے ہاں اپیل کر سکتا ہے لیکن مرکز کا فیصلہ آخری ہوگا۔ (۴/۵۹)، حتیٰ کہ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ مملکت میں خوف یا امن
سے متعلق کوئی بات بھی ان تک پہنچے تو یہ اسے اپنے طور پر نہ لے اڑا کریں۔ انہیں چاہیئے کہ اسے افسرانِ ماتحت یا
مرکزی حکومت (رسول) تک پہنچائیں تاکہ وہ مناسب تحقیق و تفتیش کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ کر فیصلہ کریں (۴/۸۳)
یہ تھا وہ عملی نظام جسے اختلافات رفع کرنے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ یعنی افرادِ امت ہر اختلافی معاملہ کے لئے
حکومت کے نمائندگان کی طرف رجوع کریں۔ افرادِ امت سے تو یہ کہا اور فیصلہ دینے والی اتھارٹی کو اس کی تاکید کی گئی
کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ ۔ (۵/۴۸) لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کتاب
اللہ کے مطابق کیا کرو۔

یہ تھا وہ نظام جو امت میں وحدت قائم کرنے اُسے اختلافات کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں الدّین اور عرفِ عام میں اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ جب تک یہ نظام قائم رہا امت میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا اور نہ کوئی فرقہ۔ جب یہ نظام بگڑا تو مسلمان اس مقام پر آ گئے جس مقام پر اسلام سے پہلے اہلِ کتاب تھے۔ ان کا الدّین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اجتماعیت کی جگہ انفرادیت آگئی۔ مرکزیت کے بجائے انتشار پیدا ہو گیا۔ ان میں کوئی ایسی اتھارٹی نہ رہی جو ان کے اختلافی معاملات میں حکم بن سکے۔ امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور ہر فرقہ اپنی اپنی شریعت (فقہ) پر عمل کرنے لگ گیا۔ قرآن نے جو فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ایک قانون پر عمل کرنے کے بجائے مختلف قوانین پر عمل کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کر دی تھی کہ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ۔ یعنی الدّین میں مختلف شریعتیں دینے والے درحقیقت خدا کے شریک ہیں۔

مسلمانوں میں یہی کیفیت اس وقت تک چلی آرہی ہے۔ یعنی ان کے ہاں امت کا تو وجود ہی نہیں رہا صرف فرقے موجود ہیں۔ اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں فرقوں کی موجودگی میں اسلام باقی نہیں رہتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مرکزی اتھارٹی تو نہیں رہی تھی لیکن قرآن تو بہرحال ان کے پاس موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں ان کے ہاں اس قدر مختلف اور باہمدگر متضاد عقائد اور شریعتیں کس طرح پیدا ہو گئیں۔ سوال بڑا اہم ہے اور اس کا جواب بڑا غور طلب۔ اگر مسلمان صرف قرآن ہی کو قانون کی اساس مانتے رہتے تو بھی ان میں اس قدر اختلافات پیدا نہ ہوتے۔ لیکن انہوں نے قرآن کے ساتھ اس کی مثلٌ (مثلہ معہ) ایک اور اساسِ قانون تجویز کر لیا۔ انہیں روایات کہا جاتا ہے۔ روایات سے ابتدائی اور بنیادی مفہوم تھا وہ باتیں جنہیں ان کے بیان کرنے والے (راوی) رسول اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ واضح رہے کہ رسول اللہ نے اپنی باتوں (احادیث) کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا، نہ ہی صحابہ کرام نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد لوگوں نے اپنے اپنے طور پر روایات کے مجموعے مرتب کئے۔ اور وہ بھی لوگوں سے زبانی سن کر۔ ان میں امام بخاری ؒ کے مرتب کردہ مجموعہ کو سب سے صحیح مانا جاتا ہے۔ روایات کی اصل حقیقت تو اتنی تھی لیکن بعد میں انہیں احادیثِ نبویؐ کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی پہلے تو انہیں ایسی باتیں کہا جاتا تھا جنہیں لوگ رسول اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے لیکن بعد میں انہیں احادیثِ رسول اللہ یعنی خود رسول اللہ کی باتیں مشہور کر دیا گیا۔ اس اصطلاح سے لوگوں کے دلوں میں فطری طور پر ان کی عظمت اور عقیدت اور بڑھ گئی۔ اس کے بعد انہیں سنتِ رسول اللہ قرار دے دیا گیا۔ قرآن تو ساری امت کے پاس ایک ہی تھا لیکن روایات یا احادیث یا سنت

رسول اللہ ہر فرقے کی الگ الگ تھیں۔ ان سے مختلف شریعتیں (مختلف فرقوں کی فقہیں) مرتب ہوئیں۔ یہ فقہیں تھیں تو الگ الگ، لیکن ہر فرقہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ "کتاب و سنت" کے مطابق ہیں۔ "کتاب و سنت" کی اصطلاح میں لفظ تو "کتاب" کا پہلے آتا ہے لیکن عملاً مقدم حیثیت "سنت" یعنی روایات کو حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر فرقہ قرآن کی آیات کا وہی مفہوم قابلِ قبول قرار دیتا ہے جو اس فرقے کے ہاں کی روایات کی رو سے متعین کیا جائے۔ حتیٰ کہ جہاں قرآن کی کسی آیت اور روایت میں اختلاف ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جاتا ہے اور عمل روایت کے مطابق ہوتا ہے۔ مختصراً، امت کی صدیوں سے کیفیت یہ ہے کہ

(۱) اختلافی معاملات میں حکم بننے والی اتھارٹی (اسلامی حکومت) غائب ہے۔

(۲) ہر فرقہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کا عمل "کتاب و سنت" کے مطابق ہے۔ لیکن درحقیقت اس کی شریعت کا مدار روایات پر ہے اور روایات ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں۔

آپ "کتاب و سنت" کے مطابق عمل پیرا ہونے کے دعوے کا تجزیہ کریں گے تو آپ کے سامنے عجیب صورت آئے گی۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب اگر مسلمانوں کے ہر فرقے کے اس دعویٰ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عمل قرآن کے مطابق ہے تو اس سے لازماً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ اس کی کتاب میں کوئی اختلافی بات نہیں جس کتاب سے مختلف فرقوں کو اس قدر مختلف احکامات مل سکتے ہوں اس کا یہ دعویٰ کس طرح صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں؟ لہٰذا یا تو اسے تسلیم کرنا ہو گا کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ مبنی برحقیقت نہیں اور اگر خدا کا دعویٰ سچا ہے (اور اس کے سچا ہونے میں کس مسلمان کو شک ہو سکتا ہے) تو پھر لازماً اسے تسلیم کرنا ہو گا کہ ان فرقوں کا یہ دعویٰ سچا نہیں کہ ان کا عمل مطابق کتاب اللہ ہے۔

ان فرقوں سے پوچھئے کہ ان کے نزدیک ان دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

اب آیئے اتباعِ سنت کے دعویٰ کی طرف۔ تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے کہا تھا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ۔ (۶/۱۵۹)

جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھیں تو (اے رسولؐ) تیرا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

اس سے واضح ہے کہ فرقوں میں بٹی ہوئی امت کا رسول اللہ کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ان کا یہ دعویٰ کہ "ہم سنت رسول اللہ کا اتباع کرتے ہیں" باطل ہے۔

یہ ہے اعتصام بکتاب وسنت کے دعویٰ کی حقیقت! قیامِ پاکستان کے بعد، ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا جس کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھی جائے گی جن لوگوں کی نگاہ قرآنی تعلیمات پر تھی وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ

(۱) اسلامی نظام میں، ساری قوم، امتِ واحدہ ہوتی ہے۔ اس میں فرقوں کا وجود نہیں ہوتا۔

(۲) اسلامی نظام میں، ضابطۂ قوانین ایک ہی ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام افرادِ امت پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

لیکن، اس کے برعکس، ہماری مذہبی پیشوائیت، اسلامی نظام کا یہ نقشہ پیش کرتی تھی کہ

(۱) مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں کا وجود آئینی طور پر تسلیم کیا جائیگا۔

(۲) شخصی قوانین ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے۔

(۳) ملکی قوانین کتاب سنت کی رُو سے مرتب کئے جائیں گے۔ اس سے یہ تاثر دیا جانا مقصود تھا کہ کتاب وسنت کی رُو سے ملکی قوانین ایسے مرتب ہو سکتے ہیں جنہیں تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔

طلوعِ اسلام نے کہا کہ اول تو جس نظام میں، امت فرقوں میں بٹی رہے اور مسلمانوں کے شخصی اور ملکی قوانین میں تقسیم وتمیز کی جائے، وہ نظام قرآن کی رُو سے اسلامی کہلا ہی نہیں سکتا۔ اور ثانیاً یہ دعویٰ یکسر فریب پر مبنی ہے کہ کتاب وسنت کی رُو سے ملکی قوانین ایسے مرتب ہو سکتے ہیں جنہیں تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔ ایسا قطعاً ناممکن ہے۔ اس پر طلوعِ اسلام کے خلاف وہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ توبہ بھلی ـــ اور اب بائیس تئیس برس کے پرفریب پروپیگنڈہ کے بعد انہیں بالآخر اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ

کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو

(مودودی)

لیجئے! اسلامی نظام کے قیام کے دعویٰ کی قلعی کھل گئی۔

لیکن ہماری قوم کی حالت عجیب ہے۔ ایک طرف وہ یہ بھی سن رہی ہے کہ "کتاب وسنت" کی بنیاد پر کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا، اور دوسری طرف ملک کی ہر پارٹی اعلان پر اعلان کئے جارہی ہے کہ اگر ہماری پارٹی برسرِاقتدار آگئی تو ہم کتاب وسنت کے مطابق نظام قائم کریں گے، اور قوم میں سے کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ جب تم خود کہتے ہو کہ ایسا ہونا ناممکن ہے تو پھر اس دعویٰ کو دہرا کیسے رہے ہو؟ جب قوم کی غفلت اور بے حسی کا یہ عالم ہو تو پھر رہزنوں پر کیا گلہ کہ وہ اسے لوٹتے کیوں ہیں۔

جب یہ پرچہ آپ کے ہاتھوں تک پہنچے گا تو الیکشن کے دن قریب تر ہوں گے اور انتخاب لڑنے والوں کا جنون انتہا تک پہنچ چکا ہوگا۔ اس جنون میں کسی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے آمادہ ہو

جائے گا، خود فریبی کے مرادف ہوگا۔ لیکن اس کے بعد (اگر الیکشن بخیر و خوبی تکمیل پہنچ گئے تو) منتخب شدہ امیدوار مجلس دستورساز کی شکل میں یک جا ہوں گے اور ایک سو بیس دنوں میں دستورسازی کا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔ دستور میں اس بنیادی اصول کا طے پانا ضروری ہوگا کہ ملک میں قانون کی اساس کیا ہوگی؟ اس وقت تک یہ حضرات دستور میں پہلے سے یہ شق رکھ دیا کرتے تھے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ لیکن، اس اعتراف کی موجودگی میں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اگر انہوں نے پھر یہی شق شامل دستور کرنا چاہی تو آپ سوچ لیجئے کہ یہ قوم سے کس قدر فریب ہوگا! ضرورت اس امر کی ہے کہ مجلس دستورساز کے ارکین سے یہ سوال پوچھا جائے کہ ملک میں قانون کی اساس کیا ہوگی؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اس مقصد کے لئے اُس دَور کی طرف پلٹ جانا چاہیئے جب پہلے پہل اسلامی نظام کا وجود عمل میں آیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُس وقت اسلامی نظام کی تشکیل کے لئے دو اجزاء لاینفک تھے۔ ایک کتاب اللہ جو قانون کی اساس تھی اور دوسرے وہ اتھارٹی جو متنازعہ فیہ معاملات میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے دیتی تھی۔ آج ہمارے پاس بتوفیق ایزدی، یہ دونوں اجزاء موجود ہیں۔ کتاب اللہ کی موجودگی کے متعلق کسی فرقے کو بھی کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ اتھارٹی کے لئے ہمارے ہاں ایک ایسی مملکت موجود ہے جس میں ہنوز کسی فرقے کی حکومت ..... بر سر اقتدار نہیں آئی۔ اگر ہم اپنے آئین میں کتاب اللہ کو اساس قرار دے کر ایک ایسی اتھارٹی کا تعین کر دیں جو اس باب میں حَکم بن سکے، تو سارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ قرآن مجید سے اس طرح فیصلہ لینے کے لئے کسی خاص فرقہ کی روایات یا فقہ اثر انداز نہ ہو۔ اگر قوم اس کے لئے تیار ہے تو اس ملک میں اسلامی نظام کا قیام ممکن العمل ہوگا۔ اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو پھر ہم جس قدر جلد اس خود فریبی سے نکل جائیں (کہ ہم اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں) اسی قدر بہتر ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قوم تو اس کے لئے تیار ہو جائے گی لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوگی۔ اس لئے کہ اسلامی نظام میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اِس وقت یہ حضرات جو "اسلامی نظام" کا شور بپا رہے ہیں، تو اس لئے کہ اس سے ان کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ مودودی صاحب نے جو یہ تجویز پیش کی ہے کہ چونکہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا اس لئے ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ (واضح رہے کہ ہمیں نہ کسی خاص فرقے کی فقہ سے دشمنی ہے نہ کسی دوسرے فرقہ کی فقہ سے دوستی۔ چونکہ مودودی صاحب نے فقہ حنفی کا متعین طور پر نام لیا ہے اس لئے ہم بھی اسی کے حوالے سے بات کر رہے ہیں)۔ فقہ حنفی، ایک ضابطہ

قوانین ہے۔ اس ضابطہ کو ملک کا قانون قرار دے دیا جائے تو پھر ملک میں کسی مجلس قانون ساز (LEGISLATIVE ASSEMBLY) کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جب قانون بنا بنایا موجود ہے تو مجلس قانون سازی کی ضرورت کیا ہے۔ اگر اس میں کوئی دشواری پیش آئے گی تو اس کے لئے، اس فقہ کے ماہرین (علماء حضرات) کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ منیر کمیٹی کے سوال کے جواب میں، علماء حضرات نے یہی موقف اختیار کیا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ جب آپ یہاں کوئی بنی بنائی فقہ رائج کریں گے تو اس کا عملی نتیجہ مذہبی پیشوائیت کی تھیاکریسی ہوگا۔

(۰)

جب ان حضرات کے سامنے قرآن مجید کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں فرقہ بندی کو شرک، کفر اور ارتداد قرار دیا گیا ہے تو ان میں سے ہر فرقہ کا جواب یہ ہوتا ہے کہ صاحب! ہم نے فرقہ نہیں بنایا۔ ہم تو اسی اسلام پر قائم چلے آ رہے ہیں جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھا۔ ان دوسرے فرقوں نے اپنا اپنا اسلام الگ تجویز کر لیا اور ہم سے علیحدہ ہو گئے۔ آپ ان سے کہئے کہ یہ اپنا جداگانہ مسلک چھوڑ کر اصل اسلام کی طرف آ جائیں ـــ یعنی ہمارا مسلک اختیار کریں۔

ہر فرقہ کا جواب یہی ہوگا کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ کی عملی تفسیر یہی ہے اور ہزار سال کے بین الفرق مناظروں اور مباحثوں کا مقصد یہی تھا کہ ہر فرقہ یہ ثابت کر دے کہ اصل اسلام کے علمبردار وہی ہیں۔ نہ یہ ثابت ہوا نہ ثابت ہو سکیگا۔ اس لئے کہ جب قرآن نے کہا تھا کہ فرقہ وارانہ میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور دوسرے باطل پر۔ تو اس نے کسی ایک فرقہ کو بھی استثناء نہیں کی تھی۔ وہ (قرآن) اس سوال ہی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا کہ فرقوں میں سے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ وہ امت میں فرقوں کے وجود ہی کو شرک قرار دیتا ہے۔

فرقہ سازی کے سلسلہ میں یہ نہیں ہوا تھا کہ امت ایک مسلک پر چلی آ رہی تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لوگ اس انبوہ میں سے نکل نکل کر الگ ہوتے گئے اور اس طرح مختلف فرقوں کا وجود عمل میں آگیا اور اب ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ گروہ جو صحیح اسلام کے راستے پر گامزن تھا ہم ہیں، اور دوسرے لوگ ہم میں سے نکل کر الگ ہو گئے تھے۔ ہوا در اصل یہ تھا کہ جب امت میں مرکزی اتھارٹی (خلافت علیٰ منہاج نبوت) باقی نہ رہی تو ان کی (مسلمانوں کی) جمعیت پارہ پارہ ہو گئی۔ اسی منتشر شدہ امت کا نام مختلف فرقے ہیں۔ قرآن نے امت میں تشتت و انتشار کو شرک اور کفر قرار دیا ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں فرقہ صحیح راستے پر چلا آ رہا تھا۔ اور دوسرے فرقے اس میں سے نکل کر الگ الگ ہو گئے۔ لہٰذا فرقہ بندی کے جرم کے مرتکب وہ فرقے ہیں، یہ نہیں۔ جب زلزلے سے کوئی چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے تو ان میں

سے کوئی ٹکڑہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو اصلی چٹان ہوں، اس میں سے الگ ہونے والے ٹکڑے دوسرے ہیں۔ ٹکڑے ہو جانے سے چٹان کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کوئی ٹکڑہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ چٹان ہے۔ امت میں انتشار پیدا ہو جائے تو اسلام باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کسی فرقے کا یہ دعویٰ قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکتا کہ وہ حقیقی اسلام کا پیرو ہے اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ منتشر شدہ چٹان کو پھر سے وجود میں لانے کا طریق یہ نہیں کہ مختلف ٹکڑوں سے یہ کہا جائے کہ وہ کسی ایک ٹکڑے میں جا کر جذب ہو جائیں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ سب ٹکڑے یک جا ہو کر پھر سے چٹان بن جائیں۔ اسی طرح مختلف فرقوں سے یہ کہنا کہ وہ کسی ایک فرقہ کی فقہ کو اسلام تسلیم کر کے تفرقہ کو ختم کر دیں، ناممکن العمل مطالبہ ہے۔ ان میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ تمام فرقے اپنی روایات اور فقہ کو الگ کر کے قرآنِ خالص کو قانون کی اساس قرار دے لیں۔ اور اس اساس پر ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر لیں جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکنے کے قابل ہو۔ اس کے سوا اسلامی نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔

اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآنِ خالص کی بنیاد پر بھی کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اور اس کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں فرقہ اہلِ قرآن نے ایسا دعوےٰ کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کے ہاں اتفاق پیدا نہ ہو سکا۔ گنتی کے چند نفوس اس فرقہ سے متعلق ہیں اور ان میں بھی باہمی اختلافات ہے۔

یہ حقیقت ہے لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے جس شخصیت کی طرف یہ فرقہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے فطرت کی طرف سے دلِ دردمند عطا ہوا تھا۔ وہ امت کے انتشار پر خون کے آنسو تھا۔ اس نے جب اس کی علت پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کے سا اور چیزوں کو بھی دین کی اساس قرار دے رکھا تھا۔ اس تفرقہ کو مٹانے کا طریق یہ ہے کہ قرآن خالص کو د کی اساس قرار دیا جائے۔

یہاں تک تو اس کی نگاہ نے صحیح کام کیا لیکن وہ وحدتِ امت کی دوسری لاینفک کڑی تک نہ پہنچ سکے یعنی قرآن کے ساتھ ایک مرکزی اتھارٹی کے وجود کا تصور ان کے سامنے نہ آ سکا۔ چنانچہ وہ خود ہی قرآ سے فقہی احکام مستنبط کرنے لگے —— بالفاظِ دیگر، وہ مذہب کی سطح پر ہی رہے۔ اسلام کو بہ حیثیت ایک نظام (الدین) کے سامنے نہ لا سکے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ امت میں وحدت پیدا ہونے کے بجائے ام ایک اور فرقے کا اضافہ ہو گیا۔

طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر وحدتِ امت کی دونوں کڑیاں ہیں — قرآن بطور اساسِ قانون،

مرکزی اتھارٹی بطورِ حکم ـــ یہی وجہ ہے کہ یہ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ نئے نئے فقہی احکام مرتب کرکے امت میں مزید انتشار کا موجب بنے ـــ وہ تین نمازوں، تو دن کے روزوں، یا اردو میں نماز قسم کی تشتت آفریں تحریکوں کا سخت مخالف ہے۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ اس وقت مختلف فرقے حسبِ حال مسلک کے پابند ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔ اور ایک مرکزی اتھارٹی (اسلامی مملکت) قائم کرکے، قرآن کی اساس پر جدید فقہ مرتب کی جائے جس کی پابندی ہر ایک پر لازم ہو۔

جب انہیں فرقہ بندی کے جواز میں کوئی دلیل نہیں مل سکی، تو ہماری مذہبی پیشوائیت نے اب ایک اور ٹیکنیک اختیار کی ہے۔ اب یہ فرقوں کو "فرقے" نہیں کہتے۔ "مختلف" "مکاتبِ فکر" کہہ کر پکارتے ہیں اور اس طرح (اپنے آپ کو تو نہیں لیکن دوسروں کو) فریب دینے کی سعی لاحاصل میں وقفِ اضطراب ہیں۔ یاد رہے ہمارے مذہبی فرقے "فرقے" ہیں، مکاتبِ فکر نہیں۔ فرقہ اور مکتبِ فکر میں جو فرق ہے وہ سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآنِ کریم میں متغیر احکام و اصول ہیں جو اسلامی نظام میں قانون کی اساس قرار پاتے ہیں اور کچھ حقائق کائنات ہیں۔ احکام و اصول متعین ہیں اور ان کی بنیاد پر جو ضابطۂ قوانین مرتب ہوتا ہے وہ امت میں وحدت پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کا موجب بنتا ہے۔ جب مختلف گروہ، مختلف چیزوں کو قانون کی اساس قرار دے لیں اور مختلف احکام پر عمل پیرا ہو جائیں تو انہیں فرقے کہا جاتا ہے۔

جہاں تک حقائقِ کائنات کا تعلق ہے، انہیں ہر دور میں، اس دور کی علمی سطح اور کائناتی تحقیقات کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز ایک ہی زمانہ میں، انہیں مختلف افراد اپنی اپنی علمی اور فکری صلاحیت کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً قرآنِ کریم نے اجرامِ فلکی کے متعلق جو کچھ کہا ہے، اسے مختلف زمانوں میں، زمانوں کے علم الافلاک کی روشنی میں، مختلف انداز سے سمجھا جاتا رہا۔ آج ان کا مفہوم کچھ اور سامنے آ رہا ہے۔ جو لوگ کسی ایک دور میں، ان حقائق کے متعلق، کسی ایک نظریہ کے قائل ہوں، انہیں ایک مکتبِ فکر (SCHOOL OF THOUGHT) سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً نیوٹن کا مکتبِ فکر، آئن سٹائن کا مکتبِ فکر وغیرہ۔ ان مکاتبِ فکر سے متعلق لوگ، مختلف قوانین پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ وہ جس مملکت میں رہتے ہیں، اس مملکت کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس لئے وہ مختلف مکاتبِ فکر سے متعلق ہونے کے باوجود، مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ لیکن اگر وہ عملی زندگی میں مختلف راستے اختیار کر لیں تو وہ مختلف فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ مثلاً آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کے قائل عیسائی، رومن کیتھولک بھی ہو سکتے ہیں اور پروٹسٹنٹ بھی۔ یہ لوگ، ایک مکتبِ فکر سے متعلق ہونے کے باوجود، جب مذہب کی د

کی طرف آئیں گے تو دو فرقوں میں بٹ جائیں گے۔

اور اگر ایسا ہو جیسا کہ ہمارے ہاں ہوا ہے، کہ حقائق کائنات سے متعلق فکری اختلافات کو فرقہ کی بنیاد بن جائے تو اس طرح پیدا شدہ فرقوں کو فرقے کہا جائے گا۔ مکاتبِ فکر نہیں۔ فرقوں کا امتیازی نشان اختلاف فی العمل ہوتا ہے اور امت کی وحدت کی علامت ہوتی ہے "اتحاد فی العمل" جو قانون کی اساس کی وحدت پر مبنی ہوتا ہے۔ مکتبِ فکر کی مثال دیکھنی ہو تو طلوعِ اسلام کی تحریک کا مطالعہ کیجئے۔ یہ ایک خاص فکر کو پیش کرتی ہے لیکن امت اسلامی شعائر کی تعمیل جس جس طریق سے کر رہی ہے ان میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کر کے اس میں مزید تشتت کا موجب نہیں بنتی۔ اس لئے یہ تحریک ایک مکتبِ فکر کہلا سکتی ہے فرقہ نہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ ہمارے موجودہ فرقے، فرقے ہیں یا مختلف مکاتبِ فکر۔ "فرقہ بندی" کے اعتراض سے بچنے کے لئے انہیں مکاتبِ فکر کہہ دینا، کتنی بڑی مغالطہ آفرینی اور الفریبی ہے! یاد رکھیئے۔ جب تک ہم حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت اپنے اندر پیدا نہیں کرتے، ہمارا کوئی بھی الجھا ہوا مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔ حقیقت (FACT) یہ ہے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی نظام کسی صورت میں قائم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر مختلف فرقے، اپنی بنائے تفریق (روایات اور فقہ) پر اسی طرح جمے رہے تو پھر اسلامی مملکت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکیگا۔

آپ نے دیکھا کہ پاکستان ہی کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ میں یہ مقام کس قدر اہم اور نازک ہے۔ —— "پل صراط" کی طرح تلوار سے تیز اور بال سے باریک، کہ جس پر ایک قدم کی لغزش پوری کی پوری قوم کو جہنم کے عمیق غاروں میں دھکیل دے گی۔ فَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار۔ ہمیں امید ہے کہ طلوعِ اسلام کی فکر سے متفق حلقہ، ایسے نازک وقت میں اپنی اہم ذمہ داری کا پورا پورا احساس کرے گا اور مجلس آئین ساز کے ارکان سے متعین طور پر پوچھے گا کہ وہ مجوزہ آئین میں قانون کی اساس کیا تجویز کر رہے ہیں؟ اگر بات ان کی سمجھ میں آگئی، اور انہوں نے جرأت کر کے قرآن کو قانون کی اساس قرار دے دیا، تو اس سے آپ کا اس سال کا جشنِ نزولِ قرآن، عالمِ انسانیت کے لئے ہزار مسرت، اور صد ہزار انبساط کا موجب ہوگا! —— اور اگر انہوں نے قوم کو اُسی چکر میں رکھا، جس میں اُسے صدیوں سے رکھا جا رہا ہے تو پھر یہ جشن، سویوں کی عید سے زیادہ حیثیت اختیار نہیں کر سکے گا۔ اور وہ بھی کب تک؟

——— (۰) ———

پس تحریر

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ مودودی صاحب کی وہ تقریر سامنے آئی جو انہوں نے ۱۳ نومبر کو اپنی انتخابی مہم کے سلسلہ میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر کی تھی۔ یہ تقریر اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ صدر ایوب کے ۱۹۶۲ء کے آئین میں کہا گیا تھا کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس پر مودودی صاحب نے بہت شور مچایا کہ یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ "اسلام" ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مختلف مفہوم لئے جا سکتے ہیں۔ اس کی جگہ متعین اصطلاح "کتاب و سنت" کی ہونی چاہئیے۔ چنانچہ ایک ترمیم کے ذریعے اس آئین میں "اسلام" کی جگہ "کتاب و سنت" کے الفاظ درج کرا لئے گئے۔ اور یہی الفاظ مودودی صاحب نے اپنے منشور انتخابات میں بھی استعمال کئے۔

اب جو "کتاب و سنت" کی اصطلاح کے سلسلہ میں مودودی صاحب کا مؤاخذہ ہوا، اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ اس سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو انہیں میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ چنانچہ ان کی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی زیر نظر تقریر میں کہیں "کتاب و سنت" کے الفاظ نہیں آئے۔ اس کی بجائے انہوں نے کہا ہے۔

> (۱) جماعت اسلامی ۲۳ سال سے پاکستان میں اس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے کہ یہاں معاشرہ اور سیاست کی تعمیر دیانت اور انصاف کے ان اصولوں پر کی جائے جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ اس کے پیش نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو خلافت راشدہ کے مونے پر کام کرے۔
>
> (۲) یہ قطعی ناگزیر ہے کہ اس اسلام پر عمل کیا جائے جس کے نام پر یہ ملک وجود میں آیا تھا۔
>
> (۳) اسلام کے ان تمام احکام کو قانونی حیثیت دینا جو ایک اسلامی مملکت میں رائج ہونے چاہئیں اور خاص طور پر ان اخلاقی برائیوں کو ممنوع قرار دینا جنہیں اسلام از روئے قانون روکنا چاہتا ہے۔
>
> (۴) پچھلی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے ہم کلیۃً شرعی قوانین پر اعتماد کریں گے۔

(بحوالہ مساوات: مؤرخہ ۱۵/۱۱ء)

لیجئے۔ اب کتاب و سنت" کی جگہ" اسلام کے احکام "اور" شرعی قوانین" نے لے لی۔ "کتاب و سنت" میں تو پھر بھی گرفت کی گنجائش تھی۔ اب انہیں کھلی چھٹی مل گئی کہ جس قانون

کو چاہیں "اسلامی" قرار دے دیں اور جسے چاہیں غیر اسلامی۔ جس قانون کو چاہیں شرعی قرار دے کر نافذ کر دیں اور جس شخص کے خلاف چاہیں "از روئے شریعت" ارتداد کا فتویٰ صادر کر کے اسے حوالہ دار و رسن کر دیں۔

صدر ایوب کے آئین میں "اسلام" کی اصطلاح غیر مبہم اور اب ان کے اپنے ہاں وہی اصطلاح نہایت واضح ——— اسلام پسندی' زندہ باد! ——— حکمتِ عملی' پائندہ باد!

——— (٭) ———

صفِ ماتم ———

مشرقی پاکستان پر لرزہ انگیز سیلاب کی وجہ سے تباہی اور بربادی کی جو قیامت ٹوٹی ہے اس سے ملک کے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ ہمارے ہاں بے پناہ عزت اور افلاس کی وجہ سے عید کا تیوہار پہلے ہی ایک رسم سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا۔ لیکن حالیہ تباہی کے پیشِ نظر، اس تقریب پر خوشیاں منانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری درخواست ہے کہ اس تقریب پر ہم جو کچھ بھی زاید خرچ کیا کرتے تھے۔ اسے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے حکومت کے فنڈ میں دے دینا چاہیئے۔ اس میں اس صدقہ فطرانہ کو بھی شامل کر لینا چاہیئے جو نمازِ عید سے پہلے ادا کیا جاتا ہے۔ اس کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے۔

جگر فگار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روئداد

طلوعِ اسلام کی تیرہویں سالانہ کنونشن

(منعقدہ لاہور ۲۳-۲۴-۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

مرتبہ: غلام صابر (ایم۔ اے)

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل

محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

مشہور قول ہے کہ انسان کی زبان ہی اُس کی شخصیت کا اظہار ہوتی ہے — یعنی اپنے روزمرہ میں جس انداز سے جو جو باتیں اُس کی زبان سے نکلیں گی، وہی اُس کی شخصیت ہوں گی — !! یہ بات ایک فرد کی ہے — لیکن جب بہت سے افراد میں نظریاتی ہم آہنگی ہو جائے تو پھر ان ہم آہنگ افراد کا طرزِ بود و ماند اور اندازِ گفتار و کردار، ایک اجتماعی شخصیت کی پہچان بن جاتا ہے — ملک میں انتخابات کی سرگرمیاں جنون کی حد تک پہنچ چکی ہیں اور ہر طرف عوام کے جذبات کی آگ کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے بھڑکایا جا رہا ہے — لیکن جذباتی گھٹاؤں کے اندھیروں میں روشنی کا اہتمام کرنے کے لئے اور گم کردہ راہ کاروانِ ملت کو نشانِ منزل دکھانے کی آرزو میں رکھنے والے دردمند پیکرانِ مہر و وفا بھی اس خطۂ پاک میں موجود ہیں — وہ اپنے سوز دروں سے ملت کی اجتماعی شخصیت کو استحکام بخشنے کے لئے دل و جان قربان کرنے کے آرزومند ہیں — یہی وہ پیکرانِ مہر و وفا ہیں جو فضا کی ہنگامہ خیزیوں سے بے نیاز اور سیاسی مفادات کی جاذبیتوں سے کنارہ کش ہر سال، طلوعِ اسلام کنونشن میں اِس مقصد کو دل میں لے کر جمع ہوتے ہیں کہ یہ خطۂ پاک، قرآن کے نظامِ ربوبیت کی آماجگاہ بن جائے اور

اس طرح زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ امسال یہ اجتماع حسب معمول ادارہ کے نشیمن ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور میں منعقد ہوا۔

ان حسین و دلکش اجتماعات کے انتظامات میں بزم لاہور کے اراکین کا انہماک دیدنی تھا۔ بزم کے نئے نمائندہ محترم ایم لطیف چوہدری صاحب کی پُرجوش اور ولولہ انگیز طبیعت کی وجہ سے اراکین کی رگوں میں بھی خون تازہ پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ موجزن تھا اور وہ سب اپنی اپنی جگہ فرائض سرانجام دے رہے تھے ـــ کوئی پنڈال کی قناتوں اور شامیانوں کی ترتیب میں مصروف تھا، کوئی مطبخ کا جائزہ لے رہا تھا، اور کوئی مندوبین کے لئے رہائشی انتظامات کے لئے مصروف تگ و تاز تھا۔ اور تحریک کے پرانے کارکن محترم خواجہ محمد حسین صاحب اپنے پُراعتماد اور شگفتہ لب و لہجہ میں تمام ساتھیوں کی حوصلہ افزائی فرما رہے تھے۔

پہلا قافلہ قرآنی جو کاشانۂ پرویز میں داخل ہوا، وہ احباب کراچی پر مشتمل تھا۔ اتنے دور دراز سفر کی تکان کے باوجود ان کے چہرے ان کی بلند ہمتوں کی غمازی کر رہے تھے۔ احباب اُن سے گلے ملے اور مطبخ کے قریب ہی محمدی لبستر بچھائے گئے ـــ جو لوگ تحریک طلوع اسلام کے متعلق عجیب و غریب غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں اے کاش! وہ ایک نظر ان درویشانِ خدامست کو دیکھتے، جو خاک آلود پیشانیوں کے ساتھ اس جذب و انہماک سے فرش خاک پر محو استراحت تھے۔

یہ ۲۱ اکتوبر کی صبح تھی۔ شام تک مندوبین کے متعدد اور گروہ بھی مسرت بار قہقہوں کے جلو میں خیمہ گاہ میں وارد ہوگئے۔

آج ۲۲ اکتوبر ہے۔ ہلکی ہلکی سردی ہے، صبح کا وقت ہے اور احباب اپنے اپنے کیمپوں میں اجلاس میں شمولیت کی تیاری کر رہے ہیں۔ چہروں پر بشاشت اور مسکراہٹوں کا بہتا ہوا دریا ہے ـــ زندگی کی افسردگیاں، ان کے جوشِ طبیعت سے پناہ مانگتی دکھائی دے رہی ہیں۔ ایک وسیع و عریض پنڈال ادارہ کے سامنے کے سبزہ زار میں نصب ہے جسے آیاتِ قرآنی سے سجایا گیا ہے۔ ابھی ابھی یہ احباب آیاتِ قرآنی کے نیچے بیٹھیں گے اور کنونشن کے پہلے اجتماع کی ابتدا کریں گے ـــ لیجئے ـــ لاؤڈ اسپیکر کی گونج فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے اور بزم لاہور کے نمائندہ محترم ایم لطیف چوہدری صاحب کاروانِ قرآنی کے شیدائیوں کو آواز دے رہے ہیں۔

پہلا اجلاس

صبح نو بجے ـــــــ بروز جمعہ

زیر صدارت محترم محمد اسلام صاحب۔ نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ کراچی

لیجئے ___ محترم ظفر احسن محمود صاحب اسٹیج پر آ گئے۔ انہوں نے اراکین کے پہلے اجلاس کی صدارت کے لئے محترم محمد اسلام صاحب کا نام تجویز کیا۔ اور تلاوت کے لئے جواں سال ساتھی، جن کی شب و روز کی کاوشوں سے لائل پور کا قافلۂ قرآنی تیز سے تیز تر ہو رہا ہے، محترم حافظ محمد یونس صاحب کا اسم گرامی پکارا گیا۔ خدا نے انہیں ایسا لحن عطا کیا ہے کہ جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو فضا میں ساکن صورتِ حال جھومنے لگتی ہے۔ تلاوت کے بعد کاروانِ قرآنی کے دیرینہ ہمسفر جناب مرزا محمد خلیل صاحب نے کلامِ اقبال سے گرمیٔ محفل کا سامان مہیا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کلامِ اقبال ہی وہ معیار ہے جس سے ملّتِ پاکستانیہ کا فکری تشخص ہو سکتا ہے۔ مرزا محمد خلیل صاحب نے اقبال کی یہ مشہور غزل پڑھی اور احباب تڑپ تڑپ گئے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

کلامِ اقبال کے بعد بزمِ طلوع اسلام لاہور کے سالِ گزشتہ کے نمائندہ محترم ظفر احسن محمود صاحب نے مندوبین کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا۔

> زمانے کے ویران اندھیروں کو پاٹنے کے لئے ہم سب ہمرکاب ہیں اور ہماری پُر اعتماد اور عظیم الشان جد و جہد سے انقلابِ قرآنی قریب تر ہو رہا ہے ___ اگرچہ ملک میں حیلہ جو اور موقع پرستوں نے طوائف الملوکی کا غبار اٹھایا ہوا ہے اور یہ غبار فلک بوس اور زمین گیر ہے، لیکن ہمارا یہ طائفۂ کم مائیگاں اور قافلۂ آبلہ پایاں، برق سوز اور برق رفتار آندھیوں میں، نورانی بصیرت سے استقلال و بردباری کے ساتھ فرحاں و خنداں رواں دواں ہے ___ دعا ہے کہ خدا ہمیں جب وۂ قرآنی پر ثبات و استقامت عطا فرمائے اور یہ کرۂ ارض اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔

محترم ظفر احسن محمود صاحب کے ولولہ انگیز استقبالیہ کے بعد محترم شیخ الحق صاحب سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے فرمایا کہ

> احباب کا ذوق و شوق حوصلہ افزا ہے۔ اور منزل قریب نظر آ رہی ہے۔ طلوع اسلام کالج کی تعمیر کے لئے زمین کے حصول میں جن دقتوں اور مشکلات کا سامنا ہے وہ داستان اگرچہ طویل ہے لیکن ہم اپنی مشکلات پر انشاء اللہ جلد قابو پا لیں گے۔ ظاہر ہے کہ زمین اگر اللہ کی ملکیت ہو تو پھر مسائل پیدا نہیں ہوتے لیکن اگر یہ انسانوں کے قبضے میں چلی جائے تو پھر اُسے حاصل کرنے کا مسئلہ جس قدر مشکل ہے، اُس سے زیادہ اور کوئی مشکل

کام نہیں

نہوں نے احباب سے اس عظیم الشان منصوبے کی تکمیل کے لئے شب و روز جد و جہد کرنے کی استدعا کی اور امید
ظاہر کی کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔

قرآنک سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ کے بعد ادارہ طلوع اسلام کے ناظم محترم طالب حسین صاحب نے سالانہ رپورٹ
پیش کی۔ رپورٹ، تحریک کے نظم و نسق سے متعلق مختلف گوشوں کی سال بھر کی جد و جہد کا تفصیلی تعارف کراتی ہوئی،
تمام اراکین تحریک کی گرمجوشیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی اور گاہ گاہ ان کی تغافل شعاریوں پر گلہ مند ہوتی، اپنی سبک خرامی
سے آگے بڑھتی گئی اور سابقہ تجربوں کی روشنی میں پیش آئندہ منصوبوں کو سامنے لا کر احباب سے ان کی کامیابی کے
لئے تعاون کے وعدے لیتی گئی۔ رپورٹ، تحریک کے فروغ، فکرِ قرآنی کی ہمہ گیر کامیابی اور بزمہائے طلوع اسلام
کے حسن تعاون کے لئے پیکرِ تشکر و امتنان تھی، احباب نے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ محترم ناظم صاحب
نے تحریک کے مخلص ساتھیوں خان عبدالحکیم خان (مردان) خان بلند اقبال خان (لاہور) اور غلام محمد صاحب
(لائل پور) کی بے وقت موت پر بھی اظہارِ تعزیت کیا۔

محترم ظفر احسن محمود صاحب نے محترم پرویز صاحب کا نام پکارا اور پرویز صاحب تالیوں کی گونج میں اسٹیج
پر آئے ۔ وابستگانِ تحریک کو اپنے سالارِ کارواں کی ذاتِ گرامی سے جس قدر والہانہ محبت ہے' اس کا اندازہ
ان کی نگاہوں کی چمک اور چہروں کی تابانی سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ مودت و احترام کی اس دلربا فضا میں
پرویز صاحب نے "سکونِ گہر" کے عنوان سے اپنے خطاب کا آغاز علامہ اقبال کے اس شعر سے کیا کہ

سازی اگر حریفِ یم بے کراں مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

انہوں نے فرمایا کہ

عمر کی کشتیٔ رواں نے پھر مہلت دی اور ایک سال کی مفارقت کے بعد آپ سے ہمکلام
ہونے کا موقعہ باعثِ سکونِ دل ہوا۔ آپ کے محبت بھرے سینوں کی تمازت' مسکراہٹوں
کی لطافت، آپ کے ذوقِ قرآنی کی آئینہ داری اور جذبِ اندرون کی عکاسی ہے ۔ یہی
میرے زندہ رہنے کا سہارا ہے۔

انہوں نے اپنے استقبالیہ میں ملک کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

ملک بے پناہ تلاطم خیزیوں اور آندھیوں کے طوفان میں گھرا ہوا ہے اور آتشیں مغاریت
کی طرح' یہ شورشیں جہاں سوز ہیں۔ اور ارض پاش زلزلوں کی ہولناک آوازیں اہلِ بصیرت۔

کے کانوں میں گونج رہی ہیں اور مسلم لیڈر اس آتشیں رقص میں ننگے ناچ رہے ہیں۔ لیکن طلوعِ اسلام کا رویہ یہ ہے کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

یعنی تحریکِ طلوعِ اسلام سکوت و سکون میں، سرکش جذبات کی آندھیوں میں قرآنی بصیرت کے دیئے کو سنبھالے جذب و مستی سے رواں دواں ہے۔ ہماری یہ دعوت رجعت الی القرآن کی دعوت ہے۔

انہوں نے اپنی عمر بھر کی عرق ریزیوں کا روحِ پرور ثمر اپنی تصنیف مفہوم القرآن اور لغات القرآن کو قرار دیا۔ اور احباب کو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا کہ مفہوم القرآن کا مکمل سیٹ شائع ہو چکا ہے۔ یہ خبر اراکین کے لئے چمنِ خزاں دیدہ میں بہاروں کے لوٹ آنے کی نوید تھی۔ مفکرِ قرآن نے بتایا کہ مفہوم القرآن کا انگریزی ترجمہ بھی مکمل ہو چکا ہے اور اسباب فراہم ہونے پر وہ بھی شائع ہو جائے گا۔ واللہ المستعان۔ آخر میں پرویز صاحب نے لیلائے قرآنی کے ایسے مجنوں کو یاد کیا جس کے جنوں نے سرحد کے دشت میں فکرِ قرآنی کی آواز کو عام کر دیا تھا — یعنی خان عبدالحکیم خان (مردان) جو چند ماہ قبل اس قافلۂ قرآنی کو داغِ مفارقت دے گیا تھا — خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ احباب کی آنکھیں خان صاحب کی یاد میں نم آلود تھیں اور پرویز صاحب اپنی بھرائی ہوئی آواز میں تعزیتی الفاظ کا سہارا لے رہے تھے۔

اس طرح یہ اجلاس پُردرد اور رقت آمیز ماحول میں ختم ہوا۔ (یہ خطاب طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے)

کراچی بزم کے سٹال کا افتتاح

پنڈال کے ساتھ ہی کراچی بزم نے ایک وسیع خوبصورت سٹال لگایا تھا۔ اور اس سے ملحق خواتین نے بھی۔ سٹال کا افتتاح کرتے ہوئے پرویز صاحب نے اراکینِ بزمِ کراچی کے بلند حوصلوں اور قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے ان کے نئے نئے اسالیب کی تحسین کی اور دعا کی کہ خدا ان کے حوصلوں اور ارادوں میں پختگی عطا فرمائے۔ سٹال کو مختلف خوبصورت اور دلکش چارٹس کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ تصاویر کا ایک خوبصورت البم بھی تھا جس میں محترم پرویز صاحب اور دیگر اعیانِ تحریک کی تین سو کے قریب تصاویر تھیں۔ خان عبدالحکیم خان (مرحوم) کی تصویر اور طلبداقبال خان (مرحوم) کی تصاویر کے چارٹ دیکھ کر کئی ساتھیوں نے انہیں آہیں بھر کر یاد کیا۔ خواتین کے سٹال میں ان کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی اشیاء سے سٹال کی خرید و فروخت ہو رہی تھی — اور یہ سب رقم انہوں نے کالج فنڈ میں دے دی۔ قوم کی بیٹیوں میں اگر اس طرح ایثار کے جذبے پیدا ہو جائیں تو یہ خطۂ پاک جنتِ ارضی بن سکتا ہے۔ تمام اراکین اور

شرکائے کنونیشن نے کراچی کے اسٹال کی افادیت کو دل سے قبول کیا۔ بزمِ کراچی کے اراکین آئندہ سال اس سٹال میں جدت پیدا کریں گے ۔ جیسے ہر سال جدت ہوتی ہے ۔ محترم محمد اسلام صاحب نمائندہ بزمِ کراچی اس طرح کے امور میں ساری بزموں کے نمائندوں کے لئے قابلِ رشک ہیں، اور کراچی کی خواتین تمام طاہرہ بیٹیوں کے لئے قندیلِ راہ!

مطبخ والوں نے احباب کو کھانے کے لئے بلایا۔ ابھی کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ مسجد سے جمعہ کی اذان آئی۔ اور احباب نے نمازِ جمعہ کے لئے قریبی مسجدوں کا رُخ کیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد کھلے اجلاس سے محترم پرویز صاحب نے خطاب کرنا تھا۔ "قدیم اور جدید کی کشمکش" "کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہوسکتی ہے" اس خطاب کا موضوع تھا۔

(o)

پہلا کھُلا اجلاس

صدارت :- محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب

طلوعِ اسلام کنونیشن کے کھلے اجلاس خالصتہً فکری ہوتے ہیں۔ اُن میں نہ جذباتی نعرہ بازی ہوتی ہے، نہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے ہنگامہ آرائی۔ اس طرح ملک کا سنجیدہ اور متین طبقہ ان اجلاس میں بکثرت شامل ہوتا ہے اور ملت کے مسائل پر نہایت سنجیدگی اور متانت سے بحث کی جاتی ہے۔ موجودہ ہنگامہ خیز ماحول میں اس قسم کے سنجیدہ اور فکری جلسوں میں عوام کا اس انداز سے حصہ لینا، زرخیزئ حیات کی علامت ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ ملک کے بڑے بڑے آتشیں رقاص جن میں مذہبی پیشوائیت کے علمبردار اور سیاسی جغادری بھی شامل ہیں ۔۔ اس ملت کو قعرِ مذلت میں دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

یہ اجلاس بعد دوپہر لاہور کی گراں قدر معروف ہستی ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ محترم ظفر احسن محمود صاحب نے حافظ محمد یونس صاحب کو تلاوتِ قرآن پاک کے لئے دعوت دی۔ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد موصوف صدر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ سائنس کے اصول کے مطابق جب ایک چیز قدیم ہوجاتی ہے تو وہ خود بخود فطرت کے قانون کے مطابق ختم ہوجاتی ہے۔ اور کوئی بھی اس کے بارے میں متفکر نہیں ہوتا بلکہ نئی اشیا کی تزئین کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے۔ شکست و ریخت کے اس ارتقائی عمل میں ہر آن تبدیلی کا خیر مقدم کرنا ہی شرفِ انسانیت ہے۔ انہوں نے اپنی بات کو مختلف سائنسی دلائل سے ثابت کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے زیادہ دیر محترم پرویز صاحب اور سامعین کے درمیان حائل نہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے فاضلانہ تعارف کو ختم کیا۔

لوگ مفکرِ قرآن کے اس اہم موضوع پر خطاب کو سننے کے لئے بے تاب تھے۔ اس کا انتظار ملک کے قدامت پرست طبقہ کو بھی تھا اور ملائیت سے بیزار طبقہ کو بھی ـــــ اس طرح سامعین میں ہر قسم کے افراد کی موجودگی کسی نئے موڑ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ پرویز صاحب کا نام پکارا گیا اور وہ اپنی دلآویز مسکراہٹ کیساتھ سٹیج پر آئے۔

سامعین نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے اس دو گھنٹے کے خطاب کو سنا۔ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے بقول "پرویز صاحب نے ایک وسیع بنیاد قائم کر کے، بہت بڑی بات کی ہے۔ اور ان کی یہ جرأتِ رندانہ بہرطور قابلِ ستائش ہے"ـــــ نئی نسل تو اس پر بہت خوش تھی۔ لیکن قدامت پرست طبقے کے احباب خاموش تھے اور رائے زنی سے بھی اجتناب برت رہے تھے ـــــ!! (یہ خطاب طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائیگا) یہ کھلا اجلاس ۳ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اختتام پذیر ہوا۔

ـــــــ (٠) ـــــــ

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا اجلاس۔ شام ۵ بجے

جب افراد معاشرہ کے سامنے کوئی عظیم نصب العین ہو تو اُن کی سوچ کے زاویے بھی نصب العین کیمطابق ہو جاتے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ ان کی بنیادی پہچان، ان کے نصب العین کے علاوہ کسی دوسری طرح ممکن ہی نہیں۔ احباب کا قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا عظیم الشان منصوبہ ایک نصب العین بن چکا ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے جس جذب و انہماک سے کام کیا جا رہا ہے، اگرچہ بیتابیٔ تمنا اس سے بھی مطمئن نہیں اور "ہاں اور" کی متقاضی ہے، اور اسی لئے احباب اس رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ لیکن ذمہ دار احباب، جوش و جذبہ کو سراہنے کے باوجود کسی ایسے عاجلانہ اقدام کے لئے آمادہ نہیں تھے جس کی عدمِ تکمیل پر انہیں معذرت خواہ ہونا پڑے اسی لئے وہ احباب سے مزید اعانت کے خواستگار رہتے۔ بہرحال خوشگوار ماحول میں یہ محفل نئے حوصلوں کے ساتھ جاری رہی۔ چونکہ کالج کے لئے زمین خریدنے کا معاملہ احباب کو اپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کی وساطت سے طے پا رہا ہے، اس لئے سوسائٹی کے سیکرٹری محترم ظفر احسن محمود صاحب نے سوسائٹی کے اجلاس میں جو رپورٹ پیش کی اس کے مندرجات سے اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کو بھی مطلع کیا گیا تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اس سلسلہ میں متعلقہ حضرات کیا جدوجہد کر رہے ہیں ہیں۔

یہ محفل تقریباً ۶ بجے ختم ہوئی۔ اسی شام ایک دلچسپ ڈرامہ بزمِ کراچی کے احباب نے پیش کرنا تھا ـــــ احباب نے کھانے کے بعد دوبارہ پنڈال کی راہ لی۔

ـــــــ (٠) ـــــــ

بزم کراچی کا پروگرام

ڈرامہ: "علاج اس کا......"

رات کے ۱۲ بجے ہیں۔ دن بھر کی مصروفیات اور گوناگوں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر احباب کراچی نے ایک نہایت فکر آمیز اور سبق آموز تفریح کے لئے چند لمحات کو مختص کر لیا ہے۔ اراکینِ بزم کراچی کے ولولے اور حوصلوں کی پختگی قابل داد ہے۔ کنونشن کے سب پروگرام ملت کو تدبر و تفکر پر آمادہ کرتے ہیں۔ غالب خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ڈرامہ محض تفریحِ طبع کے لئے اسٹیج کیا جاتا ہے۔ لیکن بزمِ کراچی کے ڈرامہ نگار اور ملک کے عمومی ڈرامہ نگاروں میں نمایاں خطِ امتیاز یہ ہے کہ بزم کراچی کا ڈرامہ ایک بلند و بالا نصب العین کو سامنے رکھ کر اسٹیج کیا جاتا ہے اور اس طرح اہل فن کے سامنے ایک نہایت خوش آئند نمونہ پیش کیا جاتا ہے اور ناظرین کو بتایا جاتا ہے کہ فنون کس طرح دین کی خدمت کر سکتا ہے۔

بزم کراچی کا ڈرامہ "علاج اس کا......" آوارگی نہیں بلکہ ایک سفر ہے جو جادۂ قرآنی کو طے کرتا ہوا ربوبیتِ عامہ کی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس ڈرامے کا ہیرو سلیم ہے جسے مطالعہ کا شوق ہے اور وہ زندگی کے بارے میں سوچنے کا عادی ہے۔ المناک اور دردناک زندگی کی کیفیت، اُسے ذہنی پریشانیوں کا شکار کر دیتی ہے — مذہب پرست طبقہ جو گھر ہی کے قریبی بزرگ ہوتے ہیں وہ سلیم کے اس طرح مطالعہ کرنے اور زندگی کے حقیقی موضوعات پر سوچنے سے منع کرتے ہیں — وہ خوفناک صورتِ حال سے مایوس ہوتا ہے — اور خودکشی کر لیتا ہے۔ لیکن بر وقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ لیکن وہ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اس کا معالج ڈاکٹر، اس کا قریبی دوست ہے۔ وہ اس سے خودکشی کی وجہ پوچھتا ہے — سلیم اپنے المیوں کی طویل داستان دردبھرے انداز میں بتاتا ہے۔ ڈاکٹر پورے غور سے اس کی باتوں کو سنتا ہے اور موجودہ مذہب کے توہمات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے زندگی گزارنے کا حل پیش کرتا ہے۔ مذہب کی فرسودہ کیفیت واقعی موجودہ ماحول کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی اور حیاتِ انسانی کو صحیح اور مکمل اصولی راہنمائی اگر مل سکتی ہے تو وہ قرآن کی بارگاہ ہے — ڈاکٹر، سلیم کی الجھنوں کو سلجھاتے ہوئے عالمگیر انسانیت کی بہتری اور بھلائی کی تعلیم دیتا ہے — سلیمؔ ڈاکٹر کے پیش کردہ حقائق سے متاثر ہو کر قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے اور موجودہ دور کے مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کی کتب کا بغائر مطالعہ کرتا ہے اور پھر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے علی وجہ البصیرت قرآن کی حقانیت پر ایمان لاتا ہے۔ اور جذبات سے مست ہو کر خدا کے پیغام کو دنیا میں پھیلانے کے لئے مصمم ارادہ کر لیتا ہے اور یہی اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے اور اُسے زندہ رہنے کا ڈھب آجاتا ہے — یہی اس کی بیماریوں کا علاج تھا۔ یعنی بقول اقبالؒ:—

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

ڈرامہ سامعین کی پرجوش تالیوں سے ختم ہوا۔ اور پنڈال میں روشنیاں واپس آگئیں۔ پرویز صاحب سٹیج پر آئے، مائیک سنبھالا اور یوں گویا ہوئے کہ

برادرانِ عزیز! بزمِ کراچی کا ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود اپنے جذبۂ صادقہ سے قرآنی تعلیم کی اشاعت کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ایک شاہراہ پر پہنچنے کے لئے کئی ایک پگڈنڈیاں یعنی چھوٹے چھوٹے راستے ہوتے ہیں۔ ان پگڈنڈیوں کو "سبل" کہا جاتا ہے۔ بزمِ کراچی کے احباب اپنی فکری کاوشوں سے شاہراہ قرآنی پر پہنچنے کے لئے نئے نئے سبل اختیار کرتے ہیں — جو لائقِ تہنیت و تبریک ہیں۔ خدا ان کے حوصلوں میں برکت دے اور یہ قرآن کے شیدائی نئی نئی راہوں سے قرآن کی آواز کو دور دور تک پہنچانے میں کامیاب ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو۔

رات کا کافی حصہ گذر چکا تھا۔ اس طرح بزمِ کراچی نے پرویز صاحب کے پُرجوش خراجِ تحسین و آفرین کے بعد ڈرامے کے ختم ہونے کا اعلان کیا اور سامعین کا شکریہ محترم محمد اسلام صاحب نے ادا کیا۔

درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ ریکارڈ

بزمہائے طلوعِ اسلام کا مقصدِ وحید قرآنِ کریم کی تعلیمات کو عام کرنا ہے۔ اس کے لئے انفرادی سطح سے لے کر اخبار، کتاب اور گفتگو تک کو ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار درسِ قرآن کے سلسلہ کو ملک گیر حد تک پھیلانے کے لئے ٹیپس کا طریق کار اختیار کیا گیا ہے اور ملک کے قریباً ہر بڑے شہر میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن سنایا جاتا ہے۔ ڈرامہ کے بعد ان بزموں کے نمائندگان کا ایک خصوصی اجلاس اس مقصد کے لئے منعقد ہوا کہ اس طریق کار کو زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے کیا اقدامات کئے جائیں۔ مقصد کی اہمیت کے پیشِ نظر خود پرویز صاحب بھی شریکِ اجلاس رہے اور مختلف گوشوں پر اربابِ نظم و نسق کی راہنمائی فرماتے رہے۔ نصف شب کے قریب یہ نہایت مفید محفل اختتام پذیر ہوئی۔

———— (۰) ————

۲۴ر اکتوبر ۷۰ء بروز ہفتہ

صبح ۹ بجے ——— زیرِ صدارت: ——— نذیر حسین عارف

کل سارا دن مصروفیات میں گزرا اور رات گئے تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اعصاب پر قدرے اثر تھا لیکن ساتھیوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر تھکے ہوئے اعصاب میں بھی نئی زندگی دوڑ آئی تھی۔ بزم میں آج ایسی تجاویز اور مشورے پیش کریں گی جن سے تحریکِ طلوعِ اسلام کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ مؤثر انداز سے پھیلایا جا سکے۔ احباب صبح اٹھے۔ قریبی مسجدوں میں نمازِ فجر ادا کی اور پھر واپس آ کر صبح کے اجلاس میں تجاویز پیش کرنے کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے۔ ۔ ٹی سٹال پر ناشتہ کیا گیا۔ خوشیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر قلب و روح کے لئے باعثِ اطمینان بنا ہوا تھا۔ اور چائے پر دنیا جہان کے موضوعات پر تبادلۂ خیالات کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران پنڈال سے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے جواں ہمت نمائندہ محترم ایم لطیف چوہدری صاحب نے اعلان فرمایا کہ اجلاس شروع ہونے والا ہے لہٰذا احباب پنڈال میں تشریف لے آئیں۔ نمائندہ صاحب کی آواز سنتے ہی خوش گپیاں ختم ہوئیں اور احباب نے پنڈال کی راہ لی۔

یہ اجلاس لائل پور کی ہر دلعزیز شخصیت اور نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام محترم نذیر حسین عارف صاحب کی زیرِ صدارت شروع ہوا۔ تلاوتِ قرآنِ مجید محترم حافظ محمد یونس صاحب نے فرمائی۔ سلامِ اقبالؒ جناب مرزا محمد خلیل صاحب نے سنایا اور جذب و کیف کا نیا سماں پیدا کر دیا۔ تجاویز کا دور شروع ہوا — تحریک کے کارکنوں کی امنگوں اور آرزوؤں کا اگر پتہ لگانا ہو تو وہ ان کی تجاویز سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان تجاویز کا انداز کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، لیکن یہ گردش کرتی ہیں ایک ہی محور کے گرد۔ اور وہ محور ہے "فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت"۔

اشاعتی اسکیم

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ماہنامہ طلوعِ اسلام کی اشاعتی اسکیم دوبارہ زیرِ غور آئی۔ اور بزموں نے نہایت خندہ پیشانی سے اعلان کیا کہ اس سلسلہ میں جس قدر ذمہ داریاں انہوں نے اپنے سر پر لے رکھی ہیں، وہ اس میں کوئی کمی نہیں کریں گی اور بدل و جان اسے پورا کریں گی۔ لہٰذا اس اسکیم کو علیٰ حالہٖ جاری رکھا جائے۔ بزموں کا یہ تجدیدِ عہد بڑا خوش آیند اور حوصلہ پرور تھا۔

پمفلٹس اسکیم

اس کے ساتھ ہی یہ تجویز سامنے لائی گئی کہ طلوعِ اسلام میں جو بھی اہم مقالہ شائع ہو، اور اس قسم کے مقالات اس کی قریب قریب ہر اشاعت میں موجود ہوتے ہیں۔ انہیں الگ الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جائے اور ان پمفلٹوں کی اشاعت کا سلسلہ زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ اس سے ملک کی فضا قرآنی فکر سے معمور ہو جائے گی اور منزل قریب تر آ جائے گی۔ بزموں نے اس تجویز کا والہانہ استقبال کیا اور اس سلسلہ میں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلانات بڑے ہمت افزا تھے۔

۱۰۱ - کر لڈ ٹڈ ، ، اسکار ٹہ ، | مساجد کے درس قرآن کی مزید کا پروگرام اس قدر کامیاب

ثابت ہوا ہے کہ احباب اسے زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈرز، اس درس کے لئے رگِ جان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناظمِ ادارہ نے بتایا کہ جو دو ٹیپ ریکارڈرز اس وقت پرویز صاحب کے درس کو ریکارڈ کرتے ہیں وہ بہت پرانے ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ نئے ریکارڈرز کی ضرورت اشد ہے۔ اس پر ایک نئے ریکارڈر کا ذمہ ان بزموں نے خصوصی طور پر لے لیا جن کے ہاں درس سنانے کا اہتمام ہے اور دوسرے ریکارڈر کے لئے عام بزموں نے پیش کش کر دی۔

واضح رہے کہ طلوعِ اسلام کی بزموں کے اراکین کی اکثریت ان محنت کشوں پر مشتمل ہے جو اپنی کمائی سے بمشکل اپنا گزارہ چلا سکتے ہیں۔ ان میں کچھ حضرات ایسے ہیں جو متوسط طبقہ سے متعلق ہیں۔ سرمایہ داران میں ایک بھی نہیں۔ — جو تحریک نظامِ سرمایہ داری کی سب سے بڑی دشمن ہو، اور جنت فروشی کے فریب سے کسی سے کچھ مانگنا گناہِ عظیم قرار دیتی ہو۔ اس میں کوئی سرمایہ دار کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جس قدر اسکیمیں روبہ عمل لائی جاتی ہیں، ان سب کا بوجھ انہی غریبوں اور "سفید پوشوں" کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اور اپنی بے سروسامانی اور بے مائیگی کے باوجود یہ دل کے غنی جس خندہ پیشانی سے اس کی ہر اسکیم کا استقبال کرتے ہیں، اس پر سرمایہ داری کی ہزار بخت آسائشیں قربان کی جا سکتی ہیں۔

آزادیٔ رائے

ایک تجویز یہ پیش ہوئی کہ جس دن پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کا آغاز ہوا تھا، اس کی یاد خاص طور پر منائی جایا کرے تاکہ قوم کو معلوم ہو کہ تیرہ سو سال کے بعد خالص فکرِ قرآنی کی آواز کب کیسے اور کہاں سے بلند ہوئی تھی۔ کچھ احباب اس تجویز کے مؤید تھے لیکن بعض احباب کی طرف سے یہ ترمیم پیش کی گئی کہ ایک الگ تقریب منانے کے بجائے، کیوں نہ اسے اس جشنِ نزولِ قرآن ہی کا ایک حصہ قرار دے دیا جائے۔ جسے ہم ہر سال (عید الفطر کے موقع پر) مناتے ہیں۔ اس سے یہ تجویز بحث و نزاع کا موضوع بن گئی تو ایک صاحب نے پرویز صاحب سے کہا کہ وہ اس باب میں اپنی رائے کا اظہار فرما دیں تاکہ یہ بحث ختم ہو جائے۔ اس پر پرویز صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ ہماری تحریک کی انفرادیت کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ

> میں آپ نمائندگان کے اجلاس میں بہ حیثیت ایک مبصر کے شریک ہوتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی ایسے مسئلہ پر جس میں اختلافِ رائے ہو، اپنی رائے دے کر آپ احباب کی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے پر پابندی لگا دوں۔ آپ اس تجویز پر آزادانہ بحث کریں اور موافق و مخالف دلائل کی رُو سے کسی نتیجہ پر پہنچیں۔

اس دور میں جب کم و بیش ہر تحریک کا سربراہ، بالواسطہ یا بلا واسطہ، ڈکٹیٹر کی پوزیشن اختیار کر لیتا ہے، پرویز صاحب کا یہ انداز، ہم وابستگانِ فکرِ قرآنی کے سامنے حریتِ فکر و نظر کی کشادہ راہیں روشن کر دیتا ہے۔

تجاویز کا دور ختم ہوا، اور قرار دادیں پیش کی گئیں۔ ان قرار دادوں کی تفصیل طلوعِ اسلام میں شائع ہوگی، اسلئے ان کا تذکرہ نہیں کیا جا رہا۔

یہ اجلاس ختم ہونے سے پہلے محترم پرویز صاحب نے، صاحبِ صدر کی اجازت سے فرمایا کہ آج بعد دوپہر بزمِ مذاکرہ کا کھلا اجلاس ہونے والا ہے۔ اس میں قوم کے سلیم بیٹوں کے علاوہ ملت کی طاہرہ بیٹیاں بھی شامل ہوں گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ احباب، اپنی سابقہ روایات کے مطابق آدابِ محفل اور احترامِ نسائیت کے برقرار رکھنے کے لئے چشم کشا رہیں گے۔ پرویز صاحب کی اس مختصر اپیل کے بعد صاحبِ صدر نے اجلاس ختم کرنے کا اعلان فرمایا۔ دوپہر ہو چکی تھی ـــ احباب کو مطبخ والوں نے آواز دی اور کھانا شروع ہوا۔

بزمِ مذاکرہ

"اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ کھلا اجلاس ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ملک کا نوجوان طبقہ اپنے خیالات، احساسات اور تصورات کا اظہار کرتا ہے ـــ اس میں قوم کے بیٹے بھی ہوتے ہیں اور بیٹیاں بھی ـــ مودت و احترام کی فضا اس مذاکرہ کے منفرد ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

پرویز صاحب بہ نفسِ نفیس اس اجلاس کے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ اس سے آنے والی نئی نسل سے اُمیدیں وابستہ کرنیکا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اجلاس تحریکِ طلوعِ اسلام کے فاضل رکن محترم حسن عباس رضوی صاحب کے زیرِ صدارت شروع ہوا۔ محترم پرویز صاحب نے تمہیداً کہا کہ قوموں کی تقدیر اس کی اُبھرتی ہوئی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے نونہالوں کو سنبھال نہیں سکتی، وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بزمِ مذاکرہ کے عنوان کا انتخاب یہ نوجوان خود کرتے ہیں ـــ قوم اس وقت جس خلفشار سے دوچار ہے، اس کے پیشِ نظر ان نوجوانوں نے اپنے لئے علامہ اقبال کا یہ مصرعہ منتخب کیا ہے کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

اس مذاکرے میں قوم کے بیٹوں کے علاوہ ملت کی بیٹیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اور جو ملت اپنی بیٹیوں کا احترام کرنا جانتی ہے وہ تہذیب کے بامِ ثریا کو چھو لیتی ہے ـــ ہمیں بیٹیوں کا احترام کرنا خود حضور نبی اکرمؐ نے سکھایا ہے۔ حضورؐ احتراماً اٹھنے کو منع فرماتے تھے۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ تشریف لائیں تو آپ اُٹھ کھڑے ہوتے تھے ـــ یہ

بے بیٹیوں کا احترام ــــ لہٰذا اس محفل میں کوئی نازیبا حرکت تو ایک طرف، نگاہوں کی بے باکی اور آنکھوں کی جنبش تک بھی خلافِ شرفِ انسانیت متصور ہو گی ــــ پرویز صاحب نے اس تنبیہ کے بعد لاہور کے مشہور و معروف علمی گھرانے خلیفہ شجاع الدین (مرحوم) کی چشم و چراغ، گلشنِ قرآنی کی عندلیب اور محفلِ قرآنی کی طاہرہ بیٹی، ثریا عندلیب کو تلاوتِ قرآن کی دعوت دی۔ اور انہوں نے تلاوت سے محفل کو آئینہ پوش بنا دیا۔ تلاوتِ قرآن کے بعد قافلۂ قرآنی کے حدی خواں، پیکرِ خلوص، محترم مرزا محمد خلیل صاحب کو کلامِ اقبال پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے اقبال کی اسی نظم کے اشعار سنائے جو اس مذاکرے کا موضوع تھا۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

محترم خلیل صاحب نے ان اشعار کو اس لَے میں پڑھا کہ کئی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اشکوں کی اس جھلمل میں مفکرِ قرآن نے عزیزہ سلمیٰ لطیف کا نام پکارا ــــ اس ننھی سی بچی نے جس پُر اعتماد طریق سے اپنے احساسات کا اظہار کیا، وہ ہم بڑوں کے لئے بھی قابلِ رشک تھا۔ اُس کا مسئلہ یہ تھا کہ اُن کے والد صاحب نماز کسی اور طرح پڑھتے ہیں، ان کی سہیلی فرزانہ کے اباجی کسی اور انداز سے اور محلے کے مولوی صاحب کا اپنا ہی انداز ہے۔ ان تینوں میں باہمی اختلاف ہے۔ اور وہ سہیلیں ایک دوسرے سے اس بارے میں بات کرنے پر منع کرتے ہیں ــــ وہ پوچھ رہی تھی کہ اس مسئلے کا حل آپ بتائیں تاکہ فرزانہ کی دوستی قائم رہ سکے ــــ ! ہمارے معاشرے کا کس قدر سنگین مسئلہ تھا جس کی طرف اس معصوم بچی نے اشارہ کیا۔ کاش ہمارے ملک کے راہنما نئی نسل کی تعلیمی اور تربیتی بنیادوں کا جائزہ لیں اور اس انتشار کو ختم کریں۔

اس کے بعد سلیم عبدالقیوم صاحب نے ملک کی معاشی صورتِ حال کا تذکرہ کیا اور کہا کہ جب تک ملک کی معاشی صورتِ حال کو تبدیل کر کے نظامِ ربوبیت قائم نہیں کیا جاتا اس وقت تک نئی نسل کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی۔

ثریا عندلیب صاحبہ نے اپنے نہایت حقیقت کشا مقالے میں معاشرے کی برائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ زندگی ایک جہنم بن چکی ہے اور انسان حیوانوں سے بھی گئے گذرے۔ پاکستان کی مملکت کا قیام اس لئے نہیں تھا کہ یہاں بدی کا دور دورہ ہو اور قرآنی تعلیمات پر کوئی عمل نہ کرے۔ موجودہ دور میں مسلمان کی منزل، نظامِ قرآنی کے قیام کے علاوہ کچھ نہیں کہ

یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

خالد محمود سید جنہوں نے مشرق میں شعور کی آنکھ کھولی لیکن مغرب میں عمر کا ایک حصہ گذارا ، وہ معاشرہ میں قول و فعل کے تضاد کی اصل وجہ تلاش کر رہے تھے اور سراپا سوال بنے ہوئے تھے۔

غلام صابر راقم الحروف نے لادینیت اور سرمایہ داروں کی اخلاقیات کو ہدفِ تنقید بنایا۔ اس کے بعد خالدہ عندلیب نے معاشرے میں عورت کی مظلومیت کا ایسا دردناک منظر پیش کیا کہ وہ خود بھی روئی اور لوگوں کو بھی رُلایا۔ ان کے شکوے کا جواب، اُن کے بھائی خالد لطیف نے دیا کہ قرآن کا نظام عورت کی مظلومیت کو ختم کر دیتا ہے۔

محمد احمد نے معاشرے میں فرقہ بندی اور نفرت کی خرابیوں کا تذکرہ کیا۔ عزیزہ نوشابہ نے قوم میں سلامتی فکر کے ساتھ ساتھ حسنِ کردار پر زور دیا۔ یعنی

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

محترم پرویز صاحب نے مذاکرے کی پہلی نشست کو نمازِ عصر اور مغرب کی ادائیگی کے لئے ختم کیا اور دوسری نشست ۱/۲ ۶ بجے شروع کرنے کا اعلان فرمایا۔ دوسری نشست کی ابتدا گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم شاہد امین حیدر نے کی اور مسلکِ خانقاہیت کو ختم کرنے پر زور دیا۔ مسرت چغتائی صاحبہ نے ملک کے عمومی تربیتی نظام کی جانب توجہ دلائی۔ شوکت پرویز نے مسجدوں میں وہابی، بریلوی ہونے کی اذیت ناک کیفیت کو خوبصورت مثال سے واضح کیا۔

خاور رشید بٹ نے طلباء کی بے راہ روی کو ملک کے نظامِ تعلیم کی خرابی میں تلاش کیا اور بتایا کہ یہ نظامِ تعلیم مسلمان پیدا نہیں کر سکتا۔ مذاکرہ کی فاضل مقررہ محترمہ عارفہ سلطانہ صاحبہ نے مسلمانوں کی تاریخ کو (جس رنگ میں اسے ہماری کتابوں میں پیش کیا گیا ہے)، نوجوان نسل کے دین سے برگشتہ ہونے کی بنیادی علت قرار دیا۔ اس کے بعد کاشانہ پرویز کی دو بچیاں نجمہ اور سلمیٰ پرویز نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پُر مغز خطبۂ صدارت میں محترم حسن عباس رضوی صاحب نے کہا کہ

"اگر ہماری نئی نسل اسی طرح اپنے عمل کا احتساب کرتی رہی تو پاکستان ایک نہ ایک دن ضرور خدا کے نور سے جگمگا اٹھیگا۔"

اس کے بعد سلمیٰ لطیف، خالدہ عندلیب، شوکت پرویز کو انعامات دیئے گئے لیکن انہوں نے یہ ساری رقم کالج فنڈ میں دے دی۔ اور اس طرح یہ حسین و جمیل محفل ختم ہوئی۔

اس قسم کے مذاکروں کا اہتمام اگر ملک کی درسگاہوں میں کیا جائے تو اس کے نتائج بڑے ہی دور رس ہو سکتے ہیں۔ اربابِ نظامِ تعلیم کو اس سلسلے میں خصوصی مشورے دینے چاہئیں تاکہ وہ اس طرح کی محفلوں سے نظر و فکر میں وسعت اور گہرائی پیدا کر سکیں۔

اعلان کیا گیا کہ ۹ بجے ایک کھلا اجلاس ہوگا یعنی "مجلسِ استفسارات" یہ محفل کنونشن کے اجتماعات میں جہاں بصیرت افروز ہوتی ہے وہاں شگفتگی و شادابی کی لالہ زار بھی ــــ اراکین کو ملتان والوں نے دعوت دی ــــ احباب نے کھانا کھایا اور دوبارہ پنڈال میں آبیٹھے۔ تاکہ اس کھلے اجلاس میں جگہ کی کمی لطف اندوزی پر بار نہ بنے۔ (مذاکرہ کی تقاریر طلوع اسلام میں شائع ہو جائیں گی۔)

مجلسِ استفسارات

رات ہو چکی ہے۔ ہلکی ہلکی سردی ہے۔ وسیع و عریض پنڈال لوگوں سے بھر چکا ہے اور مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب تیز روشنیوں کے جلوے میں اسٹیج پر آچکے ہیں۔ اس محفل کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ پرویز صاحب سامعین کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے جواب قرآن کی روشنی میں پیش کرتے ہیں لیکن ان کے جوابات زاہدِ خشک کی طرح نہیں ہوتے بلکہ وہ اس میں شائستہ طنز و مزاح کو اس خوبی سے گھول دیتے ہیں کہ بات سیدھی دل میں بھی اتر جاتی ہے اور جس پر چوٹ پڑتی ہے وہ بھی ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح عرب کے حسنِ طبیعت اور عجم کے سوزِ دروں کا حسین امتزاج فکری افق پر نہایت دلکش قوسِ قزح کی نمود کا باعث بن جاتا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ اگر کسی نے پرویز صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لینا ہو، تو وہ اس محفل میں شمولیت کرے۔ وہ ایک عمیق مفکر کی طرح مسائلِ حیات کی گہرائیوں میں بھی اترتے ہیں اور ایک سچے فنکار کی طرح سامعین کے احساسات پر نگاہ رکھتے ہوئے سنجیدہ موضوعات پر خون کے آنسو بھی رُلاتے ہیں اور قہقہوں کے جام بھی لنڈھاتے ہیں۔ انہوں نے سلسلۂ کلام کو شروع کرتے ہوئے کہا کہ

> یہ محفل گھر ملو قسم کی ہوتی ہے جس میں اجنبیت اور غیریت نہیں ہوتی۔ میں آپ کے سوالات کے جوابات قرآن کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق دوں گا۔ میں قرآن کا ادنیٰ طالب علم ہوں اس لئے میرے جوابات میں سہو و خطا کا امکان ہو سکتا ہے۔ اگر آپ میرے جواب سے مطمئن ہوں تو ھوالمراد۔ اگر کوئی گوشہ تشنہ رہ جائے تو آپ مجھ سے بذریعہ خط دریافت فرمالیں یا مجھ سے ملاقات کا وقت لے لیں۔ باہمی تبادلۂ خیالات سے افہام و تفہیم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

انہوں نے ایک ایک سوال کو پڑھا اور جن کے جوابات دینے تھے، انہیں الگ رکھ لیا اور بتایا کہ اکثر سوالات ایسے ہیں جو اس دنیا سے متعلق نہیں، اگلی دنیا سے متعلق ہیں ــــ لہٰذا اُن کے جوابات تو اُس دنیا میں ہی جا کر دوں گا۔

استفت اِس دنیا کی باتیں کرتا ہوں اور اُن سوالات کا جواب دیتا ہوں جن کا تعلق ہماری عملی دنیا سے ہے۔ اس کے بعد انہوں نے سوالات کے جواب دینے شروع کئے اور اس لطف کا اعتراف مجھے ہی نہیں بلکہ جن قلمکاروں نے گزشتہ کنونشنوں کے روئداد مرتب کی تھی، وہ بھی اس اعتراف میں میرے شریک رہے ہیں کہ اس محفل کی روئداد پیش کرنا کسی کے بس کی بات نہیں سینکڑوں سوالات اور ایک ایک سوال کے جواب میں بات سے بات نکلتی ہوئی سینکڑوں ہی گوشوں کو سمیٹتی چلی جاتی ——— سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے! ——— لہٰذا میں اس معذرت کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں۔

سامعین پرویز صاحب کی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے کہ اچانک انہوں نے اعلان کیا "لیجئے رات کے ۱۱ ۱/۲ بج گئے۔ لوگوں نے اپنی اپنی گھڑیوں کو دیکھا ——— اور تعجب سے دیکھا ——— واقعی رات ۱۱ ۱/۲ بجے کا وقت تھا۔ سچ ہے کہ جب دل و دماغ کی گہرائیوں سے کوئی کام جذب و شوق سے کیا جائے تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا ہے ———

بادلِ ناخواستہ لوگ پنڈال سے اٹھے، یہ کہتے ہوئے کہ کاش پرویز صاحب اس محفل کو زیادہ طویل بنائیں۔

صبح ۹ ۱/۲ بجے مفکرِ قرآن کا اہم خطاب تھا جس کا عنوان تھا " قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں"۔ صبح کے اس اجلاس میں شرکت کی آرزو میں لئے ہوئے اراکین اپنی اپنی خواب گاہوں میں چلے گئے، اور اس طرح مجلسِ استفسارات' رات گئے تک جاری رہنے کے بعد بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

کھلا اجلاس

۲۵ اکتوبر ——— بروز۔ اتوار ——— صبح ۹ ۱/۲ بجے

صدارت :- ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب

زندگی کے معمولات میں اگر تنوع پیدا ہوتا رہے تو مصروفیات بار گراں محسوس نہیں ہوتیں بلکہ انسان ان مصروفیات کو مقصدِ زندگی سمجھتے ہوئے بڑے جذب و انہماک سے سعی و عمل میں مصروف رہتا ہے اور نتائج بھی خوشگوار ہوتے ہیں۔ اور اگر زندگی کی ہر آن بدلتی ہوئی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ ہم رکاب نہیں ہوا جاتا تو پھر اجتماعی طور پر مایوسی پیدا ہو گی اور مایوسی کی دوسری شکل بغاوت اور ہنگامہ آرائی ہے۔ جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا مشن یہ ہے کہ انسان غیر متبدل اصولوں کا دامن تھامے ہوئے' زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیات کا ساتھ دے اور انتشار سے دوچار نہ ہو۔ اس قسم کی ذہنی کیفیات کے ساتھ اراکین پنڈال میں داخل ہو رہے تھے۔ آج مفکرِ قرآن کا اہم خطاب تھا اور موجودہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا تجزیہ پیش کیا جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ملک کے سیاسی حلقوں کو بھی اس سے دلچسپی تھی اور دن بھی ہفتہ وار چھٹی کا تھا، اس لئے پنڈال وقت سے پہلے ہی بھر گیا۔ اس اجلاس کی

صدارت لائل پور کے ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب نے فرمائی ۔۔۔ موصوف نہ صرف ایک معزز شہری ہیں بلکہ بزم طلوع اسلام لائل پور کے قابل فخر رکن بھی ہیں۔ محترم ظفر احسن محمود صاحب نے تلاوت کلام پاک کے لئے محترم خواجہ محمد معظم صاحب کو دعوت دی۔ گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس، سرخ و سفید رنگ کا یہ نوجوان ۔۔ تلاوت قرآن پاک کے لئے اسٹیج پر آیا ۔۔۔ مذہب زدہ لوگ اس طرح کے نوجوانوں کو ملتے پر تیوریوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ لیکن انہیں کیا خبر کہ اب یہ نوجوان قرآن کے کس طرح کے شیدائی ہیں اور ان کے قلب و دماغ میں دین کس طرح رچ بس چکا ہے ۔۔۔ خواجہ محمد معظم صاحب نے تلاوت کی اور دلوں میں ولولے پیدا ہو گئے۔

تلاوت قرآن مجید کے بعد محترم محمد اسلام صاحب نے طلوع اسلام تحریک کے تعارف کے موضوع پر ایک پُر مغز اور فاضلانہ مقالہ پڑھا جس میں تاریخی و تہذیبی معلومات بھی تھیں اور اس تناظر میں اپنے موقف کے اظہار کا فاضلانہ طریقہ بھی۔ (یہ مقالہ طلوع اسلام کی اشاعتوں کی شامل کر دیا جائے گا۔)

محترم اسلام صاحب کے حقیقت کشا مقالے کے بعد تحریک طلوع اسلام کے دیرینہ ساتھی محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب (ساہیوال) نے اپنا مقالہ "لخت لخت" پڑھا۔ جو زندگی کے مسائل پر ایک دیدہ ور کا مشاہدہ تھا۔ سامعین نے دوران مقالہ کئی بار پُر جوش تالیوں سے تحسین و آفرین کی ۔۔۔ (یہ دل افروز مقالہ طلوع اسلام کی آئندہ اشاعتوں میں شائع کر دیا جائے گا)۔ اس کے بعد صاحب تحریک کے دیرینہ رفیق، شیخ سراج الحق صاحب نے طلوع اسلام کا مختصراً تعارف کرایا۔

لیجئے اب وہ وقت بھی آ گیا جس کے لئے سامعین ہمہ تن انتظار تھے۔ یعنی مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کا خطاب ان کا موضوع تھا۔ "قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں"۔ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پرویز صاحب ملک کی موجودہ صورت حال کے بارے میں اظہار خیالات فرمائیں گے۔ ان کے فکری اور سنجیدہ تجزیوں سے ملک کے صاحب نظر لوگ استفادہ کرتے ہیں اور ہمارے ملک کی تہذیبی رفتار میں ان کے خطابات کا گہرا اثر ہے۔ (ان کا یہ عہد آفریں مقالہ چونکہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت نومبر ۷۰ء میں شائع ہو گیا ہے اس لئے میں اس کے مندرجات کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھتا)۔

پرویز صاحب کے اس فکر انگیز اور نظر کشا خطاب کو لوگوں نے نہایت جذب و انہماک سے سنا اور موجودہ خلفشار کو پرکھنے اور دیکھنے کے لئے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے شناسائی ہوئی۔

(o)

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا اجلاس - ۱۲ بجے

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ایک ایسی کوشش کا نام ہے جو ملت کے فرزندوں میں سیرت فولاد پیدا کرنے

کی متمنی ہے۔ اس کوشش میں ملک کے کونے کونے کے صاحبانِ علم و بصیرت مصروفِ جدوجہد ہیں۔ یہ اجلاس قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری محترم شیخ سراج الحق صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس کی غرض و غایت بتلاتے ہوئے محترم ظفر احسن محمود صاحب نے فرمایا کہ احباب قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی رفتارِ کار سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے لہذا اب تفصیلی طور پر اس بارے میں گفتگو کی جائے گی۔ اس سلسلے میں مختلف احباب نے اس سوسائٹی کی رفتارِ کار کو تیز تر کرنے کے مفید مشورے دیئے۔ سامعین کو بتایا گیا کہ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے ذمہ دار احباب اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ آگاہ ہیں اور پوری دلجمعی سے اس کام کو کر رہے ہیں۔ خارجی موانعات اگرچہ سدِّ راہ بن جاتی ہیں لیکن انشاءاللہ ہم اپنے مقصد میں بتدریج کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کی بھی وضاحت کی گئی کہ ہمارا کالج کوئی کمرشل کالج نہ ہوگا اور نہ ہی ہم کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہمارا نصب العین دوسروں سے بالکل جدا اور منفرد ہے۔ اس کے بعد حسین آرزوؤں اور مقدس دعاؤں کے ساتھ یہ اجتماع ختم ہوا۔

(٠)

پرویز صاحب کا الوداعی خطاب

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!

اراکین بزم، اپنے سہ روزہ قیام کے بعد واپس اپنے کاشانوں میں جانے والے تھے۔ نئے ولولے، نیا جوش و خروش اور نئی امنگیں ان کے ساتھ تھیں۔ اس فضا میں محترم پرویز صاحب نے اراکین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ

رفیقانِ محترم! ابھی آپ کے آنے والے قدموں کی نشید جاں فزا میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ مجھے اب آپ کو الوداع کہنا پڑ رہا ہے۔ ویسے تو ہر آنا جانے ہی کے لئے ہوتا ہے لیکن جو جانا پھر آنے کی تمہید بن جائے وہ کچھ ایسا یاس انگیز نہیں ہوتا۔

اس دفعہ آپ کے لئے ایک اہم الوداعی پیغام میرے پیشِ نظر ہے۔ کنونشن کے اجتماعات میں آپ کے کانوں میں یہ آوازیں بار بار آتی رہیں کہ طلوع اسلام نے جو کچھ اتنا عرصہ پہلے کہا تھا وہ حرف بحرف پورا ہو رہا ہے اور قوم ہر طرف سے ہار تھک کر اسی نصب العین کی طرف آ رہی ہے جسے اس نے بطور نشانِ منزل تجویز کیا تھا۔ ہم نے تئیس سال پہلے قوم کو متوجہ کیا کہ جماعتِ اسلامی قوم اور اسلام دونوں کے لئے مہیب خطرہ کا موجب ہے۔ آج ملک میں چاروں طرف سے یہی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اس نے بیس بائیس سال پہلے کہا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ آج متشدد قدامت پسندوں کی طرف سے بھی

اس حقیقت کا اعتراف ہو رہا ہے۔ اس نے سالہا سال پہلے کہا کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت اسلامی کے سر پر عاید ہوتی ہے اور مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو عہدہ برآ ہونے کے لئے وسائل مملکت کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ آج سوشلزم کے حامیوں کی طرف سے نہیں بلکہ نظام سرمایہ داری کے علمبرداروں سے بھی یہی آواز بلند ہو رہی ہے۔

یہ صورت حال یقیناً ایسی ہے جس پر آپ جس قدر بھی اظہار مسرت کریں، کم ہے۔ لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ آمادہ بہ کار ہونا پڑے گا۔ اس سلسلے میں آپ سورہ النصر کی ان آیات پر غور فرمائیے۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا

یعنی اے رسول! جب خدا کی فتح اور نصرت تیرے ہم آغوش ہو اور تو دیکھے کہ لوگ کس طرح انبوہ در انبوہ تمہارے نظام میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو . . . .

ان الفاظ کے سننے کے بعد دنیا یہی کہے گی کہ اس کے بعد کہا گیا ہوگا کہ تم اپنی اس فتح و کامرانی پر جشن مسرت مناؤ۔ اور اطمینان کی نیند سو جاؤ کہ تم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا لیکن خدا اپنے رسولؐ سے اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ — اس کے بعد تو اپنے اس پروگرام کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے اور شدت سے سرگرم عمل ہو جا۔ اسی حقیقت کو اس نے ان جامع الفاظ میں دہرایا ہے کہ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ۔ جب تو اپنے پروگرام کی ایک کڑی سے فارغ ہو جائے تو یہ نہ سمجھ کہ اب تمہارے فریضہ ادا ہو گیا بلکہ اس کے بعد اس کی اگلی کڑی کو لے کر اس پر استقامت سے جم جاؤ۔

لہٰذا میرے عزیز رفیقو اور ہمسفرو! آپ کے پروگرام کی موجودہ کامیابی کہیں آپ کو اس فریب میں مبتلا کر کے کہ اب منزل طے ہو گئی ہے، آپ کو محوِ خواب یا سست خرام نہ کر دے۔ کاروانِ قرآنی کا تو پروگرام یہ ہوتا ہے کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یہاں تو عمر بھر کے لئے چلنا ہے، آخری سانس تک چلنا — بلکہ اس کے بعد بھی پھر آگے چلنا لہٰذا ہمارے ہاں آرام طلبی کا کوئی مقام ہی نہیں۔ جو لوگ آپ کی پیش کردہ دعوت کے الفاظ دہرا رہے ہیں وہ ابھی مقدمۂ لا تک پہنچے ہیں، انہیں الّا کی منزل تک لانا، ہنوز آپ کے ذمے ہے، لہٰذا آپ پہلے سے بھی زیادہ ہمت اور مستعدی سے اس

پروگرام کی تکمیل کے لئے پا بہ منزل رہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت آپ کے ساتھ ہو !!

والسلام !

پرویز صاحب کے اس پیغام حیات آور کو بطور زادِ سفر اپنے ساتھ لیتے ہوئے یہ کاروانِ نور ونکہت اپنے اپنے نشیمن کی طرف فرحاں وخنداں لوٹ گیا ــــ لوٹ گیا پھر آنے کے لئے ــــ !

ــــــــ ○ ــــــــ

قراردادیں

(۱) شرکائے کنونشن بزمہائے طلوع اسلام کی طرف سے بزم طلوع اسلام لاہور کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ اس نے سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے کنونشن کے جملہ انتظامات بحسن وخوبی سرانجام دیئے اور اس کے لئے شب وروز انتھک محنت کی۔　　(محرک۔ محمد اسلام)

(۲) بزم طلوع اسلام لاہور ان تمام شرکائے کنونشن و مہمانان خصوصی کی شکر گذار ہے جنہوں نے سفر کی صعوبتوں اور گوناگوں رکاوٹوں کے باوجود کنونشن میں شرکت فرما کر اسے کامیاب بنایا۔　　(محرک: ایم لطیف چوہدری)

(۳) محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے اتنی مدت تک ادارہ طلوع اسلام کی نظامت کے فرائض جس پرخلوص طریق سے سرانجام دیئے ہیں یہ کنونشن اسے بنظر استحسان دیکھتی ہے اور ان کی ان خدمات کے لئے دلی شکر گذار ہے۔

(محرک۔ طالب حسین)

(۴) راولپنڈی بزم کے ممتاز رکن ملک ظہور احمد ایک عرصہ دراز سے محترم پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کے ٹیپ کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا فریضہ رضاکارانہ طور پر سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ مرحلہ جس قدر ہمت طلب اور صبر آزما ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ جس قدر استقامت، ثبات اور استقلال سے اس کوہ کنی میں والہانہ طور پر مصروف ہیں وہ قابلِ صدرشک اور موجب ہزار فخر و مباہات ہے۔

طلوع اسلام کی یہ کنونشن محترم ظہور صاحب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتی ہوئی دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس مبارک فریضہ کو تکمیل تک پہنچاویں۔ یہ کنونشن بزم راولپنڈی کو بھی درخور مبارکباد سمجھتی ہے جسے اس قسم کا کوہکن میسر ہے۔　　(محرک، طالب حسین)

(۵) بزم کراچی تحریک کے فروغ کے لئے جن نئے نئے طرق واسالیب سے مصروف جدوجہد ہے۔ طلوع اسلام کی یہ کنونشن اسے نہایت قدر وقیمت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور آرزومند ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہمتوں

میں برکت، ان کے عزائم میں ثبات اور ان کے وسائل میں کشاد عطا فرمائے تاکہ وہ اس کی کتاب عظیم کی خدمت، اس سے بھی زیادہ ذوق و شوق اور جوش و ولولہ سے کر سکیں۔

بزم کراچی کی طاہرہ بیٹیوں نے جس ذوق و شوق اور سلیقہ و شائستگی سے اپنی مصنوعات کو کنونشن میں پیش کیا ہے اور جس جذبۂ ایثار سے کام لے کر انہوں نے ان مصنوعات کی قیمت طلوع اسلام کالج فنڈ کی نذر کی ہے، یہ کنونشن اس کے لئے ان بیٹیوں کو صد ہزار مبارکباد کے قابل سمجھتی ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معصوم ہاتھوں کے لگائے ہوئے ان ننھے ننھے پودوں کو شجرِ طیب بنا دے۔

(محرک - ایم لطیف چوہدری)

(۹) قرارداد تعزیت

سالِ رواں میں قافلۂ قرآنی کے چار ممتاز رفقاء محترم خان عبدالحکیم خان (مردان)، محترم بلند اقبال خان (لاہور) محترم میاں چراغ حیدر (میانوالی)، محترم ماسٹر غلام محمد انصاری (لائل پور) ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

طلوع اسلام کی یہ کنونشن دلی صدمہ کے ساتھ ان احباب کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتی اور اللہ سے دعا کرتی ہے کہ قرآن کے ان شیدائیوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (محرک: طالب حسین)

طلوع اسلام کے آئندہ شمارہ میں

پرویز صاحب کا کنونشن کا خطاب

قدیم اور جدید میں کشمکش

کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

استقبالیہ

جس سے صدر کنونیشن کمیٹی، میاں ظفر احسن محمود نے مندوبین کو خوش آمدید کہا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفیقانِ ہم سفر۔ سلام و رحمت:

ماہِ اکتوبر کی اس مسکراتی چمکتی اور بہاریں صبح میں میری مسرت اور خوشی کا حساب نہ پوچھئے جو مجھے یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ میں مشعل برداران قرآن کی اس عظیم الشان برادری کو خوش آمدید اور مرحبا کہہ سکوں۔ میرے عزیز بھائیو! خدائے کریم آپ کی عمروں میں درازی، آپ کے عزائم میں پختگی، آپ کے قدموں میں ثبات و استقلال اور آپ کے مقاصد میں کامیابی عطا کرے۔ آپ ہزار ہا ہزار سال اس درخشندہ و پائندہ مقصد کی کرنیں بکھیرتے اسی طرح یہاں آتے رہیں اور قرن ہا قرن "قرآنِ خالص کی ضیا بار روشنی سے دنیا و جہان کی راہیں روشن کرتے رہیں۔

آپ کو خوش آمدید کہتے کہتے میری زبان نہیں تھکتی اور آپ کو مرحبا مرحبا کہتے کہتے میرا جی نہیں بھرتا۔ یقین کیجئے آپ کے قدموں میں آنکھیں بچھاتے بچھاتے ہم بزم لاہور والے کبھی کماحقہٗ سیر نہیں ہو پاتے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آپ کی آمد ہمارے نہاں خانہ ہائے دل کی آبادی ہے۔ آپ کا اجتماع ہمارے لئے وجہِ تقویت ایمان اور باعثِ تجدیدِ عزائم بنتا ہے۔ آپ کے ہم دوش کھڑے ہو کر ہمیں موقع فراہم ہوتا ہے کہ سالِ گزشتہ کے بارہ میں احتسابِ خویش کر سکیں اور سالِ آیندہ کے لائحہ عمل کو ترتیب دے سکیں۔ آپ کے قرب و حضور میں یہ سرور آگیں احساس جاگتا ہے کہ قافلۂ دینِ قیم میں اب کوئی مسافر یکہ و تنہا نہیں۔ اور اب تاریکی و ظلمات کی وادیوں میں کسی سرفروش کو اکیلا پن نہیں ڈستا۔ ہم آپ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے انتہائے اعتماد و استقلال کے ساتھ زمانے کی ویران راہوں کے اندھیرے پاٹنے کے لئے رواں دواں ہیں۔ آپ کی رفاقت میں ہم اس یقینِ محکم سے سرشار ہوتے ہیں کہ ہر

جانے والی شام مقصدحیات کا سویرا نزدیک تر لا رہی ہے اور ہر لمحہ و ہر گام انقلاب قرآنی قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ احساس یہ اعتماد اور یہ بھروسہ ایک عظیم سرمایہ عظیم اور متاع کثیر ہے۔

صاحبانِ محترم! سال گذشتہ عجب افراتفری اور انتشار میں گزرا ہے۔ ہر طرف عدم اعتماد، ابہام اور تشکک کا دور دورہ رہا۔ عجیب و غریب نظریات سامنے آئے اور تعجب انگیز نعرے بلند ہوئے۔ الفاظ بے معنی اور افکار لایعنی کے انبار لگ گئے۔ جو کہا گیا وہ کسی کے بھی دل کی بات نہ تھی اور وہ جو ہر ایک کے دل میں تھی اُسے کہا نہیں گیا۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اور ہر حیلہ جو اور موقع پرست راہِ حق کا مجاہد و غازی بن بیٹھا۔ خود غرض اور کوتاہ اندیش رہنماؤں نے موقع پرستی، مطلب براری، بدنظمی، طوائف الملوکی کا وہ غبار اٹھایا کہ کچھ وقت کے لئے تو وطنِ عزیز کی نظریاتی بنیادیں بھی دھندلا گئیں۔

یہ غبارِ خاک ابھی تک فلک گیر اور زمیں پوش ہے۔ الحمد اللہ۔ باری تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور نہایت یقین و اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک اور صرف ایک طائفہ کم مائیگاں ایسا بھی نکلا ہے جو نورِ قرآنی سے فروزاں مشعلیں ہاتھوں میں لئے، اپنے دیدہ ور، دور اندیش رہبر اور قرآن فہم راہنما کی قیادت میں نہایت استقلال و بردباری، نہایت خاموشی اور متانت کے ساتھ اپنے منتہائے مقصود کی جانب رواں دواں رہا۔ وادیٔ پُرخار میں ہر جھاڑ و جھنکار سے دامن بچاتا ایک قافلۂ آبلہ پایاں ایسا تھا جو اپنی منزل کی طرف آہستہ آہستہ فرحاں و خنداں چلتا رہا۔ اگرچہ ان کا جلوہ خیرہ کن نہ تھا، گرچہ ان کی رفتار برق وش نہ تھی مگر ان کے قدوم کا ثبات اور ان کے دلوں کا استغنا ہر لمحہ و آن وقت کے ناپیدا کنار سینے پر اپنے چمکدار نقوش بناتا گیا ہے اور بنا رہا ہے۔

میرے دوستو! یہ مبارک قافلہ صرف آپ ہی کی جماعت ہے اور یہ راہبر بابصر صرف پرویز صاحب کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ زندہ و جاوید نظریہ اور ثبات آشنا پیغام صرف پیامِ قرآنی ہے اور اس آوازۂ حق کا علمبردار طلوعِ اسلام ہے۔ خود دیکھ لیجئے کہ آج جب ہنگامہ خیزیوں کا گرد و غبار کچھ کم ہو رہا ہے تو نظر آتا ہے کہ وہ برق رفتار جو ستاروں سے خبر لے آنے کے مدعی تھے، تھکان اور درماندگی سے چور چور ہیں لیکن آپ کے قدموں کی صدائے بازگشت آج بھی ہر کوچہ و بام سے آ رہی ہے۔

کل جب فتنہ و فساد نقطۂ عروج پر تھا اور آج جب شور و غوغا اپنی انتہا پر ہے صرف آپ ہی کا موقف ہے جو حقیقت اور قائم بذات کہلا سکتا ہے اور صرف آپ کا مسلک ہے جو جنت بداماں قائم رہ سکتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے وقت کی کہ آنے والے کل کو جب اس شور و شر کے بعد ایک بھیانک خاموشی اور مرگھٹ کا سکوت اس ملک کے ہنگامہ خیزوں کا مقسوم بن جائے گا صرف آپ ہی کا پھریرا وہ علمِ ربانی ہوگا جو ہر طرف رنگ و نور

اور آس وامید کی برکتیں بکھیرے گا۔

خدائے عزّ وجل کا احسان ہمارے باباجی پر ہے اور ان کا احسان ہم پر ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اور اپنی مسافت کے ہر مرحلے پر ترک کر ہم نے خدائے حکیم کی کتابِ مبین سے راہنمائی حاصل کی۔ مقامِ شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں اس لائق بنایا اور اس میں مداومت بخشی کہ ہم تمام مسائل کا حل اُس ازلی۔ ابدی، ہمہ وقت محفوظ اور لازوال خزینے سے حاصل کرلیں جسے نورِ مبین اور سراجاً منیراً کہا گیا ہے اور تمام معاملات میں حکم و سند اُسی کو اور صرف اُسی کو قرار دیں۔

میرے عزیز ہم جلیسو! آج کا دن ہمارے لئے یومِ فتح ہے۔ یہ صرف طلوعِ اسلام کا آوازۂ داعیِ حق ہے جو پاکستان کے ہر کہہ و مہ کی زبان پر ایک حقیقتِ مسلمہ اور ایک یقینی مطالبہ بن کر مسلط ہو گیا ہے۔ یہی وہ سچا اور پاک راستہ ہے جس کے سامنے دوسرے تمام نظریات وعقاید آج باطل و ہیچ نظر آرہے ہیں۔ الحمدللہ کہ انسانوں کے تراشیدہ لات ومنات آج خدائے محمدؐ کے حضور سرنگوں اور سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اور حقیقت وہ جو خود کو بزورِ اندروں منوالے۔

مجھے یقینِ کامل ہے کہ وہ وقت دور نہیں اور چشمِ تصور میں وہ عہد دیکھ رہا ہوں جب تمام جماعتیں اور گروہ آوازۂ قرآن اور طلوعِ اسلام کے مسلک کو من وعن اپنا لیں گے۔ اور پھر ہاتفِ غیب پکارے گا۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْہُ۔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔

اے برادرانِ عزیز! آپ آگئے ہمارے لئے مژدۂ عید ہوا۔ ہمارے قلب وجگر روشن ہوئے۔ ہماری آنکھیں ٹھنڈی اور ہمارے دل مسرور ہوئے۔ اس آمد کے لئے آپکا ہزار بار شکریہ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ ہم ایک ہی شاخ کے پھول پتے ہیں۔ ہمارے جسد الگ الگ ہیں مگر دلوں کی دھڑکن ایک ہے۔ ہمارا مقصدِ حیات ایک ہے اور ہماری منزل واحد ہے تو پھر کون مہمان ہوا اور کون میزبان۔ آپ یہاں اجنبی نہیں لگنے میں ہم لاہور والوں نے اپنی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ آپکا قیام لاہور بہ سکون وآرام گزرے۔ لیکن بہرصورت ہمیں اپنی بے مائیگی اور کوتاہ دامنی کے اعتراف میں بھی کوئی تامل نہیں۔ ہو سکتا ہے ان تمام مساعی کے باوجود ہم آپ کی شایانِ شان مدارت نہ کر سکے ہوں تو اس کیلئے ہم تہ دل سے معذرت خواہ ہیں۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب کو کوئی زحمت یا تکلیف درپیش ہو تو براہِ کرم اپنی بات برادرِ محترم محمد نصراللہ خانصاحب تک ضرور پہنچائیے جو کیمپ کمانڈر ہیں یا پھر برادر محترم چوہدری ایم لطیف صاحب کی طرف رجوع فرمائیے جو نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور ہیں۔ انشاءاللہ آپ ہمیں خدمت پر مستعد پائیں گے۔

اب میں اپنے استقبالیہ کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اے خدا ہمارے دلوں میں زیادہ سے زیادہ محبت اور یکجائی پیدا کر ہمیں ہم نگہی اور ہم آہنگی عطا فرما الٰہی ہمیں ان لوگوں میں سے نہ کرنا جن کے اجسام تو مجتمع ہو جاتے ہیں مگر دلوں پر تشتت اور انتشار کی حکمرانی ہوتی ہے۔ الٰہی ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے اور جادۂ قرآنی پر صبر وثبات سے کھڑے ہونے کی استقامت عطا فرما۔ الٰہی ہمارے راہبرِ مشفق کو عمرِ خضر اور صحتِ کاملہ عنایت کرنا کہ وہ تیرے دین کا غلغلہ مشارق ومغارب سے بلند کر سکیں اور اس طرح یہ کرۂ ارض اپنے پیدا کرنیوالے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ آمین! شکریہ!

طلوع اسلام کنونشن

طلوعِ اسلام کالج

اپنے انداز کی منفرد درسگاہ

رپورٹ : پیش کردہ محترم شیخ سراج الحق صاحب سیکریٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

خواتین وحضرات!

قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس قسم کے آج کے نوجوان
سی قسم کی کل کی قوم۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم وتربیت صحیح خطوط پر ہو جائے۔ تو قوم خود بخود صحیح قالب میں
وھل جائے گی۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی
کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ
تغافل برتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا ماتم کر رہے ہیں۔ یہ قوم کون سی ہے،
جس کی ہم اس قدر شکایت کرتے ہیں؟ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ جو تشکیلِ پاکستان کے وقت ہماری
رس گاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہی طالب علم بیس بائیس برس کے بعد اب ہماری قوم کا ہوشمند طبقہ بن گئے
یں۔ اور انہی کا رونا ہم کئے دن روتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ ہم قوم کی بے راہ روی کا
ونا بھی روتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر سال اسی قوم میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو نوجوان ہماری
رس گاہوں سے غلط تعلیم حاصل کر کے باہر نکلتے ہیں۔ وہ ہماری قوم کے اجزا بنتے ہیں۔ اس تباہی سے
بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔

۲۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی۔ قرآن کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا
مارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے
یں ڈھالا جائے۔ اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے۔ کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے۔ وہ فیصلہ

کرسکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں۔ کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب اور دارالعلوم الگ کھولے جائیں۔ اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا یہ طریق ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ (PERIOD) دینیات کا رکھ دیا جائے۔ یا ایم۔ اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر لیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جسے علامہ اقبالؒ نے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ ؏

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ " دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے۔ کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات۔ تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ــــ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے، جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے۔ یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ

" فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعت عامہ کے لئے صرف کیا جائے"

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی۔ جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا رو رہے ہیں۔

(۳) تعلیم کے جس نظریہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے سب سے بڑے نقیب، مفکرِ قرآن، محترم پرویز صاحب ہیں جنہوں نے اپنی زندگی، فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں والہانہ انداز سے حصہ لیا۔ تو اسی مقصد کے پیشِ نظر کہ جب تک اپنی آزاد مملکت نہ ہو اسلام ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکتا۔ اب تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ اس نظریے کے عام کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ کہ یہ مملکت اسلامی قالب میں ڈھل نہیں سکتی۔ جب تک قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ تجویز پیش کی۔ کہ ایک اپنا کالج کھولا جائے۔ جس میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدہ کے مطابق ہو۔ تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل

طالب علم، زندگی کے کسی شعبے میں، دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اور اس کے لئے مختلف میدان، دوسرے طالب علموں کی طرح کھلے ہوں۔ لیکن اس کالج میں یہ مضامین اس طرح پڑھائے جائیں کہ طلبا کو ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ ان میں کون سی بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور قرآن کریم اس باب میں کیا نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں قرآنِ کریم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ:۔

(۱) ــــ پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں۔ وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی، اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کون سی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے۔ یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے۔ اور

(۲) ــــ دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے۔ قرآن کریم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نقطۂ نظر نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور خود اپنے ملک میں بھی اپنوں کی فکری راہنمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید مثال بن سکیں اور اسی طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت پیش کر سکیں۔ کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائیں۔ اور وہ سیرتِ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ کے رکھ لیں۔ تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر انسانیت فخر کر سکے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی تربیت کے لئے کالج کے ساتھ ہوسٹل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے ایک جدید طرز کی درس گاہ کے قیام کا پروگرام سامنے رکھا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ اس کی ابتدا ر الیف۔ اے (سال اول) سے کی جائے اور اسے سال بہ سال آگے بڑھاتے چلے جائیں، اس کے بعد، ابتدائی اسکولوں کی بنیاد رکھی جائے۔ تاکہ شروع ہی سے بچوں کی تعلیم اسی نہج پر ہو۔ درس گاہیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے قائم کی جائیں۔ اور جب یہ سلسلہ پھیل جائے۔ تو اس کے لئے ایک الگ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انہی درس گاہوں میں اساتذہ تیار کئے جائیں۔ اس طرح یہ درس گاہیں ملک کے عام نظامِ تعلیم کے لئے نمونہ کا کام دے سکیں گی۔ اور پاکستان میں ایک نئی قوم تیار ہو جائے گی جو اس

آئیڈیالوجی کی پیکر ہو گی جس کے لیئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

(۴) پچھلے سال کنونشن میں آپ کے گوش گزار کیا گیا تھا کہ اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی متشکل کی گئی۔ جسے حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرالیا گیا۔ اس کی ایک ایگزیکیٹو کمیٹی بھی مقرر کرلی گئی۔ سوسائٹی کے چیئرمین خود پرویز صاحب ہیں۔ جن کی قرآنی فکر کی روشنی میں اس کالج کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں قوم کے بچوں کو ایک گوشہ میں لے کر بیٹھ جائیں۔ اور قرآنی شمع ان کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے رخصت ہوں ان کی اس آرزو کی برومندی بھی اسی اسکیم سے وابستہ ہے۔

(۵)۔۔ کالج کی تعمیر کے لئے سب سے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنا تھا۔ زمین حاصل کرنے کے لئے جس قدر ابتدائی سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے کوشش کی گئی۔ کہ اراضی کہیں سے بطور عطیہ مل جائے۔ لیکن اس میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر بعض مخلص احباب کی طرف سے ایک ایسی اسکیم سامنے لائی گئی۔ جس سے (بحمد اللہ) یہ مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔ مختلف احباب نے ایک ایک کنال قطعہ اراضی کے لئے عطیات کی پیش کش کردی ہے۔ جس سے کافی رقبہ حاصل ہو جائے گا۔ پچھلے سال تعمیر فنڈ کے لئے عطیات فراہم کرنے کی مہم بھی شروع کردی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ آپ یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ کالج فنڈ میں اب تک قریب ۲ر۸۰ر۰۰۰ ۰۰۰ روپے جمع ہو چکے ہیں۔

(۶) ــــ یہ ہیں وہ عزائم جنہیں لے کر قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی وجود میں آئی ہے، ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ اسکیم اپنی تکمیل کے لئے بہت بڑے ذرائع اور وسائل چاہتی ہے۔ جو اس وقت اسے میسر نہیں۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ قوم کے وہ درد مند اصحاب جو ملت کے سچے بہی خواہ ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں تباہی سے بچ جائیں۔ اور ان کا وجود باعث فخر پاکستان اور وجہ شرف انسانیت ہو۔ وہ ہمارے اس عزم کو بروئے کار لانے کے لئے آگے بڑھیں گے۔ اور ہر طرح سے ہم سے تعاون کریں گے۔ ہماری آپ حضرات سے گزارش ہے۔ کہ آپ براہ کرم زیادہ سے زیادہ مالی امداد سے اس اسکیم کو کامیاب بنائیں۔ میں توقع رکھتا ہوں۔ کہ اس اجتماع میں صاحب ثروت اور ہمت حضرات اس کار خیر کے لئے اپنے عطیات کا اعلان فرمائیں گے۔

والسلام!

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

پرویز صاحب کی پریس کانفرنس

طلوعِ اسلام کنونشن سے دو روز قبل (۲۱۔ اکتوبر کی شام) محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے مکان پر، پرویز صاحب نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں پریس کے نمائندگان بڑی کثرت سے شریک تھے۔ یہ کانفرنس متانت، سنجیدگی اور مفکرانہ انداز کی نہایت عمدہ مثال پیش کر رہی تھی ــ سوالات بھی متین، اور سنجیدہ تھے اور ان کے جواب بھی نہایت پروقار اور فکرانگیز۔ کانفرنس میں جو پریس ریلیز نمائندگان کو دیا گیا تھا۔ اس کا متن حسبِ ذیل ہے:۔

پریس ریلیز:

اس وقت سارا ملک الیکشن کے ہنگاموں میں دیوانہ وار مصروفِ تگ و تاز ہے۔ اور ہر سیاسی پارٹی کی کوشش یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے، مملکت کی زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام چونکہ عملی سیاست میں حصہ ہی نہیں لیتی۔ اس لئے مجھے ان سرگرمیوں سے چنداں دلچسپی نہیں لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ کہ ہر پارٹی حصولِ اقتدار کے لئے تو اس قدر مضطرب و بے قرار ہے، لیکن جن بنیادوں پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ ان کے متعلق کسی کو اتنا دیکھنے کی بھی فرصت یا ضرورت نہیں کہ وہ اپنے مقام پر قائم بھی ہیں یا نہیں۔ اس مملکت کی عمارت دو بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔

(i) دو قومی نظریہ ــ یعنی یہ حقیقت کہ اسلام کی رو سے معیارِ قومیت، دین کا اشتراک ہے۔ نہ کہ اشتراکِ وطن۔ اس نظریہ کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم مل کر ایک قوم کے افراد نہیں بنتے ــ مسلمان غیر مسلموں سے الگ مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں ــ یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھا۔

(ii) اسلام ایک زندہ حقیقت اس صورت میں بن سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں اسلامی نظام قائم اور قوانین شریعت رائج کئے جا سکیں۔

آئیڈیالوجی کی پیکر ہوگی جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

(۴) پچھلے سال کنونشن میں آپ کے گوش گزار کیا گیا تھا کہ اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی متشکل کی گئی۔ جسے حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرالیا گیا۔ اس کی ایک ایگزیکیٹو کمیٹی بھی مقرر کرلی گئی۔ سوسائٹی کے چیئرمین خود پرویز صاحب ہیں۔ جن کی قرآنی فکر کی روشنی میں اس کالج کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں قوم کے بچوں کو ایک گوشہ میں لے کر بیٹھ جائیں۔ اور قرآنی شمع ان کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے رخصت ہوں ان کی اس آرزو کی برومندی بھی اسی اسکیم سے وابستہ ہے۔

(۵)۔۔۔ کالج کی تعمیر کے لئے سب سے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنا تھا۔ زمین حاصل کرنے کے لئے جس قدر ابتدائی سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے کوشش کی گئی۔ کہ اراضی کہیں سے بطور عطیہ مل جائے۔ لیکن اس میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر بعض مخلص احباب کی طرف سے ایک ایسی اسکیم سامنے لائی گئی۔ جس سے (بحمد اللہ) یہ مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔ مختلف احباب نے ایک ایک کنال قطعہ اراضی کے لئے عطیات کی پیش کش کردی ہے۔ جس سے کافی رقبہ حاصل ہوجائے گا۔ پچھلے سال تعمیر فنڈ کے لئے عطیات فراہم کرنے کی مہم بھی شروع کردی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ آپ یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ کالج فنڈ میں اب تک قریب ۲٫۸۰٫۰۰۰ روپے جمع ہو چکے ہیں۔

(۶) ۔۔۔ یہ ہیں وہ عزائم جنہیں لے کر قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی وجود میں آئی ہے، ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ اسکیم اپنی تکمیل کے لئے بہت بڑے ذرائع اور وسائل چاہتی ہے۔ جو اس وقت اسے میسر نہیں۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ قوم کے وہ دردمند اصحاب جو ملت کے سچے بہی خواہ ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں تباہی سے بچ جائیں۔ اور ان کا وجود باعثِ فخرِ پاکستان اور وجہِ شرفِ انسانیت ہو۔ وہ ہمارے اس عزم کو بروئے کار لانے کے لئے آگے بڑھیں گے۔ اور ہر طرح سے ہم سے تعاون کریں گے ہماری آپ حضرات سے گزارش ہے۔ کہ آپ براہِ کرم زیادہ سے زیادہ مالی امداد سے اس اسکیم کو کامیاب بنائیں۔ میں توقع رکھتا ہوں۔ کہ اس اجتماع میں صاحبِ ثروت اور ہمت حضرات اس کارِ خیر کے لئے اپنے عطیات کا اعلان فرمائیں گے۔

والسلام!

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

پرویز صاحب کی پریس کانفرنس

طلوعِ اسلام کنونشن سے دو روز قبل (۲۱۔ اکتوبر کی شام) محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے مکان پر، پرویز صاحب نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں پریس کے نمائندگان بڑی کثرت سے شریک تھے۔ یہ کانفرنس متانت، سنجیدگی اور مفکرانہ انداز کی نہایت عمدہ مثال پیش کر رہی تھی۔ سوالات بھی متین اور سنجیدہ تھے اور ان کے جواب بھی نہایت پروقار اور فکر انگیز۔ کانفرنس میں جو پریس ریلیز نمائندگان کو دیا گیا تھا۔ اس کا متن حسب ذیل ہے:۔

پریس ریلیز:

اس وقت سارا ملک الیکشن کے ہنگاموں میں دیوانہ وار مصروف تگ و تاز ہے۔ اور ہر سیاسی پارٹی کی کوشش یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے، مملکت کی زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام چونکہ عملی سیاست میں حصہ ہی نہیں لیتی۔ اس لئے مجھے ان سرگرمیوں سے چنداں دلچسپی نہیں لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ کہ ہر پارٹی حصولِ اقتدار کے لئے تو اس قدر مضطرب و بے قرار ہے، لیکن جن بنیادوں پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ ان کے متعلق کسی کو اتنا دیکھنے کی بھی ضرورت یا ضرورت نہیں کہ وہ اپنے مقام پر قائم بھی ہیں یا نہیں۔ اس مملکت کی عمارت دو بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔

(i) دو قومی نظریہ۔۔ یعنی یہ حقیقت کہ اسلام کی رو سے معیارِ قومیت، دین کا اشتراک ہے۔ نہ کہ اشتراکِ وطن۔ اس نظریہ کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم مل کر ایک قوم کے افراد نہیں بنتے۔۔ مسلمان غیر مسلموں سے الگ مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔۔۔ یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھا۔

(ii) اسلام ایک زندہ حقیقت اس صورت میں بن سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں اسلامی نظام قائم اور قوانین شریعت رائج کئے جا سکیں۔

(۲) — جہاں تک پہلی بنیاد (دو قومی نظریہ) کا تعلق ہے۔ پاکستان میں اُسے آج تک عمل میں لایا ہی نہیں گیا۔ اور اب بھی کسی پارٹی کے منشور میں اس کا ذکر تک نہیں — حتیٰ کہ جماعتِ اسلامی کے منشور میں بھی نہیں۔ جن کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں اس نظریہ کا تصور ہی انہوں نے دیا تھا۔

(۳) — جہاں تک دوسری بنیاد (اسلامی قوانین شریعت) کا تعلق ہے، اس کے لئے مطالبہ یہ پیش کیا گیا۔ کہ دستورِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون رائج نہیں ہوگا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ مطالبہ (بظاہر) بڑا معقول اور مقدس تھا لیکن میں نے شروع ہی سے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ اس اصول کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا۔ جسے مسلمانوں کے تمام فرقے یکساں طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ لہٰذا جو نظریہ ناممکن العمل ہو اسے پیش کرنے یا منوانے سے حاصل کیا — ؟ اس مخالفت کی پاداش میں مجھے جن ناسازگار حالات سے گزرنا پڑا۔ اُس سے کون ناواقف ہے —! لیکن میں نے انہیں انتہائی صبر و سکون سے برداشت کیا اور اپنے مُوقف کو برابر دہرائے چلا گیا — تیئیس سال کی کشمکش کے بعد بالآخر مخالفین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ میرا مُوقف مبنی بر حقیقت تھا۔ چنانچہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے حال ہی میں اس امر کا اعلان کیا ہے، کہ

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں - جس پر
> مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہو سکیں —

اس کا علاج انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ملک میں فقۂ حنفی کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ اس کی تائید میں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ فقۂ حنفی کتاب و سنت کی بہترین تعبیر ہے۔ اس لئے اسے ملک کا قانون قرار دے دیا جائے — انہوں نے مغرب کے اصولِ جمہوریت کے مطابق کہا یہ ہے کہ فقۂ حنفی کو اس لئے نافذ کر دیا جائے کہ ملک کی آبادی کی اکثریت اس فقہ کی پابند ہے۔ اس کے خلاف اقلیت (یعنی غیر حنفی فرقوں) نے سخت احتجاج کیا ہے حتےٰ کہ شیعہ حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "اگر اس پر اصرار کیا گیا تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے. خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی"

"کتاب و سنت" کی رو سے ضابطۂ قوانین کی تدوین کی عملی حیثیت تو یہ ہے، لیکن ملک کی کم و بیش ہر پارٹی نے بلا سوچے سمجھے، اسے اپنے منشور میں شامل کر رکھا ہے — بلا سوچے سمجھے کی ایک بین مثال پیپلز پارٹی کا مُوقف ہے۔ — وہ ملک میں سوشلسٹک نظامِ معیشت رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا — ایسا کہتے وقت وہ اتنا نہیں سوچتے کہ جب انہوں نے کتاب کے ساتھ 'سنت' (روایات) کو بھی اپنے نظام کی بنیاد تسلیم کر لیا۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ — نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ انہیں جتنی روایات نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ملیں گی، ان سے کہیں زیادہ روایات ان کے مخالفین کی طرف سے نظامِ

سرمایہ داری کے حق میں پیش کر دی جائیں گی۔ اس صورت میں وہ یہاں کونسا نظام نافذ کرسکیں گے۔ (اس قسم کے تضادات ہر پارٹی کے سامنے آئیں گے) کیونکہ جو کچھ انہوں نے اپنے منشور میں دیا ہے۔ متعدد روایات اس کے خلاف جائیں گی۔

بہرحال آپ سوچئے کہ جو مسلک اس وقت اختیار کیا جا رہا ہے، اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا ــــ یہ کہ:۔

(i) ــــ کتاب وسنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا۔ جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔

(ii) ــــ اگر مودودی صاحب کی تجویز کے مطابق ملک میں فقہ حنفی کو پبلک لاز کی حیثیت سے نافذ کر دیا گیا تو مذہبی فرقوں میں باہمی فساد شروع ہو جائے گا۔

(iii) ــــ اس فساد کو روکنے کے لئے اگر یہ کہا گیا کہ اندریں حالات، ملک میں سیکولر نظام رائج کر دیا جائے تو مذہب پرست طبقہ اس کے خلاف اعلانِ جہاد کر دے گا۔

یہ ہے وہ صورت حالات، جس کا اس ملک میں پیدا ہونے کا امکان ہے؛ لیکن ملک ہے، کہ انتخابی سرگرمیوں میں دیوانہ وار الجھا ہوا ہے اور کوئی ایک "رجل رشید" بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان سے کہے کہ ذرا کھڑے ہو کر سوچو تو سہی کہ تمہاری ان سرگرمیوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

(۴) میں نے شروع ہی میں یہ کہا تھا۔ کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے۔ جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے اس لئے اگر مختلف فرقے اس بات پر رضامند ہو جائیں کہ اپنی اپنی روایات اور فقہ کو الگ کرکے، عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن مجید کی بنیادوں پر ایک فقۂ جدید مرتب کی جائے تو وہ فقہ اس مملکت کا اسلامی ضابطۂ قوانین قرار پا سکتی ہے۔ اس کے سوا یہاں اسلامی نظام رائج کرنے کی کوئی شکل نہیں؛ اس تجویز کے سلسلہ میں اکثر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ خود قرآن مجید کی تعبیر بھی تو مختلف فرقوں کے نزدیک مختلف ہے، اس لئے اس کی بنیادوں پر ایک متفق علیہ فقہ کیسے مرتب ہو سکے گی؟ ــــ ایسا کہنے والے غالباً اس حقیقت سے واقف نہیں کہ قرآن مجید کی مختلف تعبیریں اس لئے ہیں کہ ہر فرقہ نے اپنے اپنے ہاں کی روایات اور فقہ کی رو سے اس کی تعبیریں کر رکھی ہیں۔ اگر مختلف فرقے اپنے اپنے ہاں کی روایات، اور فقہ کو الگ رکھ کر قرآنِ خالص کو بنیاد تسلیم کرلیں۔ اور صرف اس کی رو سے ایک جدید فقہ مرتب کرنے پر رضامند ہو جائیں تو پھر قرآن کی مختلف تعبیریں باقی نہیں رہیں گی۔

(۵) ــــ اور اگر یہ کہا جائے کہ مختلف فرقے اس پر بھی رضامند نہیں ہوں گے تو ہمیں، جرأت کرکے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیئے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی نظام قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنے آپ

خواہ فریب میں رکھنے سے حاصل کیا ہے۔! اور اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ کہ جب نہ دو قومی نظریہ کو اپنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی مملکت میں اسلامی نظام کو قائم کیا جا سکتا۔ تو پھر اسلام دوں پر پاکستان کے ایک جداگانہ مملکت رہنے کی وجہ جواز ہی باقی نہیں رہتی۔

(۶)— یہ ہیں وہ حقائق جن کا ہمیں سامنا کرنا ہوگا۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو پھر نہ الیکشن، ملک کے حالات خوشگوار تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی حکومت خواہ وہ کسی پارٹی کی بھی ہو، ہماری بگڑی کو بنا ہے۔ ان حقائق سے چشم پوشی ہمیں موجودہ خلفشار تک لے آئی ہے۔ اور اگر ہم ان سے اسی طرح اغماض ہے تو نظر آتا ہے کہ یہ ہمیں تباہی و بربادی کے عمیق غاروں میں دھکیل دے گی۔ خدا عدو کو بھی یہ خواب دکھلائے۔

— طلوعِ اسلام نے تحریک پاکستان کا امکان بھر ساتھ دیا تھا۔ تو اس لئے کہ مملکت کی یہ بنیادیں اس کا جزو۔ اور تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ اپنے اس مؤقف کو برابر پیش کئے چلے آ رہا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ استحکام اور اس میں اسلام کے احیاء کا راز اسی میں مضمر ہے۔ میں نے یہاں ان امور کا ذکر مختصر الفاظ میں کیا تفصیل، میں اپنے اُن مقالات میں پیش کروں گا، جن سے میں طلوعِ اسلام کی حالیہ کنونشن سے خطاب

۲۲- اکتوبر (۲ ½ بجے دوپہر) کے کھلے اجلاس میں میرے خطاب کا عنوان ہوگا

"قدیم وجدید کی کشمکش — کیا قانونِ شریعت میں تبدیل ہو سکتی ہے؟"

۲۵- اکتوبر (صبح ۹ ½ بجے) کے خطاب کا عنوان

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔

میں پاکستان کی موجودہ عوامی تحریکوں کا نہایت متانت اور سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے گا۔

والسلام!

کانفرنس کی روئیداد مختلف اخبارات میں شائع ہوئی۔ جو فی الجملہ اس تقریب کی صحیح ترجمانی کرتی تھی۔ م پسندوں" کے ترجمان — روزنامہ ندائے ملت میں یہ رپورٹ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوئی۔

ر (۲۱- اکتوبر۔ نامہ نگار خصوصی) پرویزی مکتب فکر کے سربراہ مسٹر غلام احمد پرویز نے کہا ہے سے میں اسلامی آئین مرتب کرنے کے لئے سنت کو ترک کر دیا جائے۔ اور تمام ائمہ مجتہدین، فقہاء سلامی قانون کے ماہرین کی تحقیقات کو بھی نظر انداز کر دیا جائے۔ ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے کہا کہ تمام فرقوں کے نظریات کو چھوڑ کر صرف قرآن کی بنیاد پر نئے تقاضوں کے مطابق نئی فقہ

تیار کی جائے۔ مسٹر پرویز نے دعویٰ کیا کہ ان کی تیار کی ہوئی فقہ اس معیار کے مطابق ہے اور وقتی طور پر کام دے سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ علماء نے اپنے ۲۲ نکات میں کہا تھا۔ کہ آئین قرآن وسنت کی بنیاد پر مرتب کیا جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ (ندائے ملت - ۲۲- اکتوبر ۱۹۷۰ء)

اس رپورٹ کے سامنے آنے پر مدیر ندائے ملت کی خدمت میں گذارش کیا گیا کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے خلافِ واقعہ ہے۔ اور یکسر کذب وافترار۔ آپ اس کی تردید کیجئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی تردید اور تصحیح کر دی جائیگی ـــ لیکن یہ تردید یا تصحیح اس وقت تک ہماری نظروں سے نہیں گزری۔

یہ ہے ہمارے "اسلام پسندوں" کا اندازِ صحافت و دیانت!

بابُ المراسلات

سوشلزم اور قرآنی نظامِ معیشت میں بنیادی فرق

جب سے طلوعِ اسلام میں سوشلزم اور قرآن کے معاشی نظام میں فرق کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ سوشلزم کس طرح (اپنے خدا فراموشانہ فلسفۂ زندگی کی رو سے) اسلام کے نقطۂ نگاہ سے مردود اور ناقابلِ قبول ہے اُس طبقہ کی طرف سے جس کا رجحان کمیونزم یا سوشلزم کی طرف ہے۔ ہمیں اکثر خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خطوط اس حقیقت کے عکاس ہوتے ہیں۔ کہ اقبال نے اشتراکیوں کے متعلق جو ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا۔ کہ

یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

وہ کس قدر صحیح تھا۔ یہ خطوط بے ربطگیٔ فکر اور ژولیدگیٔ ذہن کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور اس حقیقت کے مظہر کہ جب انسان کسی کشمکش میں گرفتار ہو جائے تو پھر اس کی فکر کس قدر معکوس ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہ نوجوان سوشلزم کے گرویدہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کے معاشرہ سے کٹنا بھی نہیں چاہتے۔ اس لئے وہ چاہتے یہ ہیں کہ ان دونوں میں مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے۔ ان کی یہی کشمکش ہے جس سے ان کی فکر میں بعید بے ربطی اور قلب و دماغ میں پریشانی پیدا ہو رہی ہے — کس قدر قابلِ رحم ہے ان بیچاروں کی یہ "برزخی حالت" ہماری انتہائی کوشش یہ رہتی ہے کہ ہم کسی طرح ان نونہالانِ ملت کو اس کشمکش سے نجات دلا کر انہیں اس سکون اطمینان سے آشنا کرا دیں جو وحدتِ فکر و عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

اس قسم کی پریشانیٔ فکر و نظر کا اندازہ ذیل کے خط سے ہو سکے گا جو حال ہی میں موصول ہوا ہے۔

"السلام علیکم۔ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۰ صفحہ ۳۵ پر تحریر فرمایا گیا ہے کہ سوشلزم میں "سوشل" تو ٹھیک ہے لیکن "ازم" مردود ہے۔ طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۷۰ء میں مرقوم ہے کہ سوشلزم کا معاشی نظام اسلام کے معاشی نظام کے متماثل ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ زندگی اسلام کے فلسفۂ زندگی کے خلاف ہے۔ اور کفر ہے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ جب آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فلسفۂ زندگی بنیاد ہے اور معاشی یا سیاسی نظام اس پر عمارت ہے۔ یا فلسفۂ زندگی (نظریۂ حیات) ایک درخت ہے اور عملی نظام اس کا پھل یا اسلامی اصطلاح میں (آپ کی تصریحات کے مطابق طلوع اسلام ص۱۳) ایمان اصل ہے اور عمل زندگی اس کی فرع۔ تو جب یہ مسلم ہے کہ کڑوے درخت کا پھل کڑوا اور میٹھے کا میٹھا ہوتا ہے تو اسلام اور سوشلزم کے متضاد درختوں کا پھل یکساں میٹھا کیسے ہو گیا؟ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کو آم کھانے سے غرض ہے پیڑ سے کیا غرض۔ تو جناب اس سے اتفاق کریں گے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

(۲) کسی نظریہ کی صداقت کا معیار کیا ہے؟ قرآن حکیم کا ارشاد ہے (اور آپ کو بھی اس سے اتفاق ہے طلوع اسلام) "اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل فسوف تعلمون من تکون لہٗ عاقبۃ الدار" تو گویا کسی نظریہ کی صداقت کا معیار اس کے عملی نتائج ہیں۔ کہ آیا اس سے بنی نوع انسان کا فائدہ ہے یا نقصان۔ آپ کا یہ اعتراف کہ سوشلزم کا عملی نظام اسلام کے عملی نظام کے مماثل ہے تو پھر یہ ایک فلسفۂ زندگی حق اور ایک باطل کیسے ہو گیا؟

(۳) آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی کا نتیجہ ہوتی ہے (اس سے بھی آپ کو اتفاق ہے) تو جب سوشلزم کی دنیوی زندگی اسلام کی دنیوی زندگی کے مماثل ہے تو آخرت کیوں نہ مماثل ہوگی؟"

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں دلائل کس قدر رکیک اور ان سے اخذ کردہ نتائج کس قدر بعید از حقیقت ہیں جو کچھ صاحب مکتوب کہنا چاہتے ہیں اسے ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک قوم نہ خدا پر ایمان رکھتی ہے، نہ وحی پر، نہ انسانی ذات پر، اور نہ آخرت پر، لیکن اپنے ہاں جو نظام حکومت قائم کرتی ہے اس میں جھوٹ، فریب، چوری، زنا کاری، شراب خوری، قمار بازی وغیرہ کو ممنوع قرار دیتی ہے، ان صاحب کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ ان کا ضابطہ اخلاق، اسلام کے ضابطہ اخلاق کے مماثل ہے، اس لئے ان کے نظریۂ حیات کو بھی اسلام کے نظریہ حیات کے مماثل سمجھنا چاہیئے۔ اس دلیل کو آگے بڑھانے سے حسب ذیل نتائج سامنے آئیں گے:۔

(۱) قرآن نے مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ لہٰذا، جو شخص لغو باتوں سے پرہیز کرے اسے مومن قرار دینا چاہیئے۔

(۲) قرآن نے کہا ہے کہ مومن جنت میں جائیں گے اس لئے اس شخص کے متعلق، جو لغو باتوں سے اعراض برتتا ہے، یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھی جنت میں جائے گا کیونکہ وہ مومن ہے۔

اس دلیل کا بودہ پن واضح ہے۔

اب روس یا چین کی سوشلزم کو سامنے لائیے ۔

(۱) سوشلزم کا معاشی نظام اسلام کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ زندگی، اسلامی فلسفہ زندگی کے یکسر خلاف ہے — وہ خدا، وحی، آخرت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اب ان صاحب کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ سوشلزم اور اسلام کے معاشی نظام میں مماثلت ہے، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان دونوں کا فلسفہ زندگی بھی ایک جیسا ہے !

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہئے —!

(۲) قرآن کریم نے کہا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کی حامل قوم کی دنیاوی زندگی بھی خوشحال ہوگی، اور آخرت بھی خوشگوار ۔ ان صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ چونکہ سوشلسٹ قوموں کی دنیاوی زندگی خوش حال ہوتی ہے، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی آخرت بھی خوشگوار ہوگی۔ (حالانکہ وہ آخرت کے قائل ہی نہیں !)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے —!

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں تین قسم کی قومیں ہوسکتی ہیں ۔

(۱) وہ قوم جس کا نظام حیات، مستقل اقدار خداوندی کے مطابق متشکل ہو، اس کی دنیا کی زندگی بھی کامرانیوں کی ہوگی اور آخرت کی زندگی بھی سرفرازیوں کی ۔

(۲) وہ قوم جو صرف طبیعی زندگی کے مفادات کے لئے کوشاں ہو ۔ اسے اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ جس سے اسے اس دنیا کی خوش حالیاں نصیب ہو جائیں گی۔ لیکن آخروی زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا — اور

(۳) وہ قوم جو نہ مستقل اقدار خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور نہ ہی دنیاوی ترقیوں کے لئے کوشاں ہو۔ وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگی اور اُخروی زندگی میں بھی تباہ حال۔

لہٰذا، یہ کہنا تو صحیح ہوگا کہ جو قوم اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے اس کی اخروی زندگی خوشگوار نہیں ہوگی۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ جو قوم دنیاوی زندگی میں خوش حال ہے، اس کی آخرت بھی سنوری ہوتی ہوگی۔ ایسا سمجھنا قرآن کے خلاف اور فکر معکوس کی تخلیق ہوگا۔

(۳) ان کی سب سے بڑی مغالطہ آفریں دلیل یہ ہے کہ " درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" — جب سوشلسٹ نظریہ زندگی کے پھل (یعنی معاشی نظام) اور اسلامی نظریہ زندگی کے پھل (یعنی معاشی نظام) باہمدگر مماثل ہیں۔ تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ دونوں درخت بھی ایک جیسے ہیں ۔

اسے کہتے ہیں مدعی سست گواہ چست ۔کیا آپ نے روس یا چین کے کسی سوشلسٹ کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ ان کے نظریہ حیات کا درخت اور اسلام کے نظریہ حیات کا درخت، ایک ہی ہیں ۔ وہ اس نظریہ حیات کے درخت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے درپے ہیں ۔ اور ان کا ارشاد یہ ہے کہ دونوں درخت ایک ہی ہیں، کیونکہ ان کے پھل ایک جیسے ہیں۔

اور یہی ان صاحب کی بنیادی غلطی ہے ۔ ہم نے جو پہلے مثال پیش کی ہے، اس میں سیکولر نظریہ حیات کی حامل قوم کا ضابطہ اخلاق، ان کے درخت کا پھل نہیں ۔ انہوں نے یہ پھل دوسروں سے مستعار لے کر اپنے درخت میں لٹکا رکھے ہیں ۔ اصل یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو اخلاقی اقدار وقتاً فوقتاً انسانوں کو ملتی رہیں ان میں سے اکثر اقدار نے ایک عالمگیر ضابطہ اخلاق (UNIVERSAL CODE OF ETHICS) کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ جنہیں دنیا کی مختلف قومیں فلسفۂ حیات کے مختلف ہونے کے باوجود، اپنے اپنے ہاں بطور ضابطہ قوانین رائج کر لیتی ہیں ۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ (U.N.O.) کے بنیادی حقوق انسانیت کے منشور کا قریب (۷۵) فیصد حصہ انہی حقوق پر مشتمل ہے، جو وحی کے ذریعے عطا ہوئے تھے، یہ ضوابط اخلاق و حقوق، ان درختوں کے پھل نہیں جو ان قوموں کے ہاں بطور نظریہ حیات ایستادہ ہیں ۔ ان اقوام نے یہ پھل خارجی منڈیوں سے لے کر اپنے درختوں میں لٹکا رکھے ہیں ۔ ان پھلوں کے غیر فطری ہونے کا نتیجہ ہے کہ ضوابط اخلاق کے اس قدر مشترک ہونے کے باوجود اقوام عالم میں اس قدر باہمی تصادم و تزاحم ہے۔

ہماری سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ دین کا نظام اتنے طویل عرصہ سے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے ۔ کہ یہ بات ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ ایمان اور اعمال کا باہمی رشتہ کیا ہے ۔ اور غلط ایمان کا نتیجہ صحیح اعمال ہو ہی نہیں سکتے ۔ (ایمان سے مراد نظریہ زندگی یا فلسفۂ حیات ہے) ۔ اگر آپ کہیں دیکھیں کہ ایمان تو غلط ہے لیکن عمل صحیح ہے، تو سمجھ لیجئے کہ یہ مصنوعی عمل تقلیم (GRAFTING) کا نتیجہ ہے ۔ اساسی درخت کا پھل نہیں ۔

اور یہ بات بالکل واضح ہے ۔ ایک شخص ایک ایسے نظام سے متمسک ہے، جو نہ خدا پر ایمان رکھتا ہے، نہ وحی کی راہنمائی پر نہ انسانی ذات کو تسلیم کرتا ہے، نہ حیات آخرت کو ۔ اس کے سامنے ایک ایسا موقع آ جاتا ہے کہ وہ اگر ذرا سا جھوٹ بول دے تو اسے لاکھوں روپے مفت میں حاصل ہو جاتے ہیں ۔ جھوٹ کی شکل یہ ہے کہ وہ نہ سوسائٹی کے نوٹس میں آ سکتا ہے ۔ اور نہ ملک کی عدلیہ کی مشینری کی گرفت میں ۔ سوال یہ ہے، کہ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جس کی بنا پر یہ شخص اس وقت جھوٹ نہ بولے اور دیانت داری سے کام لے ۔ وہ ایسا کیوں کرے، دنیا کا کوئی فلسفہ اس کیوں کا جواب آج تک نہیں دے سکا ۔ اور نہ ہی دے سکتا ہے، اس جذبۂ محرکہ کا فقدان ہے

کہ تمام اقوام عالم کے ہاں اس قسم کے ضوابط اخلاق و قوانین موجود ہیں، لیکن جھوٹ، فریب، بددیانتی عام ہوتی چلی جارہی ہے، اور ذی حساس دانشوروں کی ہزار آہ و فغاں، اور ارباب سیاست کے تدبر کی لاکھ فسوں کاری کے باوجود اس کی روک تھام کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔

اب آیئے سوشلزم کی طرف۔ سوشلزم کے معاشی نظام کا پہلا حصہ یہ ہے، کہ وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں نہ رہیں۔ بلکہ مملکت کی تحویل میں آجائیں۔ اس نظام کا یہ حصہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن یہ تو صرف منفیانہ پہلو ہے، اور ظاہر ہے کہ محض اس منفیانہ تبدیلی سے سوشلزم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کا مثبت حصہ اس سے آگے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ:-

> ہر شخص اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق جان لگا کر محنت کرے۔ لیکن اپنی محنت کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔

سوال یہ ہے کہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے، جس کی بنا پر ایک شخص اس کے لئے آمادہ ہو جائے، اور آمادہ بھی صرف ایک وقت کے لئے نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرے۔ یہ چیز خود اس کی زندگی کا تقاضا بن جائے، اس سوال کا جواب مارکس سے لے کر ماؤزے تنگ تک کوئی نہیں دے سکا۔ زیادہ سے زیادہ کہا گیا ہے تو یہ کہ ---- یہ کچھ تاریخی وجوب کی رو سے ہوگا۔ تاریخی وجوب ایک مبہم اور بسیط اصطلاح ہے، جس کا کوئی مفہوم متعین نہیں لیکن اسی تاریخی وجوب کی اندھی قوت کا تقاضا یہ بھی بتایا جاتا ہے۔ کہ اگر وہ آج نظام سرمایہ داری کو الٹ کر اس کی جگہ سوشلسٹ نظام قائم کرے گی۔ تو اس کے بعد وہ اس نظام کو الٹ کر اس کی ضد نظام قائم کر دیگی انسان کی مرضی اور ارادے کو نہ پہلی تبدیلی میں کوئی دخل ہوگا۔ اور نہ دوسری میں ---- آپ نے غور فرمایا۔ کہ اس تاریخی وجوب کے نظریہ کی رو سے صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کو کس قدر مجبورِ محض بنا کر رکھ دیا گیا ہے، کہ وہ ان انقلابات کے سیلابوں کو امڈتا دیکھے اور نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف کچھ نہ کر سکے، خس و خاشاک کی طرح ان میں بہے چلا جائے۔

سوچئے کہ کیا اس قسم کا نظریۂ حیات انسان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرے، اور اپنی کم از کم ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کے لئے دے دے؟ یہ تبدیلی تو بہت بڑی ہے۔ سوشلسٹ ممالک کے افراد میں تو ابھی تک عام سطح کی قلبی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ شمالی کوریا ایک سوشلسٹ ملک ہے۔ "روزنامہ مساوات" لاہور کی یکم ستمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں وہاں کے "عظیم رہنما کمال سنگ" کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے سرکردہ ماہرین معیشت اور دانشوروں کے سوالات کا جواب دیا

تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

"سوشلسٹ معاشرہ میں ابھی تمام لوگوں میں اجتماعیت کا جذبہ اس حد تک بلند نہیں ہوا کہ وہ سرکاری املاک کو اپنی املاک کی طرح عزیز جان سکیں۔ اور ان کی ذمہ دارانہ دیکھ بھال کر سکیں۔"

ان ممالک میں ابھی تک غیر سرکاری منڈیاں بھی موجود ہیں جہاں کاشت کار اپنی اجناس کو فروخت کر سکتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ اس ثنویت سے (یعنی سرکاری منڈیوں اور غیر سرکاری منڈیوں کی موجودگی) سے نظام معیشت کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ مسٹر سنگ نے کہا۔

"اگر اس مفروضے کی بنیاد پر کہ جز وقتی پیداوار اور کاشت کار منڈی کا وجود مشترکہ معیشت کے لئے نقصان دہ اور خود غرضی کو ہوا دینے کا سبب ہے کاشت کار منڈی کو قانوناً ختم کر دیا جائے، تو پھر کیا ہوگا۔ گو اس طرح منڈی کا بازار تو ضرور ختم ہو جائے گا۔ لیکن چور بازاری بدستور باقی رہے گی۔ کاشت کار چپکے چپکے دوسروں کے عقبی دروازوں پر دستک دیں گے اور اپنی جز وقتی پیداوار کی مرغیوں اور انڈوں کو فروخت کرنے کے لئے چور دروازے تلاش کریں گے......

یاد رہے کہ جو چیزیں عوام کی مانگ پورا نہیں کرتیں، اگر حکومت ان کی یکساں قیمتیں مقرر بھی کر دے، تب بھی ان چیزوں کی چور بازاری ہوتی ہے اور یہ کاشت کار منڈی میں فروخت ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات یوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ سرکاری دکانوں سے چیزیں خرید کر ان کا ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ اور جب دوسروں کو ان چیزوں کی انتہائی سخت ضرورت ہوتی ہے تو وہ انہیں دوبارہ گراں قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں.......... انڈوں کی سرکاری قیمتوں اور کاشت کار منڈی کی قیمتوں کے درمیان فرق ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرکاری دکانوں سے انڈے خرید کر انہیں دوبارہ منڈی میں فروخت کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔"

[illegible]عبارت ہے ایک بہت بڑے سوشلسٹ ملک کے عظیم سوشلسٹ راہنما کی۔ آپ نے دیکھا کہ سوشلزم [illegible] مسلسل عملی تجربہ کے باوجود وہاں کے لوگوں کی ذہنیت بعینہٖ وہی ہے، جو نظام سرمایہ داری کے تابع رہنے

یہ لوگوں کی ہوتی ہے۔ او رہاں ہی بھی ابھی تک وہی خرابیاں موجود ہیں جنہیں نظام سرمایہ داری کی تخلیق کہا جاتا ہے، یہ
بیان نہ تو نظام سرمایہ داری کی تخلیق ہیں اور نہ ہی ان کا علاج سوشلزم کے خدا فراموشانہ نظام سے ہو سکتا ہے۔ اقبال
جب روس سے کہا تھا کہ تمہارے ہاں وہ اساس محکم موجود نہیں جو اس قسم کے عظیم معاشی انقلاب کا بار اٹھا سکے
اس سے اس کی مراد یہی تھی، اور یہی وہ اصل ہے، جسے ہم بھی کئی برسوں سے مسلسل دہرا رہے ہیں۔ سوشلزم کے
نظریہ حیات کے درخت میں اس قسم کے پھل لگ ہی نہیں سکتے، انہوں نے ببول کے درخت کے کانٹوں کے
ساتھ آم لٹکا دیئے تھے۔ یہ آم نہ ببول کے درخت کے پیدا کردہ تھے۔ نہ ببول میں کبھی آم لگ سکتے ہیں، روس میں
یہ مصنوعی آم خشک ہو رہے ہیں۔ باقی سوشلسٹ ممالک میں بھی رفتہ رفتہ ایسا ہی ہو جائے گا۔
یہ اساس محکم قرآنی ایمان مہیا کر سکتا ہے۔ اس ایمان یا نظریہ حیات کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسانی زندگی
اس کی طبیعی زندگی ہی نہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک چیز اور بھی ہے، جسے انسانی ذات کہتے ہیں، اس ذات
کی نشوونما انسانی سعی و کاوش کا مقصود ہے۔ یہ نشوونما خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار پر عمل پیرا
ہونے سے ہو سکتی ہے۔ اس طرح کی نشوونما یافتہ ذات، موت کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی مراحل طے کرنے
کے قابل ہو جاتی ہے۔ ان اقدار میں ایک بنیادی قدر یہ ہے۔ کہ کوئی شخص اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر
دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیتا ہے، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے، یہ ہے وہ تخمِ صالحہ
جس سے اسلامی نظام کا شجرِ طیب بڑھتا۔ پھولتا اور پھلتا ہے۔ اور اس میں فطری طور پر قرآن کے معاشی
نظام کا پھل لگتا ہے۔ یہ ہے بنیادی فرق سوشلزم کے معاشی نظام اور قرآن کے معاشی نظام میں۔ قرآن کا
معاشی نظام معاشیات تک ہی محدود نہیں، یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام
نہ تو سوشلزم کی جگہ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اختیار کرنے سے عمل میں آ سکتا ہے، اور نہ ہی مساواتِ محمدیؐ وغیرہ
قسم کے مقدس الفاظ کے تعویذوں سے، اس کے لئے لاینفک شرط یہ ہے، کہ مسلسل تعلیم و تربیت سے لوگوں کے دلوں میں
یہ ایمان پیدا کیا جائے، جب یہ ایمان پیدا ہو جائے گا۔ تو اس کا فطری نتیجہ اس قسم کا معاشی نظام ہو گا۔ غیر مسلم قوموں کے
ہاں تو اس قسم کے ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج مسلمانوں میں بھی یہ ایمان موجود نہیں، جس طرح ہم نے
سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا اضافہ کر دیا ہے، اسی طرح ہمارے ہاں پیدا ہونے والے بچے کا اسلامی نام رکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا
ہے، کہ وہ اس قسم کے ایمان کا حامل ہو گیا ہے۔ یہ ہماری بنیادی غلط فہمی ہے، اس قسم کے ایمان (یعنی قلبی اور ذہنی
تبدیلی) کے بغیر ہم زیادہ سے زیادہ سوشلزم کی منفی منزل طے کر سکتے ہیں — یعنی ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت
سے چھین کر مملکت کی تحویل میں دے سکتے ہیں — لیکن اس کا مثبت پہلو کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ جب وہ اس ایمان
کے بغیر، پچاس سال کی تگ و تاز کے باوجود سوشلسٹ ملکوں کے ہاں قائم نہیں ہو سکا، تو ہمارے ہاں کس طرح قائم ہو جائیگا۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی بھی مخالفت کرتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ شرعی قوانین کے نفاذ سے قوم کی اخلاقی برائیاں دور ہو جائیں گی، قوانین کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، انہیں میکنکی طور پر نافذ کرنے سے اخلاقی برائیاں دور نہیں ہوا کرتیں ــــ اس سے صرف کھلے دروازے، چور دروازوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس کی بیّن مثال سعودی عرب کی مملکت ہے (کہنے کو وہاں) شرعی قوانین تمام و کمال نافذ ہیں۔ لیکن ان سے وہاں کے عربوں کی ذہنیت اور کردار میں کس قدر تبدیلی واقع ہوئی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھئے، قرآن کریم نے قوموں کے حالات کی تبدیلی کے لئے ان کی نفسیاتی تبدیلی کو لازمی شرط قرار دیا ہے، اور نفسیاتی تبدیلی نہ تو شرعی قوانین کے میکانکی نفاذ سے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی سیاسی ایجی ٹیشنوں سے۔ یہ پیدا ہوتی ہے کتاب و حکمت کی صحیح تعلیم و تربیت سے۔

بعض گوشوں سے یہ بھی کہا گیا ہے، کہ کسی زمانے میں تو اسلام اس قسم کا نظام قائم کر سکا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اس کی یہ صلاحیت ختم ہو گئی، اور اب وہ ایسے نظام کے قیام کا موجب نہیں بن سکتا، اس اعتراض کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ اگر حقیقت یہی ہے جو آپ بیان کرتے ہیں تو پھر آپ نے سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کی چیپی کیوں لگائی ہے۔ کیا (آپ کے نظریہ کے مطابق) چلے ہوئے بم کا یہ اس قدر وزنی خول جسے آپ سوشلزم کی گردن سے باندھ رہے ہیں۔ اپنے ساتھ اسے بھی نہیں لے ڈوبے گا ؟

اور اس کا مثبت جواب یہ ہے کہ کسی درخت کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے خارجی تخریبی قوتوں سے بھی محفوظ رکھا جائے، اور سامان نشو و نما بھی بہم پہنچاتے رہیں۔ جب تک ایسا ہوتا رہا، اسلام کا شجرِ طیّب اپنے پھل دیتا رہا۔ جب مسلمانوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ تو وہ درخت سوکھ گیا۔ قرآن نے ایمان کے ساتھ جو عمل کی شرط ضروری قرار دیا ہے، تو اس سے یہی مراد ہے۔

لیکن اس درخت کا تخمِ صالح اب بھی قرآن کے اندر اُسی طرح موجود ہے، یا یوں کہئیے کہ اس کی جڑیں ابھی تک موجود ہیں اگر انہیں از سرِ نو سامانِ نشو و نما دیا جائے، تو یہ پھر اُسی قسم کا شجرِ طیب بن سکتا ہے اور اسی قسم کے پھل لا سکتا ہے ـــ اور اس شجرِ طیب کے علاوہ دنیا کا کوئی اور درخت بھی ایسے پھل نہیں لا سکتا، یہ خدا کا دعویٰ ہے اور اس دعوے کے محکم ہونے میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے ! ـــــ اور اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ نظام سرمایہ داری کو ضرور ضرور الٹ کر رہنا ہی ہے اور اس کی جگہ پُرامن طریق سے اپنا نظام لاؤ، لیکن اسے اسلامی نظام نہ کہو۔ یہ نظام کہلا سکے گا جب اس کی عمارت خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی پیدا کردہ، قلب و نگاہ کی تبدیلی کی بنیادوں پر استوار ہو گی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو گا ـــــ معہذا ! اگر کوئی مسلمان (جس طرح کے ہم مسلمان ہیں اسی طرح کا) کسی معاشی نظام کو اپنا تا ہے، لیکن خدا، وحی، اور آخرت سے انکار نہیں کرتا۔ تو محض اس بنا پر کہ اس نے اس نظام کو اپنایا ہے اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی وہ ویسا ہی مسلمان رہیگا جیسے دوسرے مسلمان ہیں۔

حقائق و عبر

۱- امام مالکؒ کے مناقب

لاہور سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے — ترجمان الحدیث — اس کے مدیر ہیں (مولانا) احسان الٰہی ظہیر، ایم-اے، ایم-او-ایل، فاضل مدینہ یونیورسٹی۔ مجلس ادارت میں شریک ہیں پروفیسر محمد اکبر ایم-اے بشیر احمد انصاری۔ ایم-اے، حافظ ثنار اللہ ایم-اے۔ اور مجلس مشاورت حسب ذیل زعماء پر مشتمل ہے۔
شیخ التفسیر مولانا محمد عبدہٗ۔ شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایم-اے ڈی لٹ
ڈاکٹر احسان الٰہی رانا۔ ایم-اے۔ پی-ایچ-ڈی۔ اور پروفیسر عبدالقیوم ایم-اے۔

اس ماہنامہ کی اگست ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں، پروفیسر بشیر احمد (ایم-اے) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے — امام مالکؒ — اس میں لکھا ہے کہ "بعض کتب سیر میں آپ کے مناقب کے ضمن میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جس سے آپ کے علم وفضل پر روشنی پڑتی ہے" اور وہ واقعہ (جسے ہم قارئین طلوع اسلام سے حسن ذوق سے صد معذرت، اور ان کے احساس حیا سے ہزار ندامت کے ساتھ درج کرنے کی اجازت چاہتے ہیں) حسب ذیل ہے:۔

مدینہ میں ایک معتبر اور پارسا عورت رہتی تھی۔ جب اس کی وفات ہوئی، اور غسالہ اسے غسل دینے لگی۔ تو اس نے اس نیک بی بی کی شرمگاہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کہ عورت تو پرلے درجے کی زانیہ اور فاحشہ تھی۔ غسالہ کا یہ کہنا تھا کہ اس کا ہاتھ وہیں چپک کر رہ گیا۔ اور بہت کوشش کے باوجود جدا نہ ہوا۔ اس عورت کے وارث علماء اور فقہا کے پاس بھاگے۔ لیکن کوئی بھی شخص خاطر خواہ جواب دے سکا آخر وہ امام مالکؒ کے پاس آئے۔ اور تمام ماجرا بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ غسالہ نے ایک نیک عورت پر تہمت لگائی ہے اس لئے غسالہ پر حد قذف عائد کی جائے یعنی اس کو تہمت لگانے کی سزا اسّی درّے دی جائے، جب غسالہ کو اسّی درّے لگائے گئے۔ تو ہاتھ خود الگ ہوگیا۔ اس واقعہ کا بہت دور دور تک چرچا ہوا کیونکہ اس سے آپ کی علمی بصیرت اور فقہی اجتہاد پر قدرت رکھنے کا پتہ چلتا تھا"

واقعہ آپ نے پڑھ لیا۔ اس کے بعد آپ صرف ایک بار ایک نظر پھر ان ڈگریوں پر ڈال لیجئے۔ جو مندرجہ بالا فہرست میں لاؤڈ سپیکروں کی طرح آویزاں ہیں۔

۲۔ سب کچھ جانتے بوجھتے

جریدہ ایشیا (لاہور) کی ۱۱۔ اکتوبر کی اشاعت میں ڈاکٹر الٰہی علوی صاحب، سابق کونسلر آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اسلامی آئین اور قائداعظم"۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو ۱۹۴۳ء میں کراچی میں منعقد ہوا تھا (اور جس میں ڈاکٹر علوی صاحب خود شریک تھے) ایک قرارداد منظور ہوئی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ

> پاکستان میں جو آئین ہوگا وہ قرآن وسنت کے مطابق ہوگا اور رائج الوقت قوانین میں جلد سے جلد شریعت کے مطابق تبدیلی کی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس تجویز کی موافقت میں متعدد تقاریر ہوئیں، اور اس کی مخالفت میں کوئی ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ خود قائداعظم نے اس کے حق میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ـــــ

> جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے وہ ہر مسلمان کے دل کی پکار ہے، اور قرارداد پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ مسلم لیگ کا مشن اور پاکستان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ پاکستان میں اللہ کے دین کا نظام قائم ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ وہ (اس اجلاس کے بعد) مودودی صاحب سے ملنے سرنا ـــــ (دارالاسلام) گئے۔ اور ان سے اس اجلاس کی کارروائی اور قرارداد کا تذکرہ کیا۔ اور

> مولانا سے عرض کیا کہ لیگ کے قائد اور ممبران کا یہ میلان دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لئے اب آپ کا مشورہ کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا۔ کہ مسلم لیگ میں اس رجحان کو تقویت دینے کے لئے مخلص اور دیندار لوگوں کا اس میں رہنا نہایت ضروری ہے۔

یہ ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد

(۱) مودودی صاحب خود مسلم لیگ میں شریک ہو گئے؟ اگر نہیں ہوئے تو کیوں!

(۲) کیا انہوں نے اپنی جماعت کے اراکین کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔ ظاہر ہے۔ کہ ان میں کچھ تو "مخلص اور دیندار" ہونگے ہی؟

(۳) کیا مودودی صاحب نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں، مسلم لیگ کی اس قرارداد کا تذکرہ کیا یا عام مسلمانوں

کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔

اس کے برعکس کیا یہ واقعہ نہیں کہ

(۱) مودودی صاحب بدستور مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے؟ حتیٰ کہ

(۲) انہوں نے فروری ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں لکھا کہ "جنت الحمقا میں بسنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں۔ لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا ——— اور

(۳) اپریل ۱۹۴۷ء میں جب ان کی جماعت کے ایک اجلاس (منعقدہ ٹونک) میں ان کی جماعت کے بعض افراد نے مسلم لیگ میں شمولیت کے متعلق سوال کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ "جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں۔ تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دے؟"

حالانکہ جب اسی قسم کی قرارداد، پاکستان کی مجلس دستور ساز نے پاس کی (جسے قرارداد مقاصد کہا جاتا ہے) مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اس سے یہ مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ یعنی مملکتِ پاکستان تو اس قرارداد سے مسلمان ہو گئی۔ لیکن تحریک پاکستان اس قسم کی قرارداد کے باوجود غیر اسلامی کی غیر اسلامی رہی۔

اور اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب بھی' اپنے ہم نواؤں کی نگاہ میں بدستور" امام احمد بن حنبلؒ"۔ اور امام ابن تیمیہؒ "کے ہم پایہ رہے!!

اے زر تو خدا نئی، ولیکن ——— ستار العیوبی وقاضی الحاجاتی

۳۔ ووٹ کی قیمت ——— حرام کو حلالِ طیّب قرار دیدیا گیا

جماعت اسلامی کے نقیب' ایشیا' کی ۲۵۔ اکتوبر کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ لاہور کے ایک سو آٹھ (۱۰۸) وکیلوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔ اس تقریب پر مودودی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

پاکستان کے وکلاء نے ہمیشہ اپنے فرض کو پہچانا ہے اور ہر نازک مرحلے پر وہ ملک کو بچانے کے لئے آگے بڑھے ہیں۔ انہوں نے اس ملک میں قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کے لئے اپنا کردار پوری طرح ادا کیا ہے۔ میں ان وکلاء کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جو اس موقع پر جماعت اسلامی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر رہے ہیں۔

اور اسی اشاعت میں "ایشیا" نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

تحریکِ پاکستان کے راہنماؤں میں یہ وکلا ہی تھے جنہوں نے آئینی اور قانونی جنگ لڑ کر پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کی اور پاکستان بننے کے بعد اس کو ایک صحیح اسلامی مملکت بنانا۔ یہاں کے عوام کو ان کے انسانی حقوق سے بہرہ مند کرنا، اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے بچانا، اور مختلف فتنوں سے محفوظ کرنا بھی سب سے زیادہ وکلا ہی پر منحصر ہے۔ ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی زمانے میں حضرات علما کی تھی۔

یہ الیکشن کے موسم کی بات ہے، لیکن اس سے پہلے' وکلا ہی نہیں، بلکہ خود پیشہ' وکالت کے متعلق مودودی صاحب کے کیا ارشادات تھے، انہیں بغور سنئے۔ انہوں نے ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا۔

وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت ہے، اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے پیشہ میں کچھ حرام کی آمیزش ہو تو وہ بہرحال بغاوت سے تو کچھ کم درجہ میں گناہ ہے، تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں۔ جن کے اندر کم از کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم کر سکتا ہے۔ اور وہ کم از کم اس حد میں تو حرام نہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے — (ترجمان القرآن - فروری ۱۹۴۴ء)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے۔" اور "اس کے ہاں کھانے پینے سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔"

مودودی صاحب نے وکلا حضرات کو مبارک باد پیش کی ہے، کہ وہ ان کی جماعت میں شامل ہو گئے ان کی ہم نوائی میں ہم بھی وکلا حضرات کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کہ (وقتی طور پر ہی سہی) ان کی کمائی حرام سے حلال تو ہو گئی! اب الیکشن کے بعد دیکھیئے فتویٰ کا رخ کس طرف مڑتا ہے؟

مودودی صاحب نے اپنے اسی جواب میں "زنانِ بازاری کے کسب" کو بھی حرام قرار دیا تھا۔ لیکن ووٹ تو ان کے بھی ہیں! دیکھیئے" ان کے لئے شریعت مودودی کی "کتاب الحیل" سے کیا برآمد ہوتا ہے — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ "

۴۔ اظہارِ تشکر

عسکری حکومت نے ایک کام بالیقین ایسا کیا ہے۔ جس کے لئے نہ صرف موجودہ ملتِ پاکستانیہ، بلکہ

اس کی آنے والی نسلیں بھی اس کی شکر گزار رہیں گی - اس حکومت نے انتخابات منعقد کرنے کے فیصلے کے بعد ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کو جو کھلی چھٹی دی ہے - تو اس سے ہمارے یہ "لیڈران کرام" جو اتنے عرصہ سے قوم کی مرفہ الحالی اور ملک کی بہبودی، بلکہ اسلام کی سرفرازی کا نقاب اوڑھ کر قوم کو مسلسل دھوکا دے رہے تھے - اس بری طرح سے ننگے ہوئے ہیں کہ ساری دنیا ان کے اس رقص برہنہ کا تماشا دیکھ رہی ہے - اور قوم ان کی اصل و حقیقت سے خوب آگاہ ہوتی ہے، ان میں سب سے زیادہ بے نقاب جماعت اسلامی ہوتی ہے، کیونکہ وہی سب سے زیادہ دبیز اور مقدس پردوں میں چھپی ہوئی سامنے آئی تھی - اس سے پہلے ان لوگوں کی ٹیکنیک یہ تھی - کہ یہ اپنے سے باہر کسی کو اپنا ہدف بنا کر، قوم کو تالیاں بجانے کے لئے اس کے پیچھے لگا دیتے تھے - عسکری حکومت کے اس فیصلہ سے اب ان کے سامنے کوئی خارجی ہدف نہیں رہا - اس لئے یہ باہمد گر گتھم گتھا ہو رہے ہیں - اور اس میں ان کے نقاب ہی نہیں پھٹ رہے، کپڑوں تک اتر رہے ہیں -

اور یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافات عمل کی رو سے ہو رہا ہے - انہوں نے اتنے عرصہ تک جو قوم اور ملک کو اس قدر ذلیل، اور خدا کے دین کو اس قدر بدنام کیا تھا - تو خدا کے قانون مکافات نے انہیں اس قدر رسوا اور ذلیل کیا ہے کہ باید و شاید ـــ

پیپلز پارٹی کا انتخابی منشور
(قرآن کے آئینے میں)

ایک طویل عرصے کے انتظار کے بعد پیپلز پارٹی نے بھی بالآخر اپنا انتخابی منشور شائع کر دیا۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا وہ متن ہے، جو نصرت (لاہور) کی ۱۵ تا ۲۲ نومبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ہم اس کا قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

۲۔ کسی تمہید و تعارف کے بغیر منشور کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"پاکستان پیپلز پارٹی کا یہ اعلان کہ،

اسلام ہمارا دین ہے۔

جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

طاقت کے مالک عوام ہیں۔

پارٹی کے نظریہ کی پوری وضاحت کر دیتا ہے اور اس منشور میں پارٹی کا جو پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ اس سب پر محیط ہے۔"

شروع شروع میں اس پارٹی کی طرف سے یہ اعلان ہوا کرتا تھا۔ کہ

اسلام ہمارا مذہب ہے۔

جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

یہ اعلان، سیکولر نظام حکومت کے عین مطابق تھا۔ جس میں مذہب کا دائرہ چند ایک معتقدات اور رسوم پرستش تک محدود ہوتا ہے۔ اور زندگی کے عملی معاملات کا حل اپنے طور پر سوچا جاتا ہے۔ جب اس پر اعتراضات ہوئے تو انہوں نے "مذہب" کی جگہ "دین" کہنا شروع کر دیا۔ لیکن باقی شقیں بدستور رہیں، اور اس طرح یہ

بلا مذاق بن کر رہ گیا۔ ہم نے اس زمانے میں کہا تھا۔ کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے کہنا یوں چاہیے کہ

اسلام ہمارا دین ہے۔ جس کی رُو سے، معاشرت، سیاست، معیشت

غرضیکہ نظامِ حیات کے تمام گوشے ان حدود کے اندر رہتے ہیں۔ جو

قرآن کریم نے متعین کی ہیں، یہی ہمارا نصب العین ہے ——

۳۔ ان کے موجودہ فارمولا میں ایک اور شق کا اضافہ ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ طاقت کے مالک عوام ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے، طاقت (یعنی اقتدارِ اعلیٰ) کے مالک نہ عوام ہوتے ہیں، نہ خواص، نہ افراد ہوتے ہیں نہ قوم

طاقت اس قانون کو حاصل ہوتی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اگر کسی قوم کے ایکاون فیصد تو

ایک طرف، سو فی صد افراد بھی کوئی ایسا قانون وضع کریں جو قرآن کے خلاف ہے، تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس

کی وقعت پرِکاہ جتنی بھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا منشور کی یہ شق۔ قرآنی تصورِ حکومت کے خلاف ہے۔ اس حکومت میں

لاحکم الا للّٰہ۔ اور لاغالب الّاھو۔ "طاقت" کا بنیادی اصول ہے۔

۴۔ منشور میں کہا گیا ہے، کہ

پارٹی کے پروگرام، مطالبات اور سرگرمیوں کی روح اسلام کی تعلیمات کے تابع ہے۔ پارٹی ایسا

کوئی قانون برداشت نہیں کرے گی، جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات کے منافی ہو۔ پارٹی کی مثبت

تجاویز، اسلام کے احکام کی روح اور اصولوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

ان الفاظ کے انتخاب میں بڑی چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔ عصرِ حاضر کی کامیاب سیاست اسے کہا جاتا ہے

جس میں کوئی بات متعین طور پر کہہ کر اپنے آپ کو (COMMIT) نہ کیا جائے —— مندرجہ بالا الفاظ اسی اندازِ سیاست

کے صحیح آئینہ دار ہیں۔ مثلاً کل کو اگر پارٹی کے کسی پروگرام۔ مطالبہ یا سرگرمی پر اعتراض کیا جائے، تو اس کے جواب

میں کہا جا سکے گا۔ کہ آپ اس پروگرام، مطالبہ یا سرگرمی کی محسوس شکل کی طرف نہ دیکھئے۔ اس کی "روح" پر نگاہ

رکھئے۔

اسی طرح اگر پارٹی کے کسی فیصلہ یا اقدام کے متعلق کہا جائیگا کہ وہ اسلام کے فلاں حکم کے خلاف ہے تو جواب

میں کہا جا سکے گا کہ آپ اسلام کے حکم کے الفاظ کی طرف نہ جائیے۔ اس کی "روح" کو پیشِ نظر رکھیئے کہ یہی بات ہم نے

اپنے منشور میں کہی تھی۔ منشور کے ان الفاظ میں کافی تفسیر بلکہ تاویل کی گنجائش رکھ لی گئی ہے۔

پھر اس میں ایک چیز اور بھی قابلِ غور ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ "پارٹی ایسا کوئی قانون برداشت نہیں کرے

گی جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات کے منافی ہو۔" یہ نہیں کہا کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا۔ جو اسلا

[illegible]

ہو، تو اس پر اعتراض کیا گیا کہ یہ اصطلاح (اسلام) بڑی مبہم ہے۔ اس کی جو تعبیر کوئی چاہے کر لی جائے گی، اس کی جگہ "کتاب و سنت" کے الفاظ رکھے جائیں۔ چنانچہ ایک ترمیم کی رو سے اس میں یہ الفاظ رکھ دیئے گئے۔

اب انہی مودودی صاحب نے، جنہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین میں "اسلام" کی جگہ "کتاب و سنت" کے الفاظ درج کرائے تھے، یہ کہہ دیا کہ وہ الفاظ تو محض عوام کے بہلانے کے لئے رکھ دیئے گئے تھے۔ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے، ملک میں حنفی ضابطۂ قوانین نافذ ہونا چاہیئے۔ اس پر مختلف فرقوں کی طرف سے جو بحث چل رہی ہے، اس کا تذکرہ طلوعِ اسلام کے صفحات میں کیا جا چکا ہے (اور کیا جا رہا ہے)۔ اس سلسلہ میں پیپلز پارٹی کے ترجمان روزنامہ مساوات کی ۳ ستمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ سپردِ قلم کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا — مولانا مودودی کی ملتِ مرحومہ (۲) پر تازہ ضربیں — اس میں لکھا گیا تھا کہ

> اسلامی حکومت سے مراد وہ حکومت ہے، جس کا نقشہ سرورِ کائنات نے پیش کیا تھا۔ اگر کسی شخص کو — مزاج شناسِ رسول — کا القاب قبول کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے طرزِ فکر کو حضورؐ کے طرزِ فکر پر ڈھالنے کی سعی کرے اور سوچے کہ اگر حضورؐ کے زمانے میں ملت ان حالات سے دوچار ہوتی، تو وہ کونسا راستہ اختیار کرتے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ قرآن کی طرف رجوع کا حکم دیتے جس میں کسی شخص کے لئے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، کیونکہ حکم اور قانون اللہ کے ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔

یہ پڑھ کر ہماری زبان پر بے ساختہ آیا تھا کہ الحمد للہ! — دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال۔ اور مدیرِ مساوات (محترم حنیف رامے) کے لئے دل سے دعائیں نکلی تھیں۔ قرآن کو قانون کی اساس قرار دینے سے نہ صرف یہ کہ توحیدِ مثبت کا اقرار و اعلان ہو جاتا ہے بلکہ بات بالکل واضح اور متعین ہو جاتی ہے، اس سے ہمیں یہ امید بندھی تھی کہ پیپلز پارٹی کے منشور میں غالباً یہ شق آ جائے گی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں پارٹی میں ایسے افراد تھے جو قرآنِ خالص کی رو سے قانون کی اساس کو متعین رکھنا چاہتے تھے۔ وہاں ایسے عناصر بھی تھے جو اپنے آپ کو اس طرح پابند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ (دبنا بر مصلحت) اسلام سے وابستگی کا اعلان بھی کرنا چاہتے تھے، بنا بریں انکی خواہش تھی کہ منشور میں "اسلام" کی مبہم اصطلاح شامل کی جائے۔ منشور مرتب کرنے والوں نے ان دونوں متخالف گروہوں کی مفاہمت کی شکل یوں پیدا کر دی کہ منشور میں لکھ دیا۔ کہ کوئی قانون "اسلام اور قرآن" کے خلاف نہیں ہوگا — [illegible] متحارب فریقوں کو تو راضی کر لیا۔ لیکن "اسلام اور قرآن" کہہ کر جہالت کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی مثال [illegible]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام اور قرآن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یا للعجب!

منشور کے سرنامہ پر دین۔ اسلام۔ قرآن کے الفاظ (ص ۸۶) کی طرح لکھنے کے بعد، باقی منشور میں کسی ایک

جگہ بھی ان الفاظ کو نہیں لایا گیا۔ سارا منشور سوشلزم کی تشریحات پر مبنی ہے، جن میں چین کے ڈھانچہ کا زیادہ تتبع کیا گیا ہے، اور عبوری دور میں، تدریجی پروگرام کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس دور سے گزرنے کے بعد، جب یہ پروگرام تکمیل تک پہنچے گا۔ تو اس کا نقشہ چین کے سوشلسٹ نظام کا سا ہوگا۔ چنانچہ منشور میں، اسلامی نظام یا اسلامی معاشرت وغیرہ اصطلاحات کے بجائے سوشلسٹ اصلاحات، سوشلسٹ نظام، سوشلسٹ سماج وغیرہ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں، یہ منشور دوسری پارٹیوں کے منشور کے مقابلہ میں زیادہ "دیانتدارانہ" ہے۔ کہ اس میں بات واضح طور پر کہی گئی ہے ــــ اگر اس کے منشور میں، دین۔ اسلام۔ یا اسلام اور قرآن جیسی اصطلاحات نہ رکھی جاتیں تو اور بھی اچھا ہوتا۔ پھر اس دیانت میں مصلحت کی آمیزش نہ رہتی۔

۶۔ قوموں کی زندگی میں نئی نسل کی تعلیم کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جو قوم یا مملکت کسی خاص نظریہ کی حامل ہو، اس کے ہاں یہ سوال اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ زیر نظر منشور میں تعلیم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے

> تعلیم کے میدان میں منتہائے مقصود، از سر نو متعین کرنا ہوگا۔ تعلیم کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ نوجوان نسل کو اپنے گرد و پیش کی دنیا سے باخبر ہونے کے قابل بنانا ہی ضروری نہیں، بلکہ اس کو تبدیل کرنے کے قابل بنانا بھی ضروری ہے، انہیں سماجی تبدیلی کی نوعیت اور تاریخ کے لمحوں کا بھی گہرا علم ہونا چاہیئے، انہیں قدرت کے نظر آنے والے عملوں کے اسرار سمجھنے اور منکشف کرنے کے لئے ضروری سائنسی آلات سے ہی لیس نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ ان میں اتنی دیانت اور جرأت بھی ہونی چاہیئے۔ کہ وہ حقیقت اور سچائی کو اسی طرح قبول کرلیں جس طرح وہ ان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک صحیح معنوں میں غیر طبقاتی سماج کو وجود میں لانے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ طالبان علم کی نظر پورے سماج پر محیط ہو[1]۔

ایک سیکولر مملکت میں نظام تعلیم اسی نہج کا ہوتا ہے، اسلامی مملکت میں نظام تعلیم، طالب علموں کے سامنے، حق اور باطل کے پرکھنے کا ایک خاص معیار (مبنی بر وحی) پیش کرتا ہے اور ان کے قلب و دماغ کو اسی قالب میں ڈھالتا ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی یہی وہ تبدیلی ہے جس کی رو سے وہ دنیاوی نظاموں کو بدلتے ہیں کسی موجودہ نظام کا بدل دینا فی ذاتہٖ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بدلنے کے معنی یہ ہیں کہ غلط کو صحیح سے بدلا جائے۔ اور قرآن کی رو سے ایسی تبدیلی وحی کی راہ نمائی کے بغیر ناممکن ہے۔

۷۔ انتخابی نظام کی اصلاح کے سلسلہ میں منشور میں کہا گیا ہے کہ

> پارلیمنٹ میں مالدار اور صاحب جائیداد طبقہ کو غلبہ دلانے کے لئے موجودہ انتخابی نظام سے بہتر طریقہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ الیکشن لڑنے پر بھاری رقم خرچ ہوتی ہے جو غریب امیدوار اس وقت تک خرچ

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اصل منشور انگریزی زبان میں مرتب کیا گیا تھا۔ اور زیر نظر متن اس کا اردو ترجمہ ہے۔

نہیں کر سکتا۔ جب تک اسے مالدار سرپرستوں کی امداد حاصل نہ ہو۔ یہاں تک کہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتوں کو بھی مفاد پرستوں سے مالی رعایت حاصل کرنے یا معقول مالی وسائل رکھنے والے اشخاص کو ٹکٹ دینے کے خطرہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے!

اس کی اصلاح کے لئے تجویز یہ کیا گیا ہے کہ:۔

انفرادی امیدواروں کے بجائے پارٹی لسٹ کی بنیاد پر انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے گا!

ان سے کوئی پوچھے کہ کیا پارٹیوں کو اپنے وجود، استحکام، پراپیگنڈہ وغیرہ کے لئے مالدار سرپرستوں کی امداد کی ضرورت نہیں پڑتی؟ ان کے اس قدر وسیع اخراجات مالداروں کی اعانت کے بغیر پورے کہاں سے ہو سکتے ہیں؟

انتخابات کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ملک میں آمدنی کے لحاظ سے نشستوں کے حلقے بنائے جائیں۔ اور اسی لحاظ سے نشستوں کی تعداد مقرر کی جائے۔ پھر ہر حلقہ میں امیدوار بھی وہی ہو جس کی اتنی آمدنی ہو اور اسے ووٹ بھی وہی دیں جو اس قدر آمدنی والے ہوں۔ اس سے ملک کی حکومت میں غریبوں کی صحیح نمائندگی ہو سکے گی۔ ہماری اس تجویز کی مخالفت سرمایہ پرستوں کی طرف سے تو ہونی تھی۔ سو ہوئی۔ ہمیں توقع تھی کہ کم از کم پیپلز پارٹی اسے خوش آمدید کہے گی۔ لیکن اس نے بھی اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور موجودہ انتخابات بھی اسی سرمایہ دارانہ طریق سے لڑنے اور آئندہ کے لئے بھی اسی طریق کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سچ کہا تھا اقبال نے کہ:۔

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

۸ ۔ ہمیں توقع تھی کہ اس انتخابی منشور میں اتنا تو ضرور کہا گیا ہوگا کہ

مملکت تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی

ذمہ دار ہوگی

لیکن متعین طور پر اس میں یہ بھی نہیں کہا گیا۔ زرعی اقدامات کے سلسلہ میں صرف اتنا کہا گیا ہے۔ کہ

نیم بے روزگاری ملکی معیشت پر بہت بڑا بوجھ ہے۔ نیم بے روزگاروں اور
بے روزگاروں کو بہرحال پہننے کے لئے لباس، رہنے کو مکان۔ اور
ہر صورت میں خوراک بہم پہنچانا ضروری ہے۔

"بہم پہنچانا ضروری ہے" کے الفاظ تو ہر پارٹی دہراتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار بھی اس ضرورت سے انکار نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی نظام ایسا بھی ہے جو یہ کہے کہ ان ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اور اگر ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں، تو انفرادی طور پر ہر محروم کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ مملکت کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے، اور اجتماعی طور پر قوم کو اس کا حق ہوگا کہ وہ اس قسم کی

حکومت کو بدل ڈالیں۔

اس قسم کی ذمہ داری قرآنی نظام ہی اپنے سر پر لیتا ہے۔ اس وقت تک یہ ذمہ داری نہ روسی نظام نے اپنے سر پہ لی ہے نہ چینی نظام نے۔ اور نہ ہی موجودہ منشور نے ایسا کہا ہے۔ اس میں بھی وہی اجرتوں، تنخواہوں اور پنشنوں کی اصلاح کا چکر چلایا گیا ہے۔ قرآنی نظام میں اجرتوں اور تنخواہوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا اساسی اصول ہے کہ

ہر شخص اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق کام کرے۔ اور

مملکت ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

۹۔ قرآن کی رو سے، قومیت کا معیار اشتراکِ ایمان ہے نہ کہ رنگ، نسل، زبان، وطن کا اشتراک۔ اسی اصل الاصول کو "دو قومی نظریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ مملکتِ پاکستان میں اس نظریہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کے متعلق روزنامہ مساوات نے اپنی ۱۱ ستمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا۔

پاکستان اس دو قومی نظریہ کی پیداوار ہے، جسے برصغیر پاک و ہند میں سراج الدولہ سے لیکر قائداعظم محمد علی جناح تک ہمارے اکابرین نے اپنے خون اور پسینے سے سینچا۔ یہ دو قومی نظریہ ہی تھا جس نے ایک ملک کو دو مختار مملکتوں میں بانٹ کر دنیا کا جغرافیہ بدل دیا۔ اور ہندوستان میں بسنے والی ایک اقلیت کو دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کا وارث بنا دیا۔

پاکستان کو بجا طور پر قائداعظمؒ کی میراث کہا جاتا ہے، لیکن قائداعظم کی اصل میراث وہ دو قومی نظریہ ہے جس نے پاکستان کو جنم دیا۔ اور جو خود انہیں، ٹیپو سلطان۔ سید احمد شہید۔ سید احمد خان، محمد علی جوہر اور اقبال سے ورثے میں ملا تھا۔ آج اگر اس نظریے پر زد پڑتی ہے۔ تو گویا پاکستان کی بنیاد ڈھے جاتی اور ہماری جداگانہ قومیت کے نیچے سے زمین سرک جاتی ہے۔

دو قومی نظریہ پہلے بھی ہمارے دشمنوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اور آج بھی ان کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ جوں جوں پاکستانی قوم اس نظریے کی معنویت سے غافل ہوتی جائے گی، ہمارے دشمنوں کا وہ خواب پورا ہوتا جائے گا۔ جو انہوں نے کل اکھنڈ بھارت کی شکل میں دیکھا تھا۔ اور آج پاک بھارت کنفیڈریشن کی صورت میں دیکھ رہے ہیں ....

نظریہ پاکستان اگر کچھ ہے تو صرف دو قومی نظریہ ہے۔ اسی نظریے پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اسی پہ پورے برصغیر کے مسلمانوں نے ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے پاکستان کے حصول کے لئے سرفروشانہ جدوجہد

کی، اس نظریہ کے مطابق ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، جن کا دین، تہذیب و تمدن اور طرزِ حکومت اس حد تک مختلف ہیں، کہ وہ ایک مملکت کی صورت میں زندگی نہیں گزار سکتیں"۔۔۔۔۔

یہ ہے دو قومی نظریہ کی اہمیت، خود پیپلز پارٹی کے ترجمان کے الفاظ میں۔ لیکن زیرِ نظر منشور میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم باشندے ایک قوم کے افراد نہیں، بلکہ مسلمان اپنے دین کی اشتراک کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں، اس کے برعکس، اس میں غیر مسلم اقلیتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ

> پاکستان کے تمام شہریوں کو مذہبی عقیدے، نسل اور رنگ کے امتیاز کے بغیر مساوی سیاسی حقوق حاصل ہوں گے، انہیں قانون کا یکساں تحفظ حاصل ہوگا۔ وہ ہر پبلک عہدہ حاصل کر سکیں گے اور ملازمت کے سلسلہ میں ان کے خلاف کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

ہم محترم مدیرِ مساوات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ کیا یہی وہ "دو قومی نظریہ" ہے۔ جو مملکت پاکستان کی اساس تھا؟

لیکن ہم محترم مدیرِ مساوات سے کیا پوچھیں۔ وہ تو کچھ ایسے مضیق میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ ہمیں ان کی حالت پر رحم آتا ہے۔ محترم موصوف (حنیف رامے صاحب) کے متعلق ہم اچھی رائے رکھتے ہیں ــ وہ سلجھی ہوئی فکر کے نوجوان ہیں۔ جنہیں قرآن پاک سے بھی شغف ہے۔ اس دور میں ایسے نوجوان بہرحال مغتنمات میں سے ہیں لیکن پارٹی بازی ایسی لعنت ہے کہ اس میں انسان اگر وہ بندانہ عصبیت کا اس بُری طرح سے شکار ہو جاتا ہے کہ وہ زیرِ دام پھڑپھڑاتا تو ہے، اس کے حلقے توڑ کر باہر نہیں نکل سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا اندازہ غلط ہو، لیکن نصرت کی نگارشات سے کچھ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے۔ مثلاً زیرِ نظر منشور کی اشاعت کے ساتھ ہی نصرت کے مقالۂ افتتاحیہ میں اس منشور پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا گیا ہے۔

> اس منشور کو ایک جملہ میں ادا کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلامی نیشنلزم اور اسلامی سوشلزم کے ان دو عظیم ستونوں کی تعمیر نو کا بلیو پرنٹ ہے جن پر قائداعظمؒ نے پاکستان کی عمارت کھڑی کی تھی۔ اسلامی نیشنلزم یا دو قومی نظریہ ہی سیاسی سطح پر تحریک پاکستان کا محور اور قیام پاکستان کا سنگِ بنیاد تھا۔

یہ ہے محترم حنیف رامے صاحب کا دو قومی نظریہ کا تصور جس کی تشریح ان کے اس مقالہ افتتاحیہ میں بھی ہمارے سامنے آچکی ہے جس کے اقتباسات پہلے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے اس تصور کو سامنے رکھیے، اور اس کے بعد اس سلسلہ میں جو کچھ منشور میں کہا گیا ہے، اس پر ایک نظر پھر ڈالئے اور سوچئے کہ جو کچھ منشور میں کہا گیا ہے وہ "دو قومی نظریہ" ہے یا مسلم اور غیر مسلم کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کا نظریہ۔ جسے تحریک پاکستان کے مخالفین پیش کیا کرتے تھے۔ اگر رامے صاحب پیپلز پارٹی سے وابستہ نہ ہوتے تو ظاہر ہے کہ وہ منشور میں پیش کردہ تصور

قومیت کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے۔ لیکن بُرا ہو پارٹی عصبیت کا کہ منشور میں تو متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے لیکن وہ اپنے اداریہ میں تاثر یہ دینا چاہتے ہیں کہ منشور میں دو قومی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ رائے صاحب سے ہمیں (کم از کم) اس حد تک آگے چلے جانے کی توقع نہ تھی کہ وہ منشور کے سیاہ کو سفید کر کے دکھلانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہیں پارٹی بازی کی مجبوریاں اور وہ کشمکش جس میں رائے صاحب گرفتار ہیں۔

کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ !

سر جھکائے نہ بنے، آنکھ اٹھائے نہ بنے

رائے صاحب نے مملکتِ پاکستان کا دوسرا ستون اسلامی سوشلزم قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

> اس پروگرام کو اسلام کے دو عظیم اصولوں پر استوار کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ سود ختم کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ بیت المال قائم کر دیا جائے۔ دنیا بھر کے ماہرینِ اقتصادیات اور مسلمانوں کے نمائندہ فقہی مکاتب اس بات پر متفق ہیں کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام سود پر چلتے ہیں۔ ان کے برعکس صرف ایک ہی نظام ہے جو محنت پر مبنی ہے اور سود کی نفی کرتا ہے۔ اہلِ اسلام اسے مساواتِ محمدی کا نام دیتے ہیں۔ دنیا والے اسے سوشلزم کہتے ہیں۔

رائے صاحب نے بات تو صحیح کہی ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے خلطِ مبحث کا اندیشہ ہے۔ ہمارے مذہبی پیشوا (جو نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار ہیں) قدم قدم پر یہ کہتے ہیں کہ سود حرام ہے اور بیت المال کا قیام ضروری ہے۔ یہی الفاظ رائے صاحب نے بھی استعمال کئے ہیں۔ اس سے ہماری مذہبی پیشوائیت یہ کہے گی کہ یہی کچھ ہم کہتے ہیں اور یہی کچھ یہ "سوشلسٹ" کہتے ہیں۔ ہم خدا اور رسولؐ کے نام کے ساتھ یہ کچھ کہتے ہیں اور یہ لوگ سوشلزم کے ملحدانہ نظریات کے مطابق یہ کچھ کہتے ہیں۔ سو مسلمان خود فیصلہ کر لیں کہ کس کا دعویٰ مطابقِ اسلام ہے۔

رائے صاحب کو چاہیئے تھا کہ سود کے بجائے ربٰوا کی قرآنی اصطلاح استعمال کرتے اور اس کے بعد بتاتے کہ ربٰوا کے معنی ہیں "سرمایہ کا معاوضہ، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ اس سے مزارعت، مضاربت، کرایہ، بٹہ وغیرہ کی تمام شکلیں ممنوع قرار پا جاتیں اور یوں مذہبی پیشوائیت کے حرام کردہ سود اور قرآنی ربٰوا کا فرق نکھر کر سامنے آ جاتا۔ رائے صاحب نے یہ تو کہا ہے کہ "اسلامی نظام محنت پر مبنی ہے اور سود کی نفی کرتا ہے" لیکن اس سے بات واضح نہیں ہوتی۔ ہمارے فقہی مکاتب 'سود' کو تو بے شک حرام قرار دیتے ہیں' لیکن ربٰوا کو نہیں۔

لیکن محترم رائے صاحب کی غالباً دشواری یہ بھی کہ زیرِ نظر منشور میں بھی اس قسم کی صراحت نہیں کی گئی۔

باقی رہا بیت المال سو یہ وہی چیز ہے جسے آجکل خزانہ یا (TREASURY) کہتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں حکومت کا مال — دولت یا اجناس وغیرہ — جمع کیا جاتا ہے۔ رائے صاحب نے اُس مفہوم کی جس کے لئے انہوں نے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے یہ کہہ کر تصریح کر دی تھی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رزق کے سرچشموں کو قومی ملکیت میں لے کر ملک بھر کے حاجتمندوں کی حاجتوں کو قومی خزانہ سے پورا کرنے کا سامان مہیا کیا جائے۔ اس کے لئے زیادہ موزوں اصطلاح "قرآن کا معاشی نظام" ہے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے ہمہ گیر ہے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رائے صاحب مذہب کی مروجہ اصطلاحات کا استعمال زیادہ قرینِ مصلحت سمجھتے ہیں۔ لیکن انہیں غالباً اس کا احساس نہیں کہ ان اصطلاحات کا مروجہ مفہوم ہی تو ہے جو ہمارے مروجہ اسلام کی جگہ دین کا نظام قائم کرنے کے راستے میں سب سے زیادہ وزنی سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ اس کے لئے ہمیں قرآنی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں اور ان کا قرآنی تصور بھی زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیئے۔ مثلاً رائے صاحب نے اس اداریہ کے آخر میں کہا ہے کہ اس نظام کی رو سے "ہر شخص کو اتنا خوشحال بنا دیا جائے کہ وہ زکوٰۃ دے سکے لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہو"! اس سے زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم سامنے آ گیا ہے جس کی رُو سے جمع شدہ دولت پر اڑھائی فیصد سالانہ دے دینے سے اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کا یہی تصور ہے جسے نظامِ سرمایہ داری کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے زکوٰۃ کے معنی ہیں "سامانِ نشو ونما مہیا کرنا" اور اسے حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو ۲۲/۴۱)۔ اس تصور کی رُو سے ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ "ہر شخص زکوٰۃ دے سکے۔ لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہو"۔ جب اسلامی نظام میں دولت جمع ہی نہیں کی جا سکتی تو اس میں مروجہ زکوٰۃ دینے والوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جب قرآن کا معاشی نظام پیش کریں تو اس کے لئے ایک تو غیر قرآنی اصطلاحات کبھی استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ اور قرآنی اصطلاحات استعمال کی جائیں تو ان کا قرآنی مفہوم واضح کر دینا چاہیئے۔ اسی سے "الفرقان" کی کیفیت پیدا ہوگی — یعنی دو متضاد تصورات کو نکھار کر اور ابھار کر الگ الگ کر دینا۔

(۰)

بات پیپلز پارٹی کے انتخابی منشور کی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس منشور کو قرآنی نقطۂ نگاہ سے اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کی رُو سے اسلامی منشور تو وہی کہلا سکے گا جو (قائداعظم کے الفاظ میں) اس امر کا دو ٹوک اعلان کرے کہ

ہماری آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب متعین کرے گی۔ اور
ہمارا نظامِ حکومت قرآنی احکام و قوانین کے نفاذ کی ایجنسی ہو گی۔ اور بس۔

لیکن ان معنوں میں تو کسی پارٹی کا منشور بھی اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا دینی نقطۂ نگاہ سے سب منشور ایک جیسے ہیں۔ لیکن پیپلز پارٹی کا منشور کم از کم دنیاوی نقطۂ نظر سے باقیوں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ ان میں سے ہر منشور کا عملی نتیجہ سیکولر نظامِ حکومت ہو گا۔ لیکن جہاں باقی منشوروں کا نتیجہ "خسر الدنیا و الآخرۃ" (دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی) ہو گا، زیرِ نظر منشور کم از کم دنیاوی مفاد کے حصول کی واضح تجاویز تو پیش کرتا ہے۔ امید ہے انہیں آئینی طور پر بروئے کار لایا جائے گا' سوشلزم کے طریقے سے نہیں۔

—— (پرویز) ——

طلوعِ اسلام کنونشن

محترم محمد اسلام صاحب

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

انسانی تاریخ کا یہ ایک عجیب سا تضاد نظر آتا ہے کہ جو آواز لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھتی ہے اسکی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف بلانے کی دعوت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے علاوہ دنیا کی ہر محکومیت سے آزاد کرا دیا جائے۔ اور خدا پرستوں کا مقصدِ حیات یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو اپنا محکوم بنایا اور رکھا جائے۔ قرآنِ مجید اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت کی مخالفت ہمیشہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی جس کا پشت پناہ سرمایہ دار طبقہ ہوتا ہے۔ اور انبیاء کرام کا مشن ان قوتوں کو شکست دے کر انسانوں کو ان کی محکومی کی لعنت سے آزاد کرانا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں یہ کشمکش بھی اپنی انتہا تک پہنچی اور اس کے بعد خدا کی حکومیت کا نظام بھی اپنی انتہائی آب و تاب کے ساتھ متمکن ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پھر انہی مخالف قوتوں نے سر اٹھایا اور یہ نظام آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تیرہ سو سال کے بعد یہ آواز ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اقبالؒ کی زبان سے بلند ہوئی اور قائد اعظمؒ اسے عملی شکل دینے کے لئے میدان میں آ گئے۔ تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا اور مذہبی پیشوائیت اس کی مخالفت میں پوری شد و مد سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ قائد اعظمؒ، انگریز اور ہندو کے محاذ کو نہایت عمدگی سے سنبھال سکتے تھے لیکن وہ حضرات جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کے نعروں سے مخالفت کے لئے ابھرے تھے، ان کے مقابلے کے لئے انہیں کسی معاون کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ان کی نگاہِ انتخاب ایک ایسے نوجوان پر پڑی کا جو ایک مدت سے انہی وادیوں میں مصروفِ تحقیق تھا۔ اس نوجوان کا نام جو اس وقت حکومتِ ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا اور آج قرآن کریم کے حقائق کے سلسلہ میں اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے غلام احمد پرویز تھا۔ اور یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا۔ اس میدان میں اس کے مدِ مقابل قبا اور عمامہ کے بڑے بڑے علمبردار تھے جن کی علمیت اور فضلیت کا سکہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ ہند تک کے لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا ـــــ مولانا ابو الکلام آزاد، حسین احمد مدنی،

احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ وغیر نیشنلسٹ علماء، مجلس احرار، سرخ پوش، جمعیت انصار، جماعت اسلامی، اور ان کے ہمنوا ــــ یہ سب تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے تھے اور ان کے مقابلہ میں یکہ و تنہا طلوعِ اسلام۔ اس نے مخالفتوں کے اس ہجوم کا پامردی سے مقابلہ کیا اور انہیں ہر مقام پر جس بری طرح سے شکست دی اس کی زندہ شہادت طلوعِ اسلام کے اس زمانے کے فائل ہیں۔

للہ الحمد کہ وہاں یہ معرکہ بہ حسن و خوبی سر ہوا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ یہاں آنے کے بعد طلوعِ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز جنوری ۱۹۴۸ء کو ہوا اور یہ بہ توفیقِ ایزدی، تمام مخالفتوں سے ٹکراتا ہوا اور ہر قسم کی آلودگی سے دامن بچاتا اپنے ارتقائی منازل طے کرتا، آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

عزیزانِ محترم! تقلید کی روش بڑی آرام دہ، سہولت بخش اور خوش آیند ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فکر کی، نہ کچھ محنت درکار ہوتی ہے نہ کاوش، عوام کے مروجہ عقاید اور متوارث اعمال و رسوم، خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، آپ ان کی تائید کیجئے پوری قوم آپ کے ساتھ ہوگی۔ آپ اپنے زورِ بیان سے ان عقاید و رسوم کی مدح و ستائش میں قصائد لکھتے ہیں یا ان کے بے مثل و بے نظیر ہونے پر کتابیں تصنیف کرتے ہیں تو آپ قوم کے محبوب القلوب عالمِ بے بدل، دنیا کے سب سے بڑے مفکر اور اسلام کے بہت بڑے محسن قرار پاتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو صرف کرنا یہ ہوگا کہ جو بات یا مسئلہ آپ کے سامنے آئے اس کے متعلق یہ بتا دیں کہ فلاں کتاب میں اس کے متعلق یہ لکھا ہے اور فلاں امام صاحب نے اس کی بابت یہ بتایا ہے۔ پھر جو شخص اس کے برعکس کچھ کہے اسے بہت بڑے فتنے کا بانی قرار دے کر اس کے خلاف "جہاد" کا فتویٰ صادر فرما دیں۔ بس اس کے بعد آپ کی پرستش ہوگی، جلوس نکلیں گے۔ اس قسم کی خدمتِ دین کے لئے لاکھوں روپے آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے جائیں گے جس کے بل بوتے پر سینکڑوں لکھنے اور بولنے والے آپ کے ہمنوا ہوں گے۔ آپ کو ان ہمنواؤں کی رفاقت اور عوام کے اتباع سے بہت بڑی طاقت حاصل ہوگی۔ اس طاقت کے زور پر آپ جس شے کو جی میں آئے منوا سکیں گے۔ یہ ہے تقلید کی روش کا ایک پہلو، اور اس کے بظاہر نفع بخش نتائج۔

اس کے برعکس دوسری روش تحقیق کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر مروجہ عقائد اور متوارث اعمال و رسوم موجود ہیں انہیں ایک ایک کر کے پرکھا جائے۔ ان میں سے جو صحیح ثابت ہوں انہیں اختیار کیا جائے اور جو غلط نکلیں انہیں چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر کہ ایک مسلمان محقق کے لئے تحقیق و تنقید کی میزان صرف خدا کی کتاب ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہی حق و باطل کا معیار ہے۔ اسی سے غلط اور صحیح میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ وہی یہ بتا سکتی ہے کہ دین کا کونسا نظام اللہ نے تجویز کیا ہے اور کون کون سی باتیں ایسی ہیں جو اس میں بعد ازاں باہر سے انسانوں نے شامل کر دی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحقیق کے لئے علم و فکر کی بھی ضرورت ہوگی اور محنت و کاوش بھی درکار۔ اس لئے کہ اس میں

ہر غلط کی علی وجہ البصیرت تردید کرنی ہوگی اور اپنے ہر دعویٰ کی تائید میں خدائی سند پیش کرنی پڑے گی۔ جب آپ اس تحقیق کے بعد ان غیر قرآنی عقاید و اعمال کے خلاف آواز اٹھائیں گے جو عوام میں متوارث چلے آرہے ہیں تو اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ ہر طرف سے آپ پر الزام تراشیاں شروع ہو جائیں گی۔ تکفیر کے فتوے ڈھالے جائیں گے۔ نہ کوئی آپ کا ساتھی ہوگا نہ ہمنوا۔ آپ کو اپنے مقدور کے مطابق تنہا یہ جنگ انسانوں کے خودساختہ مذہب کے خلاف لڑنی پڑے گی اور اپنی ہر "ذاتی" اور اضافی متاع کو اس کی نذر کر دینا ہوگا۔ پرویز صاحب نے یہاں اگر قرآنِ کریم کی روشنی میں یہی روش اختیار کی۔ میں اس مختصر سے وقت میں انہی کے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا پیغام کیا ہے اور اس کی علم کیا۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ

"کائنات میں ہر شے اپنی ارتقائی منزل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی سبب سے آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ قانونِ ارتقاء ہے جس کی رو سے زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو، آگے وہی بڑھ سکتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استعداد ہو، یعنی وہ نوع جو کشمکشِ حیات میں ناسامد قوتوں سے نبرد آزما ہو کر انہیں شکست دے اور یوں اپنے زندہ رہنے کا ثبوت فراہم کرے وہ زندہ رہتی ہے جو ایسا نہ کرے وہ مٹ جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقاء جاری و ساری ہے۔ انسانیت کا ارتقاء علم و دانش کی راہ سے ہوتا ہے۔ ہر نئی نسل کے سامنے اس کے ماحول کے موانع و مشکلات ہوتی ہیں جنہیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیقِ مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیقِ مقاصد کا ہے۔ مقاصد کی تخلیق جدتِ فکر و ندرتِ خیال کی رہین ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے، اس کے قوائے فکریہ معطل ہو جائیں تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی۔ لہٰذا وہ قابلِ نمو (DYNAMIC) اور ذی استعداد (ORGANIC) ہونے کے بجائے مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن کے رہ جاتی ہے اور مٹی اور پتھر سے جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔"

محترم پرویز صاحب کی پکار یہ ہے کہ "میرا ایمان ہے اور میں اسی ایمان کے سہارے زندہ ہوں کہ اگر آج بھی قرآن سے ان تو بر تو پردوں کو الگ کر دیا جائے جو انسانی تصورات نے اس پر ڈال رکھے ہیں اور سیرتِ محمدیہ کو ان حشو و زواید سے پاک کر دیا جائے جو ہماری ناعاقبت اندیشیوں اور غلط عقیدت مندیوں نے اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی طرف منسوب کر رکھے ہیں تو اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت اب بھی زندگی کی اس متوازن و ہموار راہ پر لگ سکتی ہے جو اسے سیدھی شادابیوں اور کامرانیوں کی جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا مقصود انسانیت سازی ہے جس کا مشہود پیکر ذاتِ محمدی ہے (لیکن وہی پیکر جسے قرآن نے پیش کیا ہے) جب تک دنیا اس مقام تک نہیں پہنچ جاتی شرف و عزیت کی فیروزمندیاں اس کے حصے میں نہیں آسکتیں اور اس مقام تک پہنچنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن اور سیرتِ صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) دنیا کے سامنے اپنی اصل شکل میں آجائے۔"

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ "قرآنِ کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ اس ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آجائے۔ اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کی جائے لیکن اگر نسخہ کے الو کھے استعمال کی طرح اس ضابطۂ زندگی کو بازوں سے باندھ لیا جائے گلے میں لٹکا لیا جائے۔ گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے۔ اس کے الفاظ و حروف کی گنتی شروع کی جائے اور توقع یہ کی جائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطۂ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے وہ ہمیں اس الوکھے مگر سہل طریقے سے ہی مل جائے تو نتیجہ سوائے خسران کے اور کیا ہوگا؟"

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ "اسلام میں نظامِ زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے جو ایک عبدِ مسلم کے فکر و نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے یعنی انسانوں کو (خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ) دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں نسل یا ملک کی تقسیم سے انسانیت کی تقسیم نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مار پیچاں کی طرح لپٹے ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "وہی نظریۂ حیات، وہی اصولِ زندگی، وہی نظامِ معاشرہ دنیا میں باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ یعنی ایک تو وہ نفع رساں اور منفعت بخش ہو اور دوسرے یہ کہ اس کی منفعت بخشی کسی خاص گروہ، خاص پارٹی، خاص ملک، خاص قوم تک محدود نہ ہو بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ یہ ہے وہ عالمگیر اصول جس کی بنیادوں پر قرآن اپنا نظامِ زندگی استوار کرتا ہے اور یہی اصول قوموں کی زندگی کا حقیقی ضامن بن سکتا ہے۔"

حضرات! طلوعِ اسلام اس دعویٰ کا حامی ہے کہ قرآنِ کریم نوعِ انسانی کے تمام بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتا ہے۔ اس بنا پر اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ معاشی نظام جیسے اہم ترین مسئلہ کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بناتا۔ چنانچہ اس نے گزشتہ بیس پچیس سال میں اس موضوع پر ہزارہا صفحات شائع کئے۔ ان میں نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد اور اشتراکی نظام کے فلسفہ اور معاشی نظم و نسق کا تجزیہ کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس کے بعد شرح و بسط سے بتایا کہ قرآنِ کریم کون سا فلسفۂ زندگی اور اس پر متفرع کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے اور ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے جو کچھ "اسلام" کے نام پر پیش کیا جاتا ہے اس کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ جو حضرات قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی تفصیلات دیکھنا چاہیں۔ وہ ادارہ

طلوعِ اسلام کی شائع کردہ دو کتابیں "نظامِ ربوبیت" اور "خدا اور سرمایہ دار" کا مطالعہ فرمائیں۔ اس وقت میں صرف چند اقتباسات پر ہی اکتفا کروں گا۔

معاشی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا: "اس میں شک نہیں کہ ہمارے دور میں (معاشی) مسئلہ نے ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آنے والا مورخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصرِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکار سکیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیب، تمدن، معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت دنیا عملاً جن دو بلاکس (BLOCKS) میں بٹی ہوئی ہے، ان میں کہنے کو تو خطِ امتیاز نظامِ حکومت ہے، یعنی ڈکٹیٹر شپ اور جمہوریت، لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلاف نظامِ معیشت (ECONOMIC ORDER) ہی کا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام، روٹی کے مسئلہ نے دونوں کی ناک میں نکیل ڈالی ہوئی ہے اور وہ انہیں جدھر بھی چاہے کشاں کشاں لئے پھر رہا ہے"۔

"انسان نے اس مسئلہ کے لئے جب مذہب کے دروازہ پر دستک دی، مذہب سے میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب تو اس نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ ہمارا مقصد انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے ہمارا کوئی سروکار نہیں یہ مادی دنیا کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے اس لئے خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہوسکے اس سے دور بھاگیں۔ لیکن یہ محض فریبِ نفس تھا یا فرار کی راہ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دور کیوں نہ بھاگے اور اس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے۔ لیکن خوراک کے مسئلہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے، کھائے بغیر گذارہ نہیں رہ سکتا بھوک رشیوں، منیوں کو بھی لگتی ہے اور پیروں فقیروں کو بھی۔ کھائے بغیر نہ ایشور کے اوتار زندہ رہ سکتے ہیں، نہ اللہ کے مقرب۔ اسلئے (انسانوں کے خود ساختہ) "مذہب" کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں، حقیقت کو جھٹلانا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو، یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو اس پر خدا کا غضب ہے"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "عسرت اور زبوں حالی کسی فرد یا قوم کی زندگی کا معمول ہو جاتے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے اس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ اس لئے جن اعمال کے نتائج اِس زندگی میں رسواکُن اور ذلت انگیز ہوں، عاقبت میں ان کے نتائج عزت بخش اور مسرت آمیز نہیں بن سکتے۔ لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہوگی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کیسی ہے۔ اگر اسے سامانِ زیست کی فراوانی نصیب نہیں، اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں ماخوذ ہے، اگر وہ اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے دروازے پر جھولی پھیلانے کے لئے مجبور ہے تو اس قوم کو عاقبت کی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے، جو تمام نوعِ انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔ اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔ اگر افراد روٹی کی فکر سے آزاد نہ ہوں تو وہ انسانی سطح کی زندگی تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیئے جو افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظامِ ربوبیت، افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے جاتا ہے۔ اسلامی معاشرہ اس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر لے لیتا ہے جس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وہ وجود میں آتا ہے۔ وہ تمام افراد معاشرہ سے پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ (۶:۱۵۱) ہم تمہاری اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "انسانی دنیا میں خدا کا دعویٰ رزاقیت و ربوبیت اس نظام کی رُو سے پورا ہوتا ہے جو اس کے قوانین کی بنیادوں پر خود انسانوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے انسان کی دنیا میں مشیتِ خداوندی کی تکمیل انسانوں ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کا رزق اللہ کے ذمے ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نظام جو قوانینِ خداوندی کی رُو سے قائم ہو تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔"

محترم پرویز صاحب کہتے ہیں کہ "یہ چیز آپ کو صرف اسی نظام میں ملے گی کہ امت کا بلند ترین فرد امیر المؤمنین روٹی کا ایک لقمہ اپنے منہ میں نہیں ڈال سکتا جب تک اسے پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ جس حلقہ کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد پیٹ بھر کر سکھ کی نیند نہیں سو گیا ہے۔ آج انسان کی حالت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ پر ضابطہ خداوندی کی بجائے اپنے خود ساختہ ضوابط کو مسلط کر رکھا ہے اور جب اس نظام کے

فاقہ بھوک، افلاس، ذلت، پریشانی و بربادی کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو اس کا الزام خدا پر دھرتا ہے اور اس کے بعد ان مصائب کا حل پھر کسی اپنے ہی متعین کردہ نظام میں تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے آپ کو خدا کے نظام کے حوالے کردے تو پھر دیکھئے کہ وہ تمام مشکلات کس طرح خود بخود آسان ہو جاتی ہیں۔ نظام اپنے اوپر مسلط کر لینا طاغوتی اور نتائج تلاش کرنے ملکوتی۔ اگر کھلی ہوئی جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے بجائے اس کے کہ ہم اس کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہو گیا ہے لیکن یہ پیوند اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کمیونزم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا) فطری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفۂ زندگی اسلامی فلسفۂ حیات کی ضد ہے۔ "کمیونزم" خود ایک غیر فطری فلسفۂ زندگی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک غیر فطری نظام کی تباہ کاریوں کا حل دوسرا غیر فطری نظام نہیں کر سکتا۔ غیر فطری نظام کا حل صرف کائناتی نظام کر سکتا ہے جسے ہم اسلامی نظام کہہ کر پکارتے ہیں۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "مادی نظریۂ حیات کی رو سے انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا۔ لیکن قرآنی نظریۂ حیات کی رو سے احترامِ انسانیت، انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے "قوت" کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی یہ تبدیلی یقین (CONVICTION) سے آتی ہے۔"

محترم پرویز صاحب کا اعلان یہ ہے کہ "میں اس حقیقت کو بھی واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح اسلام کا فلسفۂ حیات اور نظامِ زندگی کمیونزم کے خلاف ہے، اسی طرح وہ مفاد پرستانہ اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے بھی خلاف ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار اور عجمی تصورات کی یادگار ہے۔" سرمایہ دار طبقہ نے ہمیشہ دین کی مخالفت کی تھی لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے مروجہ مذہب کا سب سے بڑا حامی یہی سرمایہ دار طبقہ ہے۔ فقط یہ ایک بات کہ (سوا یہ دار طبقہ ہمارے مروجہ اسلام کی حمایت کرتا ہے) اس حقیقت کے اثبات کے

لئے دلیل محکم ہے کہ یہ اسلام بہرحال وہ دین نہیں جو خدا کی طرف سے بوساطت محمدؐ رسول اللہ دنیا کو ملا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ وہی دین ہے تو اس سے (معاذ اللہ) خدا کی یہ شہادت جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ "دین جہاں بھی ہو گا سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا۔" طاغوتی قوتوں کی طرف سے کسی دعوت کی مخالفت نہیں ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ دعوت حق و صداقت کی دعوت نہیں ہے خواہ اس پر خدا پرستی کے کیسے ہی جاذبِ نگاہ و نظر فریب پردے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے زندگی (خواہ ان کی شکل کچھ اور نام کوئی سا کیوں نہ ہو) ان کی مفاد پرستیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور نظامِ خداوندی نوعِ انسانی کے ربوبیتِ عامہ کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں پر سخت زد پڑتی ہے، لہٰذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت فطری چیز ہے۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نظام صحیح معنوں میں نظامِ خداوندی نہیں۔ حق و صداقت اور باطل و ضلالت کی دعوتیں پرکھنے کا یہ ایک ایسا کھلا ہوا معیار ہے جس میں کبھی، کہیں کوئی استثناء نظر نہیں آئے گا۔

حضرات! محترم پرویز صاحب کی کوشش یہ ہے کہ "ہم اس خطۂ زمین میں جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ یہاں اسلام کا صحیح نظام قائم کریں خدا کے کائناتی قانون کی رفاقت کا فریضہ سرانجام دیں تاکہ اس کے نتائج ہمارے حساب و شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن کا جو تصورِ زندگی اتنے عرصے سے نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آ جائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد میں نے اپنی تمام مساعی کو اسی نقطہ پر مرکوز رکھا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ ملّت صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدم بہ قدم قرآنی نظامِ ربوبیت کی آخری منزل تک لے جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان کس طرح کشاں کشاں اس نظام کے حیات پرور سایۂ عافیت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح پھر یدخلون فی دین اللہ افواجًا (۱۱۰/۲) کا کیف آور منظر وجہ بالیدگیٔ قلب و نظر ہو جاتا ہے۔ واشرقت الارض بنور ربھا (۳۹/۶۹) زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی؛ کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آ جاتی ہے؟

اعلان

ماہنامہ طلوعِ اسلام ہر ماہ کی یکم تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ۱۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع پہنچ جانی چاہیئے۔ نیز خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ دینا ضروری ہے۔